خطباتِ حکیم الامت

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان فون: 4540513-4519240

ذکر و فکر

بسلسلہ خطبات حکیم الاُمت جلد - ۲۲

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

عنوانات

منشی عبد الرحمن خاںؒ

تصحیح و تزئین
صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ

تخریج احادیث
مولانا زاہد محمود قاسمی

اِدارۂ تالیفاتِ اَشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240

ذکر و فکر

تاریخ اشاعت.................... رجب ۱۴۲۸ھ

ناشر.............................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

طباعت.....................سلامت اقبال پریس ملتان

قارئین سے گذارش

ادراہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تا کہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

ادارہ تالیفات اشرفیہ....چوک فوارہ....ملتان	مکتبہ رشیدیہ........راجہ بازار........راولپنڈی
ادارہ اسلامیات.........انارکلی.........لاہور	یونیورسٹی بک ایجنسی.....خیبر بازار.......پشاور
مکتبہ سید احمد شہید.......اردو بازار.......لاہور	ادارۃ الانور.........نیو ٹاؤن.........کراچی نمبر 5
مکتبہ رحمانیہ.......اُردو بازار .... لاہور	مکتبہ المنظور الاسلامیہ....جامعہ حسینیہ....علی پور

مکتبہ المنظور الاسلامیہ...........بلاک زیڈ........مدینہ ٹاؤن........بنک موڑ........فیصل آباد

ادارہ اشاعت الخیر - حضوری باغ روڈ - ملتان

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K **119-121- HALLIWELL ROAD**
(ISLAMIC BOOKS CENTERE **BOLTON BLI 3NE. (U.K.)**

عرض ناشر

خطبات حکیم الامت جلد نمبر ۲۲ ''ذکر وفکر''

جدید اشاعت سے مزین اپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ کے فضل وکرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل کافی عرصہ سے خطبات کی اشاعت کا ادارہ کو شرف حاصل ہو رہا ہے۔

بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ ان کی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو جائے۔ ادارہ نے زرکثیر خرچ کر کے یہ کام محترم جناب مولانا زاہد محمود صاحب (فاضل جامعہ قاسم العلوم ملتان) سے یہ کام کرایا اور فارسی اشعار اور عربی عبارات کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ تصحیح کا کام حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے سرانجام دیا۔

اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ

ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ بمطابق جون 2007ء

اجمالی فہرست

فہرست عنوانات

تفصیل الذکر

یہ وعظ ۲۵ رجب ۱۳۲۵ھ بروز چہار شنبہ بمقام میرٹھ محلہ خیر نگر مکان حافظ شرافت اللہ صاحب جو کہ حضرت والا نے بیٹھ کر ڈیڑھ گھنٹہ ارشاد فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا وَمَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

يَاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا o

(الاحزاب آیت نمبر ۴۱، ۴۲)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کو خوب کثرت سے یاد کیا کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔''

غفلت ام الامراض ہے

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ایک ایسے امر کا ذکر کیا ہے کہ وہ ہمارے ایسے مرض کا کہ وہ ام الامراض ہے علاج کلی ہے وہ مرض غفلت ہے اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں جو کچھ مفاسد ہیں ان سب کا بڑا سبب غفلت ہے۔

غفلت خروج عن الاسلام کے خطرے سے خالی نہیں

بحمد للہ مسلمانوں میں سے کوئی اسلام کی کسی چھوٹی یا بڑی بات کا منکر تو نہیں ہے نہ اصول کا نہ فروع کا، ہاں غفلت ان سب سے ہو گئی ہے کیا اصول اور کیا فروع اور وہ غفلت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ عجب نہیں کہ انکار تک نوبت آ جائے۔ انکار تو صریح کفر اور خروج عن الاسلام (اسلام سے خارج ہونا) ہے ہی یہ غفلت چونکہ اسی کا ذریعہ ہے اس واسطے خطرہ سے خالی نہیں اور بہت توجہ کے ساتھ علاج کی محتاج ہے۔

عورتیں غفلت کا زیادہ شکار ہیں

اس مرض میں مسلمانوں کے جس گروہ نے زیادہ حصہ لیا ہے وہ عورتوں کا گروہ ہے کہ ان کی تو طبیعت ہی مسلمانوں کی سی طبیعت نہیں رہی جو باتیں اسلام کے خلاف ہیں ان کی عادت اور طبیعت

ثانیہ بن گئی ہیں۔ بجائے اس کے کہ خدا تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرتیں دوسری باتیں جوان احکام کے برخلاف ہیں اپنی طرف سے ایجاد کرلیں اوران سب کی وجہ میرے نزدیک سوائے جہالت کے کچھ نہیں' ہماری عورتوں میں جہالت کوٹ کوٹ کے بھر گئی ہے جوان میں سے پڑھی لکھی ہیں ان میں بھی اور جو ان پڑھ ہیں ان میں بھی۔ بے پڑھی میں تو ظاہر ہے اور رہیں پڑھی ہوئی سوان میں جہالت اس واسطے ہے کہ ان کا نصاب تعلیم بالکل غیر کارآمد نصاب ہے۔ عورتوں نے اپنی تعلیم کے بلکہ یوں کہئے کہ مردوں نے ان کی تعلیم کے تین نصاب بنا رکھے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ بس قرآن شریف پڑھ لیا جس نے قرآن شریف پڑھ لیا اس کو کہا جاتا ہے کہ فلانی پڑھی ہوئی ہے۔ جاہلوں میں بیٹھ کر کہتی ہیں کہ وہ بھی کیا آدمی جو پڑھا ہوا نہ ہو۔ گویا اور کو جاہل کہنے کے لیے یہی کافی ہے کہ انہوں نے قرآن شریف ناظرہ پڑھ لیا ہے اور وہ بھی خدا جانے غلط ہے یا صحیح' عورتیں ایسی بہت کم ہیں جو قرآن شریف صحیح پڑھتی ہوں اور جس بی بی نے الٹا سیدھا ترجمہ بھی قرآن شریف کا پڑھ لیا تو ان کا کچھ پوچھنا ہی نہیں تو وہ اپنے محلّہ کی علامہ سمجھی جاتی ہیں کسی سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی ہیں' اندھوں میں کانا راجہ تمام محلّہ کی امامت ان کو مل جاتی ہے۔ مسئلہ مسائل مولوی کو چھوڑ کر ان ہی سے پوچھے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ بیماریوں کے علاج میں بھی پہلے ان کی ہی کی پوچھ ہوتی ہے' محلّہ والیاں کہا کرتی ہیں اری فلانی کے گھر میں جا کر دوا پوچھ آ وہ بی بی بڑی علم والی ہیں۔

عورتوں کو ترجمہ پڑھانے میں خرابیاں

خوب یاد رکھئے کہ عورتوں کو ترجمہ پڑھانے میں بڑی خرابیاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن میں بہت سی باریک باتیں ہیں جن کے سمجھانے کی ضرورت ہے اور ترجمہ کی حقیقت یہ ہے کہ عربی کے ایک لفظ کی جگہ اردو کا ایک لفظ رکھ دیا جائے گا۔ اگر اردو کا ایک لفظ مطلب سمجھنے کے لیے کافی ہوتا تو عربی کا ایک لفظ بھی ان لوگوں کے لیے کافی ہوتا جو عربی زبان جانتے ہیں اور استاد کی اور کتابوں کی ضرورت نہ ہوتی حالانکہ یہ بالکل خلاف واقع ہے تو اس ترجمہ پڑھنے سے عورتوں کو کیا نفع ہوسکتا ہے بلکہ خرابیاں پیدا ہوگئیں۔

عورتوں کی آواز بھی عورت ہے

ایک بی بی تھیں کہ انہوں نے سارے قرآن شریف کا ترجمہ حفظ کر ڈالا تھا بس اب کیا تھا ان کی ثانی کوئی عورت کاہے کو نکل سکتی تھی وہ بی بی اپنے آپ کو علامہ دہر سمجھتی تھی حتیٰ کہ ایک روز کسی مولوی سے ایک مسئلہ سنا تو کہا غلط بیان کیا' قرآن شریف میں کہیں اس کا پتہ نہیں اور ایک خرابی یہ ہے کہ ترجمہ بغیر علم عربی کے طوطے کی طرح رٹا دینے سے کبھی یاد نہیں رہ سکتا کبھی نہ کبھی کچھ الفاظ

ذہن سے اڑ جائیں گے اور سب ترجمہ گڑ بڑ ہو جائے گا اور طرح طرح کی غلطیاں واقع ہوں گی تو عجب نہیں فائدے سے نقصان زیادہ ہو۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ جتنی محنت ترجمہ کے رٹانے میں کرائی جائے بجائے اس کے ان کتابوں کے پڑھانے میں کرائی جائے جن میں قرآن شریف سے نکال کر احکام لکھ دیئے گئے ہیں اس میں غلطی کا احتمال نہیں بلکہ محنت بھی کم ہے۔ ایک نصاب تو یہ ہوا اور ایک نصاب یہ ہے جس کا عورتوں میں رواج ہے کہ قرآن شریف ختم کرنے کے بعد بہار خلد اور نسیم جنت اور نور نامہ اور چند مناجاتیں اور نظم کی کچھ کتابیں پڑھ لیں اور محفلوں میں بیٹھ بیٹھ کر نظمیں پڑھنے لگیں اور ساری محفل داد دینے لگی ان علامہ عورتوں کو خود اپنا مسئلہ معلوم نہیں کہ عورت کی آواز بھی عورت ہے۔ خوش الحانی سے محلّہ والوں کو سنانا کہاں جائز ہے۔ علاوہ اس کے اس میں جو کچھ مفاسد ہیں سب جانتے ہیں یہ دو نصاب تو وہ ہیں جن کا رواج دین دار عورتوں میں ہے۔

دنیا کی خانہ داری کے لیے بربادی آخرت

ایک نصاب تیسرا اور ہے جس کو دنیا دار عورتوں نے اختیار کیا اور وہ دراصل مردوں کا تجویز کیا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ عورتوں کو مراۃ العروس، توبۃ النصوح اور ایامیٰ وغیرہ پڑھائی جائیں۔ اس نصاب کو آج کل نئے لوگوں نے بہت اچھا اور ضروری سمجھا ہے۔ یوں کہتے ہیں کہ خانہ داری کے لیے یہ نصاب بہت ضروری اور کافی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دنیا کے گھر کے لیے تو کافی ہے آخرت کے گھر کا بھی کچھ اس میں ہے سو کچھ بھی نہیں بلکہ آخرت کے گھر کو خراب کرنے والا ہے۔ ان کتابوں میں مصنف نے بہت سی باتیں وہ لکھی ہیں جو شرعاً منع ہیں۔ مثلاً اصغری اور اکبری کے قصہ میں لکھا ہے کہ اصغری ایسی ہوشیار لڑکی تھی کہ ایک مرتبہ گھر میں شب برأت کے دن حلوے کا سامان نہ تھا تو اس نے یہ چالاکی کی کہ جہاں سے حلوا آیا اس کو گھر میں خرچ نہ ہونے دیا اور ادھر کا ادھر اور ادھر کا ادھر چلتا کر دیا۔ اس سے رسم بھی ادا ہو گئی اور کچھ بھی صرف نہ ہوا۔ بجائے اس کے کہ مصنف اس رسم کو اٹھاتے اور اس کے جاری رکھنے کی آسان تدبیر بتلا دی۔ دنیا کی خانہ داری کے لیے آخرت کا گھر برباد کیا اور ایامیٰ میں تو مصنّف نے غضب کیا ہے ایک سے زیادہ نکاح کرنے کو منع ثابت کیا ہے جو بالکل خلاف نصوص ہے۔ جب اس قسم کی تعلیمی کتاب میں موجود ہیں تو کیسے اس کو اچھا کہا جائے۔ (میں نے اس وقت ان کتابوں کا نام لے دیا حالانکہ میری عادت کے خلاف ہے اس وجہ سے کہ بے نام لیے علم کیسے ہو) علاوہ بریں (اس کے علاوہ) جو باتیں ان کتابوں میں سکھلائی گئی ہیں دنیا کے لیے بھی کچھ زیادہ مفید نہیں وہی باتیں ہیں جن کو عورتیں اکثر خود ہی جانتی ہیں اور ہمارے ابنائے زمان (زمانہ کے لوگ) کا ایک

نصاب اور بھی ہے جوان سب سے بڑھا ہوا ہے اس کی اصل ترقی ہے جس کا ادنیٰ نتیجہ پردہ کا اٹھا دینا ہے ان لوگوں نے دین کی بہت سی خرابیاں دنیا کے ایک تھوڑے فائدے کے لیے گوارا کر لیں اس کے متعلق میں صرف یہ کہتا ہوں "وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ" جب آنکھ مچے گی تو معلوم ہو جائے گا کہ کتنی ذرا سی چیز کے لیے کتنی بڑی چیز کو چھوڑا تھا اور گویا ایک کوڑی کے لیے ایک اشرفی کی پروانہ کی بلکہ یوں ہی کہئے کہ ایک کوڑی کے لیے اپنے گلے میں پھانسی ڈال لی۔ غرض پہلے دو نصاب جو دینی نصاب ہیں وہ دینی تو ہیں مگر غیر کافی گویا حکم میں عدم کے اور پچھلے دونوں دنیوی نصاب ہیں ان کو دین سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ دین کے لیے مضر ہیں تو دین کے لیے ایک نصاب بھی کار آمد نہ ہوا۔

عورتوں میں جہالت کوٹ کوٹ کر بھری ہے

تو یہ کہنا صحیح ہوا کہ ہماری عورتوں میں جہالت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور یہ حالت ان عورتوں کی بیان ہوئی جو پڑھی لکھی شمار کی جاتی ہیں اور جو ان پڑھ ہیں وہ تو ان پڑھ ہی ہیں ان کی حالت تو بیان ہی کی محتاج نہیں اور اس الزام کی عورتیں تو مستوجب (واجب کرنے والا) ہیں ہی مرد بھی اس الزام سے بری نہیں ہو سکتے ان کو خدا تعالیٰ نے ان پر حاکم بنایا ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ یعنی

"مرد عورتوں پر حاکم ہیں"۔

جیسا کہ دنیا کی تمام ذمہ داریاں مردوں کے سر ہیں ایسے ہی دین کی بھی ہونی چاہئیں۔ تعجب ہے کہ دنیا جو دین سے ادنیٰ شمار کی جاتی ہے اس کی ہر قسم کی حفاظت اور اصلاح مردوں کے ذمہ ہو اور دین جو اعلیٰ اور زیادہ ضروری ہے اس سے مرد فارغ البال ہوں۔ اصل یہ ہے کہ مرد خود علم سے عاری ہیں دوسروں کو تو علم ان سے جب پہنچے جب خود ان کو آتا ہو علم دین سے مردوں نے بھی ایسا منہ موڑا ہے کہ اس کی ضرورت تک احساس نہیں رہا بلکہ علم دین کی حقارت قلوب میں آ گئی ہے جس چیز کی ضرورت کا احساس نہ رہے بلکہ اس کی تحقیر ذہن میں ہو اس کی طرف توجہ کا ہے کو ہونے لگی ہے اس سے تو غفلت ہی ہوگی۔ جب مردوں کو خود ہی علم سے بعد ہے تو عورتوں کو وہ کیا سکھائیں گے۔ حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کے مرد بھی غافل ہیں اور عورتیں بھی غافل۔ مسلمانوں پر ہر چہار طرف سے غفلت چھا گئی۔

غفلت کا علاج

غرض ہمارا اصل مرض غفلت ہے خدا تعالیٰ نے اس کے علاج کی طرف توجہ دلائی ہے۔ "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا" (اے ایمان والو تم اللہ تعالیٰ کو خوب کثرت سے یاد کیا

کرو۔) لفظ ہے تو چھوٹا سا مگر اتنے معنوں کو حاوی ہے کہ ہمارا کوئی مرض چھوٹا یا بڑا' خفی یا جلی ان سے باہر نہیں' فرداً فرداً ہر ایک کا کافی علاج نکلتا ہے۔ اب سمجھ لیجئے کہ وہ علاج کیا ہے جو اس آیت میں ارشاد ہوا:

ذکر کا مفہوم

وہ ذکر اللہ ہے ذکر کے معنی لغت میں ہیں یادداشتن اس کا مقابل ہے نسیان یعنی بھول جانا۔

ذکر کی دو قسمیں

یاد رکھنا دو طرح پر ہوتا ہے ایک صوری اور ایک حقیقی۔ صوری زبان سے یاد کرنے اور نام لینے کو کہتے ہیں سبق یاد کرلو یعنی بار بار زبان سے پڑھو اور حقیقی کہتے ہیں اداء حقوق کو ہمارے عرف میں بھی بولا جاتا ہے۔ (تم نے ہمیں بھلا دیا) مراد یہ ہوتی ہے کہ تم ہم سے میل نہیں رکھتے اور ہمارے ساتھ سلوک نہیں کرتے چاہے مخاطب زبان سے یاد کر بھی لیتا ہو جب بھلانے کے معنی ہوئے حقوق ادا نہ کرنا تو ان کے مقابل ذکر کے معنی ہوئے حقوق ادا کرنا یہ ایسی اصطلاح ہے جس سے ہر شخص واقف ہے کچھ شرح اور ثبوت کی ضرورت نہیں۔

حقوق اللہ کی ادائیگی ذکر اللہ حقیقی ہے

تو ذکر اللہ بالمعنی الاخیر (آخری معنی کے ساتھ) کا ترجمہ ہوا ادائے حقوق اللہ' ذکر اللہ حقیقی اور ذکر اللہ کا فرد کامل یہی ہے ذکر لسانی بھی ذکر اللہ کا ایک فرد ہے مگر ناقص اور صرف صوری۔ ہاں اگر دونوں جمع ہوجائیں یعنی ادائے حقوق کے ساتھ ذکر لسانی بھی ہو تو سبحان اللہ درجہ اکمل ہے۔ غرض اس آیت میں ذکر اللہ کو ہمارے مرض کا علاج قرار دیا گیا' اجمالاً سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ذکر اللہ کتنے معنوں کو حاوی ہے اگر آپ غور سے دیکھئے تو ظاہر ہوجائے گا کہ کوئی خیر دنیا و آخرت کی نہیں جو اس میں نہ آ گئی ہو۔

حقوق اللہ کی اقسام

پس معلوم ہوا کہ حقوق اللہ کی بہت قسمیں ہیں جیسے عقائد اعمال' اخلاق' معاملات' حقوق الناس

حقوق العباد حقوق اللہ کی قسم ہے

حقوق الناس کے لفظ پر کوئی صاحب یہ شبہ نہ کریں کہ حق العبد اور چیز ہے اور حق اللہ اور چیز۔ وہ بندوں کی طرف منسوب ہے وہ اللہ کی طرف اور دونوں کے احکام میں فرق ہے۔ حق اللہ توبہ کرنے سے معاف ہوجاتا ہے اور حق العبد توبہ سے معاف نہیں ہوتا۔ (اگر ایسا ہوتا تو پھر کیا تھا بڑی سہولت ہوتی کسی کا مال چھین لیا اور ہضم کرلیا پھر توبہ کرلی) حق العبد میں صاحب حق کے

معاف کرنے کی ضرورت ہے حتیٰ کہ حج اور شہادت سے بھی اس سے ذمہ فارغ نہیں ہوتا۔ پس جب حقوق العباد قسیم ہیں حقوق اللہ کی تو تم نے اس کو قسم کیسے بنا دیا۔ حل اس شبہ کا یہ ہے کہ پوچھا جاتا ہے کہ بندوں کے حقوق کہاں سے پیدا ہوئے، بندہ خود مخلوق اور مملوک ہے تو اس کے حقوق اس کے پیدا کردہ تو ہو نہیں سکتے دوسرے کے عطا کردہ ہوں گے۔ یعنی حق تعالیٰ کے حقوق العباد وہ حقوق ہوئے جن کو حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے مقرر کر دیا۔ نظیر اس کی یہ ہے کہ کہتے ہیں یہ گھر فلاں شخص کا ہے ظاہر ہے کہ کہنے والے کی مراد یہ نہیں ہوتی کہ اس کی ذاتی ملک ہے بلکہ ملک حقیقی حق تعالیٰ کی ہے ہاں حق تعالیٰ نے اپنی طرف سے اس کو مالک بنا دیا ہے اس سے حق تعالیٰ کی ملک سے گھر نکل نہیں گیا حالانکہ تمام حقوق مالکانہ دنیا میں اسی شخص کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ اسی طرح حقوق العباد حق تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لیے مقرر ہوئے ہیں اور حکم دیدیا گیا ہے۔ [1]"اَعْطُوْا کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّهٗ (ہر حق دار کو اس کا حق ادا کرو) اور یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" یعنی اے ایمان والو! معاہدوں کو پورا کرو حقوق العباد کو ادا نہ کرنا اس آیت کی مخالفت ہے جو امر اللہ ہے اور امر اللہ کی مخالفت ہی عصیان اور اضاعت ہے حق اللہ کی تو حقوق العباد بھی دراصل حقوق اللہ ہیں اس معنی کو میں نے حقوق الناس کو بھی حقوق اللہ میں داخل کیا اور پس یہ سب قسمیں ہوئیں حقوق کی اور شریعت تمام ان ہی حقوق کی شرح ہے جس میں اتنا طول ہے کہ ایک کتاب میں بھی نہیں آ سکتے۔ چہ جائیکہ میرا اس وقت کا بیان تھوڑے سے وقت کا ان کو محیط ہو سکے لیکن میں اس تھوڑے سے ہی وقت میں حقوق کے افراد کو کلیاً[2] ذرا ذرا سا بیان کرتا ہوں۔

سب سے پہلا ضروری حق

سو سب سے پہلا اور ضروری حق عقائد ہے۔ یہ جیسا ضروری ہے سب کو معلوم ہے لیکن تعجب کی بات ہے کہ اسی میں سب سے زیادہ عورتوں نے خبط کیا ہے اور طرح طرح سے اس میں اختراع کیا ہے جیسے کہ وہ وہ خیالات باندھ رکھے ہیں جن کو دین سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ دین نے ان کو رد کیا ہے۔ نحوست کا خیال بعضے پرندوں کو منحوس سمجھتی ہیں اور بعضے دنوں کو منحوس کہتی ہیں اور بعض عورتوں کو بھی جو ان ہی جیسی انسان ہیں منحوس کہتی ہیں۔ اول کی مثال تو یہ ہے کہ جہاں اُلو بولتا ہے تو عورتوں کے دل میں ایک خوف بیٹھ جاتا ہے اور اسی وقت اس کو مارتی ہیں کہ یہ کہاں ویران کرنے آیا، یہ خیال فاسد کچھ ایسا عام ہوا ہے کہ مردوں تک پر اثر کر گیا ہے۔ اگرچہ مردوں میں ایسا راسخ نہ ہو جیسا عورتوں میں ہے

---

[1] (ہر حق دار کو اس کا حق دو) [2] (کلیہ کے طور پر)

لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر اس کے بولنے کے بعد اس جگہ کوئی موت ہو جائے یا اور کوئی آفت آ جائے تو مردوں کے دل میں بھی یہ خیال گزر جاتا ہے کہ شاید اسی کا اثر ہو اور جب عورتیں ان کو بڑبڑاتی ہیں تو اس خیال کو مرد عملی صورت تک میں لے آتے ہیں اور اس جگہ کو چھوڑ دیتے ہیں۔

ویرانہ کا اصل سبب معاصی ہیں

صاحبو! یہ مسلم ہے کہ اُلو ویرانہ کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں کہ ویرانہ اس کے آنے سے پیدا ہو بلکہ ویرانہ دیکھ کر وہ آیا اور خود ویرانہ آپ کے اعمال بد سے ہوا تو منحوس ہم ہوئے نہ کہ وہ۔ ہم کو اپنی نحوست اس کے اندر نظر آتی ہے۔ پس ہماری مثال اس حبشی کی سی ہے کہ راستے میں ایک آئینہ پڑا ہوا پایا' اس نے جو اپنی صورت دیکھی تو بہت خفا ہوئے اور آئینہ کو زمین پر پٹک دیا کہ لاحول ولاقوۃ ایسا بدصورت تھا جب تو پھینک گیا۔ سو اس نے اپنی زشتی[1] کو اس کی زشتی سمجھا' اُلو بے چارہ ایک صوفی منش جانور ہے کہ خلوت کو پسند کرتا ہے اگر آپ نظر کو عمیق کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ آپ کے لیے واعظ ہے کہ آپ کو آپ کے گناہوں پر آگاہ کرتا ہے جن سے ویرانہ پیدا ہوا یا ہونے والا ہے اور اصل سبب ویرانہ کا معاصی ہیں جب آپ کو خود کسی طرح تنبہ نہیں ہوتا تو اُلو آن کر بولتا ہے جس سے آپ کے کان میں پڑ جائے کہ ہم نے ویرانہ بنا دیا ہے لیکن آپ نے اس کو غلط سمجھا کہ اُلو کے بولنے کو اس کا سبب سمجھا۔ اس کا سبب معاصی ہیں ان کا علاج استغفار ہے اس کو اڑانے اور مارنے سے کیا ہوگا اگر حبشی نے آئینہ کو پٹک کر توڑ دیا تو کیا صورت درست ہوگئی اس کو چاہیے کہ اگر کسی تدبیر سے کر سکے تو صورت درست کرے پھر اسی آئینہ کو دیکھے جس نے بری صورت دکھائی تھی اب وہی آئینہ اس کو اچھی صورت دکھائے گا۔

عقیدہ کی خرابی عملی خرابی سے بڑھ کر ہے

اُلو کو اڑانے سے گناہ معاف نہیں ہوتے بلکہ اور دوسری جہالت زائد ہو جاتی ہے پہلے تو صرف عملی خرابی تھی اب عقیدہ کی خرابی ہو جاتی ہے جو عملی خرابی سے بدرجہا زیادہ ہے اور وہ نحوست کا عقیدہ رکھنا ہے جس کا حاصل اختراع فی الدین[2] ہے بجائے اس کو منحوس سمجھنے کے استغفار کی کثرت کرو اور فکر کرو کہ ہم سے کیا گناہ ہوا جو ویرانہ ہو گیا۔ اس سے نہ عقیدہ کی خرابی ہوگی نہ گناہ باقی رہیں گے اُلو کو اپنا دشمن نہ سمجھو اس سے بھی ایک نصیحت حاصل کرو اور حُبِّ خلوت بھی سیکھو۔

---

[1] (بدشکل ہونا) [2] (دین میں نئی چیز پیدا کرنا)

قمری کو منحوس سمجھنا فاسد عقیدہ ہے

اسی طرح قمری کو منحوس کہتی ہیں جہاں قمری بولی عورتیں کہتی ہیں دوڑ دوڑ اسے مسجد میں لے جاؤ ہمارا گھر ویران کرے گی' کیا خوب ویران کرنے کے لیے خدا کا گھر رہ گیا ہے یہ عجیب جہالت در جہالت ہے۔ اول تو اس کی اصل نہیں کہ وہ ویران کرتی ہے اور جب ویران کرنے کا خیال ذہن میں ہے تو اس کے لیے مسجد کو تجویز کیا جاتا ہے یہ عادت عورتوں کی اکثر باتوں میں ہے کہ جس چیز کو کوئی پسند نہ کرے وہ خدا کے نام کر دی جاتی ہے گھر میں کھانا بچتا ہے جب تک وہ کسی کام کا بھی رہے تو چاہے خود نہ کھائے مگر کسی کو نہیں دیں گے۔ جب وہ رکھے رکھے خراب ہو جائے گا تو کہیں گی لیجاؤ خدا کے واسطے دے دو۔ کپڑا جب پیوند لگا کر بھی پہننے کے قابل رہے اس وقت تک دل سے نہیں اترتا۔ جب وہ بالکل گودڑ ہو جائے تو کہتی ہیں مسجد کے ملا کو دے آؤ۔ بیبیو خوب سمجھ لو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ بھوکا یا ننگا نہیں ہے جس کو تمہارا سڑا بھسا کھانا' پھٹا کٹا کپڑا غنیمت معلوم ہوگا بلکہ اگر بہتر سے بہتر کھانا اور عمدہ سے عمدہ کپڑا جو ہم دیں اس کو قبول فرمالیں تو یہ ایک انعام اور احسان سمجھو' ہم کھانا کہاں سے لائے اور کپڑا کہاں سے آیا جس کو خرچ کرنے سے ہم انعام اور احسان سمجھیں ہم کھانا کہاں سے لائے اور کپڑا کہاں سے آیا جس کو خرچ کرنے سے ہم انعام کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ہم کو کھانا دیا تو اگر ہم نے خدا کی راہ میں دے دیا تو خدا تعالیٰ پر کیا احسان ہوا۔ کسی نے خوب کہا ہے:

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی   حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

فضائل خیرات

خدا تعالیٰ کا فضل واحسان ہے کہ اپنی دی ہوئی چیزوں میں سے کچھ واپس مانگتے ہیں کہ تم دنیا میں کھا پہن کر تلف نہ کر ڈالو' کچھ آخرت کے لیے بھی جمع ہو جائے۔ حدیث شریف میں ہے:

"یَقُوْلُ ابْنُ اٰدَمَ مَالِیْ مَالِیْ وَھَلْ لَّکَ مِنْ مَّالِکَ اِلَّا مَا اَکَلْتَ فَاَفْنَیْتَ وَلَبِسْتَ فَاَبْلَیْتَ"[۱] یعنی انسان خوش ہوتا ہے کہ یہ میرا مال اور یہ میرا مال ہے حالانکہ اے انسان اس مال میں سے تیرا کیا ہے سوائے اس کے کہ جو کھائے کہ فنا کر دے اور جو پہن لے کہ اس کو پرانا کر دے۔ آگے ہے اَوْتَصَدَّقْتَ فَاَبْقَیْتَ یعنی جو کچھ خیرات کرے کہ اس کو جمع کر لے۔ مطلب یہ ہے کہ جتنا مال دنیا میں ہے جو اس میں سے کھانے میں خرچ ہوا وہ خراب ہو گیا جو پہننے میں خرچ ہوا وہ بھی

---

۱ (مشکوۃ المصابیح: ۵۱۶۹)

خراب ہی ہوگیا۔ یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ کچھ حصہ کو اس میں سے بندوں سے مانگ لیا کہ انہیں کے واسطے جمع کریں۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو تم خیرات کرتے ہو اس کو حق تعالیٰ اپنے داہنے ہاتھ میں لیتے ہیں (داہنے کا لفظ صرف تادیباً ہے ورنہ خود تصریح موجود ہے "وَكِلْتَا يَدَى رَبِّىْ يَمِيْنٌ"[1] وہاں داہنے بائیں کا ذکر نہیں) پھر اس خیرات کو ایسا پالیتے ہیں اور بڑھاتے ہیں جیسے کوئی اپنے بچھیرے کو محبت سے پالتا اور بڑھاتا ہے اگر خیرات کام کی ہے اور قبول ہوگئی تو قیامت کے دن آدمی پہچانے گا بھی نہیں کہ یہ وہ میری خیرات ہے کیونکہ دی تھی ایک مٹھی بھر چیز اور وہاں سامنے آئے گی احد پہاڑ کے برابر۔ جائے انصاف ہے کہ ہم جو کچھ خدا کی راہ میں دیتے ہیں وہ ہمارا احسان ہے یا حق تعالیٰ کا احسان ہے کہ اپنی دی ہوئی چیزوں میں سے تھوڑی چیز واپس لے کر ہمارے کام کے لیے جمع کر دیں اور یہ واپس لینا بھی برائے نام ہے۔ درحقیقت خود دینا مقصود ہے اتنی سی چیز کا بہانہ رکھ کر احد پہاڑ کی برابر دینا چاہتے ہیں اب تم ہی غور کرلو کہ تم ہی اپنے واسطے اچھی چیز جمع کرنا چاہتے ہو یا سڑی بھسی چیز اس سے قطع نظر جب آ چکا کہ خیرات صدقات کو حق تعالیٰ اپنے داہنے ہاتھ میں لیتے ہیں تو کیا شرم کی بات نہیں ہے کہ سڑی بھسی اور خراب چیز ہاتھ میں دو۔

اللہ کی راہ میں عمدہ چیز خیرات کرو

ایک ذرا سا حاکم اگر تم سے پانی پینے کو مانگے تو کیا ممکن ہے کہ تم گرم پانی یا میلا پانی اس کے سامنے پیش کردو بعض آدمی یہ غضب کرتے ہیں کہ خیرات کرتے وقت یہ بھی نہیں دیکھتے کہ مال حرام دیتے ہیں یا حلال جو روپیہ حرام کا دیا گیا وہ ظاہر میں روپیہ ہے لیکن حقیقت میں گندی اور غلیظ چیز ہے اس کی مثال تو ایسی ہوگئی کہ ایک بڑا بادشاہ کسی ادنیٰ غلام سے کھانا یا پانی مانگے اور وہ بجائے کھانے کے ایک عمدہ طشتری میں پاخانہ اور ایک خوبصورت نقیشن گلاس میں پیشاب بھر کے سامنے رکھ دے اور پھر اکڑ کر کھڑا ہو جائے کہ حضور کو میں نے کھانا پانی دیا اس کی قیمت ملنی چاہیے۔ صاحبو! حرام صدقات کی یہی حالت ہے ہم کو تو بہت غنیمت سمجھنا چاہیے۔ اگر تصدق کی ساری شرائط ادا کرنے پر بھی قبول فرمالیں اور اگر حرام و حلال کی بھی تمیز نہ کی تو اس غلام اور بادشاہ کی مثال پیش نظر کر کے غضب الٰہی سے ڈریئے نہ کہ اس کو خیرات اور کار ثواب سمجھو۔ صاحبو! حق تعالیٰ کے نام وہ چیز دیجئے جو اگر سب سے عمدہ نہ ہو تو خراب بھی نہ ہو اور ذرا ادب کا خیال رکھئے میں تو اس کو بھی سوئے ادب سمجھتا ہوں کہ ایک چھوٹا سا جانور نہایت بدشکل ہوتا ہے اس کا نام رکھا ہے اللہ تعالیٰ

---

[1] (اتحاف السادة المتقين ٢ : ١١٠)

کی بھینس لفظ بھینس کی اصل وضع بتا رہی ہے کہ بڑی چیز کا نام ہونا چاہیے مگر برعکس اس کے اس چھوٹے سے جانور کا نام رکھ دیا ہے اور اس غلط وضع کے بعد اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔ اس جوڑ کو ملاحظہ کیجئے کہ اول تو اس قدر چھوٹے جانور کو بھینس کہنا اور اس کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف۔ اگر بالفرض خدا تعالیٰ کے کوئی بھینس ہوتی بھی تو کوئی بہت ہی بڑی ہوتی مگر اسی عادت کے بموجب یہاں بھی عملدرآمد ہوا کہ حقیر چیز کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کہنے والوں کی یہی مراد ہوتی ہے مگر یہ محاورہ اس شائبہ سے خالی نہیں اور میں سب کو برا سمجھتا ہوں۔

عورتوں کو منحوس سمجھنے کی حکایت

اور عورتیں بعضی عورتوں کو منحوس سمجھتی ہیں جب کسی کی عورتیں مر مر جاتی ہوں تو چوتھی بیوی کو منحوس کہتی ہیں۔ ایک قصہ ہے کہ ایک مرد کی تین بیویاں مر گئیں اس کی بہن نے چوتھا نکاح جب کرنا چاہا تو اس نحوست سے بچنے کے لیے پہلی ایک کپڑے کی گڑیا بنا کر اس سے نکاح پڑھایا۔ ایجاب و قبول سب اسی طرح ادا کیا گیا تا کہ چوتھی بیوی یہ ہو اور اس کے بعد ایک عورت سے نکاح کر دیا تا کہ یہ چوتھی نہ ہو کہ منحوس ہو۔ معاذ اللہ ان خرافات سے پناہ مانگنی چاہیے۔ اس احمق سے یہ پوچھنا چاہیے کہ اگر چوتھی بیوی منحوس ہوتی ہے تو بیوی تو وہی ہے جس سے نکاح پڑھا جائے' کیا گڑیا سے نکاح واقعی نکاح ہو گیا جو یہ عورت پانچویں ہوئی کس نے ایجاب کیا اور کس نے قبول اور کون میاں اور کون بیوی' صرف شیطانی خیال ہے کہ اسی کو منکوحہ سمجھ لیا۔ اگر یہ تھا تو بلا نکاح کے ہی سمجھ لیا ہوتا کہ چوتھا نکاح ہو گیا۔ اور میں کہتا ہوں کہ چوتھی کا قصور کیا کہ وہ منحوس سمجھی جائے۔ اگر بیویوں کے مرنے میں کچھ دخل فرض بھی کیا جائے تو ان خاوند صاحب کو ہو سکتا ہے چوتھی بیوی کو جو بالقوہ بیوی ہے اس کا تو اب تک وجود بھی نہیں کہ اس نے ان تین کو مار ڈالا' قطع نظر شریعت سے اگر عقل سے ہی کام لیں تو ان خیالات کا غلط ہونا واضح ہو جائے' یہ عقائد میں ایجادیں ہوئیں۔ اب اعمال میں اختراع سنئے۔ اس اختراع میں سے شادی بیاہ اور تقریبوں کی رسمیں بھی ہیں بلکہ خود عورتوں کا جمع ہونا ہی مذموم ہے میرے پاس ان تقریبات میں عورتوں کے اجتماع کے منع ہونے کی ایک فقہی دلیل بھی ہے۔ چنانچہ درمختار میں مصرحاً لکھا ہے کہ عورتوں کا ولائم میں جمع ہونا برا ہے جس کا جی چاہے درمختار میں دیکھ لو تو میں اپنی طرف سے منع نہیں کرتا ہوں اور اس وقت اس حوالہ دینے کے بعد مجھے کسی اور دلیل کے قائم کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ جزوی مسئلہ کتاب میں موجود ہے مگر تبرعاً کہتا ہوں کہ جب آپ غور کریں گے تو رسموں میں سوائے دنیاوی اور دینی نقصانوں کے کچھ بھی نہ نکلے گا۔

تقریبات میں خرابی دین ودنیا

ایک موٹی سی بات میں بتائے دیتا ہوں کہ جن تقریبوں میں باقاعدہ رسمیں ادا ہوتی ہیں۔ نماز کا کسی کو بھی خیال نہیں رہتا جس تقریب میں چاہے دیکھ لیجئے یہ دینی نقصان ہے یا نہیں اور کیسا نقصان جس کی نسبت حدیث شریف میں ہے: "اَلْفَرْقُ بَيْنَ الْعَبْدِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلٰوةِ"[1] (بندے اور کفر کے درمیان فرق صرف نماز چھوڑنے کا ہے) اس کے ظاہر الفاظ سے تو تقریبوں میں مشغول ہونے والے جو نماز کے تارک ہوجاتے ہیں ایمان ہی سے خارج ہوئے جاتے ہیں اور دنیا کے نقصان تو آپ نے خود دیکھے ہوں گے کہ ریاستیں کی ریاستیں ایک شادی کرنے میں تباہ ہوگئیں، دلہا دلہن کیا یاد کریں گے کہ نکاح کے وقت تو اس قدر دھوم دھام تھی اور کھانے کے لیے اتنا بھی نہ بچا کہ معمولی طور سے بھی گزر سکیں۔ یہ ان رسموں کا دنیاوی نقصان ہے اور رسمیں بہت ہیں جن کو میں نے اپنی کتاب اصلاح الرسوم میں تفصیل وار بیان کیا ہے۔

نیوتہ شرعاً ناجائز ہے

اس وقت چونکہ وقت تنگ ہوگیا ہے میں ان میں سے صرف ایک کو بیان کرتا ہوں جس کو آدمی اچھا سمجھتے ہیں اس کے مفاسد بیان کرنے سے ان رسموں کا حال بطریق اولیٰ کھل جائے گا جن کو خود کرنے والے بھی اچھا نہیں سمجھتے وہ رسم نیوتہ کی ہے بہت سے آدمی کہتے ہیں کہ یہ بڑے کام کی رسم ہے۔ اس میں وقت پر کام چل جاتا ہے تو صلہ رحم میں داخل ہوئی۔ میں کہتا ہوں نیوتہ قواعد شرع موافق قرض ہے اور قرض کیوں نہ ہو اس کے واپس لینے کے لیے لڑائیاں ہوتی ہیں اور جو کوئی واپس نہ دے اس کو برادری سے خارج کیا جاتا ہے تو اس سے قطع رحم لازم آتا ہے یہ کیسا صلہ رحم تھا جو قطع کے ہو جب ہوا غرض یہ قرض ہے اور قرض کے احکام میں شرعاً یہ ہے کہ اس میں میراث بھی جاری ہوتی ہے یعنی اگر کوئی شخص اپنا قرض کسی پر چھوڑ مرے تو وارثوں کے اس کے حصول کرنے کا حق ہوتا ہے اس حکم کو یاد رکھئے اور نیوتے میں دیکھئے اگر کوئی شخص مرجائے جس کے دوسو روپے لوگوں کے ذمہ نیوتہ کے پڑے ہوں اور وہ دو بیٹے چھوڑ جائے تو رواج یہ ہے کہ جب ان دونوں بیٹوں میں سے بڑے کے نکاح کا وقت آئے گا تو سب ان نیوتوں کو ادا کریں گے اور اس کو لوگ بہت ہی خیر سمجھتے ہیں۔ اگر اس کے باپ نے اتنا نیوتہ نہ چھوڑا ہوتا تو بڑی بات بگڑ جاتی۔ اس وقت آڑے وقت میں کام چل گیا (بناء فاسد علی الفاسد) سمجھ لیجئے کہ شریعت کا حکم

---

[1] (سنن الترمذی: ۲۶۹۰)

میراث میں یہ ہے کہ فرائض کے موافق تقسیم کی جائے جس کو خدا تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں بیان فرمادیا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ باپ کا قرض دو بیٹوں میں سے ایک کو دے دیا جائے بلکہ ادا کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں پر آدھوں آدھ بانٹے اور اگر ایسا نہ کرے گا تو عنداللہ گنہگار ہوگا۔ یہ حال تو ادا کرنے والے کا ہے اب اس بیٹے کا سنئے جس نے لیا۔ یادرہے کہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ جو باپ کے ترکہ میں قرض وصول ہوا اس کو تمام ان وارثوں پر تقسیم کرے جو اس وقت موجود ہوں جن کو شریعت نے مستحق قرار دیا ہو بڑے بیٹے کو کوئی اختیار نہیں ہے کہ کل روپیہ اپنے کام میں لگائے اگر اس بڑے بیٹے نے ان دوسو روپیہ کو تقسیم نہ کیا اور اپنی شادی میں لگایا اور اس سے وہ رسم کی جو شرعاً مسنون ہے مثلاً ولیمہ تو اس کا بھی حکم یہ ہے کہ مال سحت ہے جو کوئی اس کو کھائے گا آکل سحت[1] ہوگا اور حق العبد گنہگار ہوگا جس کے معاف ہونے کی بھی کوئی صورت نہیں سوائے اس کے کہ ارباب حق یعنی وارث معاف کریں تو یہ اس کے لیے کافی نہیں۔

حق العبد کی اہمیت

اور ہر ہر شخص سے قیامت کے دن ہر ایک دانگ کے بدلے جو تین پیسے کا ہوتا ہے سات سو مقبول نمازیں چھین لی جائیں گی۔ یہ حالت اگر لوگوں پر منکشف ہوجائے تو کوئی اس کے معمولی کھانے کو بھی گوارا نہ کرے۔ چہ جائیکہ ولیمہ کرنا جب اس مال میں سے ایک مسنون رسم ادا کرنے کا یہ حکم ہے تو ان رسموں کا حال قیاس کر لیجئے جو رسوم کفار ہونے سے فی نفسہ بھی قبیح (بری) ہیں جن کا ادا کرنا اپنی ملک میں سے بھی جائز نہیں اور طرح طرح کے مفاسد پر مشتمل ہیں۔ یہ رسمیں تو گناہ در گناہ ہوجائیں گی۔ تشبہ بالکفار اور اختراع فی الدین اور حق العبد وغیرہ وغیرہ کہاں تک عرض کروں کوئی صاحب یہ نہ کہیں کہ حق العبد جب لازم آئے کہ بلا اجازت ہو اس نیوتہ کی رقم وصول شدہ میں بڑے بیٹے کو دیگر ورثاء کی اجازت ہوتی ہے سب اپنا اپنا حق بڑے بیٹے کو ہبہ کردیتے ہیں کیونکہ اول تو نابالغ کی اجازت معتبر نہیں دوسرے بالغوں کی بھی وہ اجازت معتبر ہے جو صمیم قلب اور خوشی سے ہو اور میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ دل سے ایک بھی اجازت نہیں دیتا اس کا تجربہ یوں ہوسکتا ہے کہ سب کو اپنا اپنا حق دے دیجئے اور کہہ دیجئے کہ جس کسی کو خوشی سے اپنا حق بڑے بیٹے کو ہبہ کرنا ہو کردے دیکھ لیجئے گا کہ انشاء اللہ ایک بھی نہیں کرے گا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض جگہ میت کے مرتے ہی بیٹے بہنوں سے باز دعوے لکھوا لیتے ہیں اور بہنیں شرما حضوری

---

[1] (حرام کھانے والا)

لکھ دیتی ہیں اور اگر کوئی بہن انکار کرے تو برادری میں بڑی ذلیل سمجھی جاتی ہے کہ باپ کے مرنے کی منتظر ہی تھی کہ کب مرے اور کب مال ملے چونکہ یہ رسم شائع ہوگئی ہے۔

باپ کی میراث میں عورتوں کا حصہ ہے

اس واسطے عورتوں کے ذہن میں سے قریب قریب یہ بات بالکل نکل ہی گئی ہے کہ باپ کی میراث میں کچھ ہمارا بھی حصہ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر ان بہنوں سے بھائی کہیں بھی کہ اپنا حق لے لوتو کہتی ہیں تم نے ہمیں ایسا غیر سمجھ لیا کہ باپ کے مال کے حصے بخرے کرنے لگے۔ اب ہبہ اور باز دعوے کی حقیقت سنئے کہ جب چندروز باپ کو مرے ہو جاتے ہیں اور ان کو کسی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارا بھی حق میراث میں تھا تو اپنے اس باز دعوے اور ہبہ کو واپس کرنے کی تدبیریں کی جاتی ہیں اس کاغذ کو جعلی ثابت کیا جاتا ہے جھوٹے گواہ بہم پہنچائے جاتے ہیں' خوب مقدمہ بازی ہوتی ہے جس میں طرفین کی بربادی ہو جاتی ہے۔ (واقعی دلی اجازت اور ہبہ کے یہی معنی ہیں) یہ رسم بھی نہایت ہی قبیح رسم ہے کہ اناث کو محروم الارث (عورتوں کو وراثت سے محروم کرنا) کر دیا جائے یہ صریح ظلم ہے اس کی بڑی احتیاط چاہیے قرآن شریف میں ہے:

اٰبَاءُ کُمْ وَاَبْنَاءُ کُمْ لَاتَدْرُوْنَ اَیُّھُمْ اَقْرَبُ لَکُمْ نَفْعًا فَرِیْضَۃً مِّنَ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًاo

مطلب یہ ہے کہ تم اپنی طرف سے ماں باپ اور بیٹوں کے بھی صحیح حصے نہیں مقرر کر سکتے ہم نے جو مقرر کر دیئے وہی صحیح ہیں کیونکہ ہم علیم و حکیم ہیں اور حدیث شریف میں ہے: اَعْطُوْا کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ (یعنی ہر حقدار کو اس کا حق دو) بہنوں کو محروم کرنا اس کا صریح خلاف ہے نہایت ضروری ہے کہ ترکہ فرائض کے موافق تقسیم کر کے بہنوں اور بھائیوں اور چھوٹے اور بڑے سب وارثوں کو دے دو دے دینے کے بعد اگر کوئی وارث اپنا حصہ کل یا جزو دوسرے کو خوشی سے دے دے تو کچھ حرج نہیں اور اس رسمی اجازت کے بھروسہ نہ رہے جو تقسیم سے پہلے ہوتی ہے جبکہ چند روز کے بعد جب میت کے غم وغیرہ سے قلب فارغ ہو جاتا ہے وہی بہنیں جنہوں نے بظاہر لینے سے انکار کیا تھا خصومت (دشمنی) کے لیے آمادہ ہو جاتی ہیں تو ان سے یہ کیا امید کی جا سکتی ہے کہ قیامت کے دن جبکہ اپنی جان چھڑانے کے لیے ہر شخص یہ چاہے گا کہ سارا جہاں پکڑ لیا جائے اور میں کسی طرح چھوٹ جاؤں اس وقت یہ اپنا حق نہ مانگیں گی۔

يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْيَفْتَدِىْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِىْ تُؤْوِيْهِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِo

(اوراس روز) مجرم (یعنی کافر) اس بات کی تمنا کرے گا اس روز کے عذاب سے چھوٹنے کے لیے اپنے بیٹوں کو اور بیوی کو اور بھائی کو اور کنبہ کو جن میں وہ رہتا تھا اور تمام اہل زمین کو اپنے فدیہ میں دے دے پھر یہ اس کو (عذاب سے) بچالے۔

شریعت کے چلنے میں نفع دنیا و آخرت

ضرور مانگیں گی اور کیوں نہ مانگیں گی جبکہ ان کو معلوم ہوگا کہ ایک ایک دانگ یعنی تین تین پیسہ کے بدلے سات سات سو مقبول نمازیں ملیں گی وہاں درہم و دینار کو تو کوئی پوچھے گا نہیں نماز اور نیکیوں کی بڑی قدر ہوگی۔ جب یہ ان کو بدلے میں ملیں گی تو کیسا بھائی اور کیسا باپ اور کیسی ماں اور کیسی ساری دنیا۔ حرمان اناث (عورتوں کو محروم رکھنا) کا مسئلہ گو خارج عن البحث ہے مگر زبان پر آ گیا تھا اس واسطے بیان کر دیا گیا۔ نیز کچھ خارج عن البحث بھی نہیں اس واسطے کہ آپ غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ حرمان اناث کا مسئلہ بھی انہی مخترعہ (نئی ایجاد شدہ) رسوم سے ہے اور رسوم ہی کا بیان ہو رہا ہے تو اس کا بیان رسوم ہی کا بیان ہے جہلاء نے اس حصہ فرائض اناث کا ایک بدل تجویز کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کسی عورت کے بال بچہ ہو تو ماں باپ کے ہاں سے چھوچھک آتا ہے اگر ماں باپ نہ ہو تو بڑا بھائی ان کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے یہ خرچ بھائی کے ذمہ ہے اور رسم ہے کہ جب عورت کے یہاں کوئی تقریب ہو تو والدین یا بڑے بھائی کے ذمہ اس کے اخراجات کا ایک معقول حصہ رکھا جاتا ہے حتیٰ کہ بڑا بھائی چھوٹی بہن کے یہاں آئے یا چھوٹی بہن بڑے بھائی کے یہاں جائے تو علاوہ مہمانداری کے کوئی رقم بھائی کے ذمہ ضرور واجب ہوتی ہے یہ خرچ بھائی کے ذمہ ہے اس کے علاوہ ہر دوسرے موقعوں پر بھی بہن کے خرچ بھائی کے ذمہ ہے اور ان اخراجات کو بجائے حصہ میراث دے دینے کے سمجھا جاتا ہے ہم نے خود کہتے سنا ہے کہ اگر ہم نے بہنوں کو محروم کر دیا تو کیا غضب کیا' بیاہ شادی اور ستر خرچے بھی تو ہمارے ہی ذمہ ہیں' ساری عمر کا لینا دینا ہمارے ہی سر ہے حساب لگایا جائے تو بہنوں کو ہم سے کچھ زیادہ ہی مل رہے گا اور کہنے کو یہ کہ بھائی نے ساری میراث لے لی۔ سبحان اللہ پہلے رسمیں سر رکھ لیں ایک گناہ یہ ہوا پھر قبیح کا نتیجہ قبیح دوسرا گناہ حق دار کا حق مارنا لازم آیا۔ ایسا ہی لازم اور ایسا ہی ملزوم پھر خود منہ سے اقرار کا نتیجہ

یہی ہے کہ بہنوں کو ہم سے کچھ زیادہ ہی مل رہے گا۔ کیوں صاحب جب نتیجہ یہی ہے کہ بہنوں کو میراث آپ کے برابر بلکہ کچھ زائد پہنچ جاتی ہے تو اسی طریق سے تقسیم کرنے میں کیا عیب تھا جس طرح خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا۔

ہبہ میں خاموشی معتبر نہیں

اس صورت میں بھی بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہبہ ہے بہنیں خود ہی حصہ نہیں لیتیں ان کی اصل تو ہم نے دکھادی کہ جہاں چند روز گزرے اور تقسیم کی سوجھی اور جوتی پیزار اور مقدمہ بازی کی نوبت آئی۔ نیز یہی فرمایئے کہ اگر آپ کو پورا اعتماد ہے کہ بہنیں خود نہیں لیتیں تو ان سے فوراً تحریر کرواتے اور اس کی رجسٹری کیوں کراتے ہو یہی دلیل کافی ہے اس بات کی کہ تمہارے دل میں خود کھٹکا ہے کہ اس وقت جبراً قہراً تو بہنیں خاموش ہیں بعد میں مطالبہ کریں گی۔ ثابت ہوگیا کہ بہنوں کی خاموشی صرف رسماً ہے دل سے نہیں حتیٰ کہ قانون حاکم وقت بھی اس خاموشی کو ہبہ نہیں مانتا پھر خدائے تعالیٰ کی عدالت کی نسبت کیا خیال ہے وہاں تو دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوگا نہ بہنوں کا ثبوت ہبہ ہے نہ دیگر ورثاء کا ہاں رسوم کی پابندی کی وجہ سے جبراً قہراً خاموش ہیں یہ سکوت صرف ظاہری ہے اور اجازت کے لیے شرط ہے عن صمیم القلب ہونا غرض بہن کا سکوت ہو تو اور مستحقین نیوتہ کا سکوت ہو تو شرعاً معتبر نہیں اس نیوتہ میں جو بڑے بیٹے کو دیا جاتا ہے سب وارثوں کا حق ہے اس کو کوئی حق نہیں کہ اپنے کام میں لائے اور اگر لائے گا اور اس سے کھانا وغیرہ کیا جائے گا تو کھانے والوں کا وہی حکم ہے جو ابھی بیان ہوا سب حق العبد تلف کرنے والے ہوں گے اور یہ ان وارثوں کے بارے میں ہے جو بڑے ہیں۔

نابالغ کے اخراجات ممنوع التصرف ہیں

اور اگر وارثوں میں کوئی چھوٹا بھی ہے تو وہ اگر منہ سے صریح اجازت بھی دے تب بھی معتبر نہیں نابالغ کے تصرفات خرچ میں نافذ نہیں ہوتے اس صورت میں کھانے والوں پر یہ وعید عائد ہوتی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا۝

یعنی جو لوگ یتیموں کا مال بلا کسی حق کے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں کو آگ سے بھرتے ہیں۔ عنقریب دوزخ میں جائیں گے (حق سے مراد حق شرعی ہی ہوسکتا ہے اور شریعت نے نابالغ کو اخراجات میں ممنوع التصرف (خرچ کرنے سے روکنا) قرار دیا ہے تو جو کچھ اس کی اجازت

سے بھی صرف ہوگا ناحق ہی ہوگا) اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ جب کوئی مرتا ہے تو کچھ نہ کچھ وارث صغیر بھی ہوتے ہیں قریب ہوں یا بعید جن کو شریعت نے وارث قرار دیا ان سب کا حصہ ہے اور ان کا بھی حکم ہے خوب ولیمہ ہوا کہ تقریب خوشی کی تھی اور گناہوں کے بوجھ کے بوجھ شرکاء پر لد گئے۔ یہ حال اس رسم کا ہے جس کو آپ محمود کہتے ہیں اور جن کے قبیح ہونے کے آپ خود قائل ہیں ان کی نسبت کیا کہا جائے۔ اب یہ بھی سمجھ لیجئے کہ رسمیں اگرچہ از جنس اعمال ہیں لیکن اعمال کا منشا قلب ہے۔ آدمی ہاتھ پیر سے کوئی کام جب کرتا ہے کہ جب دل میں اس کی خواہش پیدا ہو اور دل میں خواہش جب پیدا ہوتی ہے جب اس کو اچھا سمجھے یا کم از کم اس کو برا نہ سمجھے۔

رسومات کی ادائیگی دراصل فساد عقیدہ ہے

اور قلب کا کسی خلاف شرع کام کو اچھا سمجھنا یا برا نہ سمجھنا بعینہٖ فساد عقیدہ ہے تو رسموں کا کرنا درحقیقت فساد عقیدہ ہے اسی واسطے ان مفاسد میں بیان کیا گیا جو از جنس عقائد ہیں اور اگر از جنس عقائد بھی نہ ہوں اور مان لیا جائے کہ رسوم از جنس فساد اعمال ہیں تب بھی میں ایک خرابی ان میں ایسی بتاتا ہوں کہ بہت اندیشہ کی چیز ہے۔ یاد رکھئے کہ جس عمل پر مداومت کی جاتی ہے اس کا استنکار (دل سے اس کو برا سمجھنا) قلب سے نکل جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کوئی کچہری میں نوکر ہوتا ہے اور اس کو موقع رشوت لینے کا ملتا ہے تو تنہائی میں بھی لیتے ہوئے شرماتا ہے اور منہ سے مانگنا تو کیسا پھر چند مرتبہ لینے کے بعد وہ شرم نہیں رہتی بلکہ خود منتظر رہتا ہے کہ اب ملے گی مگر منہ سے مانگنے کا حوصلہ نہیں ہوتا اور چند روز کے بعد مانگنے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ ایسا بے باک ہوجاتا ہے کہ سر بازار گردن پکڑ پکڑ کر وصول کرتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ رشوت لیتے لیتے عادی ہوگیا اور جو استنکار قلب میں تھا وہ جاتا رہا، ہر عمل کا یہی قاعدہ ہے کہ چند روز کی مشق سے استنکار قلب جاتا رہتا ہے اور جب استنکار جاتا رہا تو قلب کو اس کے چھوڑنے کا ارادہ اور خیال کیوں ہونے لگا بلکہ اور دن بدن اس عمل کی طرف میلان بڑھتا جائے گا اور برابر یہی حالت رہے گی۔ یہاں تک کہ موت آ جائے گی اور خوف ہے کہ توبہ کی توفیق نہ ہو کیونکہ توبہ نام ہے ندامت اور پشیمانی کا اور پشیمانی اس کام سے ہوسکتی ہے جس کا استنکار قلب میں ہو یعنی قلب اس کو برا جانتا ہو اور یہ استنکار پہلے ہی جاچکا۔ یہ مفسدہ کس قدر اندیشہ کی چیز ہے اس کو وہ لوگ یاد رکھیں جو کہہ دیا کرتے ہیں کہ رسمیں ہیں تو بری ہی مگر شرما حضوری کر لیتے ہیں۔ ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ اس زمانہ میں رسمیں پہلے سے بہت کم ہوگئی ہیں جوں جوں روشنی کا زمانہ آتا جاتا ہے جہالتیں کم ہوتی جاتی ہیں۔ میں نے کہا جناب کیفاً (حالت میں) چاہے کم ہوگئی ہوں مگر کمیۃً (مقدار میں) بڑھ گئیں۔

مطلب یہ ہے کہ پہلے لوگوں میں تفاخر اور تکبر اور تکلف بالکل نہ تھا لباس پھٹا پرانا' موٹا جھوٹا جیسا مل گیا پہن لیتے تھے' کھانا باسی تازہ سب طرح کھالیتے تھے۔ جب ان باتوں کے عادی تھے تو رسوم میں بھی ان کے تفاخر وغیرہ کے شرکت نہ تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ رسمیں ان کی گو گنتی میں کم تھیں مگر شرک کی حد تک پہنچی ہوئی تھیں اور ہمارے زمانہ میں تفاخر اور تکبر اور تکلف ہر چیز کا جزو ہو گیا ہے کھانا اور پینا اور لباس اور بودوباش کوئی چیز بھی ان سے خالی نہیں حتیٰ کہ ان کا احساس بھی نہیں رہا کہ یہ قبائح موجود ہیں یا نہیں۔ رسم کچھ اسی بات کو نہیں کہتے جو نکاح اور تقریبات میں کی جاتی ہے۔

رسم کا مفہوم

بلکہ ہر غیر لازم چیز کو لازم کر لینے کا نام رسم ہے خواہ تقریبات میں ہو یا روزمرہ کے معمولات میں پس اگر پہلے لوگوں کی رسمیں شرک تک پہنچی ہوئی تھیں تو آج کل کی رسمیں بھی بدعت تک پہنچی ہوئی ضرور ہیں اور بدعت جب راسخ فی القلب (دل میں پختہ ہو جانا) ہو جاتی ہے تو وہ بھی شرک تک پہنچ جاتی ہے تو مال دونوں قسم کی رسموں کا واحد ہے عقل کی بات یہ ہے کہ سب کو چھوڑ دو۔ ایک گوہ ایک موت سہی نجات دونوں ہیں' دونوں سے طہارت ضروری ہے۔ یہ تو عقائد کا بیان ہوا مگر نہایت اجمالی کیونکہ وقت نہیں ہے اب اعمال کو لیجئے ان میں عقائد سے بھی زیادہ ابتریاں رائج ہو گئی ہیں ان کی بھی جس طرح ممکن ہو اصلاح کرو اعمال بہت ہیں سب کو کہاں تک بیان کر سکتا ہوں۔ اس وقت میں صرف بطور نمونہ ایک فرد میں کلام کرتا ہوں جس کو لوگ خود بھی جانتے ہیں کہ سب سے زیادہ ضروری ہے اس کی ابتریاں واضح ہونے سے دوسرے اعمال کی نسبت خود اندازہ ہو سکے گا کہ ان میں کیا کچھ ابتریاں ہوں گی کیونکہ ظاہر ہے کہ جب مؤکد ترین اعمال کے ساتھ ہم لوگوں کا یہ تعامل ہے تو جن کو چنداں ضروری بھی نہیں سمجھتے ان کا تو کبھی خیال بھی نہ آتا ہوگا وہ عمل نماز ہے جس کو دین کا ستون فرمایا گیا ہے اور جس کو ایمان اور کفر میں فرق قرار دیا گیا ہے۔ نماز کی حقیقت کو تو چھوڑ دیجئے وہ تو ایک لفظ ہی رہ گیا ہے جس کے معنی بھی ہم کو یاد نہیں کہ کیا تھے صرف صورت ہی کو لیجئے یعنی ارکان ظاہرہ اٹھنے بیٹھنے' رکوع سجدہ وغیرہ کو تو اس میں سے بھی کچھ باقی نہیں رہا۔

عورتوں کی نماز میں کوتاہیاں

خصوصاً عورتوں میں بہت سی عورتیں جو نماز کی پابند ہیں وہ ساری ساری عمر نماز پڑھتی رہتی ہیں مگر ان کی نماز اس سے زیادہ نہیں کہ خدائے تعالیٰ کا دھوکا دینا ہے نہ وقت کی پہچان ہوتی ہے نہ پاکی کے مسئلے جانتی ہیں' وضو کرتی ہیں تو اس کے ارکان ادا نہیں ہوتے ایسی غلطیاں ہوتی ہیں کہ

وضو ہوتا ہی نہیں، نماز پڑھتی ہیں تو نماز نہیں ہوتی' اول تو وضو ہی نہیں ہوا تھا پھر اگر نماز درست کر کے بھی پڑھتیں جب بھی درست نہ ہوتی۔ چہ جائیکہ نماز بھی ایسی ہی پڑھتی ہیں کہ وضو کی طرح اس کے ارکان بھی ادا نہیں ہوتے' نماز فاسد ہوتی ہے۔ یہی رواج چل گیا ہے کہ باریک کریپ کا دوپٹہ یا تنزیب کا دوپٹہ سر پر رکھ کر نماز پڑھ لیتی ہیں اور خوش ہیں کہ ہم نماز پڑھتی ہیں مگر یہ نماز نہیں ہوتی محنت ضائع ہوتی ہے۔ کپڑا ایسا ہونا چاہیے کہ جس میں بال ذرا نہ چمکیں کیونکہ بال بھی عورت مستورہ میں داخل ہیں پھر رکوع کریں گی تو وہ رکوع نہیں ہوتا سجدہ کریں گی سجدہ نہیں ہوتا۔ ساری ساری عمر اسی طرح گزر جاتی ہے۔

عورتوں کو دیندار نہ بنانے کی مردوں سے شکایت

مجھے اس میں مردوں سے بھی شکایت ہے ہم نے بہت سے مردوں کو دیکھا ہے کہ ایک نمک کھانے میں کم زیادہ ہو جانے پر عورت کو تنبیہ کرتے ہیں اور مارتے ہیں اور اگر اس پر بھی نہ مانے تو نکال باہر کرتے ہیں اور یہ ہم نے کسی کو نہیں دیکھا کہ نمازیں ضائع کرنے پر کوئی عورت کو نصیحت بھی کرتا ہو۔ الا ماشاءاللہ اور اگر کسی نے کیا تو بہت سے بہت یہ کہ ایک دفعہ یا دو دفعہ سمجھا دیا پھر اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں تو جان تیرا کام جانے برا کرے گی' آپ بھگتے گی۔ کیوں صاحب جب نمک کھانے میں ٹھیک نہ تھا تو ایک دو دفعہ کہہ کر کھانے کو کیوں نہ کھالیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اَلَا فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ"[1] یہ ایک حدیث کا ٹکڑا جس میں بیان ہے کہ بادشاہ اپنی رعیت کا ذمہ دار ہے حاکم اپنے محکوم کا ذمہ دار ہے۔ غرض ہر بڑا اپنے چھوٹے کا ذمہ دار ہے یہاں تک کہ گھر والا اپنے گھر بھر کے افعال کا ذمہ دار ہے تو سب اپنے چھوٹوں کے ذمہ دار ہوئے اور سب سے ان کے افعال کی باز پرس ہوگی۔ مردوں کو خدا تعالیٰ نے وہ ذرائع دیئے ہیں جن سے وہ گھر کی نگرانی کر سکتے ہیں۔ اسی بناء پر "قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ" (عورتوں پر حاکم) فرمایا ہے تو جیسا کہ عورتوں کی دنیا کو درست کرتے ہیں ایسا ہی عورتوں کی آخرت کو بھی درست کرنا چاہیے ہم نے کسی کو نہیں دیکھا۔ الا ماشاءاللہ کہ اس نے اپنی بی بی کا وضو درست کرایا ہو یا اس کی نماز درست کرائی ہو' اپنے سامنے بٹھا کر وضو کرایا ہو' اپنے سامنے قرآن پڑھایا ہو' نماز کا ایک ایک رکن سکھایا ہو' اے مردو! اپنے اعمال بھی درست کرو اور اپنے گھر والوں کے اعمال کو بھی درست کرو اور اے عورتو! تم ان کے کہنے پر چلو اور اپنے اعمال کو درست کرلو پھر اپنے بچوں کے اعمال کو اور اپنے خادموں کے اعمال کو بھی درست کرو۔

---

[1] (مسند احمد ۳: ۱۲۱)

وقت بالکل ہی ہو چکا عصر کی نماز پڑھنی ہے۔ خیر اخلاق میں سے تفاخر کو چھوڑ و اور تکبر کو حسد کو اور غصہ کو ان کے بیان کے لیے تو وقت چاہیے میں صرف غصہ کی ایک ذرا سی فرع آپ کو بتاتا ہوں اس سے سمجھ دار آدمی اندازہ کر سکتا ہے کہ جیسے ایک فرع کے یہ بدنتائج ہیں ایسے ہی سب فروع کے ہوں گے۔ نیز یہ کہ جب غصہ میں یہ برائیاں ہیں تو باقی عادات میں بھی ہوں گی وہ فرع غیبت ہے۔ غیبت غصہ کی فرع ہے جب آدمی کوئی بات اپنی طبیعت کے خلاف دوسرے سے دیکھتا ہے تب ہی تو اس کی برائی کرتا ہے۔ غیبت جس قدر عورتوں میں شائع ہے خدا کی پناہ۔ ان کا تو مشغلہ ہی سب سے بڑا یہی رہ گیا ہے جہاں دو عورتیں بیٹھتی ہیں اسی کا شغل ہوتا ہے، کام کاج کرتی جاتی ہیں اور زبان اس میں چلتی رہتی ہے۔ بلا مبالغہ جیسے حقہ پان کی طلب ہوتی ہے ایسے ہی ان کو غیبت کی طلب اٹھتی ہے کہ بلا اس کے چین ہی نہیں آتا۔ حتیٰ کہ ان کے ذہن سے یہ بات ہی نکل گئی کہ غیبت کوئی بری چیز ہے اور ہم اس میں مبتلا ہیں، غیبت کرتی جاتی ہیں اور کہتی ہیں ہم کسی کے بھلے برے میں نہیں پڑتے (برائی میں تو پڑ گئیں اور برے میں پڑنا کس کو کہتے ہیں زبان سے سب کچھ تو کہہ لیا، برے میں پڑنا جوتیاں ہی مارنے کو کہتے ہیں۔ بات تو لات سے زیادہ اثر رکھتی ہے۔

جراحات السنان لها التيام ولا يلتام ماجرح اللسان

(تلوار کے زخم بالآخر بھر جاتے ہیں مگر زبان کے زخم کبھی نہیں بھرتے)

ہاں یہ جملہ اس معنی کو صادق بھی ہے کہ بھلے برے دونوں میں پڑنے کی نفی ہے اور صرف برائی میں پڑنے سے مجموعہ نہیں پایا گیا۔ کاش اس کو اس طرح صادق کیا ہوتا کہ کسی کی صرف بھلائی ہوتی تب بھی مجموعہ وجود میں نہ آتا مگر یہ تو عادت ہی نہیں کہ پیٹھ پیچھے کسی کو بھلائی سے یاد کر لیں جب منہ پر بھی ان سے کسی کا شکر نہیں ہوتا تو پیچھے تو کیا ہی کریں گی، ہاں برائی چاہے جتنی کرا لو) غیبت کی تعریف یہ ہے کہ کسی کے پیچھے ایسی بات کہنا کہ اگر اس کے سامنے کہیں تو اس کو بری معلوم ہو۔ حتیٰ کہ لکھا ہے کہ کسی کے گھوڑے کو دیکھ کر یہ کہنا کہ گدھیا پال رکھی ہے یہ بھی غیبت ہے کسی کے مکان کو دیکھ کر یہ کہنا کیا جھونپڑا بنایا ہے غیبت ہے بیبیاں غور کر لیں ان باتوں میں مبتلا ہیں یا نہیں، کوئی بی بی شاید ان سے بچی ہوئی ہو ورنہ سب ہی مبتلا ہیں۔ جب آپس میں ملیں گی تو پہلے نظر دوسرے کے زیور پر کپڑے پر عیب بینی ہی کے ساتھ پڑے گی اور پیچھے اس کے ضرور کہیں گی فلانی نے چمپا کلی پہن رکھی تھی، بڑی اتراتی تھیں حالانکہ بناؤ اس کا کیسا بھدا تھا، دوپٹہ میں گوٹا چھوٹا تھا، گوٹا ٹانکنا بھی نہ آیا، بیبیو یہ سب غیبت ہے۔ بہت احتیاط کرو اس کی تدبیر یہ ہے کہ خیال رکھو کہ باتوں میں دوسرے کا ذکر نہ آئے نہ اچھا نہ برا جو لوگ احتیاط کرتے ہیں اور برائی کسی کی نہیں کرتے جب اچھائی کے ساتھ بھی پیٹھ پیچھے کسی کو یاد کرتے ہیں تو بھلائی میں بھی بسا اوقات برائی کچھ نہ کچھ ان کی غلطی سے یا مخاطب کی طرف سے شامل ہو ہی جاتی ہے۔

غیبت کا علاج

اسی واسطے احتیاط یہی ہے کہ پیٹھ پیچھے بلاضرورت شدیدہ کسی کا ذکر کسی قسم کا بھی نہ کرو اور باتیں بھی تو بہت ہیں' مسئلے مسائل آپس میں پوچھا کرو یہی باتیں ہو جائیں گی مگر مجھے بیبیوں سے اس کی امید کم ہے۔ جانے دو دنیا ہی کی بات کرو' کسی علم و فن کی تحقیق کرو سینے پرونے' کھانے پکانے کے متعلق باتیں کرو' تم کو اس سے اور اس کو تم سے کچھ حاصل ہوگا' کسی کی برائی بھلائی میں کیا رکھا ہے۔

لطف یہ ہے کہ غیبت میں صرف دین ہی کی خرابی نہیں ہے دنیا کی بھی خرابی ہی خرابی ہے، ہم کوئی گھر ایسا نہیں پاتے جس میں عورتوں میں لڑائی جھگڑا کچھ نہ کچھ نہ ہو اس کے اسباب اور اس کے دفعیہ کی تدابیر کچھ بھی ہوں اس وقت ان کے بیان کا موقعہ نہیں میں صرف اتنا ہی کہتا ہوں کہ اگر گھر کی ساری بیبیاں ایک غیبت ہی کے چھوڑنے پر پکی ہو جائیں تو میں ذمہ دار ہوں کہ لڑائی جھگڑا نہ رہے جو خاندان چاہے امتحان کر لے خوب سمجھ لے کہ جو شخص غیبت نہیں کرتا وہ ہر دلعزیز ہوتا ہے لوگوں کو اس پر اعتماد ہو جاتا ہے کہ ہماری عیب جوئی نہ کرے گا' ہماری بات کسی سے نہ کہے گا' اس کے پاس بیٹھ کر دوسرا آدمی خوشی کے ساتھ اٹھتا ہے۔

جب ساری گھر کی بیبیوں کی یہی حالت ہوگی تو آپس میں لڑائی جھگڑا کیسا ہر دلعزیزی اور لڑائی جھگڑا تو متبائن (جدا ہونے والا) اشیاء ہیں سب کا عیش صاف و بے کدورت ہوگا' سارے گھر کی ہوا بندھ جائے گی اور دوسروں کی نظروں میں عزت ہوگی' دنیا میں بھی اگر آرام اور عزت کا ذریعہ ہے تو غیبت کا چھوڑنا ہی ہے اور برعکس اس کے جو شخص غیبت کرتا ہے اس سے لوگوں کو نفرت ہوتی ہے اس کے سامنے کوئی دل کا راز کہتے ہوئے رکتے ہیں اور جب دوسرا شخص سنتا ہے کہ اس نے میری غیبت کی تو وہ بھی اس کے عوض میں اس کی غیبت کرتا ہے اس کی خبر اس کو بھی ضرور ہی پہنچتی ہے پس دونوں میں عداوت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر شخص موقع کا منتظر رہتا ہے کہ کسی طرح نقصان پہنچائے دوسرے کو اس کے دفعیہ کی تدبیریں کرنی پڑتی ہیں اور ہر وقت یہی فکر رہتا ہے۔ فرمایئے بے فکری کی زندگی اچھی ہے یا فکر کی۔ جب گھر کی بیبیوں میں غیبت کی بدولت نفاق پھیل گیا تو اس گھر کی ہوا اُکھڑ جاتی ہے پھر نہ بڑے کی عزت ہے نہ چھوٹے کی' دوسروں کی نظروں میں سب حقیر ہو جاتی ہیں اور ذرا سی غلطی کسی سے ہو جائے تو بازاروں میں سن لیجئے یہ کیسی زندگی ہے کہ کوئی منہ لگانا پسند نہیں کرتا' یہ دنیا کی خرابیاں ہیں جو غیبت کے چھوڑنے کے لیے کافی ناصح ہیں۔ گو کہ یہ خرابیاں فانی ہیں کہ جب کوئی مرے گا یہ سب ختم ہو جائیں گی اور آخرت کی خرابیوں میں اتنا اور اضافہ ہے کہ وہ باقی ہیں' آنکھ میچنے کے بعد نظر آئیں گی جن کا پھر کچھ تدارک ہونا ناممکن ہے۔

معاملات اور حقوق کی چند مفید عام کتب

معاملات اور حقوق اور جو کچھ ذکر کے افراد میں سے باقی رہا وقت ختم ہو جانے کی وجہ سے ان سب کو ان کتابوں پر حوالہ کرتا ہوں جو اس کے کام کے لیے لکھی گئی ہے۔ بقدر ضرورت ان میں موجود ہے دو تین نام میں اس وقت بتائے دیتا ہوں۔

اصلاح الرسوم۔ اس میں رسموں کا مفصل بیان موجود ہے۔ صفائی معاملات' یہ معاملات کے لیے بقدر ضرورت کافی ہے۔ حقوق الاسلام سے آپس کے اکثر حقوق معلوم ہو سکتے ہیں۔

مستورات کو بہشتی زیور کو سبقاً سبقاً پڑھنے کی ضرورت

اوران سب کا مجموعہ چاہو تو بہشتی زیور ہے اس کتاب کی تصنیف خاص عورتوں ہی کے واسطے ہوئی ہے۔ بیبیو اس کو ضرور پڑھو اور اپنی اولاد کو پڑھاؤ لیکن اتنی بات یاد رکھو کہ گو تم پڑھی لکھی ہو مگر بطور خود مطالعہ نہ کرو۔ بہشتی زیور کو سبقاً سبقاً پڑھو۔ اپنے خاوند سے یا اپنے بیٹوں سے کسی اور محرم[1] سے اور کوئی بھی نہ ہو تو کسی عورت سے جس نے باقاعدہ کسی سے پڑھا ہو اور اس کتاب کو ہمیشہ اپنے مطالعہ میں رکھو۔ ایک دفعہ پڑھ لینے سے کچھ نہیں ہوتا اور پھر جب کوئی بات پیش آئے بہشتی زیور میں اس کالم کو تلاش کرو اکثر تو اسی سے نکل آیا کریں گے اور اگر کوئی مسئلہ نہ ملے تو کسی مولوی معتبر سے پوچھئے۔ اپنے خاوند سے یا کسی اور محرم سے زبانی دریافت کرالو یا آج کل تو سہل ترکیب یہ ہے کہ دو پیسے خرچ کرو اور بذریعہ تحریک چاہے جہاں سے جواب منگالو۔ یہ تو ان کے واسطے ہے جو پڑھی لکھی ہیں اور جو بیبیاں ناخواندہ[2] ہیں وہ اپنی اصلاح اس طرح کریں کہ جہاں دنیا کے سینکڑوں کاموں کے وقت ہیں وہاں ایک دین کا بھی وقت مقرر کر لیں۔ چند بیبیاں بیٹھ جائیں اور ایک پڑھی ہوئی بی بی یا کوئی لڑکی یا محارم میں سے کوئی مرد بیٹھ جائے اور بہشتی زیور ورق ورق کر کے سنا ڈالے اور بیبیاں تھوڑی دیر کے لیے بیچ بیچ کو بند کر کے دھیان لگا کر سنیں اور پڑھنے والا ہر بات کو مناسب طریق سے سمجھائے۔ جب کتاب ختم ہو جائے تو پھر شروع سے دہراؤ۔ اسی طرح بار بار سنو اور پڑھو' گھر کے مرد اس بات کا خیال رکھیں کہ جو کچھ کتاب میں پڑھایا سنایا جاتا ہے عورتیں اپنے افعال میں اس کی کاربند ہیں یا نہیں اس طرح سارے گھر کی اصلاح ہو سکتی ہے نہ کہیں سکول میں جانے کی ضرورت رہی نہ مدرسہ میں' یہ سب داخل ہیں اس آیت میں "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا" (اے ایمان والو! کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرو)۔ اب دعا کرو کہ حق تعالیٰ اس کی توفیق دیں۔ فقط

---

[1] (عورت کا قریبی رشتہ دار جس سے نکاح ناجائز ہو) [2] (ان پڑھ)

المراقبہ

یہ وعظ ۱۱ ذی قعدہ ۱۳۳۹ھ بروز دوشنبہ بمقام تھانہ بھون مکان حضرت مولانا دام مجدہم جو کہ حضرت والا نے چارپائی پر بیٹھ کر ۲ گھنٹے ۳۰ منٹ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ساٹھ عدد تھی۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیَاتٍ لِّاُوۡلِی الۡاَلۡبَابِ○ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِھِمۡ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ رَبَّنَا مَاخَلَقۡتَ ھٰذَا بَاطِلًا سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ○ (آل عمران: ۱۹۰'۱۹۱)

ترجمہ: ''بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں اہل عقل کے لیے دلائل ہیں جن کی حالت یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں' کھڑے بیٹھے بھی لیٹے بھی اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں اور ہمارے پروردگار نے ان کو لایعنی پیدا نہیں کیا۔ پس ہم کو عذاب دوزخ سے بچا لیجئے۔''

ذکر وفکر کی ترغیب

یہ آیت ہر چند کہ ایک خاص مضمون کے متعلق وارد ہے یعنی توحید کے مگر اس کے ضمن میں حق تعالیٰ نے چند باتوں پر تنبیہ فرمائی ہے اور ان کی ترغیب دی ہے۔ مجھے ان کے متعلق اس وقت کچھ بیان کرنا ہے اور وہ دو عمل ہیں جو توحید کے ضمن میں یہاں مذکور ہوئے ہیں مجھے ان میں سے ایک کو مقصوداً بیان کرنا ہے اور دوسرے کو تبعاً اور وجہ ان کے بیان کرنے کی یہ ہے کہ ہماری دینی خرابی اور دنیوی خرابی جو کچھ ہو رہی ہے اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ من جملہ ان کے ایک سبب اس آیت میں مذکور ہے' اول تو میرے ذہن میں ان سے ایک ہی وجہ آئی تھی مگر آیت میں غور کرنے سے دوسری وجہ اور معلوم ہوئی۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ یہاں دو عملوں کی ترغیب ہے ایک ذکر

کی ایک فکر کی اور ان ہی دونوں میں کوتاہی کرنا ہماری دنیوی اور دینی خرابی کا سبب ہے۔ ہر چند کہ اس آیت میں خاص فکر کا ذکر ہے جو کہ آسمان وزمین کی پیدائش اور بناوٹ میں کیا جائے کیونکہ یہ موقع اثبات توحید کا ہے اور مقصود مقامی یہی ہے اور اثبات توحید میں تفکر فی السماء والارض کو خاص دخل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ان مخلوقات میں غور کرو کہ یہ سب حادث ہیں اور حادث کے وجود کے لیے مرجح کی ضرورت ہے اگر مرجح بھی حادث ہوا تو اس کے لیے پھر مرجح کی ضرورت ہوگی اور سلسلہ غیر متناہی چلے گا اور تسلسل محال ہے۔ پس ضرور ہے کہ انتہا واجب پر ہوگی اور اسی کو ہم اللہ کہتے ہیں غرض فکر اس جگہ مقید ہے مگر مجموعی آیات سے جو اس باب میں وارد ہیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو ہر چیز میں فکر ہونا چاہیے رسالت میں بھی توحید میں بھی۔ اسی طرح اور کوئی عمل بھی فکر سے خالی نہ ہونا چاہیے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ اس باب میں ہمارا کیا حال ہے سو ہماری حالت یہ ہے کہ ہم کو کسی کام میں فکر نہیں ہوتی' اپنی ہر حالت کو یاد کر کے دیکھ لو کوئی وقت بھی ایسا ہوتا ہے جس میں ہم فکر کرتے ہوں یا کسی کام میں سوچ سے کام لیتے ہیں۔ یقیناً آپ اپنے سب اوقات کو فکر سے خالی پائیں گے حالانکہ قرآن وحدیث میں تو توحید و رسالت تک میں بھی فکر کی تاکید ہے گو توحید و رسالت کے حاصل ہوتے ہوئے ان میں فکر نہ کرنے کی شکایت نہ ہو کیونکہ اس فکر کا نتیجہ بحمد للہ ہم سب کو حاصل ہے کیونکہ بحمد للہ سب مومن مسلمان ہیں یہ اور بات ہے کہ خلل اعمال کی وجہ سے ایمان کی نورانیت بعض میں کم ہے باقی نفس ایمان میں کمال ونقص نہیں ہے۔ بحمد للہ نفس ایمان سب کو حاصل ہے حتیٰ کہ نفس ایمان فاسق کو بھی حاصل ہے بعض عارفین کا قول ہے کہ ضعیف ایمان کا نور بھی اگر ظاہر ہو جائے تو آسمان وزمین سب کو چھپا لے۔ بہر حال یہ فکر اگر نہ ہو تو کچھ شکایت نہیں کیونکہ اس فکر کا حاصل یہ ہوگا کہ شے موجود کو قوی کیا جائے گا اور موجود کو قوی کرنا مقصود کے حاصل کرنے سے مؤخر ہے' مقدم یہ ہے کہ مقصود کو حاصل کیا جائے۔

جزا وسزا میں فکر کی ضرورت

میں اسی فکر کو بتلانا چاہتا ہوں جس کی ہر عمل میں ضرورت ہے اور وہ فکر یہ ہے کہ جزا وسزا میں فکر کیا جائے۔ چنانچہ سورہ رحمٰن میں اول سے آخر تک اسی کا بیان ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی نعمتیں اور عقوبتیں بیان فرما کر بار بار سوال کیا ہے: "فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ" (اے جن وانس! تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے) جس کا حاصل یہی ہے کہ ان نعمتوں کو اور عقوبتوں کو سوچنا اور یاد کرنا چاہیے مگر اس مقام پر کسی طالب علم کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ نعمتوں کے ساتھ تو "فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ" (اے جن وانس! تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے) موقع

پر ہے مگر عذاب کے ساتھ اس کے ذکر کا کیا موقع ہے اس کا جواب یہ ہے کہ عذاب کے ذکر سے انسان کو تنبیہ ہوتی ہے اور وہ عذاب کو سوچ کر نافرمانی سے بچتا ہے اس حیثیت سے اس کا ذکر بھی نعمت ہے اگر ہم کو فکر کی عادت ہوتی تو یہ راز معلوم ہو جاتا اس کی ایسی مثال ہے جیسے حاکم منادی کراتا ہے کہ جو شخص سرکاری درخت کاٹے گا اس پر اس قدر جرمانہ ہوگا اور سزا دی جائے گی عاقل اس منادی کو بھی نعمت سمجھے گا کہ اس منادی کی وجہ سے ہم جیل خانہ سے بچ گئے۔ اگر ہم کو خبر نہ ہوتی تو قید بھگتنا پڑتی یا طبیب کسی مضر شے کی مضرت سے ہم کو اطلاع دے۔ عاقل اس کی بھی قدر کرے گا۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ عذاب گو فی نفسہ نعمت نہ ہو مگر اس سے مطلع کر دینا ضرور نعمت ہے۔ پس اب "فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ" (سوائے جن وانس! تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے) کسی جگہ بے موقع نہیں ہے بہر حال سارا قرآن فکر کی تاکید سے بھرا ہوا ہے کہیں قیامت کے بارے میں ارشاد ہے "اَفَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا آسمانوں اور زمین کے عالم میں) کہ ان کو قیامت کے امکان کو سمجھنے کے لیے ملکوت سموات وارض میں نظر چاہیے نظر وفکر ایک ہی ہے۔

تفکر فی الدنیا

ایک جگہ ارشاد ہے: "لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ" (تاکہ تم غور وفکر کرو دنیا اور آخرت میں) اللہ تعالیٰ یہ احکام صاف صاف اس لیے بیان فرماتے ہیں کہ تاکہ دنیا وآخرت میں فکر کرو۔ یہاں تفکر فی الدنیا کی بھی تاکید ہے اس پر یہ اشکال ظاہر میں ہوتا ہے کہ دنیا میں تفکر کی کیا ضرورت ہے بلکہ اس سے تو تفکر کو ہٹانا چاہیے اشکال سننے کے بعد اب دو تفسیریں سنو! جن میں ایک دوسرے سے لطیف ہے ایک تفسیر تو یہ ہے کہ دنیا کے اندر جو فکر مذموم ہے وہ وہ ہے جو تحصیل دنیا کے لیے ہو اس کو مقصود بالذات سمجھ کر اور اگر مقصود بالذات نہ سمجھے تو وہ فکر بھی جائز ہے کیونکہ حدیث میں ہے "طَلَبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَۃِ"[1] (کسب حلال فرضوں کے بعد ایک فرض ہے) اور طلب کے لیے فکر لازم ہے مگر یہ فکر مقصوداً مطلوب نہیں بلکہ تبعاً ہے کیونکہ دنیا بقدر ضرورت کو دین کی تکمیل وتحصیل میں دخل ہے۔ دوسری تفسیر اس سے لطیف ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا وآخرت میں تفکر وموازنہ کے لیے ان میں کون قابل اختیار کرنے کے ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا وآخرت میں تفکر وموازنہ کے لیے ان میں کون اختیار کرنے کے لیے ہے اور کون قابل

---

[1] (کنز العمال: ۹۲۰۳)

ترک ہے اور دنیا میں جو فکر مذموم ہے وہ وہ ہے جو تحصیل کے لیے ہو اور جو فکر ترک دنیا کے لیے ہو وہ تو مطلوب ہے۔ پہلی تفسیر کا حاصل یہ تھا کہ دنیا میں تبعاً تفکر کرو اور آخرت میں مقصوداً اور دوسری تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ دونوں میں مقصوداً تفکر کرو موازنہ کے لیے اہل اللہ نے دنیا میں فکر کر کے ہی اس کی حقیقت کو سمجھا ہے اسی لیے ان کو دنیا سے سخت نفرت ہے۔

دنیا کی حقیقت

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اگر آخرت کا وجود نہ ہوتا یا تحصیل و دنیا و آخرت سے مانع نہ ہوتی تب بھی دنیا کی حقیقت ایسی ہے کہ اس کو معلوم کر کے عاقل ہرگز اس کی طرف رغبت نہ کرتا اور آخرت کے مقابلہ میں تو اس کا طلب کرنا محض حماقت اور جہالت ہے۔ شاید اس پر اہل دنیا کو یہ سوال ہو کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ دنیا خود قابل ترک ہے ہماری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آئی ہم تو دیکھتے ہیں کہ دنیا سے بہت راحت ملتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی ایسی مثال ہے جیسے سانپ کے کاٹے کو نیم کے پتے میٹھے معلوم ہوتے ہیں مگر تندرست آدمی کو کڑوے معلوم ہوتے ہیں۔ پس آپ کو دنیا اس لیے اچھی معلوم ہوتی ہے کہ آپ کی ایمانی حس درست نہیں، اگر ایمانی حس درست ہوتی جس کے متعلق مولانا فرماتے ہیں:

صحت ایں حس بجوئیداز طبیب   صحت آں حس بجوائیداز حبیب

(جسمانی امراض کا حال حکیم سے پوچھو اور امراض روحانی کی کیفیت شیخ کامل سے پوچھو)

کہ ایمان کی حس اگر درست کرنا چاہو تو اس کا طریقہ مقبولان الٰہی سے پوچھو۔ بہر حال وہ حس جو مجاہدات کے ذریعے سے خانقاہوں میں حاصل کی جاتی ہے درست ہو تو اس کہنے کی بھی ضرورت نہ رہی کہ آخرت ایسی چیز ہے کہ اس کے مقابلہ میں دنیا قابل ترک ہے بلکہ تم خود بخود دنیا سے دلبرداشتہ ہو جاؤ۔ اس کی حالت کو ان لوگوں سے پوچھئے جن کی عمر دراز ہوگئی ہے جنہوں نے دنیا کو اچھی طرح آزمایا ہے اور اس کے سرد و گرم کا تجربہ حاصل کیا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ایک تجربہ کار شاعر کہتا ہے:

ومن یحمد الدنیا لعیش یسرہ   فسوف لعمری عنقریب یلومھا

اذا ادبرت کانت علی المر معسرہ   وان اقبلت کانت کثیرا ھمومھا

کہ جو شخص کسی خوش کن عیش کی وجہ سے دنیا کی تعریف کر رہا ہے میری جان کی قسم وہ عنقریب اس کی خود ہی برائی کرے گا۔ اس کی حالت یہ ہے کہ جب یہ چلی جاتی ہے تو آدمی کو حسرت و رنج دے کر جاتی ہے اور جب آتی ہے تو بہت سے افکار ساتھ لاتی ہے اور یہ حسرت انہی لوگوں کو ہوتی ہے جو اس

میں پھنسے ہوئے ہیں ورنہ عاقل کو خصوصاً عارف کو حسرت نہیں ہوتی کیونکہ کھنا بلا جائے تو خوشی کی بات ہے مگر جو لوگ دنیا کے عاشق ہیں ان کے یہاں چوری ہو جائے تو ان کی بری حالت ہو جاتی ہے۔

ایک عبرت انگیز حکایت

چنانچہ بعض لوگ تو حسرت وغم میں مر گئے ہیں۔ میں نے اسی قصہ کی حکایت سنی ہے کہ سکھو والی مسجد کے ایک پردیسی ملا کے پاس سو اشرفیاں جمع ہو گئی تھیں وہ ان کو روز شمار کیا کرتا تھا' محلہ کے شہدوں کو پتہ چل گیا اور موقع پا کر سب نکال لیے گئے۔ پھر حافظ جی کی دعوت کی اور خوب عمدہ کھانے کھلائے' جب حافظ جی کھانے کی تعریف کرتے تو وہ بار بار یوں کہتے کہ حافظ جی سب آپ کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ حافظ جی کو اپنی رقم کا کھٹکا ہوا' جلدی سے حجرہ میں آئے اور اشرفیوں کو تلاش کیا' وہاں تو میدان صاف تھا۔ بس یہ حالت دیکھتے ہی فوراً جان نکل گئی۔ کوئی بزرگ اس وقت تھے ان کو واقعہ معلوم ہوا تو فرمایا کہ ان اشرفیوں کو اس کے ساتھ ہی دفن کر دیا جائے کوئی ان کو اپنے کام میں نہ لائے کیونکہ جس مال نے مسلمان کی جان لے لی وہ ضرور نامشروع طریق سے جمع کیا گیا تھا۔ یہی سنا ہے کہ کسی بیباک شخص نے ان اشرفیوں کو قبر میں سے نکالنا چاہا' ہاتھ لگانا تھا کہ ایک آگ لگ گئی جب تک زندہ رہا ہر وقت انگلی کو پانی میں رکھتا تھا۔ غرض بعضے تو اس کی حسرت میں مر گئے ہیں اور ایسے لوگ تو کثرت سے دیکھے جاتے ہیں جو اولاد کے مرنے پر بدحواس ہو جاتے ہیں اور ان سے ایسے کلمات کہہ ڈالتے ہیں کہ خدا کی بھی پرواہ نہیں کرتے اور اگر تہذیب سے کام بھی لیا تو اس وقت خدا سے ان کا دل ویسا راضی نہیں ہوتا جیسا پہلے تھا' یہ حالت تو بہت ہی عام ہے۔ افسوس خدا تعالیٰ نے تو اپنی ہی چیز لی تھی تمہاری چیز نہیں لی حالانکہ دنیا کے محبوبوں کو تو تم خود اپنی چیزیں دیتے ہو اور وہ اگر نہ لیں تو یوں کہتے ہو:

چو در چشم شاہد نیاید زرت   زر و خاک یکساں نماید برت

(جب محبوب کی نظر میں تمہارا مال وزر نہیں آتا تو خاک اور مال وزر تمہارے نزدیک برابر ہیں)

صاحبو! کیا یہ حالت افسوس کے قابل نہیں ہے۔ اب عارفین کی حالت کو دیکھو کہ وہ دنیا کو قید خانہ سمجھتے ہیں جو یہاں سے جاتا ہے وہ عقلاً اس پر خوش ہوتے ہیں۔ گو طبعاً رنج ان کو بھی ہوتا ہے۔

مخلوق کو بڑا اور کارساز سمجھنا شرک ہے

حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص روتا ہوا آیا کہ حضرت میری بیوی مر رہی ہے دعا کیجئے وہ بچ جائے' حضرت نے مسکرا کر فرمایا کہ ایک تو جیل خانہ سے رہائی پا رہا

ہے اور یہ رو رہے ہیں کہ تو جیل خانہ سے کیوں نکلتا ہے تو بھی جیل خانہ سے نکلا چاہتا ہے وہ کہنے لگا حضرت میری روٹی کون پکائے گا' فرمایا! جی ہاں آپ ماں کے پیٹ سے نکلے تھے اس وقت بھی بیوی روٹی پکاتی ہوئی ساتھ آئی تھی میاں جس نے ماں کے پیٹ میں تم کو پالا وہ اب بھی پالے گا۔ ان باتوں پر تو حضرت ظرافت کے ساتھ باتیں کرتے رہے پھر اس نے کہا کہ حضرت فلاں شخص نے مجھے اپنے ساتھ مدینہ لے جانے کا وعدہ کیا تھا اب وہ انکار کرتا ہے دعا فرمائیے کہ وہ مجھے مدینہ لے جائے' ظاہر میں یہ بات غصہ کی نہ تھی مگر حضرت کو اس پر غصہ آ گیا اور تیزی کے ساتھ فرمایا کہ بس بس ہمارے سامنے یہ شرک کی باتیں نہ کرو کیا وہی شخص لے جائے گا تو تم مدینہ پہنچو گے ورنہ نہیں پہنچو گے' مخلوق پر اتنی نظر توبہ کرو ہر چند کہ مخلوق پر نظر پہلی باتوں میں بھی تھی مگر وہاں مخلوق پر نظر تھی اس کے خادم ہونے کی حیثیت سے اور یہاں نظر تھی بڑا اور کارساز ہونے کی حیثیت سے اس لیے حضرت نے اس کو شرک کی بات فرمایا۔ مقصود یہ تھا کہ حضرت نے دنیا سے جانے کو جیل خانہ سے نکلنا فرمایا' طبعی رنج ہونا قابل شکایت نہیں مگر ایسا رنج کہ پیٹ پھاڑنے لگے۔ یقیناً برا ہے تو یہ دنیا ذہاب کے وقت یہ غم دیتی ہے اور جب پاس ہوتی ہے اس وقت بھی تکدر کا سبب ہے کیونکہ سینکڑوں افکار اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔

دنیا کا میزان الکل

چنانچہ دنیا کا میزان الکل ہے کہ اس سے ہر چیز حاصل ہو سکتی ہے اس کی حالت یہ ہے کہ جب مال نہ تھا تو جنگل میں سو رہنا آسان تھا اور اب مال آنے کے بعد گھر میں سونا بھی مشکل ہے' چین سے نیند نہیں آتی۔ چنانچہ ایک گرو اور چیلے کی حکایت مشہور ہے کہ دونوں رات کو سفر کر رہے تھے' چیلے نے کہا مجھے ڈر لگتا ہے' گرو نے تسلی کی اس نے تھوڑی دور چل کر پھر کہا کہ ڈر لگتا ہے' گرو نے کہا معلوم ہوتا ہے تیرے پاس کچھ رقم ہے' کہا ہاں ایک روپیہ ہے' کہا اس کو پھینک دے' چیلے نے روپیہ پھینک دیا' اس کے بعد کچھ دور چل کر گرو نے پوچھا کہ اب تو ڈر نہیں لگتا' کہا بالکل نہیں' تو واقعی اس مال کی وجہ سے بہت سے خطرات و افکار میں انسان مبتلا ہو جاتا ہے اور جو مفلس ہوا سے کیا خوف

لنگلے زیر و لنگلے بالا نے غم دز دو نے غم کالا •

(ایک لنگی نیچے ایک لنگی اوپر نہ چور کا کھٹکا نہ مال و متاع کا ڈر)

ایسے شخص کو تو اگر کوئی قید خانہ میں بھی بھیجے تو گھر سے روٹی دینا پڑتی ہے' مفلس کو جیل خانہ سے بھی ڈر نہیں لگتا کہ پکی پکائی ملے گی اور مالداروں کی حالت یہ ہے کہ بنئے کی قوم سب سے زیادہ

مالدار ہے مگر سب سے زیادہ ڈرنے والی بھی یہی قوم ہے۔ مال کو بڑی بڑی تدبیروں سے رکھتے ہیں اور راتوں کو پہرہ دیتے ہیں مدینہ کے راستوں میں ایک راستہ مسکینوں کا بھی ہے اس میں مسکین لوگ بڑی راحت سے رہتے ہیں کہ بدو ہر منزل پر ان کی دعوت کرتے ہیں پھر مدینہ پہنچ کر تو ان کی قدر بہت ہی زیادہ ہوتی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکینوں کے عاشق ہیں جن غریبوں کی یہاں قدر نہیں حضور کو ان کی یہ حالت ہے کہ روپے کمر سے باندھتے اور نوٹ بازو پر باندھتے ہیں اور ہر وقت لوٹ مار سے ڈرتے رہتے ہیں یہ تو مال کی حالت ہے اب دنیا کے اور شعبوں کو دیکھو جن میں سے ایک نکاح ہے اس کی یہ حالت ہے کہ جو لوگ زیادہ نکاح کرتے ہیں یا ایک ہی بیوی سے زیادہ مشغول رہتے ہیں اس عیش کا انجام یہ ہے کہ کسی کی نگاہ کمزور ہو جاتی ہے کسی کے ہاتھ پاؤں میں رعشہ ہو جاتا ہے کسی پر فالج پڑ جاتا ہے پھر سب عیش منغص ہو جاتا ہے۔

خدا کی ہستی

کھانے کو لو تو یہ بھی کدورت سے خالی نہیں کیونکہ کھانے سے بعض دفعہ پھندا لگ جاتا ہے اور یہاں سے خدا کی ہستی معلوم ہوتی ہے کیونکہ انسان کے حلق میں دو سوراخ ہیں ایک سانس کے لیے ایک طعام وشرب کے لیے اگر کھانا پانی سانس کے سوراخ میں پہنچ جائے تو پھندا لگ کر انسان ہلاک ہو جاتا ہے۔ اب بتلاؤ کہ وہ کون ہے جو کھانے پانی کو سانس کے سوراخ میں جانے سے روکتا ہے اگر ہم خود روکتے ہیں تو بالکل غلط کیونکہ تم کو تو ان دونوں سوراخوں کی خبر بھی نہیں کہ کونسا سانس کا ہے اور کونسا کھانے پینے کا یہ اللہ تعالیٰ ہی کی حفاظت ہے۔ ''مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ'' (اس نے دو دریاؤں کو صورۃً ملایا کہ (ظاہر میں) باہم ملے ہوئے ہیں اور (حقیقتاً) ان دونوں کے درمیان ایک حجاب (قدرتاً) ہے) کا منظر بنا دیا ہے کہ کیا مجال کہ طعام منفد نفس میں جا سکے۔ بکثرت اس کا وقوع نہیں ہوتا ہاں کبھی اظہار عجز انسان بھی ہو جاتا ہے کہ سانس کے راستے میں کھانا پانی پہنچ جاتا ہے اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ کھانا بھی وبال جان ہے۔ اگر خدا کی حفاظت نہ ہو صاحبو! حق تعالیٰ آپ کی حفاظت فرماتے ہیں اور اس کے لیے ملائکہ بھی مقرر ہیں اسی کو شیخ سعدی فرماتے ہیں:

ابرو باد و مہ خورشید و فلک درکارند ۔۔۔ تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

(بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان سب کام میں مشغول ہیں تا کہ تو اپنے ہاتھ میں روٹی دیکھے اور غفلت نہ کرے)

اور اسی کو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَلَكُمْ مَّافِي السَّمٰوٰتِ وَمَافِي الْاَرْضِ
(کیا تم لوگوں کو یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے)

مسخر ہونے کا وہی حاصل ہے کہ درکار ند اس پر شاید یہ شبہ ہو کہ زمیں وآسمان تو ہمارے مسخر و تابع نہیں اسکا جواب یہ ہے کہ سخرلکم میں لام صلہ کا نہیں بلکہ نفع کا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے منافع مصالح کے لیے زمین وآسمان کو اور سب چیزوں کو اپنے حکم سے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے تو یہ خدا کی حفاظت وتسخیر کا نتیجہ ہے کہ کھانے میں آپ کو لذت آتی ہے ورنہ وبال جان ہو جائے پھر کھانے سے اگر سدہ پڑ جائے تو روتے پھرتے ہیں اور علاج معالجہ میں رقمیں صرف کرتے ہیں تو یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی حفاظت ہے کہ کھانے کو منہضم کر کے بآسانی فضلہ کو خارج کر دیا جاتا ہے ورنہ کھانا ہی سم قاتل ہو جائے' دنیا کا ایک شعبہ دوست اولاد ہیں جن سے انسان کو بہت تعلق ہو جاتا ہے مگر حقیقت میں دوست دشمن سے زیادہ مضر ہوتا ہے دشمن محض مال یا جان لیتا ہے اور دوست بسا اوقات ایمان بھی لے لیتا ہے اور ایمان سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں۔ دوستوں کی وجہ سے انسان غیب وشکایت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ان سے ایمان کو نقصان پہنچتا ہے پھر اگر دوستوں کے خلاف مذاق کام کیا اور وہ دشمن ہو گئے تو وہ دشمنوں سے زیادہ ضرر پہنچاتے ہیں۔

والدین کو اپنی راحت سے محبت ہے

اولاد کی یہ حالت ہے کہ جب تک باپ کے دست نگر ہیں محتاج ہیں اس وقت تک باپ کو ان سے محبت ہے ان کو باپ سے ہے اور جب نکاح ہو گیا ملازم ہو گئے اب دیکھو باپ ماں کو اُن سے کتنا تعلق ہے اور ان کو باپ ماں سے کتنا تعلق ہے بعض دفعہ باہم ایک دوسرے کی صورت سے نفرت کرنے لگے ہیں پس والدین کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ ہم کو اولاد سے محبت ہے بلکہ باپ کو اپنی ذات سے محبت ہے ورنہ اولاد کے نقصان پر تو روتا نفع پر کیوں روتا ہے۔ مثلاً معصوم بچہ کا مرجانا خود بچہ کے لیے تو نافع ہے کیونکہ بالغ ہو کر نہ معلوم جنتی ہوتا یا دوزخی اور اب تو بلاشبہ جنتی ہے مگر والدین روتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ باپ ماں کو اپنی راحت سے محبت ہے۔

ہر ایک اپنا ہی معتقد ہے

اسی طرح بعض لوگ اپنے معتقدوں کی کثرت سے خوش ہیں مگر حقیقت میں کوئی کسی کا معتقد نہیں بلکہ ہر ایک اپنا معتقد ہے اگر تم ان کے خلاف مذاق کام کر دو تب دیکھو وہ کیسے معتقد رہتے ہیں۔

ایک واعظ کی داڑھی لمبی تھی وہ وعظ کہہ رہے تھے اور ایک دیہاتی رو رہا تھا۔ واعظ صاحب خوش تھے کہ میرے وعظ کا اثر ہوا مگر اب یہ چاہا کہ لوگوں کے سامنے بھی اس سے اس کا اقرار کرا دیں اس لیے اس دیہاتی سے پوچھا کہ تو کس بات پر رو رہا تھا' کہا مولوی صاحب تمہاری داڑھی جب ہلتی تھی تو مجھے اپنا بکرا یاد آتا تھا جو مر گیا ہے کیونکہ اس کی داڑھی بھی اسی طرح ہلتی تھی۔ سو حقیقت میں سب اپنے بکرے کے معتقد ہیں تم خواہ مخواہ ان کے ہاتھ اپنی بکری مت کرو۔ یاد رکھو! تمہارا دوست خدا کے سوا کوئی نہیں' اللہ تعالیٰ کو آپ سے کوئی نفع نہیں پھر بھی وہ آپ کو چاہتے ہیں بلکہ تم تو ان کو کیا نفع دیتے وہ خود اپنے گھر سے تم کو بہت کچھ دیتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اولاد اور دوستوں سے بالکل محبت نہ ہونی چاہیے کیونکہ اگر محبت نہ ہوگی تو حقوق ادا نہ ہوں گے اس لیے یہ محبت سنت کے خلاف نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرات حسنین سے بہت محبت تھی حتیٰ کہ ایک بار یہ صاحبزادے لڑکھڑاتے ہوئے مسجد میں ایسے وقت آ گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر خطبہ فرما رہے تھے ان کے قدموں کو ڈگمگاتا ہوا دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے خطبہ کے درمیان میں اتر پڑے اور ان کو آغوش میں لے لیا اور خطبہ شروع کیا۔

مگر حقیقت میں یہ رحمت و شفقت ہے جس کی صورت محبت کی سی ہے ورنہ حقیقی محبت آپ کو مخلوق سے ہرگز نہ تھی۔ اسی لیے حدیث میں ہے:

لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلاً لاَ تَّخَذْتُ اَبَا بَكْرٍ خَلِيْلاً وَلٰكِنْ اَحْمَدُ اللّٰهَ صَاحِبُكُمْ خَلِيْلاً ٥[1]

(اگر میں کسی کو دوست بناتا تو ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو منتخب کرتا لیکن میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہوں جو تمہارے ساتھی کے دوست ہیں)

مگر صورت ازواج و اولاد کے اس تعلق کو محبت کہہ دیا گیا ورنہ حقیقت میں آپ کو صرف اللہ تعالیٰ ہی سے محبت تھی اور جس کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہو اس کو بڑی بے فکری ہے کیونکہ اس کا محبوب ایسا ہے جو نہ کبھی بیمار ہو سکتا ہے نہ ہلاک ہو سکتا ہے رہی ناراضی کی تکلیف جو حق تعالیٰ اپنے بندہ سے کبھی روٹھتے ہی نہیں بلکہ خود بندہ خود روٹھتا ہے کہ نافرمانی کرنے لگتا ہے۔ سو یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ تم خود مت روٹھو اور اگر کبھی روٹھ جاؤ تو توبہ کر لو توبہ سے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور جو امور غیر اختیاری ہیں ان سے تو اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہی نہیں اور اختیاری امور میں بھی ان خطاؤں پر ناراض ہوتے ہیں جن میں خطا کا قصد کیا گیا ہو اور اگر اجتہادی غلطی ہو تو اس پر تو ثواب ملتا ہے۔

---

[1] (مشکوٰۃ المصابیح: ۶۰۱۱)

دنیا کی محبت میں کوئی حلاوت نہیں

غرض دنیا کی محبت میں کچھ حلاوت (مٹھاس) نہیں اس کی حقیقت میں غور کرو تو یہ خود قابل نفرت ہے دیکھئے صحت دنیا میں بڑی نعمت ہے مگر جس کی صحت اچھی ہو اور خدا اس کو بڑی عمر دے دے کہ سوسوا سو برس کا ہو جائے تو اب اس کی حالت دیکھو کہ بڑھاپے میں موت کی تمنا کرنے لگتا ہے' ہماری تائی کی بڑی عمر ہوئی تھی مگر وہ ہمیشہ موت کی تمنا کرتی تھیں۔ پس خدا کی حالت کو بوڑھوں سے اور غم زدہ لوگوں سے پوچھو یہ معنی ہیں "**لعلکم تتفکرون فی الدنیا والاخرۃ**" (تاکہ تم دنیا وآخرت میں فکر کرو) کہ اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ طالبان دنیا کو اپنے مطلوب کی بھی خبر نہیں اس کا ایک تو یہی مطلب ہے کہ دنیا دار کو دنیا کی حقیقت معلوم نہیں اس کے انجام سے وہ بے خبر ہے۔ دوسرے دنیا دار اس معنی میں بھی دنیا کو نہیں جانتے کہ وہ محض ساز وسامان کو دنیا سمجھتے ہیں حالانکہ دنیا کی روح راحت ہے اور وہ ان لوگوں کو حاصل نہیں کیونکہ یہ لوگ تکلفات میں مقید ہیں ان کی زندگی تصنع اور تکلف کی وجہ سے تکلیف دہ ہے ان کو راحت نصیب نہیں۔ چنانچہ عورتیں آپس میں ملتی ہیں تو ان کا ملنا ملانا محض نفاق اور بناوٹ سے ہوتا ہے ملنے سے جو مقصود ہے یعنی راحت وہ ان کو حاصل نہیں اسی طرح رسوم شادی میں بہت کچھ خرچ کرتے ہیں مگر دل اندر سے رنجیدہ ہوتا ہے کہ بہت رقم لگ گئی' قرض بہت ہو گیا کہاں سے اترے گا بس زندگی تو اہل اللہ کی ہے یا بچوں کی کہ ان میں تکلف نہیں ہوتا اور یاد رکھو راحت ہمیشہ بے تکلفی سے ہوتی ہے۔ اہل دنیا بات کرتے ہیں تو حضور کھجور کہتے ہیں یا جناب کہتے ہیں جو جنابت سے مشتق ہے اور غریبوں میں ایسی سادگی ہے کہ ایک گاؤں والا میرے پاس آیا میں نے کہا کھانا کھالے کہنے لگا کہ میں تو گھر کھا چکا وہ بھی تیرا ہی ہے مجھ اس کی سادگی سے بہت ہی مسرت ہوئی کہ لوگوں کے القاب وآداب سے بھی وہ مسرت نہ ہوتی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ دنیا داروں کے پاس بیٹھ کر ایسا معلوم ہوا ہے کہ جیسے پنجرہ میں مقید ہو جاتے ہیں۔ میں خود اپنی حالت بیان کرتا ہوں کہ میں دعوت میں ایک پر تکلف صاحب کے ساتھ شریک ہو گیا' وہ چھوٹے چھوٹے لقمے لیتے تھے اور بڑے تکلف سے کھاتے تھے ان کے ساتھ مجھے بھی آہستہ کھانا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا پیٹ نہ بھرا کیونکہ اس طرح کھانے سے سیری نہیں ہوتی۔ اسی طرح ایک داعی کھانا کھلاتے ہوئے میرے اوپر مسلط ہو گئے کہ ہر چیز میرے سامنے رکھتے جاتے تھے کہ یہ کھاؤ اور وہ

کھاؤاس سے بھی میرا کھانا منغص ہوگیا۔اب میں نے شرط کر لی ہے کہ جب دعوت کرو تو بتلا دو کہ میرے ساتھ کھانے میں کون کون شریک ہوگا' بعض دفعہ میں یہ شرط کر لیتا ہوں کہ تنہا کھاؤں گا۔ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے ہم کو ملانوں میں داخل کر دیا ہے اس لیے ان پابندیوں کی فکر نہیں ہے خدا تعالیٰ والد کی قبر کو ٹھنڈا کرے کہ وہ مجھے ملانوں میں داخل کر گئے ہیں۔اگر چہ پورا ملا تو نہ ہوا مگر سینگ کٹا کر بچھڑوں میں تو داخل ہو گئے۔

دور حاضر کی تہذیب تعذیب ہے

آج کل کی تہذیب کا یہ حال ہے جو سراسر تعذیب ہے کہ میرے پاس کانپور میں ایک داروغہ آئے جبکہ میں مسجد کے اندر حدیث کا درس دے رہا تھا وہ آدھ گھنٹہ تک لب فرش کھڑے رہے کیونکہ وہ کوٹ پتلون میں جکڑے ہوئے تھے' فرش پر بیٹھنے سے مجبور تھے۔آخر کار واپس ہو گئے۔ پھر ایک صاحب سے شکایت کی میں آدھ گھنٹہ تک کھڑا رہا مجھ سے ایک بات نہ کی نہ میرے پاس آئے' ایک تو بوٹ جوتوں کی وجہ سے کہ ان کا کھولنا باندھنا وقت طلب ہے مجبور تھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ تم بوٹ جوتوں میں قید تھے' وہ حدیث وقرآن میں قید تھے اب خود انصاف کرلو کہ کس کا عذر قوی ہے۔افسوس یہ لوگ اس قدر تو مقید ہیں اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم آزاد ہیں' کیا آزاد ایسے ہوتے ہیں جو سر سے پیر تک فیشن میں جکڑے ہوئے ہیں بس ان کی آزادی کی حقیقت یہ ہے کہ دین سے اور خدا سے آزاد ہیں' آزاد حقیقت میں اہل اللہ ہیں کہ جہاں چاہیں بیٹھ جائیں خواہ تخت ہو یا کرسی یا فرش ہو یا زمین اور ہر لباس میں رہ سکتے ہیں خواہ قیمتی ہو یا گھٹیا صاف ہو یا میلا پھٹا ہوا ہو یا سالم کسی سے ان کو عار نہیں۔

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں ۔۔۔۔ مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اگر چہ یہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے مگر ہم سوائے ننگ ونام کے کسی چیز کے خواہاں نہیں)

ہاں البتہ ان کو ایک قید ضرور ہے وہ یہ کہ محبوب کی آغوش میں بیٹھے ہوئے ہیں اس سے الگ نہیں ہو سکتے یعنی اس کی مرضی کے تابع ہیں مخالفت نہیں کر سکتے مگر یہ قید ایسی لذیذ ہے:

اسیرت نخواہد رہائی زبند ۔۔۔۔ شکارت نجوید خلاص از کمند

(تیرا قیدی بند سے رہائی نہیں چاہے گا اور تیرا شکاری تیرے پھندے سے خلاصی کا طلبگار نہیں ہوگا)

اس قید میں ان کو راحت ہے اس سے نکلنا ان کے واسطے موت ہے۔عارف رومی فرماتے ہیں:

زفراق تلخ می گوئی سخن هرچہ خواہی کن ولیکن ایں مکن

(فراق کی تلخ باتیں کرتے ہو اور جو چاہے سو کرو مگر یہ نہ کرو)

پس آزاد یہ لوگ ہیں ورنہ دنیا دار تو ایسے مقید ہیں کہ خدا کی پناہ بھلا اور تو اور میرٹھ کے ضلع میں بعض دیہات کے چمار عیسائی ہوگئے ہیں تو ان کے فیشن کی یہ حالت ہے کہ دن بھر جوتے بناتے اور سیتے ہیں اور شام کو پھٹا پرانا کوٹ پتلون اور بوٹ پہن کر (جو نیلام میں سستا خرید لیا تھا ۱۲) تفریح کے واسطے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سڑکوں پر نکلتے ہیں اور کھانا کھانے کی یہ صورت ہے کہ ایک تختہ کے اوپر کھانا رکھ لیا جس کے نیچے اینٹیں رکھ لی اور گھڑے الٹے کر کے ان پر بیٹھ گئے اور ببول کے کانٹوں سے روٹی کھاتے ہیں، دنیا داروں کی ریس میں چماروں کی بھی آزادی سلب ہوگئی کہ اب وہ بھی تکلف جس طرح گاؤں والے رہا کرتے ہیں نہیں رہ سکتے مجھے انہی لوگوں کا ایک قصہ یاد آیا کہ ایک عیسائی چمار کوٹ پتلون پہنے ہوئے رات کو جارہا تھا کہ راستہ میں بارش زور سے آ گئی، سامنے نہر کی چوکی تھی جس میں ایک مسلمان چوکیدار جس کا نام ظہور علی تھا سو رہا تھا کہ یہ صاحب بہادر چوکی پر پہنچے اور جا کر آواز دی اور جہورلی او جہورلی کواڑ کھول صاحب باہر کھڈے بھیجیں (یعنی کواڑ کھول دے صاحب باہر کھڑے بھیگ رہے ہیں) چوکیدار گھبرا کر اٹھا کہ شاید نہر کا کوئی افسر آ گیا ہے اس نے کواڑ کھولے اور اس سے پوچھا کہ صاحب کہاں ہیں، کہا ہور ہم ہیں نہیں (اور ہم ہیں نہیں) ظہور علی نے جوتا نکال کر دس پانچ رسید کیے کہ بدمعاش صاحب بہادر بنا پھرتا ہے جا اپنا راستہ لے۔ غرض دنیا دار سراسر قید اور تکلیف میں ہیں ان کو خاک مواحت نہیں واقع میں عیش و راحت اہل اللہ کو ہے جس کا ایک گر ہے اور یہی گر ان کی آزادی کا راز ہے وہ یہ کہ غم کی حقیقت یہ ہے کہ امید کے خلاف کوئی بات ہو عورتیں اس کو ضرور سنیں کیونکہ ان کو امیدیں بہت ہوتی ہیں کہ بھاوج کے واسطے مجھے یوں کرنا چاہیے تو وہ بھی میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرے گی نند کے واسطے یوں کرنا چاہیے ورنہ وہ یوں کہے گی۔

مخلوق سے کسی قسم کی توقع مت رکھو

غرض رشتہ داروں اور دوستوں اور نوکروں وغیرہ سے جو رنج پہنچتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو ان سے امیدیں ہوتی ہیں۔ اہل اللہ نے اس جڑ ہی کو اڑا دیا ہے یعنی ان کو کسی سے کچھ امید نہیں ہے مخلوق سے سب امیدوں کو قطع کر دیا ہے۔ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار اسی مضمون کو بیان فرمایا کہ بھائی کسی سے توقع مت رکھو پھر خدام سے فرمایا کہ بتلاؤ تم مجھے کیسا سمجھتے

ہو۔انہوں نے عرض کیا کہ حضرت ہمارے مربی ہیں محسن ہیں' حضرت کا ہم پر وہ احسان ہے جس کا شکر یہ ادا نہیں ہوسکتا۔ فرمایا کہ میں تم کو دل سے کہتا ہوں کہ تم مجھ سے بھی کچھ توقع نہ رکھو' بس خدا سے امید رکھو اور کسی سے مت رکھو تو ایسا شخص جس کی رگ رگ میں توحید بسی ہوئی ہو اس کو کسی سے کیا رنج ہوسکتا ہے۔ اسی کو سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

گر گزندت رسد زخلق مرنج   کہ نہ راحت رسد زخلق نہ رنج

از خداداں خلاف دشمن و دوست   کہ دل ہر دو در تصرف اوست

(اگر تمہیں نقصان پہنچے تو رنج نہ کرو کیونکہ مخلوق نہ راحت پہنچاتی ہے نہ رنج' دشمن اور دوست کو اللہ کی طرف سے سمجھو کیونکہ دونوں کے دل اس کے قبضہ میں ہیں)

مگر اس کا یہ اثر نہ لینا کہ تم خدا ہی سے روٹھ جاؤ کہ سب تکالیف وہی پہنچاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتے ہیں درحقیقت وہ تمہاری ہی مصلحت ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے بچہ کی آنکھیں دکھتی ہیں تو ماں اس کی آنکھوں میں جست وغیرہ بھرتی ہے' بچہ اس سے بہت روتا ہے اور اس وقت ماں پر غصہ کرتا ہے مگر سمجھدار ہو کر ماں کو دعا دے گا کہ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو آج میں بالکل اندھا ہوتا۔ اسی طرح صبح کو ماں بچہ کا منہ دھوتی ہے آنکھوں سے چڑی اور ناک سے چوہے نوچتی ہے بچہ اس پر بھی روتا ہے مگر کون نہیں جانتا کہ اس میں سراسر بچہ کی ہی مصلحت ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ میرے سر میں بڑے بڑے بال تھے ان میں میل بہت جم گیا تھا اور کئی ہفتہ سے سر نہ دھویا تھا' تائی صاحبہ میرا سر دھونا چاہتیں مگر میں بھاگ جاتا تھا' جب بہت دن ہوگئے تو تائی صاحبہ نے یہ تحریک کی کہ میرے آنے سے پہلے پیالے میں کھلی بھگو دی اور جب میں گھر میں آیا تو دفعتہً میرے سر میں کھلی لپیٹ دی اس کے دھونے کے لیے مجبوراً مجھے سر دھونا پڑا تو اس وقت ان کا یہ فعل مجھے ناگوار ہوا مگر آج ان کی محبت کی قدر کررہا ہوں۔

مسلمانوں کیلئے نار جہنم تطہیر کیلئے ہے

اسی طرح حق تعالیٰ جو تم کو رنج و تکلیف دیتے ہیں حقیقت میں وہ تمہاری بھلائی کرتے ہیں یہاں بھی اور آخرت میں بھی کیونکہ اگر یہاں بلائیں نہ آئیں تو ہم کو خدا کی طرف توجہ نہ ہو۔ قاعدہ یہی ہے کہ انسان کو مصیبت میں خدا یاد آتا ہے اگر مصیبت نہ ہو تو انسان فرعون بے سامان ہو جائے اور اس حالت میں اگر موت آ گئی تو بجائے دنیا کے تم آخرت میں نار جہنم کے ذریعے سے پاک

کیے جاؤ گے۔ میں آپ کو بشارت سناتا ہوں کہ مسلمانوں کے حق میں عذاب تطہیر کے لیے ہے تعذیب کے لیے نہیں ہے اور اس کو تم بھی جانتے ہو کہ گھر کا چراغ چکٹ جائے تو اس کو آگ میں ڈال کر صاف کیا جاتا ہے تو تم خدا کے گھر کے چراغ ہو مگر چکٹے ہوئے ہو اس لیے جہنم کی آگ سے تمہارا میل صاف کیا جائے گا اور اگر دنیا ہی میں میل صاف ہو گیا تو پھر آخرت میں صفائی کی ضرورت نہ رہے گی۔ یہ تمہارے حق میں بھلائی ہے یا نہیں یہ تو آخرت کی بھلائی اور دنیا کی بھلائی یہ ہے کہ مصائب و تکالیف سے انسان کے اخلاق درست ہو جاتے ہیں اور اخلاق کی درستی سے بہت راحت ملتی ہے کیونکہ بداخلاق سے سب کو وحشت ہوتی ہے لوگ اس کو ذلیل سمجھتے ہیں نیز اس کے دل پر دنیا کی حقیقت بھی منکشف ہو جاتی ہے کہ دنیا دل لگانے کی چیز نہیں ہے اور یہ بڑا علم ہے اگر یہ علم حاصل نہ ہو تو آدمی ہمیشہ جہل میں مبتلا رہے اور جہل بڑا عیب ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تم پر امتحانات وارد ہوتے ہیں ان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص مالیخولیا کی وجہ سے یہ سمجھتا تھا کہ میرا بدن شیشے کا ہے اس لیے وہ ہر شخص سے دور بھاگتا تھا کہ میرے بدن کو ہاتھ نہ لگانا ٹوٹ جائے گا۔ لوگ اس کو حکیم کے پاس لائے حکیم نے کہا کہ تیرا بدن شیشے کا ہے کہا ہاں تو اس نے بہت سے شیشے منگائے اور مریض کو کمبل اوڑھا کر شیشوں کو توڑنا شروع کیا اور کہا ہم نے تمہارے بدن کے شیشے توڑ دیئے وہ بہت رویا' چلایا' حکیم نے کہا گھبراؤ نہیں ان شیشوں کے نیچے سے مضبوط کھال اور ہڈیاں نکلیں گی جو کسی کے ہاتھ لگانے سے شکستہ نہ ہوں گی۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد کمبل اتار لیا اور کہا دیکھو اوپر کے شیشے ہم نے توڑ دیئے اور اب تمہارا مضبوط بدن اندر سے نکل آیا' مریض کو یقین ہو گیا اور وہ سمجھ گیا کہ میں مضبوط' تندرست ہوں اور سب مالیخولیا جاتا رہا۔

اہل اللہ کی راحت کا راز

اسی طرح اللہ تعالیٰ ان مصائب کے ذریعے سے ہمارے مالیخولیا کا علاج کرتے ہیں مگر ہم کو اس کی حکمت کی خبر نہیں اس واسطے روتے ہیں اور میں آپ سے کیا کہوں کہ اہل اللہ کو مصائب میں کیا نظر آتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ان کو ہر واقعہ کی حکمت کھلی آنکھوں نظر آتی ہے اس لیے وہ کسی کلفت سے پریشان نہیں ہوتے۔ پس ان کی راحت کا راز یہ ہے کہ مخلوق سے ان کی امیدیں منقطع ہو چکی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہر فعل کو حکمت و مصلحت پر مبنی سمجھتے ہیں نیز ان کو اللہ تعالیٰ سے محبت بھی ہے اس لیے اگر حکمت و مصلحت بھی معلوم نہ ہو تو محبت کی وجہ سے وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں اور یوں کہتے ہیں:

دل فدائے یار دل رنجان من　　　ناخوش تو خوش بود برجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو مگر میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے، میں اپنے محبوب پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے دل کو قربان کرتا ہوں)

اور کہتے ہیں:

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو　　　دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(اگر تو مجھے زندہ کرے تو یہ تیری بخشش ہے اور اگر مار ڈالے تو میں تجھ پر قربان، میرا دل تیری محبت میں مبتلا ہے جو کچھ کرے میں تجھ سے راضی ہوں)

اب بتلاؤ راحت میں کون ہے صاحبو! سچ یہ ہے کہ دنیا والوں کو کچھ راحت نہیں وہ کھانا کھاتے ہیں اور کھانا ان کو کھاتا ہے کیونکہ جس شخص کے لیے پھانسی کا حکم دے دیا گیا ہو اس کو ظاہری سامان عیش سے راحت کب مل سکتی ہے؟ اسی طرح جس شخص پر جرائم تعزیرات الٰہیہ قائم ہیں اور وہ جانتا ہے کہ میں خدا کا مجرم ہوں اس کو دنیا میں راحت کیونکر مل سکتی ہے اور اہل اللہ کی شان یہ ہے کہ ان کے پاس کچھ نہیں ہے مگر خوش ہیں کیونکہ ایک چیز ان کے پاس ایسی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ان کو کسی چیز کی پروا نہیں ہے وہ کیا ہے؟ وہ آغوش محبوب ہے رضائے محبوب ہے لذت طاعت ہے لذت مناجات ہے لذت قرب ہے جس کو عارف رومی فرماتے ہیں:

ہر کجا دلبر بود خرم نشیں　　　فوق گردون ست نے قعر زمیں

ہر کجا یوسف رخ باشد چو ماہ　　　جنت آن گرچہ باشد قعر چاہ

(میرا محبوب جو حضرت یوسف علیہ السلام کے جیسے چہرے والے چاند کی طرح ہے جس جگہ موجود ہو پھر چاہے وہ جگہ اندھا کنواں ہو میرے لیے تو وہی جنت کی طرح ہے)

اور اس پر تعجب نہ کیجئے کہ ان لذتوں کی وجہ سے تکالیف کا برداشت کرنا کیونکر آسان ہو گیا جو شخص کسی پر عاشق ہوا ہو وہ اس کو سمجھ سکتا ہے۔ ایک شخص کی حکایت ہے کہ وہ ایک لڑکے پر عاشق ہو گیا تھا اور وہ لڑکا طبیب تھا ایک دفعہ وہ شخص بیمار ہوا تو وہی لڑکا معالج بنا اب اس مریض کی یہ حالت تھی کہ اپنے لیے طول مرض کی دعا مانگتا تھا کہ خدا کرے میں کبھی اچھا نہ ہوں تاکہ یہ لڑکا ہمیشہ معالجہ کو آتا رہے تو دیکھئے اس مریض کے لیے مرض کی کلفت محبت کی وجہ سے آسان ہو گئی اب اگر اہل اللہ کا خدا کی محبت میں یہ حال ہو جائے کہ تمام مصائب ان کو آسان ہو جائیں کہ قید خانہ سے تکلیف ہو نہ فاقہ سے کلفت ہو تو کیا تعجب ہے سب سے زیادہ ناگوار چیز موت ہے مگر وہ بھی ان کے لیے آسان ہے کیونکہ موت کے وقت ان کو بشارت ملتی ہے۔

يَاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ○

''اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار (کے جوار رحمت) کی طرف چل اس طرح تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش پھر تو میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔''

دوسری آیت میں ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَنْ لَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○

''جن لوگوں نے (دل سے) اقرار کرلیا کہ ہمارے رب اللہ ہے پھر اس پر مستقیم رہے ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم نہ اندیشہ کرو اور نہ خوف کرو اور تم جنت کے ملنے پر خوش رہو جس کا تم سے (پیغمبروں کی معرفت) وعدہ کیا جاتا تھا۔''

نیز حدیث میں آتا ہے کہ ملائکہ یوں کہتے ہیں:

اَيَّتُهَا الرُّوْحُ الطَّيِّبَةُ اُخْرُجِيْ اِلٰى رَوْحٍ وَرَيْحَانٍ وَرَبٍّ غَيْرِ غَضْبَانٍ ○

اے پاکیزہ روح چل راحت و آرام کی طرف چل اپنے پروردگار کے پاس جو تجھ سے ناراض نہیں ہے اس کے بعد قبر کا مرحلہ ہے وہاں بھی ان کے واسطے بشارت ہے۔ فرشتے کہتے ہیں: ''نم کنومة العروس'' کہ دلہا کی طرح بےفکر سوتے رہو۔ اس کے بعد محشر کا مرحلہ وہاں ان کی یہ شان ہے:

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○

کہ ان کو اس ہولناک دن میں بھی کوئی خطرہ نہ ہوگا وہاں بھی فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور بشارت سنائیں گے۔ مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب نے اسی کا ترجمہ فرمایا ہے:

عاشقاں را روز محشر با قیامت کار نیست عاشقاں راجز تماشائے جمال یار نیست

(عاشقوں کو محشر کے دن سے کام نہیں، عاشقوں کو سوائے دیدار حق تعالیٰ شانہ کے کوئی تماشا نہیں)

پل صراط پر مولانا رومی نے کسی روایت سے ان کی یہ حالت لکھی ہے کہ پل صراط سے گزر کر وہ ملائکہ سے پوچھیں گے کہ ہم نے تو یہ سنا تھا کہ پل صراط جہنم کے اوپر ہے مگر ہم کو راستہ جہنم نظر نہیں آیا۔ فرشتے کہیں گے کہ تم کو راستہ میں باغات نظر آئے تھے؟ کہیں گے، ہاں، فرشتے کہیں گے کہ وہ جہنم ہی تھا مگر تمہاری قوت ایمان کی برکت سے وہ تم کو باغ کی صورت میں نظر آیا۔ پھر بتلاؤ ان کو

کیا غم ہاں جن حضرات کی کچھ اتباع بھی ہیں ان کو ایک غم ہوگا اپنی تابعین کا انبیاء علیہم السلام کو اپنا کچھ غم نہ ہوگا ہاں اُمت کا غم ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''لَاتَسَوِّدُوْا وَجْهِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ'' اس کا ترجمہ کرنے کی بھی ہمت نہیں زبان کانپتی ہے مگر ضرورت کی وجہ سے کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ دیکھو قیامت میں میرا منہ کالا نہ کرنا یعنی مجھے شرمندہ نہ کرنا کہ تمہارے اعمال بد کی وجہ سے مجھے انبیاء کے مجمع میں شرمندگی ہو۔

فَدَیْنَاکَ بِاٰبَاءِ نَا وَاُمَّهَاتِنَا وَاَنْفُسِنَا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَوَجْهُکَ وَاللّٰهِ اَضْوَءُ مِنَ الشَّمْسِ اَنْوَرُ مِنَ الْقَمَرِ وَلَیْسَ السَّوَادُ اِلَّا بِوُجُوْهِنَا وَوَجْهُکَ بِمَرَاحِلِ عَنْهُ وَبِمَعْزَلٍ مِّنْهُ اَللّٰهُمَّ بَیِّضْ وُجُوْهَنَا بِبَرْکَةِ هٰذَا النَّبِیِّ الْکَرِیْمِ الْوَسِیْمِ یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ دَائِمًا اَبَدًا عَدَدَ مَایُحِبُّ وَکَمَا یَرْضٰیO

''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے باپ اور مائیں اور ہماری جانیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا ہوں خدا کی قسم آپ ﷺ کا چہرہ سورج سے زیادہ روشن اور چاند سے زیادہ منور ہے اور سیاہی تو ہمارے ہی چہروں پر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ تو اس سے پاک ہے اے اللہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ہمارے چہروں کو اس دن منور کیجئے جس دن چہرے روشن ہوں اور درود و رحمت ہو اللہ کی آپ پر اور آپ کے آل واصحاب پر ہمیشہ ہمیشہ۔''

نور ایمان کی ایک خاصیت

مقاصد حسنہ میں حدیث ہے کہ مومن جب پل صراط پر سے گزرے گا تو دوزخ کہے گی ''جُزْیَامُؤْمِنُ فَاِنَّ نُوْرَکَ قَدْ اَطْفَانَارِیْ'' (اے مسلمان جلدی سے گزر جا کہ تیرے نور نے تو میری آگ کو بھی بجھا دیا) تو جب نور ایمان میں یہ خاصیت ہے کہ دوزخ کی آگ کو بھی بجھا دیتا ہے تو دنیا کے غموم وہموم واحزان کی تو حقیقت ہی کیا ہے مگر ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے ایمان میں نور پیدا کریں اسی کی کمی کی وجہ سے ہماری دنیا وآخرت برباد ہو رہی ہے اگر یہ نور حاصل ہو جائے تو واللہ دنیا و آخرت کی راحتیں ہمارے ہی واسطے ہیں پھر ہمارے پاس غم و رنج کا نام ونشان بھی نہ رہے۔ ہاں ایک غم رہے گا خدا کی بقاء ورضا کا۔ سو یہ غم لذیذ ہے اگر یہ حاصل ہو جائے تو آپ ہفت اقلیم کی سلطنت پر لات ماردیں گے باقی دنیا کا کوئی غم پاس نہ آئے گا۔ چنانچہ ایک بزرگ کے پاس ایک بادشاہ نے بڑا قیمتی موتی بھیجا بزرگ نے اس کو دیکھ کر کہا الحمد للہ اور خادم سے فرمایا کہ اس کو احتیاط سے رکھ دو۔ کچھ

عرصہ کے بعد خادم نے عرض کیا کہ موتی چوری ہوگیا' بزرگ نے فرمایا الحمدللہ' خادم نے دریافت کیا کہ دونوں حالتوں میں الحمدللہ کس لیے فرمایا اگر آنے کی خوشی تھی تو جانے کا رنج ہونا چاہیے تو اس وقت الحمدللہ کا کیا موقع اور اگر جانے کی خوشی ہوئی تو آنے پر رنج ہونا چاہئے تھا تو اس وقت الحمدللہ کیوں فرمایا' بزرگ نے فرمایا کہ میں نے الحمدللہ نہ اس کے آنے پر کہا نہ جانے پر بلکہ دل کی حالت پر الحمدللہ کہا ہے۔ جب یہ موتی آیا تھا تو میں نے اپنے دل کو دیکھا کہ کچھ خوشی ہوئی یا نہیں معلوم ہوا کہ خوشی نہیں' اس پر الحمدللہ کہا' جب وہ چوری ہوگیا تو میں نے پھر اپنے دل کو دیکھا کہ کچھ رنج ہوا یا نہیں' معلوم ہوا کچھ رنج نہیں ہوا تو اس پر میں نے الحمدللہ کہا کہ نہ آنے کی خوشی ہوئی نہ جانے کا رنج ہوا تو بتلایئے جس شخص کا یہ حال ہو اس کے پاس رنج و غم کیوں آئے گا۔ اسی طرح حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کہیں سے ایک چینی آئینہ بڑا قیمتی ہدیہ میں آیا' آپ نے خادم کے حوالہ فرمادیا کہ کنگھا کرنے کے وقت ہمارے سامنے رکھ دیا کرو ایک دفعہ اتفاق سے وہ آئینہ خادم کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا اور وہ ڈرا کہ دیکھئے آج شیخ کس قدر ناراض ہوں گے۔ چنانچہ ڈرتے ڈرتے اس نے عرض کیا:

از قضا آئینہ چینی شکست

(قضا سے چین کا آئینہ ٹوٹ گیا)

حضرت غوث اعظم نے برجستہ فرمایا:

خوب شد اسباب خود بینی شکست

(اچھا ہوا اسباب خود بینی ٹوٹ گئے)

ذاتی خدمت میں کوتاہی کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ناراض نہ ہونے کا راز

نیز حدیث میں ہے حضرت انس صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی مگر آپ نے کسی بات پر یہ نہیں فرمایا کہ یہ کیوں ہوا اور یوں کیوں نہیں ہوا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے ہیں تو ان کی عمر دس سال کی تھی بالکل بچے تھے وہ کہتے ہیں کہ بعض دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کسی کام کا حکم دیتے ہیں کہ یہ کام کرلو تو یہ زبان سے کہہ دیتے کہ میں تو نہ کروں گا مگر دل میں ارادہ ہوتا تھا کہ ضرور کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر بھی برا نہ مانتے تھے بعض دفعہ کسی کام کو جاتے اور راستہ میں کھیلنے لگتے اور اتفاقاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے کان پکڑ کر فرماتے کہ تم تو کہتے تھے میں جاؤں گا یہ ہنس کر عرض کرتے یا رسول اللہ ابھی جاتا ہوں غرض کسی

ں اللہ علیہ وسلم غصہ نہ کرتے تھے۔ اس کا راز وہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مدا پر تھی، مخلوق پر نہ تھی اس لیے آپ کو کسی کے فعل سے رنج نہ ہوتا تھا مگر یہ برتاؤ ذاتی ت کے متعلق تھا جن کا تعلق خاص آپ کی ذات سے تھا امور شرعیہ کے بارے میں یہ برتاؤ نہ تھا کیونکہ احکام شرعیہ کی مخالفت پر تو آپ کو اتنا غصہ آتا تھا کہ کوئی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ یہی شان اہل اللہ کی ہے غرض اللہ تعالیٰ آپ صاحبوں کے واسطے ایسی زندگی چاہتے ہیں کہ جس میں راحت ہی راحت ہو رنج کا نام نہ ہو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ نور ایمان کو کامل کیا جائے اور نور ایمان کے کامل کرنے کا طریقہ وہ ہے جو اس آیت میں مذکور ہے یعنی ذکر و فکر

محاسبہ و دستور العمل

جس دوسرے مقام پر اس عنوان سے ارشاد فرمایا ہے "وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ" کہ ہر شخص یہ دیکھتا رہے کہ کل کے واسطے کیا سامان کیا ہے یعنی اپنے اعمال کا محاسبہ کرو کہ آج دن بھر میں کتنے کام کیے ہیں کتنے نیک کام ہوئے کتنے گناہ ہوئے جو نیک کام ہوئے ہوں ان پر خدا کا شکر کرو اور جو گناہ ہوئے ہوں ان سے توبہ و استغفار کرو اسی کام کے لیے ایک وقت تو مقرر کرو اور ہر وقت کے لیے دستور العمل یہ ہے کہ جو بات کہو سوچ کر کہو جو کام کرو سوچ کر کرو بے سوچے کام کرنا اور باتیں بنانا دنیا و آخرت دونوں کو مضر ہے پس ہر کام سے پہلے اس کے انجام کو سوچ لو جس سے دوستی کرو اس کی حالت دیکھ لو کہ دوستی کے قابل ہے یا نہیں۔ حدیث میں ہے: "اَلْمَرْءُ عَلٰى دِيْنِ خَلِيْلِهٖ فَلْيَنْظُرْ اَحَدُكُمْ مَنْ يُّخَالِلُ"[1] انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے یعنی دوست کی دینی حالت کا اثر اس کے دین پر ضرور ہوتا ہے۔ پس ہر شخص دیکھ لے کہ کس سے دوستی کر رہا ہے یعنی اس کی دینی حالت کیسی ہے۔ پس دوستی دیدار لوگوں سے کرو بد دینوں کو دوست نہ بناؤ اسی طرح جس سے دشمنی کرو اس کو بھی دیکھ لو کہ دشمنی کے قابل ہے یا نہیں، کفار و فساق سے حدود کے اندر عداوت رکھو، مسلمانوں سے اور صلحاء سے دشمنی نہ کرو کہ اس کا وبال سخت ہے اسی طرح ہر کام میں غور کرو جس کی تفصیل تو بہت طویل ہے مگر میں آپ کو ایک گر بتلاتا ہوں کہ ہر کام میں یہ سوچ لو کہ اس کام سے ہم کو گناہ تو نہ ہوگا اور ایک یہ سوچ لو کہ اس سے ہم پر کوئی ایسی بلا تو نازل نہ ہوگی جس کی برداشت نہ ہو سکے۔ اس کے بعد آپ کی زندگی بہت پر لطف ہوگی ایسی ہی زندگی اللہ تعالیٰ آپ کے واسطے چاہتے ہیں۔ اب میں ختم کرنا چاہتا ہوں صرف دو باتیں رہ گئیں۔ ایک تو آیت کا ترجمہ جس کی تلاوت کی گئی ہے۔

---

[1] (سنن الترمذی: ۲۳۷۸)

خلاصہ دستور العمل

دوسرے دستور العمل کا خلاصہ بتلانا۔ سووہ دستور العمل تو یہ ہے کہ ہر کام اور ہر بات سوچ کر کرؤ دوسرے اپنے اعمال کا حساب کتاب کیا کرو اپنی نافرمانیوں کو سوچو اور ان سے توبہ کرو اور عذاب کو یاد کرو اس سے حیاء اور خوف پیدا ہوگا پھر جو اعمال حسنہ ہوئے ہیں ان کو سوچو اور خدا کا شکر بجالاؤ اور جنت کی نعمتوں کو یاد کرو اس سے محبت و شوق پیدا ہوگا اور جس شخص میں حیاء وخوف اور محبت وشوق پیدا ہو جائے اس سے کہیں نافرمانی ہوسکتی ہے ہرگز نہیں بلکہ اس سے زیادہ فرمانبردار کوئی نہ ہوگا۔ یہی مقصود تھا اور مجھے یہی بتلانا تھا کہ فکر ایسی محمود چیز ہے کہ دین کی تکمیل اس کے بغیر نہیں ہوسکتی اور دین کی اصلاح و تکمیل کا سہل و آسان طریقہ اس سے بہتر نہیں کہ فکر سے کام لیا جائے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے اور فکر کے ساتھ ذکر کو بھی بیان فرمایا ہے۔
اب میں آیت کا ترجمہ کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں (توحید کے اور دنیا کی حالت و حقیقت جانچنے کے) اہل عقل کے لیے جن کی حالت یہ ہے (جو آگے آتی ہے اور ایسی حالت سے ان کا عاقل ہونا معلوم ہوگا) کہ وہ لوگ (ہر حال میں دل سے بھی اور زبان سے بھی) اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں، کھڑے بھی بیٹھے بھی لیٹے بھی اور آسمان وزمین کے پیدا ہونے میں (اپنی عقل سے) غور کرتے ہیں (کہ ان کا وجود خود نہیں ہوگیا بلکہ کسی صانع حکیم نے ان کو بنایا ہے کیونکہ جس نظام کے ساتھ زمین و آسمان کی رفتار ہے وہ بدون کسی چلانے والے کے نہیں ہوسکتی پھر اس کے بنانے والے نے اس نظام میں ہم کو ایک خاص عبرت آموز سبق دیا ہے کہ مخلوق میں کوئی اونچا ہے کوئی پست ہے کسی میں نور ہے کسی میں ظلمت ہے کسی میں نور زیادہ ہے کسی میں کم ہے اس لیے تم کو اپنی حالت پر قناعت کرنا چاہیے اور دوسروں کی حالت پر حسد نہ کرنا چاہیے کیونکہ اس میں حکمتیں ہیں جیسا زمین و آسمان میں حکمتیں ہیں پھر دنیا میں یکساں حالت نہیں رہا کرتی بلکہ کبھی دن ہے کبھی رات ہے کبھی روشنی ہے کبھی اندھیرا ہے اور دونوں کی ضرورت ہے دونوں میں حکمت ہے اس لیے تم پر دو قسم کی حالتیں آئیں گی بعض گوارا حالتیں ہوں گی بعض ناگوار پس تم کو ان سے پریشان نہ ہونا چاہیے بلکہ یہ سمجھو کہ جس طرح رات دن میں حکمتیں ہیں اسی طرح ان حالات میں بھی حکمتیں ہیں ان ہی باتوں کو سوچ کر عقلاء کہتے ہیں کہ (اے ہمارے پروردگار آپ نے اس (مخلوق) کو بیکار نہیں پیدا کیا (بلکہ اس میں حکمتیں رکھی ہیں) ہم آپ کو (لایعنی پیدا کرنے سے) پاک اور منزہ

سمجھتے ہیں (اسی لیے ہم نے ان کی حکمتوں میں غور کیا اور توحید کے قائل ہوئے کہ جو کچھ ہوتا ہے آپ کے حکم سے ہوتا ہے) سو ہم کو (ایمان کی برکت سے) دوزخ کے عذاب سے بچا لیجئے۔

مسلمانوں کا اصلی کام

اس ترجمہ سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے عقلاء کی ایک تو یہ حالت بیان فرمائی ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اس کے لیے میں اول ایک مقدمہ بیان کردوں پھر اس کی حقیقت سمجھ میں آجائے گی۔ وہ یہ کہ جس کام کو انسان اپنا اصلی کام سمجھتا ہے زیادہ وقت اسی میں صرف کیا کرتا ہے اور دوسرے کاموں کو اس کے تابع سمجھتا ہے چنانچہ جو شخص اپنے گھر کا حساب کررہا ہو اس سے اس حالت میں کوئی ملنے آئے تو گو وہ اس سے ملے گا مگر دل اپنے حساب میں لگا رہتا ہے۔ اسی طرح عورتیں اپنی حالت میں غور کرلیں کہ جب وہ سینے پرونے لگتی ہیں اس وقت کوئی ان سے بات کرے تو بات کا جواب دے دیں گی مگر دل سینے میں رہے گا کیونکہ اس کو اپنا اصلی کام سمجھ رکھا ہے۔ بس اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ ہے کہ تم اللہ کی یاد کو اپنا اصلی کام بنالو اور سب کاموں کو تابع بناؤ، اصلی کام نہ بناؤ۔ حدیث میں "لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ"[1] کہ تمہاری زبان ہر وقت اللہ کی یاد سے تر رہے اور قرآن میں ہے: "يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ" کہ اللہ کی یاد کھڑے بیٹھے لیٹے ہر وقت کرنا چاہیے مگر دل سے توجہ ہر وقت مشکل تھی اس لیے قربان جائیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ نے اس کا آسان طریقہ بھی بتلادیا کہ ہر وقت زبان کو اللہ کی یاد سے تر رکھو اگر زبان سے اللہ اللہ کرنا ہر وقت یاد نہ رہے تو تسبیح ہاتھ میں رکھو اور ریاء کا خوف نہ کرو۔

ریاء کی حقیقت

کیونکہ ریاء وہ ہے جو قصد و ارادہ سے ہو وسوسہ ریاء ریاء نہیں ہے بہت لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ وسوسہ ریاء کو ریاء سمجھ کر پریشان ہوتے ہیں۔ پس خوب سمجھ لو کہ ریاء یہ ہے کہ آدمی دل سے یہ ارادہ کرے کہ میں یہ عمل مخلوق کے دکھلانے کو کررہا ہوں یا اس واسطے کررہا ہوں کہ مجھے بزرگ سمجھیں اور اگر دل سے یہ ارادہ نہ ہو محض وسوسہ آئے جس کی علامت یہ ہے کہ اس خیال سے جی برا ہو تو یہ ریاء نہیں۔ سو ان شبہات میں مت پڑو اور بے فکر ہو کر تسبیح ہاتھ میں رکھو اور کام کرو اور تسبیح کی اصل حدیث ہی سے ثابت ہے اس لیے اس پر بدعت ہونے کا شبہ نہ کرو پھر ذکر میں اختیار

---

[1] (سنن الترمذی: ۳۳۷۵)

ہے خواہ دُرود پڑھو یا سبحان اللہ الحمدللہ یا اللہ اللہ کرو اور اچھا یہ ہے کہ یا اللہ یا اللہ کرو کیونکہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے اور اللہ اللہ کہنے میں بعض علماء نے کلام کیا ہے گو وہ کلام قابل اعتبار نہیں۔

حدیث سے اللہ اللہ کرنے کا ثبوت

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے متعلق کسی نے سوال کیا تھا کہ اللہ اللہ کرنے کا حدیث سے بھی ثبوت ہے یا نہیں' فرمایا! ہاں ثبوت حدیث میں ہے: "لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی لَایُقَالُ فِی الْاَرْضِ اَللّٰهُ اَللّٰهُ"

(قیامت قائم نہ ہوگی کہ زمین میں اللہ اللہ کہنے والا نہ رہے گا)

سوچ اور فکر کا نتیجہ

دوسرا کام اللہ تعالیٰ نے یہ بتلایا ہے کہ جو لوگ عقل والے ہیں وہ آسمان وزمین اور لیل ونہار کی حکمتوں میں غور کرتے ہیں۔ یعنی سوچ اور فکر سے کام لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو فاعل ومتصرف نہیں سمجھتے بلکہ حق تعالیٰ ہی کو خالق و مالک ومتصرف سمجھتے ہیں اور ان کے ہر کام کو حکمت ومصلحت پر مبنی سمجھتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں خدا کی عظمت وجلالت پیدا ہوتی ہے اور خدا کے سوا سب سے نظر قطع ہو جاتی ہے پھر کسی سے امید وتوقع باقی نہیں رہتی بلکہ صرف خدا کو راضی کرنے کا خیال رہ جاتا ہے اور اس کے لیے وہ موت کو سوچتے ہیں قبر کی حالت کو سوچتے ہیں' جنت ودوزخ کو سوچتے ہیں کہ ایک دن خدا کے پاس جانا ہے' موت کا وقت ضرور آئے گا پھر نہ معلوم کیا انجام ہو اس لیے وہ دوزخ سے ڈر کر اس سے پناہ مانگتے ہیں اور اس خوف کی وجہ سے ہر کام کو سوچ کر کرتے ہیں کہ اس کا انجام دوزخ نہ ہو۔

خلاصہ وعظ

پس فکر اور ذکر یہ دو چیزیں خلاصہ وعظ ہیں ان کو لازم پکڑلو' فکر سے دل کے اندر خدا کی یاد جم جائے گی پھر ہر وقت خدا کی یاد آسان ہو جائے گی اور خدا کی یاد وہ چیز ہے جس سے دل کو راحت وسکون اور چین ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اَلَابِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبِ" (یادرکھو کہ دلوں کو اطمینان اللہ تعالیٰ کے ذکر ہی سے حاصل ہوتا ہے) اب میں اسی کا ترجمہ ایک بزرگ کے کلام سے کر کے بیان ختم کرتا ہوں۔ مولانا فرماتے ہیں:

گر گریزی بر امید راحتے | ہم از انجا پیش آید آفتے
ہیچ کنجے بے دو دبے دام نیست | جز نجلو تگاہ حق آرام نیست

(اگر تم کسی راحت کی امید پر کسی مصیبت سے بھاگو تو اس کی طرف سے بھی تمہارے سامنے نئی مصیبت آئے گی کوئی گوشہ جال اور درندوں سے خالی نہیں۔ سوائے اللہ تعالیٰ کی خلوت گاہ کے آرام سے)

یعنی آرام خلوت گاہ حق کے سوا کہیں نہیں خلوت گاہ حق سے مراد یہ ہے کہ دل میں خدا کی یاد بس جائے کہ ہر وقت اسی کا دھیان رہے دنیا کا کوئی کام ہوا تو مجبوری کو ضرورت کی وجہ سے کر لیا مگر دل اللہ کی یاد میں رہے اس کو کر کے دیکھو بڑی راحت کی چیز ہے۔ عورتوں اور مردوں کو سب کو چاہیے کہ اپنا اصلی کام اللہ کی یاد کو بنا لیں، دنیا کے کام مجبوری کو کریں پھر اللہ اللہ میں لگ جائیں۔

مراقبہ کی حقیقت

اب میں ختم کرتا ہوں اور مکرر کہتا ہوں کہ اپنے ہر کام کو پہلے سوچ لیا کرو اور ایک وقت موت کے سوچنے حالات قبر کے سوچنے اور قیامت کے سوچنے کے لیے مقرر کرو اور باقی اوقات میں ذکر اللہ میں مشغول رہو اس فکر کا نام مراقبہ ہے۔ اس سے آپ کو مراقبہ کی فضیلت معلوم ہوئی ہوگی کہ یہ کتنی بڑی چیز ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے جا بجا امر بھی فرمایا ہے اور ترغیب بھی دی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے دنیا و آخرت کی راحت حاصل ہوتی ہے اب دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور توفیق عمل عطا فرمائیں۔ آمین۔ اس بیان کا نام مضمون کے مناسب المراقبہ تجویز کرتا ہوں۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

القاف

یہ وعظ ۲۲ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ بروز یکشنبہ بمقام قنوج متصل مکان شیخ معشوق علی صاحب جو کہ حضرت والا نے کھڑے ہو کر ۲ گھنٹے ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ایک سو تھی اور مستورات بھی تھیں۔ حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ.

وجہ تسمیہ

ذکر کو مشابہت جبل قاف سے ہے ارتفاع میں بھی اور استحکام میں بھی اور جائے پناہ ہونے میں بھی اور اس کے مقابل یعنی غفلت کے کھڈ اور غار کے مشابہ ہونے میں بھی اور لطیفہ یہ ہے کہ قنوج کے شروع میں بھی جو کہ محل وعظ ہے قاف ہے اور اس سے پہلے ایک وعظ کالپی میں ہو چکا ہے جس کا نام الکاف ہے۔ (بتشدید الفاء بمعنی المانع) اس میں معاصی سے جو کہ مانع عن الذکر ہیں تحرز کا بیان تھا اور اتفاق سے وہ لطیفہ ابتداء کے حروف کے توافق کا اس میں بھی تھا اور فرمایا کہ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ جبل قاف محیط ہے ارض کو اگر یہ ثابت ہو تو مشابہت ہوئی احاطہ میں بھی کہ ذکر میں بھی احاطہ کی شان ہے۔ جیسا عنقریب تشبیہ عروق سے مفہوم ہوتا ہے۔ نیز لکھا ہے کہ جبل قاف کے عروق ہیں جو زمین میں پھیلے ہوئے ہیں جن کے ذریعے سے اثر تمام زمین میں پہنچتا ہے اسی طرح ذکر کا اثر قلب سے تمام بدن میں پہنچتا ہے۔ نیز قنوج کی زمین کی حالت بھی دو طرح کی ہے بعض جگہ کھڈ ہیں اور بعض جگہ اونچی پہاڑ کی طرح تو ذکر مشابہ جبل ہے ارتفاع میں اور اس کا مقابل یعنی غفلت مشابہ کھڈ کے ہے۔

دعا خطبہ

اَمَّابَعْدُ: فَقَدْقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ. اِنَّ الشَّيْطَانَ جَاثِمٌ عَلٰى قَلْبِ اِبْنِ اٰدَمَ فَاِذَا ذَكَرَ اللّٰهَ خَنَسَ وَاِذَا غَفَلَ وَسْوَسَ ○[1]

[1] (تفسیر القرطبی ۲۰: ۲۶۲)

''جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! شیطان انسان کے دل سے چپکا رہتا ہے جب وہ دل سے اللہ کو یاد کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب وہ ذکر اللہ سے غافل ہوتا ہے تو شیطان اس کے دل میں وسوسے ڈالتا ہے۔''

کسی چیز کی خاصیت جاننے کا نفع

یہ ایک حدیث ہے جو میں نے اس وقت پڑھی۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چیزوں کی دو خاصیتیں بیان فرمائی ہیں۔ ان دو چیزوں کو سب جانتے ہیں لیکن ان کی خاصیتوں سے آگاہی کم ہے اور اس آگاہی نہ ہونے سے دو قسم کی مضرتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ جب کسی چیز کی خاصیت کا علم نہیں ہوتا تو اگر اس میں کچھ نفع ہے تو اس کے حاصل کرنے کی طرف رغبت نہیں ہو سکتی اور اگر اس میں نقصان ہے تو اس سے بچنے کی کوشش نہیں ہو سکتی۔ سنکھیا سے جو لوگ ڈرتے اور احتیاط کرتے ہیں اس کی وجہ علم خاصیت ہی ہے کہ جانتے ہیں کہ اس کا کھانا قاتل ہے ورنہ ممکن تھا کہ اس کی صورت اور رنگ اور آب و تاب کو دیکھ کر کسی نادان کو رغبت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ بہت سی وہ چیزیں جن کی خاصیت معلوم نہیں ہے کھالی جاتی ہیں اور نقصان پہنچتا ہے۔ بہت دفعہ کسی نافع چیز کے دھوکے میں زہر کھالیا گیا ہے۔ مثلاً طباشیر سمجھ کر سنکھیا کھالیا گیا اور موت تک نوبت آ گئی۔ اس کی وجہ کیا ہے وہی جہل عن الخاصیت اسی طرح اعمال کی حالت ہے۔ جس کام کا اثر معلوم نہ ہو عجب نہیں اس پر عمل کرلیا جائے جس کو یہ معلوم نہ ہو کہ گلے میں پھانسی ڈالنے سے مرجاتے ہیں عجب نہیں کہ وہ کبھی ایسا کر بیٹھے چنانچہ بعض جگہ لڑکوں سے ایسا بھی ہوا کہ ہنسی ہنسی گلے میں رسی ڈالی اور کھینچ لی اور ہنسی کی گل پھنسی ہوگئی اور قتل نفس ہوگیا۔ پس ثابت ہوا کہ مضر چیز سے بچانے کی تدبیر یہی ہے کہ اس کی خاصیت بتلادی جائے اسی طرح نافع چیز کی حالت ہے کہ اس کی طرف رغبت جبھی ہو سکتی ہے جبکہ اس کی خاصیت اور منفعت معلوم ہو اور اگر کسی چیز کا فائدہ معلوم نہ ہو تو بسا اوقات ایسی ایسی مفید چیزیں پاس پڑی رہتی ہیں جو بہت قیمتی اور کام کی ہوتی ہیں مگر ان سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا' ناواقف کے ہاتھ بہت دفعہ ہیرے اور جواہرات آ گئے ہیں اور ان کو کوڑیوں میں دے دیا' اس کو یہ نقصان ہوا اور مشتری کو علم خاصیت کی وجہ سے یہ فائدہ پہنچا کہ لاکھوں روپیہ کی چیز کوڑیوں میں مل گئی۔ یہی حالت ہے۔

اعمال کے خواص جاننے کے فائدے

اعمال کی کہ جس کو علم ہو جائے کہ فلاں عمل سے یہ ترقی ہو سکتی ہے وہ ذرا دیر میں ایسی ترقی کر جاتا ہے کہ دوسرا آدمی سالہا سال میں بھی نہیں کر سکتا۔ علم خاصیت ہی ایک ایسی چیز ہے کہ آدمی کا نافع کی

تحصیل میں جو ناگواریاں بھی پیش آئیں ان کو آسان کر دیتا ہے۔ دیکھئے بدمزہ دوا کی خاصیت اجمالاً مریض کو یا تفصیلاً طبیب کو معلوم نہ ہو تو مسہل کون دے جس کی بدمزگی دور کرنے کے لیے پان اور الا ئچی کی ضرورت ہوتی ہے بازو باندھے جاتے ہیں یہ سب کچھ اسی لیے کیا جاتا ہے کہ یہ گوارا نہیں ہوتا کہ ایسی بدمزہ چیز قے ہو کر پیٹ میں سے نکل جائے پس اس کو آسان کرنے والی چیز اگر ہے تو وہی علم خاصیت ہے کہ اس دوا سے امید ہے کہ تندرست ہو جائیں گے۔ غرض کہ علم خاصیت ہی جالب نفع ہے اور علم خاصیت ہی منفعت ہے خاصیت نہ جاننے کا پہلا ضرر یہ ہے کہ بدون علم خاصیت کے استعمال نافع اور طرز المضر دونوں سے محرومی رہتی ہے اور دوسری مضرت یہ ہے کہ اگر بالفرض نافع کے استعمال سے محرومی بھی نہ ہوئی بلکہ اتفاقاً یا کسی کی تقلید سے اس کا استعمال بھی کر لیا تب بھی بدون علم خاصیت کے گو اجمالاً ہی معتد بہ نفع مرتب نہیں ہوتا گو ظاہر میں اس صورت میں خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس کو علم خاصیت کی ضرورت نہیں کیونکہ جو غرض تھی علم خاصیت سے یعنی استعمال نافع وہ اس کو حاصل ہے۔

علم خاصیت ہر شخص کو مفید ہے

لیکن میں اس صورت میں بھی یہی کہتا ہوں کہ علم خاصیت کی اس شخص کو بھی ضرورت ہے اور بلا اس کے اس کو پورا فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور یہ بات گو اول وہلہ میں بالکل اجنبی سی معلوم ہو گئی خصوصاً طالب علموں کو کیونکہ ان کو ہر بات میں لم اور کیف کی ضرورت ہے مگر میں اس کو ایسا قریب الی الفہم کر دوں گا کہ انشاء اللہ تعالیٰ کچھ شک و شبہ باقی نہ رہے گا۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ اطباء دوا سے امراض کا علاج کرتے ہیں اور یہ بات مسلم ہے کہ دواؤں میں خواص ہیں لیکن تحقیق اطباء کی یہ ہے کہ گو دوا سے مرض کو آرام ہوتا ہے مگر فاعل دوا نہیں ہے بلکہ طبیعت فاعل ہے اسی واسطے معالجہ میں تقویت طبیعت کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی واسطے قوی الطبع شخص کو اثر دوا کا جلد ہوتا ہے اور ضعیف الطبع کو اثر دیر میں ہوتا ہے جوان آدمی کو جلد فائدہ پہنچتا ہے اور بڈھے کو دیر میں ایک مقدمہ تو اس کو سمجھئے یعنی گو دوا سے فائدہ پہنچتا ہے مگر فاعل طبیعت ہے اور اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ملائیے کہ جیسے مقوی دوا کے استعمال سے قوت آتی ہے۔

خیال مؤثر چیز ہے

اسی طرح خیال بھی ایک مؤثر چیز ہے اور اس کو انسان کے افعال میں بڑا دخل ہے یہ ایسی بات ہے جس کو عوام تک تسلیم کرتے ہیں۔ گویا بدیہی ہے اور اس کے لیے دلیل کی حاجت نہیں دیکھئے سب جانتے ہیں کہ اگر مریض کو اعتقاد ہو طبیب سے تو چاہے وہ طبیب اپنے فن کا کامل بھی

نہ ہوتو نفع بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یا کسی کو کسی دوا پر اعتقاد ہوتو وہ دوا اس کی طبیعت سے خوب ساز کرتی ہے اور فائدہ جلد ہوتا ہے یہاں تک کہ ایسا بھی ہوا اور ہوتا ہے کہ ایک دوا کا اثر فی الواقع اور ہے اور کتابوں میں بھی وہی لکھا ہے مگر لوگ اس کو ضد میں استعمال کرتے ہیں ان کے خیال میں چونکہ اثر بھی یہی ہے لہٰذا وہی اثر وجود میں آ جاتا ہے جوان کے اعتقاد میں ہے بہت سی گرم دوائیں تسکین عطش کے لیے عوام استعمال کرتے ہیں جو طبی تحقیق کے خلاف ہے لیکن نفع اور اثر ہوتا ہے وجہ اس کی صرف خیال ہے علیٰ ہذا اس کی ضد یعنی بداعتقادی سے عدم نفع یا ضعف نفع ہو جاتا ہے اور یہ دن رات کا مشاہدہ ہے تو خاصیت کے معلوم ہونے سے یہ فائدہ ہے کہ اس دوا پر اعتماد اور اعتقاد ہوگا اور اس سے تعجیل نفع کی امید ہے۔

مالیخولیا میں علاج سے کم نفع ہونے کا سبب

چنانچہ مالیخولیا میں جو نفع کم ہوتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ مریض کو اعتقاد نہیں ہوتا کیونکہ اعتقاد صحت خیال سے ہوتا ہے اور مالیخولیا فساد خیال ہی کا نام ہے اور اس کے جملہ خیالات فاسد ہیں بلکہ مجنون کو تو الٹی ہی سوجھتی ہے اسی لیے مجنون کے علاج میں بڑے ہوشیار اور عاقل طبیب کی ضرورت ہے تاکہ وہ تدبیر سے خیال کو بدلے۔ ایک قصہ ہے کہ ایک شخص کو وہم ہوگیا کہ میرا جسم شیشہ کا ہوگیا ہے۔ اسی وجہ سے سب سے الگ رہتا تھا اور ذرا کوئی پاس کو نکلتا تو بچتا کہ میں ٹوٹ جاؤں گا' اطباء اس کے علاج سے عاجز تھے' مشہور ہے کہ وہم کی دارو لقمان کے پاس بھی نہیں۔ ایسے ہی علاجوں میں قابلیت دیکھی جاتی ہے۔

یک من علم رادہ من عقل باید

(ایک من علم کے لیے دس من عقل کی ضرورت ہے)

ایک طبیب ایسے بھی مل گئے جن کے خیال میں تدبیر آ گئی۔ انہوں نے نبض دیکھنا چاہا تو مریض نے کہا کہ ہاتھ نہ لگائے' میرا بدن شیشہ کا ہے ٹوٹ جاؤں گا۔ انہوں نے یہ کیا کہ کسی موقع پر اس کے اوپر لحاف ڈلوا کر سب بدن ڈھانک دیا اور منہ بھی ڈھانک دیا اور کچھ ناکارہ بوتلیں پہلے سے مہیا کر رکھی تھیں ان بوتلوں کو لحاف کے اوپر رکھ کر تڑوا دیا' لحاف اوڑھانے میں یہ بھی مصلحت تھی کہ بدن کو آزار نہ پہنچے۔ (شریف طبیب بھی کیا چیز ہے جسمانی ہو یا روحانی وہ یہ نہیں چاہتا کہ مریض کو تکلیف پہنچے) وہ بوتلیں ٹوٹنے کے وقت یہ سمجھا کہ میرا بدن ٹوٹ رہا ہے' بہت شور مچایا پھر طبیب نے لحاف اتروا کر مریض سے کہا دیکھو یہ مرض تھا واقعی تمہارے جسم پر ایک خول شیشہ کا پیدا ہوگیا تھا اس کو میں نے تڑوا دیا یہ کانچ اسی کا ہے اب جسم تمہارے اندر سے صحیح سالم نکل آیا اب تم

دیکھ لواور امتحان کرلو کہ اب چھونے سے نہ ٹوٹے گا۔ اس معالج نے خیال میں تصرف کیا اور اس کو صحیح کردیا۔ یہی مانع تھا نفع سے اب علاج جو کچھ کرے گا مفید ہوگا یہ بڑے مدبر اور حاذق کا کام ہے تو خیال کا دخل نفع میں اس درجہ ہے اب سمجھ میں آ گیا ہوگا۔

علم خاصیت میں دو حکمتیں

علم خاصیت میں دو حکمتیں ہوئیں ایک یہ کہ وہ جالب نفع اور سالب ضرر ہے دوسرے یہ کہ اگر نفع بلا اس کے حاصل بھی ہوجائے تب یہ اس کے لیے مکمل اور مقوی اثر ہے اور بلا اس کے نفع ناقص ہوتا ہے۔ اب تیسری بات یہ اور سمجھئے کہ جیسے دوا میں اثر ہے اسی طرح اعمال میں بھی اثر ہے اور اس کا دعویٰ فقط شریعت ہی نے نہیں کیا بلکہ اپنی عادات میں بھی دیکھ لیجئے کہ عمل پر اثر مرتب ہوتا ہے مثلاً کوئی کسی کو گالی دیتا ہے تو فوراً کیسا غصہ آ جاتا ہے۔ یہ کاہے کا اثر ہے کوئی دوا اس کو نہیں کھلائی گئی کوئی ضرب اس کو نہیں لگائی گئی فقط ایک عمل کا اثر ہے یا کوئی جھک کر سلام کرے تو اس سے خواہ مخواہ محبت پیدا ہوتی ہے حالانکہ اس نے کچھ گھی نہیں پلا دیا' یہ فقط ایک عمل کا اثر ہے کسی سے میٹھی بات سن کر آدمی اس کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔

آدمی فربہ شود از راہ گوش   جانور فربہ شود از ناؤ ونوش

(آدمی کان کے راستے سے موٹا ہوتا ہے اور جانور کھانے پینے سے موٹا ہوتا ہے)

کیفیات وآثار پیدا ہونے کا سبب

بلکہ غور سے دیکھا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ اکثر کیفیات وآثار پیدا ہونے میں اعمال ہی مؤثر ہوتے ہیں۔ ان کا وہی اثر ہوتا ہے جو جانور میں خورد ونوش کا اثر ہوتا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اکثر کیفیات دو کیفیتوں کی طرف راجع ہوتی ہیں جن کا نام رضا وسخط ہے اور رضا وسخط کا منشا اعمال ہی ہیں' انسان راضی ہوتا ہے تو کسی کام سے ہی ہوتا ہے اور ناراض ہوتا ہے تو کسی کام ہی سے ہوتا ہے۔ اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ کیفیات کے پیدا ہونے میں مؤثر اعمال ہی ہیں اور یہ ایسی چیز ہے کہ سخت سے سخت اور قوی سے قوی شخص بھی اس سے نہیں بچ سکتا' کیسا ہی کوئی متین اور مستقل آدمی ہو مگر اس پر بھی ان چیزوں کا اثر ضرور ہوتا ہے۔

مزاج میں لطافت کی زیادتی کا اثر

انسانوں میں سب سے بڑا آدمی بادشاہ ہوتا ہے جس کا استقلال اس درجہ ہوتا ہے کہ بڑی سے بڑی مہم سے بھی طبیعت میں تغیر نہیں آتا مگر بات کا اثر اس پر بھی ہوتا ہے بلکہ اوروں سے زیادہ

ہوتا ہے اس زیادتی کی وجہ ضعف طبیعت نہیں ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ جوں جوں آدمی بڑا ہوتا جاتا ہے مزاج میں لطافت زیادتی آتی جاتی ہے اور لطافت زیادہ ہونے سے حس بڑھ جاتی ہے اور تو ادنیٰ شے سے بھی انفعال ہوتا ہے۔ بادشاہوں کی نسبت کہا گیا ہے: گاہے بسلامے برنجند گاہے بدشنامے خلعت دہند۔ (جب بڑے سے بڑے پر بھی بات کا یہ اثر ہوتا ہے تو اوروں کا حال ظاہر ہے) تو ثابت ہوا کہ ہر انسان پر عمل مؤثر ہوتا ہے۔ غرض دونوں مقدمے ثابت ہوگئے کہ اثر کے لیے علم خاصیت کی ضرورت ہے اور یہ کہ اعمال بھی دوا کی طرح مؤثر ہیں اب یہ نتیجہ لینا بہت ہی سہل ہے کہ نفع عمل کے لیے خواص کا علم ضروری ہے۔

اعمال کی دو اقسام

اب سمجھئے کہ اعمال کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کے خواص عقل سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ عقل سے مراد ادراک حواس و عقل سب ہے کوئی عقل بالمعنی الفلسفی نہ لے اور دوسری قسم وہ جن کی خاصیت عقل سے معلوم نہیں ہو سکتی اور ان کی خاصیت کے معلوم ہونے کے لیے ایک چیز کی ضرورت ہے جو وراء العقل یعنی عقل سے بالاتر ہے اس کا نام وحی ہے اعمال شرعی اسی دوسری قسم کے اعمال ہیں جن کے منافع و مضار صرف وحی سے اور ارشاد انبیاء علیہم السلام سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ عقل ان کے ادراک کے لیے کافی نہیں۔ میری اس تقریر سے یہ خلجان رفع ہوجائے گا کہ بہت سے مذہبی کام محض اعتقاد سے مفید تسلیم کر لیے گئے ہیں جیسے نماز روزہ وغیرہ کہ مسلمان ہر روز پانچ مرتبہ دنیاوی کاموں کا حرج کرتا ہے اور ایک مہینہ تک بھوکا رہتا ہے ان میں اور ان کے نتیجہ متوقعہ میں علاقہ کیا ہے جس کی امید پر ان کو کیا جاتا ہے۔

بہت سی باتیں وراء العقل ہیں

رفع خلجان (شک دور کرنا) کی تقریر یہ ہے کہ وہ علاقہ مدرک بالعقل (عقل کی سمجھ میں نہ آنے والی) نہیں اس کا ادراک ایک دوسرے ذریعہ سے ہوا ہے جو وراء العقل ہے اور عقل اس کو صحیح مانتی ہے کیونکہ صحت وحی اور صدق رسالت پر دلائل عقلی قائم ہیں غرض بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کے ادراک کے لیے عقل کافی نہیں مثلاً زمانہ ماضی میں کسی چیز کا وقوع محض اخبار سے مانا جاتا ہے عقل و حواس اس کے ادراک کے لیے کافی بس ان کا کام اس میں صرف اتنا ہے کہ اس کے امکان کو ادراک کرلیں کہ ایسی چیز کے سچ ماننے میں کوئی امتناع عقلی تو لازم نہیں آتا اور خبر دینے والا سچا

ہے جب ان دونوں باتوں کا ادراک عقل سے ہو جائے تو کسی خبر کا یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ورنہ دنیا کا ایک کام بھی نہ ہو تو دیکھئے باوجود اس خبر کے مدرک بالعقل نہ ہونے کے اس کو ماننا پڑا تو ثابت ہوا کہ بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن کے ادراک کے لیے عقل کافی نہیں پھر اسی قبیل سے اعمال شرعی بھی ہوں تو کیا تعجب کی بات ہے' یہ تقریر ہوئی۔

عالم شریعت سے کسی کو حق مزاحمت نہیں ہے

رفع خلجان کی اور ایک فائدہ میری تقریر سے یہ نکلا کہ جیسے اطباء سے مزاحمت امر طبی میں نہیں کی جاتی اس اعتماد پر کہ واقف ہیں خواص اشیاء اور طرق تشخیص سے ایسے ہی عالم شریعت سے کسی کو حق نہیں ہے مزاحمت کرنے کا فتویٰ میں چنانچہ آپ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ علاج کے لیے ایک طبیب کو منتخب کر لینے کے بعد اس سے نسخہ میں یا پرہیز میں کسی تدبیر میں کوئی مزاحمت کرتا ہو اور منتخب کر لینے کے بعد کا لفظ اس واسطے کہا گیا کہ اس انتخاب سے پہلے اجازت ہے تحقیق اور ہر قسم کی نکتہ چینی کی بلکہ ضرورت ہے کہ خوب چھان بین کے بعد کسی کو معالج اور معتمد بنایا جائے اور جب یہ تحقیق کر لی گئی اور کسی کو معتمد بنا لیا گیا تو پھر اجازت نہیں ہے اس کے سامنے مزاحمت کرنے کی بلکہ کسی قسم کے چوں و چرا کی بھی۔ غرض طبیب سے کوئی مزاحمت نہیں کرتا۔ اس مزاحمت نہ کرنے کی وجہ دو ہیں ایک یہ کہ وہ قابل اعتماد ہے اور علاج میں غلطی نہ کرے گا۔ دوسرے یہ کہ اگر اس سے بگاڑی جائے گی تو وہ بددل ہو جائے گا اور علاج چھوڑ دے گا اور ہمارا مقصود یعنی صحت حاصل نہ ہوگی ان ہی دونوں وجہ سے معالج روحانی سے مزاحمت نہ کرنی چاہیے۔

طبیب باطنی کسی مرض کو لاعلاج نہیں کہتا

اس پر اعتماد بھی پورا ہونا چاہیے اور اس کو مکدر بھی نہ کرنا چاہیے جب طبیب ظاہری پر اعتماد ہے حالانکہ وہ ایسے اصول کو جانتا ہے جن کو وہ خود ظنی کہتا ہے تو طبیب باطنی پر کیوں اعتماد نہ ہو جس کا علم وحی قطعی کی طرف سے مستند ہے۔ دوسرے طبیب روحانی طبیب ظاہری سے زیادہ کامل بھی ہے کیونکہ طبیب ظاہری بہت سے امراض میں جواب بھی دے دیتا ہے اور طبیب باطنی کسی مرض کو لاعلاج نہیں کہتا' برے سے برے اور سخت سے سخت مرض کا علاج کر سکتا ہے۔ علاج کر کے دیکھو۔ پس اس سے بھی مزاحمت کا حق کسی کو نہیں۔ آج کل عجیب مذاق ہو گیا ہے کہ ذرا کسی نے پڑھ لکھ لیا اور اعمال شرعی میں دخل دینے کے لیے تیار ہو گیا اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ عقل کی بات ہے حتیٰ

کہ زبان پر بھی یہ لفظ آتا ہے کہ ہم ایسے بیوقوف نہیں ہیں کہ بلا سوچے سمجھے مان لیں اور اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ بلا علت معلوم کیے کسی بات کو تسلیم کر لیں اب تعلیم کا زمانہ ہے حیرت ہے کہ یہی بات ڈاکٹر اور طبیب سے کیوں نہیں کی جاتی۔

دوسرے کے کام میں دخل دینا نقصان عقل کی بات نہیں ہے؟

میں کہتا ہوں کہ یہ نقصان عقل کی دلیل ہے کہ اس کام میں دخل دیا جائے جس کو آدمی جانتا نہ ہو کتنا ہی کوئی عاقل ہو اس کو ایک ادنیٰ درجہ کے کام میں بھی جس کو جانتا نہ ہو دخل نہ دینا چاہیے۔ ایک بی اے پاس کو جولاہا کے کام میں بھی دخل دینے کا حق نہیں اور اگر ایسا کرے گا تو وہ جولاہا اس کی غلطی پکڑ لے گا۔ اس وقت ثابت ہو جائے گا کہ تعلیم سے جولاہا کی برابر بھی عقل پیدا نہیں ہوتی اور آج کل تو یہ مسئلہ تمام جہان کے نزدیک مسلم ہو گیا ہے کہ تقسیم عمل سے چارہ نہیں اور ترقی کا مدار یہی ہے۔ چنانچہ جس فن کا جو آدمی ہوتا ہے اس کا فیصلہ اس فن کے متعلق نافذ مانا جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر ایک شخص کو کہہ دیتا ہے کہ اس کے قویٰ قابل ملازمت نہیں تو اس کو ملازمت نہیں مل سکتی خواہ ڈاکٹر نے یہ حکم کسی غرض فاسد سے غلط ہی لگا دیا ہو یا ایک انجینئر ایک لاکھ روپیہ کی عمارت کو کہہ دے کہ یہ گرا دینے کے قابل ہے تو گرا دی جاتی ہے۔ خواہ اس نے بددیانتی ہی سے کہا ہو مگر چونکہ اس کو ایک فن میں ماہر تسلیم کر لیا گیا ہے اس لیے اس کے احکام میں مزاحمت نہیں کی جاتی۔ غور کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنا کمال عقل حاصل ہوگا عقل اتنا ہی مزاحمت سے روکے گی نہ یہ کہ عقل جوں جوں بڑھتی جائے اتنی ہی کو کام میں دخل دینے کی اجازت ہوتی جائے جیسے آج کل کے تعلیم یافتوں کا مذاق ہو گیا ہے۔ گفتگو یہ تھی کہ اعمال میں بھی ادویہ کی مانند خواص ہیں اور بعض اعمال کے خواص کا علم صرف وحی سے ہو سکتا ہے اور ان کا بتلانے والا بھی حق تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور وہی اس فن کا آدمی ہے اس کو نبی کہتے ہیں تو اس سے مزاحمت کا کسی کو حق نہیں۔ تو اب غلطی ان لوگوں کی واضح ہو گئی جو تھوڑا سرمایہ عقل لے کر نبی سے مزاحمت کی ہمت کرنے لگتے ہیں۔ جیسا آج کل مذاق ہو گیا ہے اس سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ آج کل کوئی نبی موجود ہے نبوت ختم ہو چکی ہے لانبی بعدی تصریحاً حدیث میں آ چکا ہے جو کوئی مدعی نبوت موجود ہو یا پیدا ہو اس کو جھوٹا سمجھو۔

علوم نبوت محفوظ ہیں

ہاں ان کے غلام موجود ہیں اور علوم نبوت محفوظ ہیں وہ ان علوم کو ظاہر کرتے ہیں اور جو وحی نے بتایا تھا وہ وہی بتاتے ہیں ان کی مزاحمت نبی ہی کی مزاحمت ہے جیسے ایک چپراسی کی مزاحمت

حاکم ہی کی مزاحمت ہے۔ سمن لے کر اگر چپراسی آئے اور کوئی اس کو بجائے تعمیل کرنے کے پھاڑ پھینک دے تو اس پر وہی دفعہ لگائی جائے گی جو منہ در منہ حاکم کے مزاحمت پر لگائی جاتی اور یہ عذر اس کا قابل سماعت نہ ہوگا کہ میں نے تو ایک چپراسی کی مزاحمت کی تھی نہ کہ حاکم کی وجہ کیا ہے کہ چپراسی صرف واسطہ ہے حکم پہنچانے کا اور حکم حاکم ہی کا ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے غلام اور ورثاء یعنی علماء صرف حکم سنا دینے والے ہیں نہ کہ اس کو ایجاد کرنے والے اور ان کے احکام نبی ہی کے احکام ہیں اور نبی کے احکام درحقیقت خدا کے احکام ہیں۔ ان کی مزاحمت پر وہی جرم ہوگا جو نبی اور خدا کی مزاحمت پر ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضرورت ہے کہ پہلے اس حکم سنانے والے کا عالم محقق ہونا اور متقی و دیانتدار ہونا معلوم کر لیا جائے ورنہ وہ عالم نہ ہوگا بہروپیہ ہوگا اور چپراسی کے بھیس میں کوئی بہروپیہ آ جائے تو اس کی مزاحمت جرم نہیں لیکن جس کا عالم محقق متقی ہونا تحقیق سے آپ کو معلوم ہو چکا ہے اس کی مزاحمت کا آپ کو کوئی حق نہیں اور مزاحمت کی صورت میں مجرم قرار پاؤ گے اور ایسے شخص کی مزاحمت نقل کے تو خلاف ہے ہی عقل کے بھی خلاف ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ عقل کا خود تقاضا یہ ہے کہ جو شخص جس فن کو جانتا ہے نہ جاننے والوں کو اس کی مزاحمت نہ کرنا چاہیے مگر افسوس ہے کہ اس وقت ایک زمانہ کا مذاق یہی ہو گیا ہے کہ دین کی جب کوئی بات سنیں گے تو اول سوال یہی ہوگا کہ اس کی کیا وجہ طبیب نسخہ میں ایک دوا تین ماشہ لکھے اور ایک چار ماشہ تو اس سے نہیں پوچھتے کہ دونوں کے وزن میں فرق کرنے کی کیا وجہ اور احکام شرعی میں پوچھتے ہیں کہ عصر کی چار رکعت اور مغرب کی تین رکعت ہونے کی کیا وجہ۔ طبیب سے اگر پوچھیں کہ تین ماشہ اور چار ماشہ ہونے کی کیا وجہ تو وہ جواب دے گا کہ تم کو کیا مجاز ہے اور تم اس کی تحقیق کرنے والے کون ہو حالانکہ وہ تشخیص اور علاج میں فاعل مختار نہیں ہے بلکہ ایک قانون کا جس کا نام طب ہے پابند ہے اس سے ایک درجہ میں یہ سوال نازیبا بھی نہیں کیونکہ سوال کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ جس طب کے پابند ہونے کے تم مدعی ہو اس تجویز کا اس سے ثبوت دو۔

حق تعالیٰ شانہ سے احکام علل پوچھنے کی کسی کو مجال نہیں

برخلاف مسائل شرعیہ کے کہ وہ خدائی احکام ہیں اور خدا تعالیٰ فاعل مختار ہیں کوئی قانون اور کوئی حکم ان پر حاکم نہیں جس کی پابندی ان پر لازم ہو تو ان سے یا ان کے پیغام رسانوں سے اس سوال کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے کہ تین رکعت یا چار رکعت کیوں مقرر کیں وہاں تو علت ہر بات کی ان کا حکم ہے ان کے حکم کے لیے کوئی چیز علت نہیں ہو سکتی۔ بہرحال آپ خدا تعالیٰ سے پوچھتے

والے کون ہیں کہ یہ حکم کیوں دیا جبکہ ایک طبیب سے بھی پوچھنے کے بھی آپ مجاز نہیں اور اگر احکام شرعی میں چوں و چرا کی ہمت ہے تو پہلے طبیب سے نسخہ کے علل پوچھو۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے افسوس کیا ہے کہ اے عزیز تو محمد بن زکریا سے (ایک طبیب کا نام ہے) نہیں پوچھتا کہ یہ نسخہ کیوں لکھا اور محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھتا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا۔

ایک کاتب کا کارنامہ

یہاں ایک واقعہ یاد آیا میرے ایک عزیز مولوی سعید مرحوم وعظ لکھا کرتے تھے کچھ وعظوں کے مسودے ان کے ہاتھ کے ایسے رہ گئے جن کے صاف کرنے کی نوبت نہیں آئی اور ان کا انتقال ہو گیا۔ ایک کاتب اور پیدا ہوئے اور انہوں نے کہا کہ میں ان کو صاف کرلوں گا۔ ایک وعظ میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی قول آیا تھا انہوں نے سمجھا کہ عبداللہ سے مراد عبداللہ بن مسعود ہیں اور اس کی اصل یہ ہے کہ روایت حدیث میں جب عبداللہ مطلق آتا ہے تو مراد عبداللہ بن مسعود ہوتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے بہت غلطیاں کیں ایسی صریح تو غلطیاں کیں اور اجرت بھی کتابت کی لے لی پھر ان کو اس کا علم بھی ہوا اور اجرت واپس نہ کی۔ بس کہہ دیا کہ میں اپنا کام کر چکا۔ یہاں سے اس کی بھی اصل نکلتی ہے کہ بعض بزرگوں کی طرف جو بعض باتیں ایسی منسوب ہیں جو خلاف شرع ہیں ممکن ہے کہ ان کو ایسے ہی کاتب مل گئے ہوں جنہوں نے عبداللہ سے مراد عبداللہ بن مسعود لیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مخالف نے الحاق کیا ہو۔ یہ تو جملہ معترضہ کے طور پر درمیان میں آ گیا۔ بیان یہ تھا کہ افسوس کیا ہے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے کہ طبی جسمانی کے حکم کو تو بے چون و چرا مان لیا جائے اور طبیب روحانی کے سامنے لم وکیف کیا جائے چاہیے تو یہ کہ جیسے طبیب پر اطمینان ہے کہ یہ خواص ادویہ اور طرق علاج کو جانتا ہے اور اس وجہ سے مزاحمت نہیں کی جاتی۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اعتماد کرنا لازم ہے کہ علم خواص اعمال کا رکھتے ہیں لہٰذا کیا حق ہے کسی کو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر ونواہی میں مزاحمت کرے حالانکہ دونوں میں یہ فرق بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم اصل سے قطعی ہیں اور طب اصل سے ظنی ہے۔ ایک شخص ظن کو نہیں مانتا وہ دوسری تحقیق رکھتا ہے اور قطعی کے سامنے تو مزاحمت کی کوئی گنجائش ہی نہیں (جملہ معترضہ کے طور پر یہ بھی سمجھ لیجئے کہ طب کو جو ظنی کہا جاتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمام طبی تحقیقات ظنی ہیں کیونکہ بعض طبی تحقیقات قطعی بھی ہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ اکثر احکام طبی ظنی ہیں۔ وللا کثر حکم الکل) تو جب ظنی علوم سے مزاحمت نہیں کی جاتی تو قطعی علوم سے مزاحمت کیسے جائز ہو گی۔

بعض اعمال کے خواص کا عقل ادراک نہیں کرسکتی

یہ فائدہ میری اس تقسیم سے نکلا کہ اعمال کی دو قسم ہیں ایک وہ جن کے خواص عقل سے معلوم ہوسکتے ہیں ان میں مزاحمت کی گنجائش ہوسکتی ہے اور ایک وہ جن کے خواص کے ادراک کے لیے عقل کافی نہیں بلکہ وہ صرف مدرک بالوحی ہیں ان میں مزاحمت کی مطلق گنجائش نہیں اور ایک یہ مسئلہ بھی حل ہوا کہ بعض اعمال پر خاص وعدے یا وعیدیں مثلاً فلاں سورت کوئی پڑھے تو جنت میں اس کو یہ چیزیں ملیں گی یا فلاں گناہ کرے تو جہنم میں یہ عذاب ہوگا ان میں عوام کو اور بعض علماء کو دونوں کو ایک ایک غلطی ہوتی ہے اہل علم کو تو توجیہ میں دقت ہوتی ہے۔ طالب علم پوچھتے ہیں کہ اس عمل اور اس کی جزا میں بہت مناسبت کیا ہے۔ مثلاً وارد ہے کہ ایک بار سبحان اللہ کہنے سے ایک درخت جنت میں لگ جاتا ہے تو تسبیح اور درخت میں مناسبت کیا ہے' اساتذہ اس کی توجیہیں کرتے ہیں مگر طلبہ کی تشفی نہیں ہوتی۔ میری تقریر سے تمام توجیہات کا اصل الاصول نکل آیا کہ یہ ان باتوں میں سے ہے جن کا علم صرف بذریعہ وحی ہوا ہے عقل ان کے ادراک سے قاصر ہے یہ توجیہ ہر جگہ ملتی ہے اس کو تو ضرور تسلیم کرادیا جائے اس کے بعد اگر کوئی توجیہ بطور تقریب الی الفہم کی جائے تو مزید تسکین کا موجب ہوگی اور درحقیقت ہے بھی یہی بات۔ اور بدون اس اصل کے مناسبت کی حقیقت سمجھانے کا دعویٰ کرنا تکلف ہی تکلف اور نرا دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ہر چیز کی حقیقت ہماری عقل میں آ ہی جائے۔

علوم شرعیہ کو مدرک بالوحی مان لینے کا عظیم نفع

بلکہ ترقی کرکے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حقیقت واقعیہ کسی چیز کی بھی ہم کو معلوم نہیں بس ہم کو ایک حد پر قناعت ہوگئی ہے اس وجہ سے آگے تلاش نہیں کرتے اور جس حد کا علم ہوگیا ہے اسی کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہم اپنی ذات اور افعال تک کی حقیقت واقعیہ نہیں جانتے' آنکھ سے ہر وقت دیکھتے ہیں مگر اس کی حقیقت نہیں بتاسکتے کہ دکھائی کس طرح دیتا ہے اس کی حقیقت سے صرف اسی درجہ پر قناعت کرلی ہے کہ آنکھ کھولتے ہی تو چیز دکھائی دے جاتی ہے اور اس پر ایسا شرح صدر ہے کہ اس میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا اور نہ ذہن اس سے آگے کبھی جاتا ہے اور اس کو بدیہی سمجھتے ہیں جس کے لیے دلیل کی احتیاج ہی نہیں یہ اس قناعت ہی کا نتیجہ ہے ورنہ جن لوگوں نے اس کی تحقیق کرنی چاہی ان کو دیکھئے کس مصیبت میں پڑگئے اور اس مسئلہ میں کتنے اقوال

ہو گئے پھر بھی جس کو تحقیق کہتے ہیں وہ حق نہ ہوئی اس سے وہ قناعت ہی اچھی تھی اسی طرح علوم شرعیہ کو مدرک بالوحی مان لینے سے بہت سے بکھیڑوں سے نجات مل جاتی ہے اور اس کے بعد کوئی توجیہ مناسب بھی کر دی جائے تو مزید اطمینان کا باعث ہے تو یہ بیان اہل علم کی غلطی کا ہوا۔

عوام کی سستی اعمال کا سبب

اور عوام کو بعضے وعدوں سے یہ غلطی ہوتی ہے کہ ایک بہانہ مل جاتا ہے اعمال میں سستی کے لیے مثلاً وارد ہے: "مَنْ قَالَ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ"[1] اس سے اطمینان کر لیا کہ جب ہم کلمہ پڑھتے ہیں تو جنت واجب ہے ہی پھر اعمال کی کیا ضرورت ہے۔ اس وجہ سے اعمال میں سستی ہونے لگی اور یہ سستی صرف ان پڑھوں میں ہی نہیں بلکہ آج کل پڑھے لکھوں میں بھی یہ غلطی کثرت سے ہونے لگی۔ چنانچہ مدعیان عقل کہتے ہیں کہ انسان کا کام ترقی دنیا ہے اور رہی آخرت تو اس کے لیے پیغمبر صاحب فرما گئے ہیں: "مَنْ قَالَ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ" اور کلمہ ہم پڑھتے ہی ہیں اور حضور کے فرمانے پر یقین بھی رکھتے ہیں۔ لہٰذا جنت ضرور ملے گی پھر دنیا کی ترقی کو کیوں چھوڑا اور جواز و ناجواز کے جھگڑے میں کیوں پڑے پس جو چاہو کرو سود لو یا رشوت اور کلمہ پڑھتے رہو اور بعض کو تو اس دعوے کا ایسا ہیضہ ہوا ہے کہ انہوں نے رسالت کی بھی ضرورت نہیں رکھی۔ کہتے ہیں:

لا الہ الا اللہ سے مراد

حدیث میں ہے: "مَنْ قَالَ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ" اس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے یہ مولویوں کا اضافہ ہے رسالت کا قائل ہونا ضروری نہیں' گو اچھا ہے اور غضب یہ ہے کہ یہ مضامین ان لوگوں نے مذہبی کتابوں میں چھاپ دیئے جن سے مسلمانوں کے ہوش اڑتے ہیں اور بعض نے اس سے بھی ترقی کی کہ توحید کے اختیار کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی اور یہ دعویٰ کیا کہ توحید تو امر فطری ہے اور ہر شخص میں موجود ہے۔ اگر زبان سے نہ بھی کہے گا بلکہ اگر انکار کرے گا تب بھی وہ موحد ہے اور موافق اس حدیث کے اس کو نجات ہو جائے گی۔ بس ان لوگوں کے نزدیک ضروری کام صرف یہ رہ گیا کہ کھانے پینے کی ترقی کرو۔

صاحبو! یہ لوگ ہیں جن کے بارے میں خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ○

---

[1] (کنز العمال: ۲۰۸)

''آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کو اپنے حال پر رہنے دیجئے کہ وہ خوب کھالیں اور چین اڑا لیں اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں ان کو اپنی حقیقت معلوم ہو ہی جاتی ہے۔''

اور ان لوگوں سے سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ

فسوف تری اذا انکشف الغبار　　افرس تحت رجلک ام حمار

(جب غبار ہٹ جائے گا عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے پر)

یہ نہیں دیکھتے کہ اگر فطری کافی ہو تو بعثت انبیاء علیہم السلام عبث ہو جاتی ہے۔ خواہ مخواہ کیوں اتنا بکھیڑا کیا گیا فطری توحید سے نجات تو سب کی ہو ہی جاتی۔ صاحبو! حقیقت یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ سے مراد پورا کلمہ ہے آدھا کلمہ مراد نہیں اور جن لوگوں نے اس سے آدھا کلمہ ہی مراد سمجھا ہے ان کی سمجھ بس ویسی ہے جیسے ریاست رام پور میں ایک طالب علم تھا۔ اس نے مجھ سے کسی پریشانی کے لیے وظیفہ پوچھا میں نے بتلا دیا کہ لاحول کی کثرت کرو چندروز کے بعد وہ ملا اور بیان کیا کہ میں لاحول لاحول لاحول تمہارا بتلایا ہوا برابر پڑھتا ہوں مگر ثمرہ مرتب نہیں ہوا میں نے کہا لاحول ولاقوۃ تو جیسے لاحول سے میری مراد پورا جملہ تھا ایسے ہی لا الہ الا اللہ سے مراد پورا کلمہ مع محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ غرض یہ تو محض واہیات اور غلط ہے کہ اعتقاد و رسالت کی ضرورت نہیں ہے یا توحید فطری کافی ہے اس کے متعلق کلام کو طول دینا فضول ہے کیونکہ اس وقت مخاطبین میں کوئی اس خیال کا نہیں لیکن افسوس ان پر ہے جو رسالت کی ضرورت کو مانتے ہیں اور اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ کلمہ پڑھنے کو کافی سمجھتے ہیں اور اعمال کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے۔ ان کے زعم میں ایک حدیث سے تائید مل گئی ہے وہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے اس کے آخر جزو سے ان کو دھوکہ ہوا ہے وہ جزو یہ ہے: ''وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ'' (اور اگر زنا کرے یا اگر چوری کرے) حدیث کا قصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ'' (جس شخص نے لا الہ الا اللہ ''اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں'' کہا وہ شخص جنت میں داخل ہوا)

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا ''وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ'' (اور اگر زنا کرے یا اگر چوری کرے) یعنی اگرچہ مومن سے معاصی بھی صادر ہوں کیا تب بھی وہ جنت میں جائے گا۔ حضور نے فرمایا ہاں ''وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ'' (اور اگر زنا کرے یا اگر چوری کرے) حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پھر پوچھا ''وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ'' (اور اگر زنا کرے یا اگر چوری کرے)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ" (اور اگر زنا کرے یا اگر چوری کرے) انہوں نے پھر تعجب سے یہی پوچھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی جواب دیا اور اتنا لفظ اور بڑھایا: "عَلٰی رَغْمِ اَنْفِ اَبِیْ ذَرٍّ" یعنی چاہے ابوذر کے طبیعت کے کتنا ہی خلاف ہو مگر ہوگا یہی کہ وہ جنت میں جائے گا۔ اس حدیث کے الفاظ ظاہراً بہت صریح ہیں۔ وہ حدیث جو اوپر پڑھی تھی یعنی "مَنْ قَالَ لَااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ"[1] (جس شخص نے لا الہ الا اللہ "اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں" کہا وہ شخص جنت میں داخل ہوا) وہ بھی اتنی صریح نہ تھی اور یہ حدیث عام لوگوں کو معلوم بھی نہیں ہے ورنہ خدا جانے کیا کرتے۔ میں نے ناحق ہی پڑھی کہ ان کے ہاتھ ایک دلیل آ گئی مگر خیر اس پر مکمل بحث ہونے سے ان شاء اللہ تعالیٰ تحقیق ہو جائے گی اور غلطی نکل جائے گی اور یہ کچھ چھپی ہوئی حدیث تو ہے بھی نہیں نیز شریعت کا یہ حکم بھی نہیں ہے کہ کوئی مسئلہ چھپایا جائے۔ کتابوں میں تو یہ موجود ہے ہی طلباء اور اہل علم اس کو جانتے ہی ہیں ہاں تحقیق ہو جانے سے امید ہے کہ پھر کتاب میں دیکھ کر بھی غلطی نہ ہوگی اور آج کل تو اس کا علم طلبہ تک بھی محدود نہیں رہا عوام کے سامنے اور گھروں کے اندر بھی حدیثیں پہنچ گئیں۔

اردو ترجمہ از خود دیکھنے کی خرابیاں

بی ترجمہ بیگم کا سر سلامت چاہیے انہوں نے گھروں کے اندر بھی باریک سے باریک مسائل کو پہنچا دیا ہے۔ ترجمہ کو اردو میں دیکھ کر ایسا آسان سمجھا جاتا ہے کہ کسی سے اسے پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے اور اس سے بڑی بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ طب کی کتابیں بھی تو اردو میں ہو گئی ہیں پھر چاہیے کہ معالجہ کو بھی ایسا ہی سہل سمجھا جائے جیسا حدیثوں کو ترجمہ سے سہل سمجھ لیا گیا تو بس خود علاج کر لیا کریں اور طبیب کی طرف رجوع کی ضرورت نہ سمجھی جائے یا قانون بھی اردو میں موجود ہے تو چاہیے کہ وکیل کی بھی ضرورت نہ سمجھیں حالانکہ ہم نے کسی کو بھی نہیں دیکھا کہ ایک نسخہ زکام کا بھی کتاب میں دیکھ کر بلا طبیب کے مشورہ کے یا ایک کرایہ نامہ بھی بلا مشورہ وکیل کے لکھا ہو۔ کوئی وجہ فرق تو بیان کی جائے۔ بس فرق یہی ہے کہ دنیا کے کاموں کی وقعت ہے ان میں بدون مہارت کاملہ کے دخل دینا پسند نہیں کرتے اور دین کی وقعت ہے نہیں اس میں ہر شخص مجتہد بنا ہوا ہے۔ بہرحال ظاہر میں اس حدیث کے ترجمہ کو دیکھ کر ضرور یہ سمجھ میں آ سکتا ہے کہ کلمہ پڑھ لینا کافی ہے اگرچہ کیسے ہی گناہ کرے جب بھی جنت میں جائے گا اور پھر گناہوں

---

[1] (کنز العمال: ۲۰۸)

میں سے بھی زنا اور سرقہ کا نام لیا گیا جو کبیرہ اور متفق علیہ گناہ ہیں پھر اس کے ساتھ حدیث کا اردو ترجمہ سہل ہے ہی اب اس کے متعلق کسی سے پوچھنے اور مشورہ کرنے کی کیا ضرورت رہی۔

اعمال کو ضروری نہ سمجھنے کا الزامی جواب

بس ثابت ہو گیا کہ اعمال کی ضرورت نہیں اور اس کے یہ معنی ہوئے کہ علماء نے ناحق فقہ کی وہ کتابیں لکھی ہیں جن میں اعمال کا بیان ہے اور فضول اس میں عمریں صرف کی ہیں کہ کہیں متن ہے اور کہیں شروح ہیں اور کہیں حواشی ہیں اور جا بجا مبسوط بحثیں ہیں اور واقعی میں یہ غلطی علماء ہی تک محدود نہ رہے گی بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے گی کیونکہ علماء تو صرف واسطہ ہیں علوم کے پہنچانے کے اور اصل علوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ارشاد فرمودہ ہیں سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں ایک جگہ تو یوں ہے: "وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ" اور دوسری جگہ موجود ہے: "لَایَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِّنْ کِبْرٍ"[1] جس کا مطلب یہ ہے کہ ذرا سی بدعملی سے بھی جنت سے محرومی ہوگی وہاں تو یہ کہ کسی عمل سے کلمہ گو جہنم میں نہیں جا سکتا اور یہاں یہ کہ ذرہ برابر برے عمل سے جنت نہیں پا سکتا۔ یہ تعارض کیسا۔ ایک تو ان لوگوں کے قول پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض دوسرے یہ کہ اعمال کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے تعلیم فرمائی ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا سکھلائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو واسطہ ہیں اللہ تعالیٰ نے سکھلائے ہیں تو یہ اعتراض اللہ تعالیٰ تک پہنچتا ہے کہ ادھر تو اپنے رسول کی زبان سے یہ وعدہ کیا کہ کلمہ پڑھ لینا کافی ہے اور ادھر اعمال کو بھی ضروری بتلایا جو ان کے نزدیک ضروری نہیں' کیا یہ صریح تعارض نہیں اس بناء پر تو یہ چاہیے تھا کہ تمدن سکھلاتے جیسا کہ مدعیان تمدن کا خیال ہے۔ بات یہ ہے کہ حب دنیا نے ان لوگوں کے قلوب کو چرایا ہے۔ بس اسی کی ضرورت ان کے قلب میں آتی ہے دین کی ضرورت قلب میں آتی ہی نہیں مگر اس کا صریح انکار بعض مصالح سے نہیں کر سکتے اس واسطے اس کے متعلق کچھ من سمجھوتہ کر لیتے ہیں اور ادنیٰ سے تاویل پر خواہ وہ بداہتہً غلط ہو قناعت کر لیتے ہیں۔ بس مقصود دنیا ہے اور اس کو اپنا کام تو سمجھتے ہی ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کا اصل کار منصبی دین ہے

غضب یہ ہے کہ مذہبی لوگوں کا اور انبیاء علیہم السلام کا بلکہ حق تعالیٰ کا کام بھی اسی کو سمجھتے ہیں کہ تمدن سکھلائیں۔ دین کا کہیں نام بھی لیتے ہیں تو وہ صرف تمدن کی ضرورت سے چنانچہ اگر کبھی

---

[1] (الصحیح لمسلم کتاب الایمان ب: ۳۹)

دین کی تعریف ہوتی ہے تو یہ کہ سبحان اللہ ہمارا کیسا دین ہے جس نے نماز سکھلائی تو جماعت کے ساتھ تا کہ آپس میں میل جول ہو مال میں بھی حقوق رکھے تا کہ غریب اور امیر میں تعلق رہے حج کی تعلیم دی تا کہ ایک مرتبہ سال بھر میں تمام دنیا کے مسلمانوں کا اجتماع ہو جایا کرے اور تمدن قائم رہے۔ غرض تمدن ہو چاہے کچھ بھی نہ ہو۔ ہم کو اس سے انکار نہیں کہ ان احکام شرعیہ میں رعایت ان مصالح کی بھی ہو مگر ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ مصلحت حکمت کے درجہ میں ہے علت کے درجہ نہیں ورنہ ایسے احکام دین میں کیوں ہیں جن کو تمدن سے علاقہ نہیں مثلاً وضو کرنا روزہ رکھنا رات کو اٹھ کر تہجد پڑھنا کہ ان اعمال میں تو تکلیف ہی تکلیف ہے ترقی قومی اور تمدن میں بظاہر ان کو کوئی دخل نہیں اور یوں بہت سے وسائط سے تو ہر کام کو ہر نتیجہ سے مربوط کیا جا سکتا ہے۔ خوب یاد رکھئے کہ دین کا مقصود اصلاح دنیا نہیں ہے اور بالتبع اصلاح ہو جانا اور بات ہے۔ یہ خوبی ہے دین کی کہ دنیا کی اصلاح بھی اس سے لزوماً ہو جاتی ہے مگر مقصود ہرگز نہیں ہے اور نہ اصلاح دنیا علماء کا منصبی کام ہو سکتا ہے نہ انبیاء علیہم السلام کا بلکہ انبیاء علیہم السلام کا اصلی کام صرف دین ہے۔

نبوت کا اصل کام سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام سے لیا گیا

یہاں سے اس کا جواب بھی نکل آیا کہ قیامت کے احوال سے گھبرا کر لوگ یہ تجویز نکالیں گے کہ کسی سے شفاعت کراؤ اور اس کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کو انتخاب کریں گے کیونکہ وہ سب کے باپ ہیں اور صفی اللہ ہیں۔ چنانچہ ان کے پاس جائیں گے اور شفاعت کی درخواست کریں گے آپ عذر کریں گے اور فرمائیں گے کہ نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ کیونکہ وہ اول نبی ہیں۔ یہ حدیث بہت طویل ہے یہاں عرض کرنا صرف اتنا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو اول نبی کہنا کیا معنی ان سے پہلے تو متعدد نبی ہو چکے ہیں خود حضرت آدم علیہ السلام ہی نبی ہیں جو خود ایسا کہہ رہے ہیں کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ اپنی نبوت سے بھی انکار ہے۔ اس کا مطلب میری تقریر سے بے غبار نکلتا ہے کہ ان کو اول نبی اس واسطے کہا گیا کہ نبوت کا جو اصل کام ہے وہ سب سے پہلے ان ہی سے لیا گیا یعنی تعلیم دین محض

بعض انبیاء علیہم السلام کے تعلیم الصنائع کی وجہ

اور ان سے پہلے جو نبی تھے انہوں نے دنیا کی بھی تعلیم کی تھی چنانچہ حضرت ادریس علیہ السلام نے سینے کا فن سکھلایا، وعلیٰ ہذا ضروری صنائع کی تعلیم بذریعہ وحی ہوئی ہے اس وقت

ضرورت تھی تمدن کی تعلیم کی بھی جب وہ ضرورت پوری ہو چکی تو اس کی تعلیم کو حذف کر دیا گیا اور صرف تعلیم دین رہ گئی اور اس تعلیم کا شروع حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے ہوتا ہے اس واسطے ان کو اول نبی کہا گیا اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ تعلیم دنیا بھی بقدر ضرورت ہوئی ہے مگر نبوت کا یہ اصلی کام نہیں ہے ہاں ضرورت کی وجہ سے اس کی اجازت ہے اور اس پر مدت تک عمل بھی رہا اس سے تعلیم دنیا کی تعلیم دین کے ساتھ برابری ہرگز لازم نہیں آتی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک بہت بڑا حاکم مثلاً وائسرائے ہے کہ اس کا اصلی کام انتظام ملکی ہے لیکن اگر کہیں ضرورت پڑ جائے اور کوئی خادم موجود نہ ہو اور اس وجہ سے اس کو اور کام بھی مثلاً کھانا پکا لینا یا کپڑا سی لینا وغیرہ کرنا پڑ جائے اب اگر کوئی اس کو یہ کام کرتے ہوئے دیکھے اور کپڑے سینے اور کھانے پکانے کو وائسرائے کا کار منصبی سمجھنے لگے یا ان کاموں کو انتظام کے برابر قرار دینے لگے تو خام خیالی ہوگی یا نہیں۔ اسی طرح محض یہ دیکھ کر کہ کسی وقت تعلیم دنیا کی انبیاء علیہم السلام نے کی تھی اس کو نبوت کی اصلی غرض کہنا یا اس کو تعلیم دین کی برابر سمجھنا ضرور خام خیالی اور غلطی ہے۔ آج کل بعض لوگ اس کو دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ تعلیم صنائع آدم علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام نبیوں نے کی ہے تو مولوی کیوں نہیں کرتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ان کی اتباع سے یہ شوق پیدا ہوا ہے تو جس نسبت کو انہوں نے محفوظ رکھا تھا وہی نسبت محفوظ رکھ کر آپ بھی مولویوں سے ان کاموں کو کرا سکتے ہیں اور بہت خوشی سے اس کی اجازت ہے وہ نسبت یہ ہے کہ تعلیم دنیا کو ان حضرات نے اصل مقصود اور منتہائے نظر نہیں قرار دیا تھا بقدر ضرورت تعلیم کی اور جب ضرورت پوری ہوگئی تو تقسیم عمل کا مسئلہ شروع ہو گیا کہ انبیاء علیہم السلام کے ذمہ سے اس کو الگ کر دیا گیا اور ان کو اس کام میں لگا دیا جو نبوت کا اصلی کام تھا اب ان کی تقلید کی صورت یہی ہے جو علماء کر رہے ہیں کہ خود اس کام میں لگے ہوئے ہیں جو ان کا اصلی کام ہے اور دنیا کی تعلیم اوروں کے حوالہ کر دی ہے۔

مصلح کا اصل کام تعلیم دین ہے

علماء نائب انبیاء علیہم السلام ہیں جو طریقہ ان کا تھا وہی ان کا ہونا چاہیے ان کی تقلید یہ کیسے ہوئی کہ اہل دنیا میں بھی دنیا کی تعلیم دیں اور اہل دین بھی دنیا ہی کی تعلیم دیں۔ آخر اس صورت میں دین کی تعلیم دینے کون آئے گا۔ شاید فرشتے آئیں گے لیکن اگر ایسا ہوا تو ان کے متعلق بھی مصلحان قوم کا فتویٰ یہی لگے گا کہ ان کو بھی تمدن ہی سکھلانا چاہیے۔ غرض دین کا نام نہ آنے پائے۔ کس قدر

عجیب بات ہے کہ طریقہ تو یہ اور دعویٰ انبیاء علیہم السلام کی تقلید کا۔ حضرت ان کی صحیح تقلید یہی ہے کہ دنیا کی تعلیم قدر ضرورت سے آگے نہ بڑھائی جائے اور یہ کہ اصلی کام مصلح کا تعلیم دین سمجھا جائے اور دنیا کی تعلیم دنیا والوں کے حوالہ کی جائے۔ نیز یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ انہوں نے تعلیم دنیا کس وقت میں کی جس وقت کی ضرورت تھی اور انسان کو کسی ذرا حاجت کا پورا کرنا نہیں آتا تھا۔

صنعت گری کا پہلا استاد کوا ہے

دیکھو قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تو اتنی بات سمجھ میں نہ آئی کہ اس کی لاش کو کیسے چھپاؤں' کرنے کو تو کر گیا مگر اب اس کا چھپانا مشکل ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ سال بھر تک لاش کندھے پر لادے پھرا اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی جس کو کوئی آدمی جانتا نہ ہو وہ چاہے واقع میں کیسا ہی آسان کام ہو مگر مشکل ہوتا ہے۔ دیکھئے منہ میں لقمہ رکھنا بھی کام ہے مگر بچہ کتنے دنوں میں سیکھتا ہے۔ غرض بہت پریشان تھا اور ڈرتا تھا کہ آدم علیہ السلام کو خبر نہ ہو جائے' دو کوے لڑتے ہوئے آئے قرآن شریف میں ہے کہ حق تعالیٰ نے ان دو کووں کو بھیجا' اللہ اللہ گناہ کے بعد بھی حق تعالیٰ ہی کی رحمت کی ضرورت ہوتی ہے یہ ان ہی کی شان ستاری ہے کہ گناہ گار کو فضیحت سے بچنے کی تدبیر بھی خود ہی بتاتے ہیں:

گنہ بیندو پردہ پوشد بحلم

(گناہ دیکھتا ہے اور حلم سے پردہ پوشی کرتا ہے)

غرض ایک کوے نے دوسرے کو مار ڈالا' پھر چونچ سے زمین کو کرید کر گڑھا کر کے اس میں اس کو سرکا کر مٹی برابر کر دی' تب قابیل کی سمجھ میں آیا کہ یہ تدبیر عیب چھپانے کی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی خود بھی کیا اور اس بار سے سبکدوش ہوا اور بہت ہی خفیف ہوا کہ اتنی سی بات بھی مجھے نہ آئی۔ دیکھئے انسان اس وقت اپنی ضروریات کے پورا کرنے سے اس قدر عاری تھے ایسے وقت میں حق تعالیٰ نے بذریعہ انبیاء علیہم السلام کے دنیا کی ضروریات کا علم بھی دیا۔ اس وقت پر قیاس کرنا محض غلط ہے جب وہ ضرورتیں پوری ہو گئیں تو منصب نبوت سے ان کو الگ کر لیا گیا اور اس قصہ سے معلوم ہوا کہ صنعت میں کوا قابیل کا بھی استاد ہے۔ کوے کی تو اہل صنعت کو بہت قدر کرنی چاہیے۔ یہ کوے جو آج کل ہیں وہ اصل موجد نہ سہی مگر اس کے ہم جنس تو ہیں اور ممکن ہے اسی کی نسل کے ہوں تو یہ استاد زادے ہوئے ان کی تو آؤ بھگت کیا کریں ان کو مارنا بھگانا برا بھلا کہنا چاہیے (مسکرا کر) عورتیں ان کو بہت برا بھلا کہتی اور کوستی رہی ہیں۔ (وجہ یہ کہ کام بھی ان ہی کو ان سے زیادہ پڑتا ہے' آٹا نوچ کر لے جاتے ہیں' روٹی پکانا دشوار کر دیتے ہیں) خیر یہ تو لطیفہ تھا اصل

بیان یہ تھا کہ یہ مسلم ہے کہ اکثر صنعتوں کا علم بھی وحی سے ہوا مگر سخت ضرورت کے وقت ہوا جب بقدر ضرورت حاصل ہو گیا تو اس کو منصب نبوت سے الگ کر دیا گیا۔ اس واسطے نوح علیہ السلام کو اول نبی کیا گیا کہ ان سے اس کی ابتداء ہوئی۔ تو اگر دنیا ہی مقصود ہے تو دین کی تعلیم کے لیے انبیاء علیہم السلام کو کیوں بھیجا' اتنے بکھیڑوں میں کیوں ڈالا۔ کہیں حکم ہے وضو کرو' کہیں صبح سویرے اٹھو' جاڑے میں مرتے ہوئے مسجد میں جاؤ' میٹھی میٹھی نیند کھوؤ۔ بس کافی تھا کہ لا الہ الا اللہ بتا دیتے' احکام بالکل نہ ہوتے' آزاد پھرا کرتے بلکہ لا الہ الا اللہ کی بھی ضرورت نہ تھی جیسے اس محقق نے کہہ دیا کہ توحید فطری ہے۔ جس کے سکھلانے کی بھی ضرورت نہیں تو کارخانہ رسالت ہی (نعوذ باللہ) سب فضول و بیکار رہا کیونکہ جو امر فطری ہے اس کو طبیعت خود سکھا لیتی ہے۔ ایک نبی کی بھی ضرورت نہ تھی۔ ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' (ہم سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) یہ تو الحاد اور زندقہ ہے۔ اس وقت مجمع اہل اسلام کا ہے اس واسطے اس مضمون کو میں طول نہیں دیتا اور مسلمانوں کی ضرورت کی بات بتلاتا ہوں۔

کلمہ طیبہ کی فضیلت

وہ یہ کہ جیسا حدیث میں آیا ہے کہ جو کوئی لا الہ الا اللہ کہے وہ جنت میں جائے گا ایسے ہی دوسری طرف محکمہ رسالت بھی موجود ہے اور ظاہر ہے کہ وہ عبث نہیں تو ماننا پڑے گا کہ لا الہ الا اللہ کہنے پر جنت پر موعود ہونے کے معنی کچھ اور ہیں اور وہ معنی بیان کرنے سے پہلے میں ایک مثال دیتا ہوں اس سے بخوبی یہ مضمون ذہن نشین ہو جائے گا وہ یہ کہ اطباء کہتے ہیں کہ بیضہ نیم برشت مولد خون ہے اور یہ اطباء کا متفق علیہ مسئلہ ہے اور تجربہ سے بھی ثابت ہے کہ جس کے بدن میں خون کم ہو گیا ہو وہ اس کو چند روز استعمال کرے تو بدن حالت اصلی پر آ جاتا ہے اور رنگ و روپ نکل آتا ہے۔ یہ سب خون کے پیدا ہونے کے آثار ہیں اب فرض کیجئے کہ ایک شخص بہت سے انڈے کھانا شروع کرے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کرتا رہے کہ روزمرہ فصد کھلواتا رہے اور وہ ایک سال تک ایسا ہی کرے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ اس کا جسم بڑھے گا یا گھٹے گا۔ ظاہر ہے کہ بڑھے گا نہیں گھٹے ہی گا بلکہ مر جائے گا۔ اب فرض کرو کوئی دیکھنے والا اگر یہ کہے کہ انڈے میں تو تولید خون کی خاصیت تھی وہ کہاں گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ طبی تحقیق غلط ہے تو اس کا جواب ہر شخص یہی دے گا کہ بیضہ میں تو خاصیت تولید خون کی بیشک تھی مگر وہ اس وقت ظاہر ہو سکتی تھی جبکہ اس کی شرط بھی پائی جاتی اور منافی کا وجود نہ ہوتا اور جبکہ وہ فصد سے خون نکالتا رہا تو بیضہ کہاں تک کافی ہو سکتا تھا۔ ایک

طرف سے حوض میں پانی ڈالا جائے اور دوسری طرف سے اس سے بڑا پرنالہ پانی نکلنے کے لیے کھول دیا جائے تو وہ حوض تو قیامت تک بھی نہ بھرے گا۔ تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اوپر سے پانی نہیں آ رہا تھا ہرگز نہیں۔ پانی بے شک آ رہا تھا مگر حوض بھرا اس لیے نہیں کہ اس سے زیادہ نکل رہا تھا اور پانی کے آنے سے حوض بھر جانے کی شرط یہ تھی کہ نکلنے کا سوراخ نہ ہوتا' سوراخ کا کھلنا بھرنے سے مانع ہو گیا۔ جب شرط موجود ہو اور مانع مرتفع ہو تب بھرنے کا ترتب ہو سکتا ہے اور مانع کے موجود ہوتے ہوئے یا تو اثر باطل ہو جائے گا یا ضعیف ہو جائے گا۔ جیسا مانع ہو۔

کلمہ طیبہ کے حصول خواص کے ضروری شرائط

پس ثابت ہوا کہ ہر چیز کے اثر کے لیے تحقیق شرط اور ارتفاع مانع ضروری ہے تو حضور کے اس ارشاد "مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ"[1] (جس شخص نے لا الہ الا اللہ" اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں" کہا وہ شخص جنت میں داخل ہوا) کا یہ مطلب کیوں نہیں لیا جاتا کہ اس میں تو خاصیت یہی ہے کہ جنت میں لے جائے مگر اس کے لیے کچھ شرائط اور موانع بھی ہیں۔ اگر موانع کا وجود یا شرائط کا فقدان ہوا تو اس کے وجود یا فقدان کے درجہ کے موافق یہ اثر ہوگا کہ لا الہ الا اللہ کا اثر باطل یا ضعیف ہو جائے گا اگر پورا معارض موجود ہو گیا جیسے کفر و شرک تو اس کا اثر بالکل باطل ہو جائے گا اور اگر پورا معارض موجود نہ ہوا جیسے معاصی تو اثر ضعیف ہو جائے گا۔ یہ تو اس معارض کا اثر ہے اور لا الہ الا اللہ کا اثر یہ ظاہر ہوگا کہ انجام کار جنت میں پہنچے گا۔ اب یہ مسئلہ بالکل بے غبار ہو گیا۔ خلاصہ یہ کہ لا الہ الا اللہ کا پورا معارض تو کفر ہے قولاً یا اعتقاداً اگر کوئی ساری عمر لا الہ الا اللہ کہتا رہا مگر کلمہ کفر بھی بکتا رہا یا کوئی عقیدہ کفر کا رہا تو بوجہ وجود قوی مانع کے لا الہ الا اللہ کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا جیسے انڈے کھانے کے ساتھ فصد کھلوانے سے انڈے کا کوئی اثر نہ ہو سکا اور ناقص معارض گناہ ہیں اگر کوئی کلمہ پڑھنے کے ساتھ گناہوں میں بھی مبتلا ہو تو لا الہ الا اللہ کا اثر ضعیف ہو جائے گا لیکن کچھ نہ کچھ رہے گا اور وہ اس طرح ظاہر ہوگا کہ اول گناہوں کی سزا ہوگی پھر لا الہ الا اللہ کا اثر ظاہر ہوگا اور دخول جنت نصیب ہوگا۔

ہر عمل کے الگ الگ خواص

خلاصہ یہ ہوا کہ اعمال میں جدا جدا خاصیت ہے اور اپنا اپنا اثر سب کرتے ہیں ان دونوں حدیثوں میں تعارض نہ رہا جس میں یہ ہے: "قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ" وہ بھی ٹھیک ہے اور

---

[1] (کنز العمال: ۲۰۸)

جس میں یہ ہے: "لَایَدْخُلُ الْجَنَّۃَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ مِّنْ کِبْرٍ"[۱] (جس کے دل میں ذرا برابر کبر ہے وہ جنت میں داخل نہ ہوگا) وہ بھی ٹھیک ہے کلمہ کا وہ اثر ہے اور کبر کا یہ اثر ہے۔ ایمان موجب دخول جنت ہے اور کبر مانع دخول جنت تو اگر مانع ایسا قوی ہوا کہ پورا معارض ایمان کا ہوگیا مثلاً حق تعالیٰ کی بندگی ہی سے انکار کردیا تو ایمان کا اثر باطل ہوجائے گا اور اگر ضعیف ہوا تو بقدر اپنے وجود کے اثر کرے گا اور اخیر میں غلبہ ایمان کو رہے گا بالکل سمجھ میں آتی ہوئی بات ہے مگر مدعیان عقل نے حدیث "قَالَ لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ"[۲] میں اپنے مطلب کے واسطے من کو تو عام لے لیا کہ جو بھی لا الہ الا اللہ کہہ لے خواہ اعمال کرے یا نہ کرے اس کے لیے دخول جنت ثابت ہے لیکن اگر ان سے کہا جاتا ہے کہ اسی حدیث کے دوسرے لفظ یعنی دخل الجنۃ کو عام کیوں نہیں لیا جاتا جس سے یہ معنی ہوجاتے ہیں کہ دخول جنت بیشک ثابت ہے مگر عام ہے اس سے کہ ابتداء ہو یا بعد سزا و جزا ہو جو شخص سزا پاکر جنت میں جائے تو اس پر بھی تو دخل الجنۃ صادق ہے تو نہیں سمجھتے ذرا سی بات تھی کہ لفظ من کو عام لے کر دخل الجنۃ کو بھی عام لینا چاہیے پھر کوئی اشکال نہیں مگر نہیں سمجھتے اور یاد رکھو کہ ترجمہ دیکھنے سے یہ باتیں سمجھ میں نہیں آسکتی ہیں ان کے لیے تو استاد کی ضرورت ہے۔ یہ اچھی زبردستی ہے کہ ایک ہی حدیث میں دو لفظ ہیں ایک کو عام لیا جائے اور دوسرے کو عام نہ لیا جائے یا تو دونوں کو عام لیجئے تو آپ کا مطلب ثابت نہ ہوگا اور ہمارا مطلب ثابت ہوگا اور اگر دخل الجنۃ کو خاص لیجئے دخول ابتدائی کے ساتھ تو میں بھی من قال کو خاص کروں گا یعنی شرائط کے ساتھ تب بھی ہمارا ہی مطلب ثابت ہوگا۔ اس تحقیق سے شبہ رفع ہوگیا اور بناء اس کی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں حدیثوں میں ایک ایک عمل کے خواص بیان فرمائے ہیں: حدیث ہے: "مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ مِّنْ کِبْرٍ لَمْ یَدْخُلِ الْجَنَّۃَ"[۳] (جس کے دل میں ذرا برابر کبر ہے وہ جنت میں داخل نہ ہوگا) من کبر کی خاصیت بیان فرمائی ہے اور حدیث "قَالَ لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" میں کلمہ اسلام کی خاصیت بیان فرمائی ہے۔ کبر کی خاصیت یہی ہے کہ جہنم میں لے جائے جیسے سنکھیا کی خاصیت یہ ہے کہ کھانے والا مر جائے اور اس کی خاصیت ضرور ظاہر ہوگی کہ جس میں یہ ہوگا جنت میں نہ جائے گا مگر ایک چیز اور موجود ہے جس کی خاصیت جنت میں لے جانا ہے اور وہ اس سے زیادہ قوی ہے۔ گویا اس کا تریاق ہے اس کا اثر بھی ضرور ظاہر ہوگا اس کا نام ایمان ہے وہ اخیر میں جنت میں ضرور لے جائے گا اب دونوں پر کیا اشکال باقی رہا۔

---

[۱] (الصحیح لمسلم کتاب الایمان ب: ۳۹) [۲] (کنز العمال: ۲۰۸)
[۳] (الصحیح لمسلم کتاب الایمان ب: ۳۹)

علوم وحی میں تعارض نہیں ہوسکتا

اس تحقیق سے ساری حدیثیں اپنی اپنی جگہ پر رہتی ہیں اور کوئی کسی کے متصادم نہیں ہوتی اور کیوں نہ ہو یہ اسی پیغمبر کا کلام ہے جن کو خود خدا تعالیٰ نے تعلیم دی ہے۔ ''عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمِیْ'' (صلی اللہ علیہ وسلم) تعارض بین الاقوال (اقوال ایک دوسرے کے مقابل آنا سب سے برا عیب ہے) بدترین عیب ہے۔ علوم وحی بالکل اس سے مبرا ہیں۔ الغرض اتنی تقریر سے یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی کہ اعمال میں بھی خواص ہیں جیسے ادویہ میں خواص ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جس طرح طبیب سے بیان خواص میں مزاحمت نہیں کی جاتی اسی طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان خواص اعمال میں مزاحمت نہیں ہوسکتی اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جس طرح کسی دوا کی خاص خاصیت سن کر اس کو ہر حال میں عام قرار نہیں دیا جاتا بلکہ شرائط وموانع کا بھی اعتبار کیا جاتا ہے اسی طرح کسی عمل (مثلاً لا الہ الا اللہ) کی خاصیت سن کر اس کو عام سمجھنا جائز نہیں اور یہ سب تمہید تھی اس کے سننے کے بعد مہتم بالشان ہونا اس حدیث کے مضمون کا جس کو میں نے پڑھا ہے معلوم ہوا ہوگا کیونکہ اس حدیث میں دو چیزوں کی خاصیتیں بیان فرمائی گئی ہیں جن کا علم وحی سے ہوا ہے اور یوں تو اعمال شرعی سب ہی ضروری ہیں اور سب ہی میں خواص ہیں اور ان سب کا جاننا مفید ہے کچھ ان ہی دو عمل کی تخصیص نہیں جو حدیث میں مذکور ہیں لیکن بعض وجوہ سے یہ بہت زیادہ ضروری ہیں جو اس حدیث میں مذکور ہیں ایک وجہ تو یہ کہ فی نفسہ مہتم بالشان ہیں دوسری وجہ کہ بدون بتلائے ان کا علم نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ دونوں اس قسم کے اعمال میں سے ہیں جن کے خواص کا علم بلا وحی کے نہیں ہوتا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ان کی طرف سے غفلت بہت ہے اور جس چیز کی طرف سے غفلت ہو اس کی تعلیم زیادہ ضروری ہوتی ہے اور جن دو چیزوں کا اس حدیث میں ذکر ہے ان میں سے ایک نافع ہے اور ایک مضر ہے اور دونوں سے غفلت ہے۔ نہ نافع سے فائدہ حاصل کیا جاتا ہے نہ مضر کے نقصان سے بچایا جاتا ہے۔ یہ وجوہ ہیں اس حدیث کے مضمون کے ضروری ہونے کی اب میں ترجمہ کرتا ہوں حدیث کا اس سے تعیین ہو جائے گی میرے اس وقت کے مقصود کی۔ سو سنئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''اِنَّ الشَّیْطَانَ جَاثِمٌ عَلٰی قَلْبِ ابْنِ آدَمَ''[1] جثوم کہتے ہیں سینہ جما کر بیٹھنے کو تو ترجمہ یہ ہوا کہ شیطان سینہ جمائے بیٹھا ہے ابن آدم کے قلب پر۔ جب جانور سینہ جمالیتا ہے کسی چیز پر تو اس کا پورا قبضہ ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ شیطان انسان کے دل پر پورا قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔ ''فَاِذَا

---

[1] (تفسیر القرطبی ۲۰: ۲۶۲)

ذَکَرَ اللّٰہَ خَنَسَ" جب آدمی ذکر کرتا ہے تو وہ ہٹ جاتا ہے واذا غفل وسوس اور جب غافل ہوجاتا ہے ذکر سے تو وہ وسوسہ ڈالتا ہے نافع اور مضر دونوں جزو کا ترجمہ ہوگیا۔ ذکر اور غفلت اس سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ذکر میں خاصیت ہے شیطان کے ہٹانے کی اور غفلت میں خاصیت ہے شیطانی وسوسہ پیدا کرنے کی۔ یہ دو عمل ہیں یعنی ذکر وغفلت اور ان کے یہ دو اثر ہیں یعنی خنس اور وسوسہ باقی اس میں دونوں جگہ اثر کی حد مذکور نہیں' خواہ کہیں تک یہ اثر پہنچ جائیں اس بناء پر ان کا مہتم بالشان ہونا زیادہ ثابت ہوگیا کہ ذکر کا نفع جب غیر محدود ہے تو بہت زیادہ قابل اعتناء ہے اور اسی طرح غفلت کا ضرر جب غیر محدود ہے تو بہت زیادہ قابل حذر ہے۔

ذکر کی غرض دفع خطرات سمجھنے میں دو غلطیاں

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ذکر اور غفلت کے ابتدائی اثر کو بیان کیا ہے ابتدائی کی قید میں نے اس واسطے لگائی ہے کہ ذکر کی ضرورت صرف یہی نہ سمجھی جائے کہ اس سے وسوسے رفع کر لیے جائیں اور بس آج کل بہت لوگ اسی کو بڑی دوڑ سمجھتے ہیں کہ ذکر کر کے خطرات کو رفع کرلیا۔ اگر خطرات رفع ہوگئے تو بڑے کامل ہوگئے اب آگے اور کہیں کی ضرورت نہیں رہی۔ اس میں دو غلطیاں ہیں ایک یہ اگر اس کے بعد پھر خطرات آ گئے تو سمجھا کہ ہمارا حال نہایت خراب ہے اور ہمارا ذکر و طاعت لاشئی ہے اتنا بھی فائدہ نہیں پہنچا کہ خطرات ہی رفع ہوجائیں' اس سے یاس پیدا ہوجاتا ہے اور اس یاس سے بسا اوقات اعمال چھوٹ جاتے ہیں کیونکہ نفس کہتا ہے کہ جب ذکر وطاعت سے کچھ حاصل نہیں تو کیوں مشقت اٹھائی۔ گویا حاصل نام ہے صرف رفع خطرات کا دوسری غلطی یہ ہے کہ جب خطرات دور ہوگئے تو قناعت ہوجاتی ہے کیونکہ اس کے زعم میں مقصود حاصل ہوگیا حالانکہ مقصود اس سے بہت آگے ہے اور رفع خطرات اس کا ایک مقدمہ ہے اس واسطے کہا گیا کہ یہ ابتدائی اثر ہے اور ظاہر ہے کہ ابتدائی اثر قناعت کی چیز نہیں مثلاً اگر کسی کو طبیب منضج کا نسخہ لکھ دے تو اس کو اس پر قناعت نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ منتہائے علاج نہیں ہے بلکہ مقدمہ علاج ہے۔ منتہائے علاج آگے آرہا ہے۔

قلب سے دشمن شیطان کو نکالنے کی تدبیر

اسی طرح ذکر کا اثر یہ بے شک ہے کہ اس سے خطرات رفع ہوتے ہیں مگر یہ منتہائے مقصود نہیں خطرات دفع کر کے تو یہ دشمن کو نکالا ہے اور دشمن کو ملک سے نکالا کرتے ہیں ملک کو آباد کرنے

کے لیے نہ یہ کہ نکالنا ہی مقصود اصلی اور منتہائے نظر ہے۔ تو تعجب ہے کہ ذکر سے رفع خطرات کر کے اسی پر قناعت کر لی جائے۔ شیطان کو ہٹایا تو تھا تعمیر باطن کے لیے پھر اس پر بس کیوں کر لیا۔ اب ملک خالی ہوا ہے اغیار سے تو اطمینان کے ساتھ اس کو آباد کرو اور باغ لگاؤ وہ باغ کیا ہے اعمال صالحہ کا باغ ہے اب باغ لگاؤ کھیتی کرو جب تک دشمن موجود تھا اس وقت تک ان کا کچھ لطف نہ تھا کیونکہ ادھر آپ نے باغ لگایا اور کھیت تیار کیا' ادھر اس نے تلف کر دیا۔ اب جب اس کو نکال دیا تو اب جو کام بھی کیا جائے گا اس میں کامیابی خاطر خواہ ہوگی اور تلف وغیرہ سے اطمینان ہوگا۔ سو ذکر پر کفایت نہ کرو بلکہ اعمال بھی اختیار کرو ورنہ کتنا ہی بڑا ذکر ہو اعمال سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اگر چہ ذکر کا اثر یعنی رفع خطرات اس کے قلب میں کسی درجہ کا بھی پیدا ہو گیا ہو کیونکہ ذکر تو اعمال کے اچھے ہونے کا ذریعہ ہے باقی مقصود اصلی اعمال ہی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں دشمن کو نکالنے کی ترکیب بتائی ہے اس کے بعد تعمیر وطن کرو اعمال سے۔ دیکھئے توپ بھی بادشاہ کے لیے ضروری چیز ہے اور بدون اس کے سلطنت نہیں ہو سکتی اور اس کا اثر دشمن کو نکال دینا ہے۔

ذکر کے علاوہ اعمال حسنہ کی ضرورت

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ساری عمر توپ ہی داغا کرو آج کل اس مشرف کے لوگ بھی ہیں کہ ذکر و شغل میں مصروف ہوئے اور اس کا کچھ اثر پایا بس ان کو قناعت ہو گئی گویا معراج ہو گئی اور تمام کمالات حاصل ہو گئے اور جو ان سے کہا جائے کہ اور بھی کچھ کرنا چاہیے تو کہتے ہیں ذکر خدا سے بھی کوئی بڑی چیز ہے اور لذکر اللہ اکبر پڑھ دیتے ہیں اور یہ سب خرابی علم دین نہ ہونے کی ہے کہ بات بات میں الجھن ہوتی ہے۔ میں بہ قسم کہتا ہوں کہ دین کا راستہ صاف ہے مگر صاف راستہ کے لیے بھی تو دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے سڑکیں کیسی ہی چکنی اور صاف ہوں مگر ان سے بھی تو واقفیت کی ضرورت ہے کوئی نئے راستہ پر بلا رہبر کے نہیں چل سکتا بلکہ بسا اوقات دیکھے ہوئے راستہ پر بھی رہبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ایک حسی سڑک کا یہ حال ہے جو آنکھ سے سیکھنے کی چیز ہے تو اس راستہ کا کیا حال ہوگا جو آنکھ سے دیکھنے کی چیز بھی نہیں۔ کس قدر فاش غلطی ہے ان لوگوں کی جو اپنی رائے اور عقل کو دین کی راہ میں کافی سمجھتے ہیں۔ نتیجہ سوائے اس کے کچھ بھی نہیں ہوتا کہ قدم قدم پر غلطی کرتے ہیں اور منہ کے بل گرتے ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ دین میں غلطی کرنے والا کہاں گرتا ہے۔ سڑک پر غلطی کرنے والا تو بہت سے بہت یہ کہ منزل مقصود تک نہ پہنچے گا جو کہ بالذات بھی مقصود نہیں یا کسی کھائی اور گڑھے میں گر جائے گا جو ایک قابل برداشت ہلاکت ہے مگر

دین کے راستہ میں غلطی کرنے والا جہاں گرتا ہے اس کا نام جہنم ہے جو نا قابل برداشت ہلاکت ہے اسی رائے کے اتباع سے بڑے بڑے عقلاء نے ذات وصفات کے مسائل میں بڑی بڑی موشگافیاں کیں جن کولوگوں نے بہت ہی نظر استحسان سے دیکھا اوران کو بڑا محقق سمجھا مگر جب وحی آئی تو معلوم ہوا کہ تحقیق سے ان کو مس بھی نہ تھا اور سارے اقوال خیال ڈھکوسلے تھے اور بالکل وہ حالت ہوئی جیسے ایک اندھا آدمی ایک ایسی چیز کی نسبت کوئی رائے ٹٹول کر قائم کرے جس کو اس سے پہلے ٹٹول کر بھی نہ دیکھا ہو پھر ایک دم اس کی آنکھ روشن ہو جائے تو اس وقت وہ لاحول پڑھے گا کہ میں نے کیا سمجھا تھا اور کیا نکلا۔ اسی طرح آج کل بھی جولوگ عقل کے مدعی ہیں اور اپنے نزدیک کسی چیز کی نسبت پورے وثوق کے ساتھ رائے قائم کر لیتے ہیں جب اہل حق سے مقابلہ ہوتا ہے تو ذرا دیر میں ان کی تحقیقات لاشی محض نظر آنے لگتی ہیں۔ آخر حق حق ہے اور باطل باطل۔ ''قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقاً'' (آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے کہ حق (سچا دین) آیا اور باطل مٹ گیا بے شک باطل مٹے) بس اسی واسطے دوسرے کی اتباع کی ضرورت ہے۔ یہ بڑی غلطی ہے کہ آدمی اپنی عقل کو کافی سمجھ لے۔ اس سے چھوٹی سے بڑی تک سب ہی قسم کی غلطیاں ہوسکتی ہیں۔

عقل اور نقل میں مناسبت

اس کا راز یہ ہے کہ عقل ایک قوت مدرکہ کا نام ہے حق تعالیٰ نے یہ قوت انسان کو عطا فرمائی ہے تا کہ وہ بھلے برے میں تمیز کر سکے جیسے اور بھی حواس عطا فرمائے ہیں مگر جس طرح تمام حواس کا احساس محدود ہے مثلاً آنکھ ایک حاسہ ہے جو ایک سمت کو دیکھ سکتی ہے ایک آن میں دوسمت پر نظر کر سکتی ہے اور مسافت بھی اس کے دیکھنے کی محدود ہے۔ علیٰ ہذا سمع بھی ایک حاسہ ہے اور اس کا احساس گو کسی سمت کے ساتھ خاص نہیں مگر محدود وہ بھی ہے کہ خاص مسافت تک کی آواز مسموع ہوسکتی ہے اس سے آگے کی نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح عقل کے ادراک کی بھی ایک حد ہے جیسے ان حواس کے احساس کی تھی پھر اس کو مطلق العنان اور غیر محدود کیوں سمجھا جاتا ہے کہ اس کے ادراک کے لیے کوئی حد ہی نہیں مانی جاتی بلکہ جس طرح آنکھ آلہ مبصرات ہے اور ایک حد پر رک جاتی ہے اور اس سے آگے کے لیے ضرورت ہوتی ہے دوربین کی اور اس اعانت سے آنکھ بہت بڑھ جاتی ہے ایسے ہی عقل کا ادراک بھی ایک حد پر رک جاتا ہے۔ وہاں ضرورت ہے وحی کی اس کی مدد سے وہ بہت کام دے سکتی ہے اور ہر برے بھلے میں فرق کر سکتی ہے۔ بس وحی کو عقل سے وہی نسبت ہے

جو دوربین کو آنکھ سے ہے اور گو اس صورت میں بھی ادراک عقل ہی سے ہوتا ہے مگر وحی کی اعانت سے اور بلا اس کے وہ اپنی ذاتی حد سے آگے ادراک نہیں کر سکتی جیسے دوربین میں بھی دیکھا آنکھ ہی نے مگر دوربین کی مدد سے اور بلا اس کے وہ بہت دور کی چیز کا احساس نہیں کر سکتی تھی اور اگر بلا دوربین کے دیکھے گی بھی تو ایسی غلطی کرے گی جیسے اندھا آدمی کرتا ہے۔ اسی طرح ان باتوں میں جن میں عقل کافی نہیں ہے اگر عقل محض سے کام لیا جائے گا تو ایسی غلطیاں صادر ہوں گی جیسے بے عقل سے ہوتی ہیں۔ چنانچہ عقلاء کی تحقیقات کو دیکھئے کہ بالکل مجنونانہ ہیں اور وحی سے ان کی غلطی پکڑنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض مجنونانہ بکواس تھیں تو ان امور میں جو وحی سے تعلق رکھتے ہیں عقل محض کو دخل دینا سوائے بددینی اور بدعقلی کے اور کیا ہے۔ اس تقریر سے بخوبی ثابت ہو گیا کہ احکام نقل عقل سے بالاتر ہیں جیسے دوربین کے مدرکات آنکھ کے مدرکات سے بالاتر ہیں اور جو چیز دوربین ہی سے نظر آسکتی ہے اس میں صرف آنکھ سے کام لینا جائز نہیں بلکہ دوربین سے اس میں اعانت لینی پڑے گی اور اس کا اتباع کرنا پڑے گا۔ اگرچہ بدون دوربین کے آنکھ سے وہ چیز بالکل بھی نظر نہ آتی ہو اس سے بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ دین کے بارے میں بھی حکم یہی ہوگا کہ اگر دین عقل محض سے بالکل بھی سمجھ میں نہ آتا ہو تب بھی دین کا اتباع چاہیے تھا جیسے مبصرات بعیدہ میں دوربین کا اتباع کرنا پڑا تھا۔ میری اس تقریر سے عقل و نقل کی باہمی نسبت بخوبی واضح ہوگئی اور اس سے یہ مسئلہ بھی بخوبی حل ہو گیا کہ ہم کو دین کے اتباع کی ہر حال میں ضرورت ہے گو اس کی بعض باتیں ہماری سمجھ میں بھی نہ آئیں۔ اگرچہ واقع میں دین کا راستہ بالکل صاف اور اس میں بعید از عقل کوئی بات نہیں مگر بعض دفعہ عقل کام نہیں دیتی تو اسی طرح محض رائے سے ذکر کو کافی سمجھنا یہ بھی جہل محض ہے ورنہ تعلیم شرائع کی اساس ہی منہدم ہوئی جاتی ہے۔

صرف ذکر لسانی کافی نہیں

غرض خوب سمجھ لو کہ محض ذکر زبانی کافی نہیں ہے بلکہ اعمال نماز روزہ وغیرہ کی بھی ضرورت ہے۔ دین بدون ان کے کامل نہیں ہوتا ذکر میں شیطان کو بھگانے کی خاصیت بے شک ہے۔

دل اعمال صالحہ سے آباد ہوگا

اور یہ ایسی خاصیت ہے جیسے توپ خانہ میں دشمن کے بھگانے کی مگر توپ خانہ قائم جب ہی رہے گا جبکہ میگزین موجود ہو اور میگزین مہیا کرنے کے لیے ملک کی آبادی کی ضرورت ہے اگر

ملک آباد نہ ہوگا تو میگزین کہاں سے آئے گا اور توپ خانہ کیا کام دے گا ایسے ہی ذکر میں بے شک خاصیت ہے قلب کی حفاظت کی مگر یہ اثر اس میں جب ہی کام دے گا جبکہ ملک قلب آباد بھی ہوا اور قلب کی آبادی اعمال صالحہ سے ہوتی ہے بدون اعمال کے خالی ذکر ایسا ہی معطل رہے گا جیسے توپخانہ بلامیگزین کے اس تقریر سے ذکر کا اثر بھی بحال رہا۔صرف یہ بات مزید ہوئی کہ اس کے اثر کے لیے کچھ شرائط ہیں اور وہ اعمال ہیں اس سے اعمال کی ضرورت ثابت ہوئی اور اس مذاق کی غلطی ظاہر ہوگئی کہ مجرد ذکر کافی ہے اعمال کی حاجت نہیں ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کا اثر ابتدائی بیان فرمایا ہے کہ اس سے شیطان ابن آدم کے قلب سے ہٹ جاتا ہے ویسے ہی ذکر کے مقابل یعنی غفلت کا بھی ابتدائی اثر بیان فرمایا ہے اور اس قید ابتدائی کی توضیح بخوبی ہوگئی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ذکر کا یہ اثر کہ شیطان ہٹ جائے اور غفلت کا یہ اثر کہ شیطان قلب پر مسلط ہو جائے اثر ابتدائی ہے پس اس سے آگے کے آثار اور نتائج کی نفی لازم نہیں آتی۔سو غفلت کا نتیجہ بھی کوئی صرف یہی نہ سمجھے کہ شیطان قلب پر آجاتا ہے اور بس یہ تو جڑ ہے آگے پھر اس میں پھل پھول پیدا ہوتے ہیں وسوسہ صرف ابتدائی نتیجہ ہوتا ہے غفلت کا پھر کبھی اس وسوسہ سے حدیث النفس کی نوبت آتی ہے۔

وسوسہ کس صورت میں مضر ہو جاتا ہے؟

پھر حدیث النفس سے عزم اور فعل کی نوبت آتی ہے وہ وسوسہ کے مرتبہ میں تو مضر نہ تھا مگر اس پر اتنے مرتبے اور متفرع ہو گئے اب وہ وسوسہ مضر ہو گیا یعنی بواسطہ عزم اور فعل کے اور بواسطہ کی قید میں نے اس لیے بڑھادی کہ کوئی یہ نہ کہے کہ وسوسہ کو تو ابھی غیر مضر کہا تھا اور اب مضر کہہ دیا اور یہ تعارض ہے اس قید سے جواب نکل آیا کہ وسوسہ فی نفسہ خود تو مضر نہیں ہاں بواسطہ مضر ہو گیا۔ یعنی وسوسہ غیر مضر اسی وقت تک ہے جب تک کہ وسوسہ رہے اور جب عزم وفعل کے مرتبہ میں آ گیا اب مضر ہے تو وسوسہ کی دو حالتیں ہیں کبھی تو یہ نوبت ہوتی ہے کہ دل میں جم گیا اور عزم وفعل تک پہنچ گیا۔ یہ درجہ مضر ہے اور کبھی اس کا مصداق ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ۝

حق تعالیٰ متقین کی شان میں اور ان کی مدح میں ارشاد فرماتے ہیں کہ جب ان کو شیطان کی طرف سے کسی وسوسہ کا اثر ہوتا ہے تو وہ فوراً ہوشیار ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اس سے وہ صاحب بصیرت بن جاتے ہیں۔اس آیت سے معلوم ہوا کہ وسوسہ بعض حالتوں

میں مضر نہیں ہوتا یہ وہ صورت ہے کہ شیطان نے وسوسہ ڈالا مگر تم نے اس کو قلب سے معاً دفع کر دیا اور اس دفع سے میری یہ مراد نہیں کہ وسوسہ کے پیچھے پڑ گئے اس کا بالکلیہ استیصال ہو جائے کیونکہ یہ تو وسوسہ والے کو بہت مضر ہوتا ہے اور جوں جوں وہ دفع کرتا ہے اتنی ہی اس میں زیادتی ہوتی ہے۔

وسوسہ کا علاج

وسوسہ کا علاج تو یہی ہے کہ براہ راست اس کے دفع کی طرف بھی توجہ نہ کی جائے بلکہ مراد دفع سے یہ ہے کہ وساوس سے توجہ کو ہٹا کر ذکر کی طرف پھیر دے اور کام میں لگ جائے اور وسوسہ کی طرف التفات ہی نہ کرے اس درجہ میں وسوسہ سے نقصان نہیں ہوتا یہی مراد ہے تذکروا سے اس آیت میں اور اسی پر متقین کی مدح کی گئی ہے۔

وسوسہ غفلت کا ابتدائی اثر ہے

پس خوب سمجھ لیجئے کہ وسوسہ غفلت کا ابتدائی اثر ہے اور یہ ضرور نہیں کہ اس سے آگے اور کچھ نتیجہ پیدا نہ ہو ممکن ہے کہ اور نتائج برے سے برے پیدا ہو جائیں۔ بنا بریں غفلت جو موجب وسوسہ ہے یہ بھی گناہ ہی کی طرح بواسطہ مضر ہو جائے گی کیونکہ وہ مقدمہ ہے ضرر کا اور اندیشہ ہے اس کے نتائج بڑھنے کا (مقدمة الشئی فی حکمه) اس کو معمولی بات نہ سمجھا جائے۔

سر چشمہ شاید گرفتن بہ میل   چو پر شد نشاید گذشتن بہ پیل

(چشمہ کے سوت کو ابتدا ہی میں سوت سے بند کر سکتے ہیں لیکن بڑھ جانے پر اگر ہاتھی بھی رکھو گے تو پر نہ ہوگا)

وسوسہ گناہ کا مقدمہ ہے

چنانچہ ہر گناہ میں اول وسوسہ ہی ہوتا ہے پھر دل میں وہ خیال پکتا ہی جاتا ہے تو وسوسہ کوئی معمولی بات نہ ٹھہری بلکہ مقدمہ ہے گناہ کا ہاں اس پر گرفت نہیں ہے بلکہ جب تک عزم اور فعل میں نہ آ جائے مگر وسوسہ کے بعد اس کے فعل میں آ جانے کا اندیشہ تو ضرور ہے تو اس بھروسے پر رہنا کہ اس خیال کو ہم آگے نہ بڑھنے دیں گے خلاف عقل ہے جب نفس چل نکلا اور کئی درجے طے کر گیا تو پھر عین وقت پر نفس کو روکنا سخت مشکل ہے۔ جیسے گھوڑا جب چل نکلے اور تیزی میں آ جائے تو مقام منہی عنہ سے اس کو ایک فرلانگ پہلے سے روکنا چاہیے ورنہ اگر ایک دم روکو گے تو نہیں رکے گا بلکہ تم ہی گر پڑو گے۔ اسی طرح اگر نفس کو روکنا ہے تو بہت دور پہلے سے روکئے اس بھروسے نہ رہے کہ وسوسہ تو گناہ

نہیں اور فعل کی نوبت ہم آنے نہ دیں گے نفس تو وہ چیز ہے کہ بڑے بڑے شاطروں کے قابو میں نہیں آتا کیونکہ گھوڑا تو ایک حیوان ہے جس کو عقل نہیں آپ کے قبضہ میں ہے جہاں چاہیں رک سکتا ہے۔ اپنی طرف سے وہ کوئی عذر رکنے میں نہیں کرسکتا۔ صرف وہ اپنی ایک طبعی بات سے مجبور ہے کہ تیز دوڑتے ہوئے ایک دم رک جانا اور بعض اوقات اس کو دشوار ہوتا ہے۔ نفس کی تو حالت یہ ہے اس کو آپ کے ساتھ دشمنی بھی ہے اور اس کی طبیعت بھی مکر بھی ہے وہ کوئی دقیقہ آپ کو نقصان پہنچانے میں اٹھا نہیں رکھتا اور اس کو وہ تدبیریں آتی ہیں کہ بڑے بڑے عقل مند بھی ان کو سمجھ نہیں سکتے۔ ایسی حالت میں اس کی باگ کو ڈھیلا چھوڑ کر یہ امید رکھنا کہ موقع پر روک لیں گے خام خیال ہے۔

اسرار شریعت

اس لیے شریعت نے اس کا بہت لحاظ کیا ہے کہ جس عمل سے روکنا ہے اس سے بہت دور پہلے سے روکا ہے اسرار شریعت میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس قاعدہ سے کس قدر کام لیا گیا ہے۔ دیکھئے شریعت نے نماز عصر اور نماز فجر کے بعد نوافل سے منع کیا۔ اس واسطے کہ اگر اجازت دی جاتی تو ممکن تھا کہ ایسے وقت میں بھی لوگ نماز پڑھنے لگتے جو نماز کا وقت نہیں ہے یعنی عین طلوع اور عین غروب کے وقت اس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ ممنوعات سے بچانے کے لیے شریعت نے پہلے سے انتظام کیا ہے اور دیکھئے حق تعالیٰ نے زنا کی حرمت اس لفظ سے بیان فرمائی ہے کہ **لاتقربوا الزنا** حالانکہ یہ لفظ بھی کافی تھا **لاتزنوا** یعنی زنا نہ کرو مگر بطور تاکید اور پیش بندی کے یہ لفظ اختیار کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ زنا کے قریب بھی مت جاؤ اور آدم علیہ السلام کو اکل من الشجرہ سے منع فرمانے کے لیے بھی "**لَاتَقْرَبَاهٰذِهِ الشَّجَرَةَ**" اختیار کیا گیا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے قریب بھی مت جاؤ اور ایک حدیث تو اس بارے میں صریح موجود ہے۔ "**مَنْ يَرْتَعْ حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِكُ اَنْ يَّقَعَ فِيْهِ**"[1] یعنی ارشاد فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کوئی سرکاری چراگاہ کے آس پاس بکریاں چرائے گا تو ممکن ہے کہ کوئی بکری چراگاہ میں بھی گھس جائے۔ یہ ٹکڑا ہے ایک حدیث کا وہ یہ ہے کہ:

اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ فَقَدِاسْتَبْرَءَ لِدِيْنِهٖ وَمَنْ يَرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِكُ اَنْ يَّقَعَ فِيْهِo[2]

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حلال بین ہے اور حرام بین ہے

---

[1] (جمع المسانید ۲: ۲۱۴) [2] (فتح الباری ۴: ۲۹۰)

اور دونوں کے درمیان میں مشتبہات ہیں یعنی وہ اعمال ہیں جن کا حلال وحرام ہونا پوری طرح واضح نہیں ہے ان کی نسبت فرماتے ہیں کہ جو شبہات سے بھی بچا رہے اس نے اپنے دین کو محفوظ کر لیا اور جو کوئی سرکاری چراگاہ کے قریب اپنے مویشی کو لے جائے گا (یعنی شبہات کا ارتکاب کرے گا جو حرام کی سرحد سے ملی ہوئی ہے) تو عجب نہیں کہ مویشی چراگاہ میں بھی گھس جائیں اور وہ سرکاری مجرم ہو جائے۔

مشتبہات میں پڑنا بھی خطرناک ہے

مطلب یہ ہے کہ مشتبہات میں پڑنا بھی خطرناک ہے اگرچہ ان کو حرام نہیں کہہ سکتے۔ دیکھئے اس حدیث میں اس قاعدہ کی تصریح موجود ہے کہ جس کو گناہ سے بچنا ہو وہ مشابہ گناہ سے بھی بچے۔ اسی اصل پر اس حدیث میں بھی جس کا بیان میں نے شروع کیا ہے حضرت شارع علیہ السلام نے گناہوں سے روکنے کے لیے وسوسہ کا بھی انسداد فرمایا ہے اور گناہوں کے مقدمہ پر بھی متنبہ فرمایا ہے جو کہ غفلت عن ذکر اللہ ہے میری اس تقریر سے بہت سے شبہات نیز ادلہ کے تعارضات رفع ہو جاتے ہیں۔

وسوسہ گناہ نہیں

مثلاً ایک آیت میں ہے: "وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ" (ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں جو اس کے جی میں خیال آتے ہیں) اس سے ظاہراً متبادر ہو سکتا ہے کہ وسوسہ بھی گناہ ہے حالانکہ حدیث میں صراحۃً موجود ہے "تَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْ اُمَّتِیْ مَاوَسْوَسَتْ بِهٖ صَدُوْرُهَا"[1] یعنی حق تعالیٰ نے میری اُمت کے قلبی وسوسوں کو معاف فرما دیا ہے سو دونوں نصوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن اس تقریر سے یہ تعارض رفع ہو گیا کیونکہ میں نے بیان کیا ہے کہ وسوسہ گو گناہ نہیں مگر منع اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ کبھی ذریعہ گناہ کا بن جاتا ہے اور یہ شریعت کا انتظام ہے کہ منہیات کے ذرائع سے بھی نہی فرمائی ہے۔ سو حدیث ظاہر حقیقت پر محمول ہے اور آیت میں جو کچھ وسوسہ کی برائی ظاہراً معلوم ہوتی ہے وہ بطور پیش بندی کے ہے اور میں نے ظاہراً اس لیے کہا کہ اگر غور کیا جائے تو واقع میں آیت میں وسوسہ پر وعید ہی نہیں ہے بلکہ صرف اپنے احاطہ علمی کا بیان فرمایا ہے جیسے دوسری آیت میں ہے: "اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ" (بے شک وہ دلوں کے حال کو جانتا ہے کہ وہ نہیں جانے گا کہ اس نے کسے پیدا کیا) یہاں وسوسہ کی بھی تخصیص نہیں بلکہ مطلق دل کی باتوں کے جاننے کو اس میں بیان فرماتے ہیں: "اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ" (بے شک وہ دلوں کے حال کو جانتا ہے) آگے اس کی دلیل ہے: "اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ" (کیا وہ نہیں جانتا

---

[1] (کنز العمال: ۳۴۵۴۰)

کہ اس نے کس کو پیدا کیا) سبحان اللہ قرآن کی کیا بلاغت ہے یعنی یہ بات تو پہلے سے معلوم ہے کہ سب چیزیں پیدا کی ہوئی خدا تعالیٰ کی ہیں اور خلق مسبوق بالعلم ہوتا ہے تو اپنی پیدا کردہ چیز کا علم دلیل عقلی سے ثابت ہوا اس واسطے بطور انکار اور تعجب کے فرمایا: "اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ" (کیا وہ نہیں جانتا کہ اس نے کس کو پیدا کیا) کیا خدا تعالیٰ اپنی پیدا کی ہوئی چیز کو نہ جانے گا ضرور جانے گا اور دل کی باتیں بھی اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں تو ان کو بھی ضرور جانے گا اس سے ظاہری محسوسات کا علم بدرجہ اولیٰ ثابت ہو گیا جس کا اوپر ذکر ہے۔ "وَاَسِرُّوْا قَوْلَکُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ" (تم اپنی بات آہستہ کرو یا اونچی آواز سے) تو اس سے احاطہ علم کا بیان کرنا منظور ہے نہ یہ کہ جس چیز کے متعلق علم ہو وہ بری اور گناہ ہے ورنہ لازم آتا ہے کہ تمام ذات الصدور اور قول سر اور قول جہر سب گناہ ہی ہوں حالانکہ یہ بداہۃً صحیح نہیں تو اسی طرح اس آیت میں سمجھ لیجئے۔ "وَنَعْلَمُ مَاتُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ" (اور ہم جانتے ہیں جو کچھ خیالات اس کے جی میں آتے ہیں) کہ اس میں احاطہ علم کا بیان فرمانا مقصود ہے۔ چنانچہ یہاں بھی پہلے "وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ" (اور ہم نے انسان کو پیدا کیا) موجود ہے تو اس آیت میں ماتوسوس پر وعید نہیں اور اس سے پیچھے نحن اقرب الیہ میں تاکید ہے اسی احاطہ علم کی اور توضیح ہے اس دعویٰ کی یعنی ہمارے علم میں کیا شبہ ہو سکتا ہے ہم تو اس کی جان کے رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں تو آیت ماتوسوس بہ نفسہ سے شبہ وسوسہ کے گناہ ہونے کا کیا جائے جیسا نعلم کے اقتران سے متوہم اس بنا پر ہو گیا تھا کہ بعض آیات میں اثبات وعید بھی مفقود ہے۔

غیر اختیاری وسوسوں سے ڈرنا نہ چاہیے

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وساوس کے متعلق بعض اغلاط کا ذکر کر دیا جائے وہ یہ ہے کہ آج کل ایک جماعت ذاکرین کی اس غلطی میں مبتلا ہو گئی ہے کہ غیر اختیاری وسوسوں سے بہت ڈرتے ہیں حتیٰ کہ بعض کو جان دینے تک کی نوبت آ گئی ہے اور اس کی وجہ ان کا ذکاءِ حس اور خوف خدا ہے اور یہ حالت بھی فی نفسہ کوئی بری نہیں ان کو احساس تو ہے باقی عوام تو ہاتھی کے ہاتھی نگل جائیں اور ان کو احساس نہ ہو اور ذاکرین کی یہ حالت ہوتی ہے کہ مکھی بھی آ بیٹھے تو ناگوار ہوتی ہے اس ہاتھی اور مکھی پر لطیفہ یاد آیا۔

وسوسہ کی مثال

دہلی میں ایک دیہاتی شخص نان بائی کی دکان پر گوشت کا سالن خریدنے گیا' دکاندار نے پیالہ میں گوشت دیا' دیکھا تو اس میں ایک مکھی بھی تھی' دوکاندار سے کہا میاں اس میں تو مکھی ہے تو

...... بیباک دوکاندار کیا کہتا ہے کہ کیا چار پیسہ میں ہاتھی نکلتا' خیر یہ تو لطیفہ تھا۔ مقصود یہ ہے کہ جیسا فرق ہاتھی اور مکھی میں ہے یہی فرق ذاکرین اور عوام کی حالت میں ہے کہ عوام تو ہاتھی کے برابر بھی گناہ کر گزریں تو دل میلا نہ ہو اور ذاکر کے قلب پر مکھی کے برابر گناہ کا وسوسہ بھی آ جائے تو جان کھونے کو تیار ہوتا ہے مگر واقع وسوسہ پر کوئی مواخذہ نہیں ہوتا۔ گو ذاکر کو اس سے نفرت ایسی ہوتی ہے جیسے گوہ سے مگر جان لینا چاہیے کہ وسوسہ میں صرف گوہ کا سونگھنا ہے گوہ کھانا نہیں ہے گوہ کھانا عمل میں ہوتا ہے۔ وسوسہ میں صرف گناہ کی بو آتی ہے اور گوہ کی بو آنے سے وہ پیٹ میں نہیں پہنچ جاتا ہاں نفرت کی چیز بدبو بھی ہے۔ راحت کے لیے خواہ اس کا بھی انسداد کرلو مگر انسداد کے اہتمام میں پریشان نہ ہو۔ اگر تمام عمر بھی وسوسہ رہے تب بھی پیٹ میں نہیں جائے گا اور مطلق گناہ نہ ہوگا۔ تاوقتیکہ فعل کے مرتبہ میں نہ آ جائے یہاں ایک شبہ یہ ہوسکتا ہے کہ حدیث سے تو معلوم ہوا کہ ذکر کرنے سے شیطان قلب پر سے ہٹ جاتا ہے اور وسوسہ نہیں ڈالتا اور مشاہدہ اس کے خلاف ہے کہ ہم ذکر کرتے ہیں اور پھر بھی وسوسہ رہتا ہے تو سمجھ لو کہ حدیث کا مضمون بالکل صحیح ہے اور ذکر سے بیشک وسوسہ جاتا رہتا ہے مگر کس ذکر سے زبان کے ذکر سے یا قلب کے ذکر سے۔ حدیث ''فَاِذَا ذَکَرَ اللّٰہَ'' کا مرجع حقیقتاً قلب ابن آدم ہے کیونکہ انسان قلب ہی سے انسان ہے۔ بس قلب سے ذکر کر کے دیکھو جو وسوسہ پاس بھی رہے اور ہم جو ذکر کر کے ساتھ وسوسہ پاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ذکر ضعیف ہوتا ہے اس میں قلب اچھی طرح ذاکر نہیں ہوتا کیونکہ یکسوئی نہیں ہوتی بس زبان ہی ذاکر ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے ذکر کا اثر بھی ضعیف ہی ہوگا ورنہ اگر قلب بھی ذاکر ہو تو پھر وسوسہ کی کیا مجال ہے کہ پاس بھی آئے۔ فلسفی مسئلہ ہے کہ ایک وقت میں دو طرف توجہ نہیں ہوسکتی جب ذکر کی طرف پوری توجہ ہوگی تو وسوسہ کیسے آئے گا۔ لیجئے اب تو عقلاً بھی یہ مسئلہ ثابت ہوگیا۔ پس ذکر کے وقت صورت وسوسہ کی یہی ہوتی ہے کہ ذکر میں پوری مشغولی نہیں ہوتی اور ذکر ضعیف ہوتا ہے۔ اب کوئی کہے کہ ذکر قوی کیسے ہو تو جواب یہ ہے کہ ذکر شروع کرتے ہی یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی۔ قلب میں شیطانی اثر پرانا مرض موجود ہے اس کے جاتے رہنے کے بعد بھی قوت کچھ دنوں بعد ہی آئے گی۔ دیکھئے کوئی جسمانی بیماری ہوتی ہے اور اس کا علاج ہو جاتا ہے تو مرض جاتے رہنے کے بعد بھی مہینہ دو مہینہ میں جان آتی ہے' صحت ہوئی دوا سے اور جان آئے گی حلوے سے اور رفتہ رفتہ قوت بڑھے گی اس میں جلدی کرنا نہ چاہیے' مریض کو دوا کرنے کے بعد کبھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ آج ہی صحت کیوں نہ ہوگئی اور آج ہی طاقت کیوں نہ آ گئی۔

رسوخ ذکر کی تدبیر

بس تقویت ذکر کی تدبیر یہی ہے کہ کئے جاؤ اور اس کیلئے کوئی میعاد نہیں یہ تو ساری عمر کا دھندا ہے۔

تادم آخرد مے آخر بود   که عنایت باتو صاحب سر بود

(آخری وقت تو کوئی گھڑی ایسی ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری رفیق بن جائے گی)

اور اگر فرضاً کامیابی نہ بھی معلوم ہو تو اس آیت پر نظر رکھو "لَایُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" (اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی قوت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) اور سمجھ لو کہ وساوس کا دفع ہو جانا تمہارے ذمہ سعی کرنا تمہارے ذمہ یہی ہے اگر وساوس دفع بھی نہ ہوں تو تمہارے کرنے کا جو کام تھا وہ تم نے کر لیا کہ اپنی قوت صرف کی بس اب گناہ نہیں رہا آپ کا کام ارادہ تھا وہ کر چکے یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ ان کے یہاں ارادہ دوا بھی نفع مقصود میں مؤثر ہے اور وہ نفع مقصود اجر وقرب ہے۔ دنیا میں تو یہ ہے کہ مریض کو بلا استعمال دوا نفع نہیں ہوتا اگر کوئی شخص دوا کے استعمال کا ارادہ ساری عمر بھی رکھے اور اس کی استعمال کی نوبت نہ آئے تو محض بے سود ہے اور وہاں صرف ارادہ پر بھی اثر مرتب فرما دیتے ہیں۔

مشقت اور مجاہدہ سے ثواب بڑھ جاتا ہے

بس اگر ذکر کے بعد بھی وساوس باقی رہیں تو ثواب وہی ہوگا جو ذکر بلا وسوسہ میں ہوتا۔ راز یہ ہے کہ اصل ثواب رضا اور قرب کے قصد سے ہوتا ہے اور دفع وساوس سے بھی رضا وقرب ہی کا قصد ہوتا ہے سو یہ فعل اب بھی پایا ہی گیا۔ لہٰذا ثواب بھی حاصل ہوگا بلکہ یہاں ایک بشارت اور ہے کہ جو شخص باوجود ہجوم وساوس کے ذکر کرتا ہے وہ مجاہدہ اور پریشانی کا ثواب اور زیادہ پائے گا اور اس بات میں وہ من وجہ جنید رحمۃ اللہ علیہ اور شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی بڑھ جائے گا کیونکہ جنید رحمۃ اللہ علیہ اور شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر بلا مجاہدہ ہے اور اس کا ذکر مع المجاہدہ ہے اور یہ تو بڑی بات مگر میں اپنی طرف سے نہیں کہتا ہوں بلکہ حدیث میں یہ مضمون موجود ہے صحیح حدیث میں ہے کہ جو شخص فتنہ کے وقت دین پر عمل کرے گا اس کو پچاس آدمیوں کا ثواب ملے گا۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے پچاس کا یا ان میں سے پچاس کا حضور کا جواب سننے کے قابل ہے فرماتے ہیں کہ تم میں سے پچاس کا اس سے معلوم ہوا کہ زمانہ فساد میں عمل بالدین کا ثواب پچاس ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ملتا ہے اور اس میں راز یہی ہے کہ فساد کے وقت دین پر عمل کرنا

بہت دشوار ہے۔ اس مجاہدہ کی وجہ سے ثواب اتنا بڑھ گیا معلوم ہوا کہ مشقت اور مجاہدہ سے ثواب بڑھ جاتا ہے تو جو شخص ہجوم وساوس کے ساتھ بھی ذکر میں لگا رہے اس حدیث کے مطابق اس کا ثواب ذکر بلا وسوسہ کے برابر بلکہ من وجہ زیادہ ہوگا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی کیا شفقت تھی کہ سوال کر کے ہم لوگوں کے لیے کیسی بشارت چھوڑ گئے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی عجیب شان

واللہ عجب ہی سوال ہے اس حدیث سے یہ نہ سمجھ جانا کہ تم صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مرتبہ میں بڑھ گئے کیونکہ مرتبہ میں بڑھ جانا کبھی عمل کی وجہ سے ہوتا ہے کہ ایک شخص کے عمل اور ان کے ثواب دوسرے سے بڑھے ہوئے ہیں اور کبھی مرتبہ کا بڑھ جانا محض فضل سے بھی ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بیوی سے محبت کبھی تو زیور کی وجہ سے ہوتی ہے کہ زیور بہت سے پہنے ہوئے ہر وقت بنی ٹھنی رہتی ہے جس سے خواہ مخواہ اس کی طرف میلان ہوتا ہے اور کبھی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اس کی صورت خداداد ہی ایسی ہے کہ محبوب چاہے اس کے بدن پر زیور بالکل بھی نہ ہو تو وہ عورت جس کے زیور زیادہ ہیں یہ نہیں کہہ سکتی کہ بس میں ہی محبوب ہوسکتی ہوں اور وہ عورت مجھ سے زیادہ محبوب نہیں ہوسکتی جس کے پاس زیور زیادہ نہیں ہیں۔ ارے اس کو تو خدا نے کچھ ایسی چیز عطا فرمائی ہے جس کے سامنے تیرے زیور کی کچھ بھی حقیقت نہیں' زیور تو ایک عارضی چیز ہے جس وقت اتر گیا کچھ بھی نہ رہا اور حسن خداداد ایسی چیز ہے کہ اسے اتارنا بھی چاہیں تو اتر نہیں سکتا۔ اس طرح حضرات صحابہ کو زیادت قرب کا ایک وہ ذریعہ میسر ہے جو کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا اور وہ فضل خداوندی ہے اور اس کے لیے کوئی قاعدہ نہیں وہ اعمال پر متفرع نہیں ورنہ اگر یہ کہا جائے کہ درجات کے بڑھنے کی بنا محض اعمال ہی ہیں تو چاہیے کہ نبوت جو سب سے بڑا درجہ کمال کا ہے وہ بھی عمل سے حاصل ہوسکے حالانکہ وہ محض حق تعالیٰ کے فضل سے ملتی ہے۔ اسی واسطے حق تعالیٰ نے کفار کے اس اعتراض کے جواب میں کہ ہم احکام خداوندی کو جب مان سکتے ہیں کہ ہم پر بھی وحی آئے۔ یوں فرمایا: "اَللّٰهُ يَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ" یعنی خدا ہی کو خوب معلوم ہے کہ رسالت کہاں چاہیے۔ یعنی ہم مختار مطلق ہیں جس پر چاہا وحی اتار دی کسی کو اس میں دخل دینے کا مجاز نہیں اور اس کے واسطے کوئی علت اور وجہ بجز ہمارے ارادے کے نہیں ہوسکتی جس کو ہم نے چاہا فضیلت دے دی۔ معلوم ہوا کہ حصول درجات وترقی مراتب کا مدار صرف اعمال پر نہیں اور اگر تسلیم کرلیا جائے تو ہم پوچھیں گے کہ عمل کہاں سے آیا اس کی اصل اخیر میں جا کر ارادہ نکلے گی اور ارادہ

منجانب اللہ ہے تو بعد قطع وسائط نتیجہ یہی نکلے گا کہ ترقی درجات منجانب اللہ ہے سو جو بواسطہ عطا فرماتے ہیں کیا وہ بلا واسطہ عطا نہیں فرما سکتے۔ غرض آپ کے اعمال پر ثواب مل جانے سے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر آپ کی فضیلت یا مساوات ہرگز لازم نہیں آتی۔

فضیلت صحابہؓ کی ایک بلیغ مثال

دیکھئے آدمی مہمان کا تو اعزاز و اکرام کیا کرتا ہے اس کی خوب خاطر کرتا ہے، طرح طرح کے کھانے کھلاتا ہے اور اپنے بیٹے اور گھر والے وہی کھاتے ہیں جو گھر میں پکتا ہے۔ تو کیا مہمان کا یہ منہ ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ میں اس کے بیٹے سے اس کی نظر میں زیادہ عزیز ہوں۔ بیٹے کا عزیز ہونا اور وجہ سے ہے وہ وجہ اس مہمان کو قیامت تک بھی نصیب نہیں ہو سکتی تو اب اگر کسی عمل کے ثواب میں حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بڑھ بھی گئے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان پر آپ کو فضیلت کلیہ حاصل ہو جائے ہاں یہ مسلم ہے کہ اس ایک عمل میں بڑھ گئے جیسے وہ مہمان روٹیوں کی تعداد میں اور کھانے کے انواع و اقسام میں بیٹے سے بڑھا ہوا ہے۔

ذکر کے ساتھ وسوسہ مضر نہ ہونے کی مثال

تقریر مذکور سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ وسوسہ کے وقت کا ذکر اجر میں ذکر بلا وسوسہ سے بڑھا ہوا ہے مگر اس سے فضیلت کلی جنید رحمۃ اللہ علیہ اور شبلی رحمۃ اللہ علیہ پر لازم نہیں آتی اور میں نے جو اوپر وسوسہ کو مضر کہا تھا اور یہاں غیر مضر بتلا رہا ہوں اس سے بھی کوئی تعجب نہ کیجئے یہ حضرت جب ہے کہ وسوسہ اپنی قوت پر ہو اور اگر کوئی چیز اس کے مقابل مثلاً ذکر اس کی قوت کو توڑنے والی موجود ہو تو اس کی مضرت باقی نہیں رہتی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ طباً کوئی دوسرا مضرت سے خالی نہیں۔ اطباء کو جہاں دوا کے منافع معلوم ہوئے ہیں وہاں مضار بھی ثابت ہوئے ہیں تو علاج میں ممکن ہے کہ کسی کو یہ خیال اور شبہ ہو کہ جب ہر دوا کے کچھ نقصانات بھی ہوں گے تو علاج کیسے ہوا۔ اگر ایک مریض کو فائدہ ہوگا تو دوسرے امراض پیدا ہو جائیں گے۔ اس کا حاصل یہی ہے کہ گو ہر دوا میں نقصان اور ضرر ہے مگر اس کی اصلاح دوسری دوا سے ہو جاتی ہے اس طرح منافع دوا کے قائم رہتے ہیں۔ اسی سے نتیجہ یہ نکلا کہ ہر درجہ ضرر کا مضر نہیں۔ مضر وہ ہے جو بلا اصلاح ہو اور جب مصلح بھی ساتھ ہو تو ضرر نہیں رہتا۔ علیٰ ہذا وسوسہ کے بھی دو درجے ہیں ایک بلا ذکر اور ایک مع الذکر۔ سو وسوسہ بلا ذکر ایک درجہ میں مضر ہے اور مع الذکر مضر نہیں۔ ذکر سے اس کی اصلاح ہو گئی بلکہ بعض اوقات اصلاح کے بعد بالعکس مفید

ہوجاتا ہے۔ دیکھئے اطباء سنکھیا اور جمال گوٹہ سے بھی علاج کرتے ہیں اس طرح کہ پہلے اس کو مدبر کر لیتے ہیں اس سے ان کا ضرر جاتا رہتا ہے اور نافع ہوجاتا ہے۔

وسوسہ بعض دفعہ نافع ہوجاتا ہے

اسی طرح وسوسہ بھی ذکر کے ساتھ مدبر ہوکر بعض اوقات نافع ہوجاتا ہے جیسے اوپر بیان ہوا کہ مجاہدہ کے سبب نافع ہوگیا جیسے سنکھیا اور جمال گوٹہ اصلاح کے بعد نفع ہی کرتا ہے۔ جب وسوسہ بھی ذاکر کے لیے اس طرح مفید ہوگیا پھر پریشانی کیوں ہو کشاکشی کا اجر تو وسوسہ ہی کے بدولت ملا ہے انسان کا کمال اسی سے ہے کہ باوجود دواعی بعد کے پھر قرب کی طرف آئے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے کہ جب حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اور ان کی ذریت کو پیدا کیا تو فرشتوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار آپ نے ان کو اس حالت میں پیدا کیا ہے کہ یہ کھائیں گے پئیں گے نکاح کریں گے سواری پر چلیں گے (یعنی خوب چین آرام کریں گے بخلاف ہمارے کہ ہم ہر وقت عبادت میں مشغول ہیں) اس لیے آپ کے لیے دنیا کردے اور ہمارے لیے آخرت۔ حق تعالیٰ نے جواب ارشاد فرمایا کہ میں نے جس کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی (یعنی آدمی) اس کو ایسی مخلوق کی برابر نہ کروں گا جس کو میں نے کن کہہ کر پیدا کر دیا (یعنی فرشتہ مطلب یہ کہ آدمی کو فضیلت میں زیادہ رکھوں گا پھر یہ تقسیم کیسے ہوسکتی ہے) سو صاحبو! آخر یہ شرف انسان کا کس وجہ سے ہے۔

وسوسہ بلا ذکر مذموم ہے

صرف اسی وجہ سے تو کہ اس پر منازعت اور کشاکشی مسلط ہے اور باوجود اس کے پھر وہ عبادت کرتا ہے تو وسوسہ فی نفسہ مذموم نہ ہوا بشرطیکہ مع الذکر ہو اور حدیث میں وسوسہ مذمومہ سے وہ مراد ہے جو بلا ذکر ہو جس کا قرینہ لفظ غفل ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ''اِذَا ذَکَرَ اللّٰہَ خَنَسَ وَاِذَا غَفَلَ وَسْوَسَ''[1] (جب وہ دل سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب وہ غافل ہوتا ہے تو وسوسہ ڈالتا ہے) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم وسوسہ بلا ذکر سے بچا رہے ہیں۔ ذاکرین اس تقریر کو خوب سمجھ لیں۔

عبادات میں دھیان کی ضرورت

بہرحال حدیث میں ذکر اور غفلت کی خاصیت بیان فرمائی ہے جس سے اس مضمون کی ضرورت معلوم ہوگئی اور یہ مضمون جس درجہ فی نفسہ نافع ہے وہ تو معلوم ہو چکا ہے اب اس عارض

---

[1] (تفسیر القرطبی ۲۰: ۲۶۲)

کی وجہ سے بھی جس قدر ضروری ہے اس کو عرض کرتا ہوں اور وہ عارض یہ ہے کہ اس کا کسی کو اہتمام نہیں ہے نہ نافع کے اختیار کرنے کا نہ مضر سے بچنے کا۔ ان دونوں باتوں کو اس قدر خفیف سمجھ رکھا ہے کہ گویا ذکر کا نفع کوئی معتد بہ نفع ہی نہیں اور غفلت کا نقصان بھی گویا قابل التفات نہیں۔ چنانچہ ذکر اللہ کو بالکل ہی چھوڑ دیا کوئی اگر دین کا نام لیتا بھی ہے تو روزہ نماز تو کچھ کر بھی لیتے ہیں مگر ذکر کا اہتمام مطلقاً نہیں اور گویا اس کو عبادت ہی نہیں سمجھتے۔ چنانچہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کا کوئی وقت خالص ذکر کے لیے ہو۔ یوں ہر عبادت بھی ذکر ہے مگر یہاں حدیث میں جو ذکر کو غفلت کے مقابل لایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر کی وہ فرد مراد ہے جو غفلت کی ضد ہو۔ غفلت کے معنی ہیں بھول جانا۔ یعنی دھیان سے کسی چیز کو اتار دینا تو ذکر کے معنی ہوں گے کسی چیز کی طرف دھیان لگانا سو ہماری عبادات میں یہ نہیں پایا جاتا کہ ہمارا دھیان حق تعالیٰ کی طرف لگا ہوا ہو بلکہ صرف ایک رسم اور عادت ہے کہ وہ گویا بلا قصد و بلا اختیار ہم سے سرزد ہو رہی ہے ذکر کا مفہوم اس میں بہت ہی کم ہے مگر شاید اس تقریر سے ابھی ذکر کا حقیقی مفہوم سمجھ میں نہ آیا ہو لہٰذا میں اس مضمون کو ذہن سے بہت قریب کرتا ہوں۔ سمجھ لیجئے کہ ذکر لفظ عربی ہے گو اردو میں بھی مستعمل ہے مگر عربی عبارت میں جب آئے گا تو اس کے معنی وہی لیے جائیں گے جو عربی لغت میں ہوں اور یہ قاعدہ مقرر ہے کہ ہر لفظ باستثناء کسی خاص ضرورت کے معنی حقیقی ہی پر محمول ہوتا ہے تو یہاں بھی اسی معنی پر محمول ہوگا۔ گو اردو میں ذکر کے معنی اور ہیں اور دونوں معنی اگرچہ قریب ہیں تاہم فرق ہے اردو میں ذکر کے معنی زبان سے کسی کی نسبت کچھ کہنا ہے ہمارے محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی تمہارا ذکر کر رہے تھے یا فلاں مجلس میں آپ کا ذکر تھا یا پوچھتے ہیں کہ فلاں جگہ میرا بھی کچھ ذکر کرتا تھا اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ میری نسبت بھی کسی نے کچھ کہا تھا اور عربی میں ذکر کے معنی ہیں یاد جس کا مقابل نسیان ہے۔ نسیان کے معنی بھول جانا اور ذکر کے معنی یاد رکھنا۔ پس ذکر جس معنی میں اردو میں آتا تھا عربی میں اس معنی میں نہیں آتا الا مجازاً لغت کی کتابیں موجود ہیں۔ دیکھ لیجئے اور لغت نہ دیکھو تو حدیث ہی میں دیکھ لو کہ ذکر غفلت کا مقابل ہے اور غفلت کا مفہوم مقابل یاد سے تو ذکر کے معنی یاد کے ہوئے غرض لغت سے بھی اور حدیث سے بھی ذکر کے یہ معنی ہوئے۔ گو اردو والوں نے عربی کا لفظ لے کر معنوں میں کچھ فرق کر لیا ہے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ ذکر اللہ اردو کا لفظ تھا اور میں نے اردو کے لفظ کو اینچ پینچ کر کے عربی بنا دیا ہے اور اپنے من مانے معنی گھڑ لیے ہیں کیونکہ آج کل یہ بھی ایک نئی ایجاد ہوئی کہ جس لفظ کو

عربی بنانا ہوا اس کی کچھ صورت بدل دی جیسے سڑک کی جمع کسی نے بنائی تھی اسڑاک یا بعضے یہ
کرتے ہیں کہ الف لام لگا دیا اور اس کو عربی بنا لیا۔ مولانا شیخ محمد صاحب کے ایک عزیز تھے کہا
کرتے تھے کہ میں مولانا کا ہر بات میں مقابلہ کر سکتا ہوں مگر اس میں عاجز ہوں کہ وہ جس لفظ کو
چاہیں ترکیب سے عربی بنالیں تو میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے ال اور بل کچھ نہیں لگایا بلکہ اس کا
عربی ہی ہونا بحوالہ لغت بیان کر دیا پھر آپ کی سمجھ کو موافق تائیداً یہ بھی بتلا دیا کہ حدیث ہی میں
غفلت کے مقابلہ سے اس معنی (یاد) کا ثبوت موجود ہے جب ثابت ہو گیا کہ اصل مامور بہ وہ
چیز ہے جس کو اردو والے یاد کہتے ہیں تو اب محاورات سے یاد کی حقیقت سمجھو کہ وہ قلب کا فعل ہے
یا زبان کا پھر دیکھو کہ حق تعالیٰ کو تم اس طرح یاد کرتے ہو یا نہیں وہ محاورات سنو آپ کی بیوی غسل
کو گئی اور زیور کا صندوقچہ تمہارے پاس چھوڑ گئی تو قالاً یا حالاً اس کا مطلب یہ ہے کہ میں دوسرے
کام میں لگتی ہوں تم اس کی حفاظت رکھنا تو اگر تم کو اس کا خیال رہا اور اس کی طرف توجہ رکھی اور
دیکھتے رہے کہ بندر یا کوا یا کوئی چور اٹھائی گیرا اس کو نہ لے جائے تو اس وقت تو کہہ سکتے ہیں کہ یاد
ہے۔ گو زبان سے کچھ بھی نہیں کہا اور نہ تم کہہ سکتے ہو کہ میں اس سے غافل رہا۔

ذکر کی حقیقت

بس یہ یاد عربی میں ذکر کی حقیقت ہے اور یہی یاد بی بی کا مطلب تھا نہ یہ کہ بیٹھے زبان سے زیور
زیور رٹے جاؤ حتیٰ کہ اگر ایسا کیا ہو کہ زبان سے تو برابر زیور کرتے رہے لیکن پشت پھیر کر بیٹھ گئے اور
زیور کوئی اٹھا کر لے گیا تو اس وقت کسی کے سامنے یہ عذر قابل سماعت نہ ہو گا کہ میں تو برابر زیور کو یاد کرتا
رہا خدا جانے کیسے جاتا رہا ہر شخص آپ کو بیوقوف بتائے گا۔ ضرور یہی کہے گا کہ تم نے غفلت کی حالانکہ
زبانی ذکر موجود ہے مگر وہ یاد نہیں سمجھا جاتا۔ بس معلوم ہوا کہ یاد فعل قلب کا ہے خواہ اس کی صورت لساناً
بھی متحقق ہو یا نہ ہو اس تحقیق کے بعد اب یہ دیکھ لو کہ ایسی یاد جو عربی میں حقیقت ہے ذکر کی آپ کو کہاں
تک حاصل ہے آپ عبادات کو ذکر کہتے ہیں مگر نہ آپ کی نماز میں یہ معنی یاد کے موجود ہیں نہ روزہ میں
بلکہ آپ کی زبان میں خاص جس کا نام ذکر ہے یعنی زبان سے اللہ اللہ کرنا اس میں یہ مفہوم ذکر بمعنی یاد کا
موجود نہیں زبان سے اللہ اللہ کا وظیفہ رٹ رہے ہیں اور دل کو خبر بھی نہیں حالت یہ ہے:

سبحہ بر کف توبہ بر لب دل پر از ذوق گناہ　　　معصیت را خندہ می آید بر استغفار ما

(تسبیح ہاتھ میں اور لب پر توبہ اور دل گناہوں سے بھرا ہوا ہمارے استغفار پر گناہ کو ہنسی آتی ہے)

آج کل کی عبادت اور ذکر محض ایک رسم ہے

جب ہماری عبادت کی حالت یہ ہے تو اس کو ذکر کہنا جس کی حقیقت ابھی معلوم ہوئی کیا معنی ہم لوگ تو ذکر کے پاس بھی نہیں ہیں ذکر کی طرف سے ہر طبقہ کو بفرق مراتب غفلت ہے کیونکہ تم خدا کو اتنا بھی تو یادنہیں کرتے جتنا بی بی کو اور اپنے ایک معمولی دوست کو یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ شاہد ہے کہ جس کو دھیان رکھنا کہتے ہیں وہ لوگوں میں بہت ہی کم پایا جاتا ہے۔ بس عابدین میں عبادت صرف ایک رسم رہ گئی ہے اسی طرح اور ذاکرین میں ذکر ایک رسم رہ گئی ہے جس کو سب ادا کر رہے ہیں باقی جو معنی تھے ذکر کے اس کا وجود تو شاید ہی کہیں ہو تو یہ کہنا بالکل صحیح ہوا کہ ذکر کا اہتمام مسلمانوں میں نہیں ہے جب ذکر معدوم ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی ضد موجود ہوگی یعنی غفلت اور اس کے دفع کا بھی اہتمام نہیں ہے تو میرا کہنا صحیح ہوگیا کہ جن دو چیزوں کا حدیث میں ذکر ہے ان دونوں کی طرف سے غفلت ہے پھر تماشا یہ کہ ذکر سے بھی غفلت ہے اور اپنی غفلت سے بھی غفلت ہے ان عوارض سے بھی ان کا بیان نہایت ضروری ٹھہرا یہ تفصیل ہوئی ضرورت کی۔

ذکر اللہ کا اثر

اب حدیث کا بیان ہوا ہے: "اِذَا ذَكَرَ اللّٰهَ"[۱] (جب اللہ کا ذکر کیا) خنس اور ذکر کے معنی ہوا کہ جب خدا کی طرف دھیان ہوتا ہے تو شیطان ہٹ جاتا ہے اب اس پر کوئی عقلی اشکال نہیں ہوسکتا کیونکہ ایک وقت میں دو طرف دھیان کا نہ ہوسکنا عقلاً مسلم ہے پس یاد خدا سے قطع وسوسہ ضروری امر ہے البتہ ذکر کے اس معنی پر عقلاً دو شبہے ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ جب ذکر سے مراد قلبی ہوا تو اگر کوئی شخص نماز میں قرأت وتشہد وغیرہ کو دل میں سوچ لے اور زبان سے کچھ نہ پڑھے تو چاہیے نماز ہوجائے کیونکہ ذکر قلبی تو پایا گیا اور یہی مقصود تھا۔ اسی طرح سے چاہیے کہ اگر کوئی قرأت وغیرہ زبان سے پڑھے اور دل میں خیال نہ ہو تو اس کی نماز نہ ہو۔ تو کیا اس میں فتویٰ شریعت کا یہی ہے اس کا جواب وہی ہے جو پہلے عرض کیا گیا کہ بعض باتیں ایسی ہیں جو وحی ہی سے معلوم ہوتی ہیں اور وحی سے معلوم ہوگیا کہ اول شخص کی نماز نہ ہوگی اور دوسرے شخص کی ہوجائے گی ہم کو اس میں عقل دوڑانے کا کوئی حق نہیں ہے اس کی مثال محسوسات میں یہ ہے کہ اطباء نے دوا کے اثر کے لیے کچھ قواعد عقلیہ لکھے ہیں اور وہ قواعد صحیح ہیں۔ مثلاً ادویہ حاریہ امراض باردہ کو نافع ہیں بوجہ حرارت کے اس طرح بالعکس یہ سب قواعد ہیں مگر بعض دوائیں ایسی بھی ہیں کہ ان کا اثر ان قواعد کے خلاف پایا

---

[۱] (تفسیر القرطبی ۲۰: ۲۶۲)

جاتا ہے اس کو اطباء مؤثر بالخاصہ کہتے ہیں وہ دوائیں حرارت اور برودت سے مؤثر نہیں ہوتیں بلکہ ان کا اثر صرف تجربہ سے معلوم ہوا ہے گویا نقل پر موقوف ہے اور عقل سے آج تک اس کی وجہ نہیں دریافت ہوسکی۔ دیکھئے کہربا تعلیقاً اختلاج قلب کو مفید ہے جس کی ظاہر میں کوئی معلوم نہیں ہوتی۔

بعض احکام کی علت معلوم نہیں

ایسے ہی اگر بعض اعمال کے خواص اور احکام وحی سے ایسے معلوم ہوں جو قواعد ظاہرہ کے خلاف ہوں اور عقل میں نہ آسکیں تو کیا استعجاب ہے۔ پس یوں کہاں جائے گا کہ حدیث میں تو آیا ہے کہ ذکر کا اثر شیطان کا ہٹ جانا ہے اور غفلت کا اثر وسوسہ ہے یہ آثار بالکیفیت ہیں اور علاج بالضد کی قبیل سے ہیں اور قرأت بلاتوجہ قلب سے نماز کا صحیح ہوجانا اور صرف قلبی قرأت سے نماز کا صحیح نہ ہونا یہ اثر بالخاصہ ہے اور کسی کو اس میں حق مزاحمت کا نہیں جیسے اگر طبیب کہے کہ کہربا تعلیقاً مفید اخلاف ہے تو کوئی مزاحمت نہیں کرسکتا۔

ذکر لسانی مع توجہ قلب کے افضل ہے

علی الاطلاق یہ اعتقاد یا دعوے کہ ذکر قلبی تمام احکام میں ذکر لسانی سے زیادہ کافی ہے الحاد ہے بلکہ حق یہ ہے کہ جہاں شریعت نے ذکر لسانی کو کافی کہا ہے وہاں وہ کافی ہے اور جہاں ذکر قلبی کو کافی کہا ہے وہاں وہ کافی ہے۔ ایک شبہ تو یہ تھا دوسرا شبہ جو مشائخ کے طرز عمل سے ناشی ہوتا ہے اس کو بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بعضے مشائخ ذکر قلبی کی تعلیم کرتے ہیں اور یوں بتاتے ہیں کہ زبان تالو سے لگا کر ذکر کرو جس میں حرکت زبان کا احتمال ہی نہ رہے۔ اس طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک قلبی ذکر لسانی سے افضل ہے بلکہ ذکر قلبی ہی ذکر ہے اور ذکر لسانی کسی شمار ہی میں نہیں ہے اور بعض محققین بجائے اس کے ذکر لسانی کی تعلیم کرتے ہیں حتیٰ کہ پاس انفاس میں بھی یہی تعلیم کرتے ہیں کہ زبان ہی سے کرو سو مشائخ کے اس مختلف طرز عمل سے تعارض کا شبہ ہوتا ہے جواب یہ ہے کہ اگلے مشائخ بے شک ذکر قلبی کی تعلیم کرتے تھے اور وہ مفید بھی زیادہ ہے۔ خصوصاً ابتداء میں لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ محض ذکر قلبی شروع کرنے کے وقت تو ذکر ہوتا ہے مگر چونکہ اس کی کوئی محسوس صورت نہیں اس واسطے ذرا دیر کے بعد قلبی توجہ زائل ہوجاتی ہے اور خیال کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے پھر نہ ذکر لسانی رہتا ہے نہ قلبی اور ذاکر اسی دھوکہ میں رہتا ہے کہ میں ذکر قلبی میں مشغول ہوں اور ذکر کا وہاں پتہ بھی نہیں رہا تو یہ وقت سارا یوں ہی ضائع ہوجاتا ہے اس واسطے آج کل ذکر لسانی کی تعلیم زیادہ معمول ہے مگر مع توجہ قلب تاکہ اگر ذکر قلبی نہ بھی رہے تو لسانی تو

باقی رہے نیز ذکر لسانی مذکر رہتا ہے ذکر قلبی کے لیے اور بوجہ مذکر ہونے کے اس میں توجہ قلب کی بالکلیہ زائل نہیں ہونے پاتی تو ذکر لسانی میں دو فائدہ ہوئے ذکر قلبی بھی اس کے ذریعے کچھ نہ کچھ باقی رہتا ہے اور خود لسانی تو ہے ہی اور یہ خرابی مذکور محض ذکر قلبی میں اس صورت میں ہے جبکہ آدمی حدیث النفس میں لگ جائے چنانچہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ زبان کو بند کر کے جب ذکر قلبی شروع کیا تو نفس طرح طرح کے خیالات میں الجھا دیتا ہے بس ذکر گیا گزرا ہوا اور کبھی اس ذکر قلبی سے بیہوشی کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے اس صورت میں بھی ذکر باقی نہیں رہتا' لوگ اس کو استغراق سمجھتے ہیں حالانکہ یہ استغراق نہیں صرف بیہوشی ہے۔

استغراق کی حقیقت

استغراق یہ ہے کہ خلق سے غفلت ہو اور حق تعالیٰ کی طرف توجہ ہو اور اس حالت میں دونوں طرف سے بے خبر ہو جاتا ہے اور گو یہ مضر نہیں اور نہ غفلت میں داخل ہے کیونکہ اہتمام ذکر کے بعد ہوا ہے مگر اس میں اجر بھی نہیں ہے کیونکہ اجر قصد پر ہوتا ہے اور بیہوشی میں قصد باقی نہیں رہتا جیسے سونے میں اجر نہیں اور یہ بیہوشی نوم تو نہیں ہے مگر مشابہ نوم ضرور ہے اور بوجہ اشتراک علت کے حکم دونوں کا ایک ہی ہے جس کی ایک فرع یہ بھی ہے کہ اس بیہوشی سے بھی ان حالات میں وضو جاتا رہتا ہے جن حالات میں نوم سے جاتا رہتا ہے بعض ذاکرین اس سے بے خبر ہیں غرض بیہوشی میں ذکر باقی نہیں رہتا بس یہ دھوکہ ہو جاتا ہے ذکر قلبی میں۔

ذکر لسانی کی عجیب مثال

اس واسطے بعض محققین کے یہاں آج کل اس کی تعلیم نہیں ہے اور صرف زبانی ذکر بتلایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ توجہ قلبی کو جمع کرا دیا جاتا ہے جس سے وہ نور علی نور ہو جاتا ہے اور اگر اس حالت میں قلبی ذہول ہو کر صرف زبانی ہی ذکر رہ جائے تو اس مذکورہ دھوکہ سے تو اچھا ہے کیونکہ اگر اصل نہ رہا تو قائم مقام تو موجود ہے۔ موتی مقوی قلب ہے لیکن اگر وہ میسر نہ ہو تو سیپ ہی کو استعمال کیوں نہ کیا جائے وہ بھی کام دے جاتا ہے۔ خمیرہ تو بن ہی جائے گا اور کچھ نہ کچھ کام تو دے ہی گا اور دنیوی اسباب میں تو عادت سبب ناقص پر سبب کامل مرتب نہیں ہوتا مگر اسباب آخرت میں ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے تو اگر یہ ذکر جو محض لسانی ہے ناقص بھی ہو تب بھی ہم کو اجر کامل کی توقع کی گنجائش ہے اور ایک ذکر ہی کی' کیا تخصیص ہے تمام اعمال میں دیکھ لیجئے کہ ہمارے ان اعمال پر اجر کیوں مرتب ہوتا ہے وہ اعمال اس قابل ہوتے ہیں کہ ان پر اتنا اجر ملے گا ہرگز نہیں۔

محض فضل خدا اور عطا ہی کہ اتنا اجر دیا جاتا ہے تو اب میں کہتا ہوں کہ ذکر لسانی ذکر قلبی کا بدل ناقص سہی اس سے گھٹا ہوا سہی مگر اللہ تعالیٰ سے امید رکھنا چاہیے کہ وہ اس پر بھی وہی قرب مرتب فرمادیں گے جو ذکر قلبی پر ہوتا ہے کیونکہ وہاں تو بہانہ ڈھونڈتے ہیں خود ذکر قلبی پر اجر بھی محض عطا ہی سے تھا ایسے ہی ذکر لسانی پر اگر محض عطا سے ہو جائے تو کیا مستبعد ہے۔

نماز کی نیت زبان سے کرنا مستحب ہے

یہی راز ہے اس کا کہ فقہاء نے زبان سے نیت کرنے کو مستحب کہا ہے گو بعض لوگوں نے اس کو بدعت کہا ہے مگر حقیقت میں بدعت نہیں ہے بلکہ مکمل سنت ہے اور اس کی نظیر بھی شریعت میں موجود ہے کہ احرام باندھتے وقت کہا جاتا ہے "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُرِیْدُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ" (اے اللہ! میں حج اور عمرہ کا ارادہ کرتا ہوں) یہ مقیس علیہ موجود ہے اور علت مشترک ہے یعنی استحضار قلب و زبان سے نیت کرنا کیوں بدعت ہوگی۔ پس اصل نیت قلبی ہی کو کہا جائے گا باقی نیت لسانی اس کو مقوی اور مکمل ہے اس لیے اکثر محققین نے زبانی نیت کو ایسے شخص کے لیے جس کے تعلقات زیادہ ہوں اور یکسوئی میسر نہ ہو خصوصیت کے ساتھ افضل کہا ہے۔ صرف اسی وجہ سے کہ اس سے نیت قلبی کا استحضار ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں نے زبانی نیت کو افضل کہا ہے ان کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نیت قلبی سے بھی افضل ہے حتیٰ کہ اگر کوئی صرف زبانی نیت پر اکتفا کرے تو نماز صحیح بلکہ افضل ہوگی۔ یہ مطلب نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ نیت قلبی کے ساتھ نیت لسانی کو جمع کر لینا افضل ہے کیونکہ ارادہ کو نیت لسانی نے قوی کر دیا نہ یہ کہ قلب کی نیت کا وجود ہی نہ ہو اور یہ تجربہ بھی ہے کہ زبان سے نیت کرنے سے خواہ قلب کسی شغل میں ہو حاضر ہو جاتا ہے۔

ذکر بالجہر کی مصلحت اور حکمت

اور اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ صوفیاء نے ذکر بالجہر کو معمول کیا اور اس کو پسند کیا۔ ظاہراً تو یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کیونکہ عبادت میں اخفاء ہی اسلم ہوتا ہے۔ ریاء کی صورت بھی نہ پیدا ہو مگر مصلحت اس میں یہی ہے کہ جہر سے قلب متوجہ ہو جاتا ہے اور بلا جہر کے متوجہ ہونا مشکل ہے تو جہر ذریعہ ہوا استحضار قلب کا اور یہاں سے یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جب جہر سے غرض صرف استحضار قلب ہے تو جہر کی حد اسی قدر ہوگی جس سے استحضار ہو جائے نہ یہ کہ اس سے اور پریشانی ہونے لگے اور دماغ کو تعب ہو اور محلہ والے بھی پریشان ہوں مگر آج کل رسوم کا ایسا غلبہ ہوا ہے کہ ذکر کریں گے تو نہ اس کی غرض سے بحث ہے نہ غایت سے بس غل مچا ڈالا۔

ایک ڈپٹی کلکٹر ہیں ان کو ایک شیخ نے تعلیم فرمایا کہ جہر سے ذکر کیا کر۔ اس بندہ خدا نے اتنا جہر کیا کہ سارے محلّہ کا سونا مشکل کر دیا اور اپنے دفاع میں یبوست آ گئی اور توحش پیدا ہو گیا۔ شیخ صاحب کو لکھا وہاں سے جواب نہ آیا' بیچارے سخت پریشان ہوئے۔ شیخ وہ چاہیے کہ لطف اس کا ہر حالت میں ساتھ رہے۔ طالب سے اس کو محبت ہو۔

شیخ کامل کی ایک حالت

شیخ کامل کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ میں نے حضرت حاجی صاحب سے سنا ہے کہ یہ لوگ کبھی خفا بھی ہوتے ہیں اور کسی کو اپنے یہاں سے نکالتے بھی ہیں تو محض زبان سے نکالتے ہیں اور قلب سے کھینچتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طالب ان کے یہاں سے جاتا نہیں ورنہ اگر قلب سے نکال دیں تو پھر طالب ٹھہر نہیں سکتا۔ حقیقت میں شیخ کامل عجب چیز ہے وہ رحمت الٰہیہ کا نمونہ ہوتا ہے۔ دیکھئے خدا تعالیٰ کے ساتھ بندوں کا برتاؤ کیا ہے اور ان کا برتاؤ بندوں کے ساتھ کیسا ہے کہ کوئی گناہ نہیں جو بندوں سے نہ ہوتا اور پھر بھی کسی پر رزق کا دروازہ بند نہیں کرتے یہی شان شیخ کامل کی ہوتی ہے۔ بقول عارف شیرازی رحمتہ اللہ علیہ

بندہ پیر خراباتم کہ لطفش دائم است
زانکہ لطف شیخ زاہد گاہ ہست و گاہ نیست

(میں میکدہ کے مالک کا غلام ہوں کہ اس کی ہمیشہ مہربانی رہتی ہے جبکہ ناقص عقل شیخ اور پاکباز شریعت زاہد خشک کی مہربانی کبھی بھی نہیں رہتی ہے)

شیخ کامل تو عاشق ہوتا ہے مرید پر گو اس کے عشق کا ظہور نہیں ہوتا کیونکہ

عشق معشوقاں نہاں است و ستیر — عشق عاشق باد و صد طبل و نفیر

(معشوقوں کا عشق پوشیدہ اور نہاں ہے اور عاشق کا عشق دو سو طبل اور چیخ و پکار کے ساتھ آشکار ہے)

ان کا نکالنا ایسا ہوتا ہے جیسے باپ بیٹے پر خفا ہوتا ہے۔ تو کہتا ہے کپڑے اتار دو اور جاؤ نکلو زبان سے تو یہ کہتا ہے اور دل میں یہ ہوتا ہے کہ یہ اپنی خطا پر نادم ہو جائے اور قدموں پر گر پڑے اور معافی چاہ لے کسی طرح اس کی اصلاح ہو جائے اور ایک تار نہ اتارے۔ غرض جب ڈپٹی صاحب کو شیخ صاحب نے جواب نہ دیا۔ تب انہوں نے مجھ سے رجوع کیا میں نے سب سے اول شرط یہ کہ شیخ اول کی کبھی بے ادبی نہ کرنا جس سے ان کو بڑا تعجب ہوا کیونکہ رسم زمانہ اس کے خلاف ہے۔

بعض علماء ومشائخ کا باہمی حسد

معقولی علماء اور مشائخ میں یہ مرض خاص طور سے ہے کہ اپنے ہم پیشہ کے نام سے جلتے ہیں۔ معقولی علماء کی تو یہ حالت ہے کہ دوسرے کا نام آیا اور جو منہ میں آیا کہنا شروع کر دیا۔ دوسرے مدرسہ کے طالب علموں کو طرح طرح کی ترکیبوں سے توڑتے ہیں۔ کان پور میں ایک مدرسہ تھا اس میں دستار بندی کا جلسہ ہوا انہوں نے دوسرے مدرسہ کے ایک طالب علم کو جہاں ان کی زیادہ کتابیں ہوتی تھیں دستار بندی کے لیے کھینچا (ساری خرابی چندہ کی ہے ہزاروں آدمیوں کا چندہ مدرسہ میں آتا ہے تو ان کو کارروائی دکھلانا بھی ضروری ہے اور وہ کارروائی یہی ہے کہ فارغ شدہ لوگوں کی تعداد زیادہ ہو اور اس کو کون دیکھتا ہے کہ جن کی دستار بندی ہوئی ہے ان کو کچھ آ بھی گیا ہے یا نہیں بس یہ فکر رہتی ہے کہ قوم کو گنتی گنا دیں ایسا نہ کریں تو مدرسہ کی نیک نامی کیسے ہو) غرض اس طالب علم کو کھینچا اور چونکہ یہ اندیشہ بھی تھا کہ عین وقت پر دوسرے مدرسہ والے اس کو اپنی طرف لے جائیں اس کے انسداد کے لیے یہ کیا کہ اس طالب علم کو کسی میلہ سے بلا کر کوٹھری میں بند کر دیا اور وہاں اس کی آسائش کا پورا انتظام کر دیا کوئی تکلیف نہیں ہونے پائی اور صبح کو عین وقت پر نکالا اور دستار بندی کر کے چھوڑ دیا کہ اب جہاں چاہو جاؤ ہمیں تو ایسی ترکیبیں نہیں آتیں۔

تصوف کوئی قرنطینہ نہیں ہے

غرض ڈپٹی صاحب سے میں نے کہا محسن اول وہی ہیں ان کو رنجیدہ کرنا اور ان کی بے ادبی کرنا مناسب نہیں اور میں نے ان کی تعلیم میں کچھ ترمیم کر دی۔ انہوں نے پنشن لے لی تھی اور ایسی خلوت اختیار کی تھی کہ عرصہ تک محلّہ سے بھی باہر نہ گئے تھے اعزہ و اقارب سے بھی نہ ملتے کسی سے بات بھی نہ کرتے، میں نے کہا یہ خلوت چھوڑ دو اور گھر سے نکلو اور اعزہ و اقارب سے ملو۔ اعزہ سے عزلت کب جائز ہے یہ تو قطع رحم ہے اور سفر کرو اور باغوں میں ٹہلا کرو ہوا خوری کے لیے دو چار کوس جایا کرو، تصوف کوئی قرنطینہ نہیں ہے کہ بس سارے کام چھوڑ کر ایک کنوئیں میں بیٹھ جاؤ اور ذکر میں بھی صرف اتنا جہر کرو کہ خود سن لو دوسروں کو سنانے کی کوئی حاجت نہیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا، محلّہ والے خوش ہو گئے اور دعا دیتے تھے کہ خدا بھلا کرے اس کا جس نے ان سے شور وغل چھڑایا ہم کی تو نیند بھی حرام ہو گئی تھی اور وہ ڈپٹی صاحب بھی تر و تازہ ہو گئے۔ یبوست اور وحشت سب کافور ہو گئی اب خط آیا کرتا ہے لکھتے ہیں کہ الحمدللہ کام میں لگا ہوا ہوں۔

ذکر جہر میں اعتدال

اس قصہ سے افراط تفریط ابنائے زمانہ کی معلوم ہوتی ہے غرض ذکر جہر سے مقصود یہی ہے کہ اپنی آواز کان میں آتی رہے اور اس طرف توجہ ہونے سے خطرات نہ آئیں۔ اسی طرح ذکر لسانی سے قلب غافل بھی متنبہ ہو جاتا ہے تو ذکر لسانی بیکار چیز نہیں ہے بلکہ ذریعہ ہو جاتا ہے دونوں کے جمع کا اور ذکر قلبی کبھی ذریعہ ہو جاتا ہے دونوں سے خالی ہونے کا۔ لہٰذا محققین کہتے ہیں کہ ذکر لسانی ضرور کرو زبان سے ضرور کام کرو خواہ توجہ قلبی بھی نہ ہو کیونکہ اگر ایک وقت توجہ نہ ہوگی دوسرے وقت ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ ذکر قلبی اصل میں افضل سہی مگر ایک عارض سے زبانی کو ترجیح ہے اور وہ عارض یہ ہے کہ ذکر قلبی کی صورت میں بعض اوقات مطلق ذکر کے مفقود ہونے کا اندیشہ ہے اور لسانی میں کچھ نہ کچھ تو باقی رہتا ہے لیکن یہ معنی نہ سمجھ لیے جائیں کہ ذکر صرف زبان ہی زبان پر ہو اور دل میں اتنا بھی خیال نہ ہو جتنا نماز میں ارادہ ہوتا ہے کہ نماز پڑھتا ہوں جیسے بعض جہلاء میں یہ آج کل ایک رواج ہو گیا ہے کہ کام کاج کر رہے ہیں باتیں کر رہے ہیں واہی تباہی بک رہے ہیں اور تسبیح چل رہی ہے سمجھ رہے ہیں کہ ہم ذکر کر رہے ہیں یا واہی تباہی میں تو مشغول نہیں زبان سے ذکر کر رہے ہیں مگر دل میں مقدمات کی تجویزیں ہیں حساب کتاب کی میزانیں لگا رہے ہیں، دور دور کی سوچ رہے ہیں یہ کیا ذکر ہے گو برکت سے خالی یہ بھی نہیں لیکن محض اس پر اکتفا کرنا تو ضرور قابل شکایت ہے ذکر لسانی کی تعلیم تو اس واسطے تھی کہ وہ ذریعہ بن جاتا ہے ذکر قلبی کا نہ یہ کہ بس یہی ہے جو کچھ ہے ذریعہ پر اکتفا کرنا اور مقصود پر نظر نہ ڈالنا ایسا ہے جیسے کسی کو چھت پر چڑھنا ہے اور اس کے لیے سیڑھی بنانا شروع کرے لیکن ساری عمر سیڑھی بنانے میں لگا رہے تو اس کا کیا حاصل ہے وہ چھت کیا ہے دل سے باوجود ذکر کا ترجمہ ہی سو یاد ایسی ہوتی ہے جیسے بیوی کی یاد اور بچوں کی یاد کہ اس کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ بیوی کا نام ہر وقت لیتے رہیں یا بچوں کے نام ہر وقت لیتے رہیں بلکہ ایک دل کی کشش کا نام ہے کہ وہ ہر وقت رہتی ہے بچے کا نام لیتے بھی نہیں مگر یہ سوچا کرتے ہیں کہ اس کو یہ کھلائیں گے اور یہ پلائیں گے یہ سب اس کی یاد ہے یا جیسے گاؤں جائیداد کی یاد کہ وہ گاؤں خریدیں گے اس میں یوں ترقی کریں گے کہ خواہ زبان سے کبھی ظاہر بھی نہ کریں یہ ہے ذکر۔ مگر تعجب ہے کہ مخلوق کا ذکر تو ایسی یاد کو سمجھتے ہیں لیکن جب ذکر کو خدا تعالیٰ کی طرف مضاف کرتے ہیں تو اس کے معنی ہی پلٹ جاتے ہیں پس دوسری چیزوں کی چیز کے صحیح معنی تو سب لوگ جانتے ہیں مگر خدا کی یاد کے صحیح معنی بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ بس بڑی یاد یہ دیکھی کہ تسبیح لے کر اللہ

اللہ کرنے لگے اور یہ خبر نہیں کہ دل کہاں ہے سو یاد یہ نہیں ہے یاد اور چیز ہے۔ میں اس کی حقیقت اور زیادہ سہل کر کے بتاؤں گا تا کہ ذکر سے وحشت نہ ہو کہ بڑی دشوار چیز ہوگی۔

تصوف کو ہوّا سمجھنا غلطی ہے

کیونکہ لوگوں نے آج کل تصوف کو ہوّا بنا رکھا ہے اسی واسطے اس کے نام سے گھبراتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ یہ ہمارے بس کی چیز نہیں ہے۔ افسوس ایک نہایت حسین صورت کو ہڈو کا چہرہ پہنا دیا ہے شاید کوئی ہڈو کو نہ سمجھے تو وہ یہ ہے کہ مٹی کا نہایت مہیب چہرہ بناتے ہیں اور اس کو منہ پر رکھ کر بچوں کو ڈراتے ہیں اس پر امریکہ کا ایک قصہ یاد آ گیا کہ وہاں ایک روغن ایجاد ہوا ہے جو صندوقوں پر چڑھا دیا جاتا ہے اور اس میں صفت یہ ہے کہ جو کوئی اس کے پاس آتا ہے اس کی تصویر صندوق پر آ جاتی ہے یہ ترکیب چور سے حفاظت کے لیے ایجاد کی گئی تھی کہ جو شخص چوری کرنے آئے اس کا پتہ لگ جائے مگر چور بھی امریکہ ہی کے تھے۔ انہوں نے یہ ترکیب ایجاد کی کہ جب چوری کرنے لگے منہ پر ایک دوسرا مصنوعی چہرہ چڑھا لیا اور چوری کر لی۔ اس مصنوعی چہرہ کا عکس صندوق پر آ گیا...... ہمارے یہاں بھی تصوف کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہوا ہے کہ ایک نیا چہرہ نہایت مہیب اور بدشکل الفاظ یا رسوم کا چڑھا لیا گیا ہے اس کا نام تصوف رکھ لیا ہے اس واسطے لوگ دور سے دیکھ کر ڈرتے ہیں اگر وہ چہرہ اتار دیا جائے تو وہ اس قدر حسین چیز ہے کہ ممکن نہیں اس کو دیکھ کر آدمی اس طرف کھنچ نہ جائے۔ بقول شاعر

از فرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم　　　کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

(سر سے پاؤں تک اور چوٹی سے لے کر ایڑی تک جہاں بھی دیکھتا ہوں اس کی کشش دل کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے کہ ہر جگہ قابل دید ہے)

تصوف سے ڈرنے والے اس کے اصل چہرہ سے روشناس نہیں

اور یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ تصوف سے ڈرنے والے اس کے اصلی چہرہ سے تعارف نہیں رکھتے اور اس کی ماہیت سے آگاہ نہیں کیونکہ مصنوعی چہرہ سے خوف جبھی ہوتا ہے جبکہ آدمی اصل شخص کو پہچانتا نہ ہو اور اگر اصل شخص کو پہچانتا ہو تو صرف اس کی وضع قطع سے بھی بتلا دے گا کہ اگر چہرہ دوسرا چڑھا ہوا ہے لیکن یہ فلاں شخص ہے۔ بقول شاعر

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش　　　من از رفتار پایت می شناسم

(حقیقت میں جس رنگ کا تو لباس پہن لے گا میں تیرے پاؤں کی رفتار پہچان لوں گا)
تصوف تو ایسا حسین ہے کہ اس کا کوئی پہچاننے والا ہو تو ناخن پا سے بھی اس کو پہچان سکتا ہے ناخن پا کے لفظ پر ایک قصہ یاد آ گیا ہے کہ حضرت وحشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک صحابی ہیں ان کے ہاتھ سے قبل اسلام حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت ہوئی ہے بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اگر ممکن ہو تو تم میرے سامنے نہ آیا کرو کیونکہ مجھے اپنے چچا کا واقعہ تازہ ہو جاتا ہے۔ یہ کتنی سخت سزا تھی کیونکہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا عشق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دنیا کو معلوم ہے ایسا محبوب عاشق ہے یوں کہے کہ تم میرے سامنے نہ آؤ تو مرنا بھی اس کے واسطے سے زیادہ سخت نہیں مگر اللہ اکبر صحابہ کی اطاعت دیکھئے سچا عشق یہی ہے کہ عاشق محبوب کے امر کو اپنی خواہش پر مقدم رکھتا ہے۔ انہوں نے بالکل اس کا مصداق کر کے دکھلا دیا۔

ارید وصاله و یرید هجری　　　فاترک ما ارید لما یرید

(میں اس کا وصال چاہتا ہوں اور وہ میری جدائی چاہتا ہے میں اس کے ارادہ پر اپنے ارادہ کو قربان کرتا ہوں اور چھوڑتا ہوں)
اس کا ترجمہ کسی نے فارسی میں کیا ہے:

میل من سوے وصال و میل او سوے فراق　　　ترک کام خود گرفتم مابرآید کام دوست

(میرا میلان وصل کی طرف ہے اور محبوب کا خیال فراق کی طرف میں نے اپنی مراد کو ترک کر دیا تا کہ محبوب کی مراد پوری ہو جائے)
حضرت وحشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی تعمیل ایسی کی کہ وہاں کی سکونت بھی چھوڑ دی اور ملک شام کو چلے گئے اور تمام عمر صورت نہیں دکھلائی۔ یہ مضمون تو استطراداً بیان ہو گیا۔ اس قصہ سے مقصود یہ تھا کہ حضرت وحشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ملک شام میں ایک بزرگ پہنچے اور ان کا دل چاہا کہ ان سے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قتل کا قصہ دریافت کریں اور یہ خیال امتحان کہ حضرت وحشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کو پہچانتے ہیں یا نہیں منہ لپیٹ گئے۔ حضرت وحشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو کبھی بچپن میں کسی کی گود میں دیکھا تھا اور اب چہرہ ڈھکا ہوا تھا لیکن انہوں نے صرف پیر کے پنجہ سے پہچان لیا اور نام لے کر کہا کہ فلانے ہو جس کو کسی سے تعلق ہوتا ہے وہ ایسے ہی پہچان لیتا ہے۔ حسب شعر بالا

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش　　　من از رفتار پایت می شناسم

(جس رنگ کا تو لباس پہن لے گا میں تیری پاؤں کی رفتار کو پہچانتا ہوں)

مگر لوگ آج کل مقصود کو پہچانتے ہی نہیں تصوف معلوم نہیں کس چیز کا نام رکھ لیا ہے ورنہ تصوف تو وہ چیز ہے کہ اگر بالمعنی الحقیقی ذہن میں ہو تو ہر آیت اور حدیث میں اور ہر عاقل کے کلام میں بلکہ ہر عاقل کے افعال میں بھی وہی نظر آئے کوئی چیز اس کے لیے حجاب نہیں ہو سکتی اور پہچان نہ ہو تو بات ہی اور ہے۔ غرض الفاظ ورسوم کا پردہ تصور پر پڑا ہوا ہے اس واسطے میں الفاظ ورسوم کو چھوڑ کر یاد کی حقیقت آسان صورت میں سمجھتا ہوں تا کہ بجائے وحشت کے اس سے محبت ہو جائے۔ دیکھئے ہم کسی محبوب کو یاد کرتے ہیں تو اگر پوری یاد ہو تو اس وقت اور چیزیں تو قلب میں کیا ہوتیں واللہ اس طرف بھی توجہ نہیں ہوتی کہ ہم فلاں شخص کو یاد کر رہے ہیں اور اپنی یاد کی بھی یاد نہیں ہوتی صرف محبوب کی یاد ہوتی ہے اور اس سے بھی زیادہ واضح مثال یہ ہے کہ جب ہم کوئی کتاب دیکھتے ہیں اور غور سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس وقت ہمہ تن مضمون کتاب کی طرف ایسی توجہ ہوتی ہے کہ دل میں یہ بھی خطرہ نہیں ہوتا کہ ہم مطالعہ کر رہے ہیں اس مطالعہ میں مطالعہ کا بھی خیال نہیں آتا۔ اسی طرح جب آپ دھوپ کو دیکھ رہے ہوں تو اس وقت یہ خیال نہیں آتا کہ ہم دھوپ کو دیکھ رہے ہیں ان مثالوں سے یہ مضمون بہت ہی واضح ہو گیا کہ یاد وہ ہے جس میں اس یاد کی بھی یاد نہ رہے بس مذکور ہی کا دھیان رہے اسی کو فناء الفناء کہتے ہیں۔

ہمارے محاورات میں خود اس کا مفہوم شب وروز مستعمل ہے کسی کی یاد کو یاد اسی وقت کہتے ہیں جب یاد کی بھی یاد ذہن میں نہ رہے اور اگر یاد کی یاد ذہن میں ہو تو وہ اس چیز کی یاد نہیں بلکہ یاد کا خیال ہے۔ اب بتائیے کیا اس درجہ میں خدا کی یاد کی جاتی ہے یاد کے معنی وہی ذہن میں رکھئے جو حقیقت ہے یاد کی پھر دیکھو کہ کیا وہ یاد ہے۔ اول تو جب غیروں کا چرچا ذہن میں ہے تو یاد کہاں اور اکثر حالت ہم لوگوں کی یہی ہے کہ خدا کا نام لیتے ہیں اور دنیا بھر کے بکھیڑے اس وقت ذہن میں موجود ہوتے ہیں بلکہ اس وقت ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جو دوسرے وقت ذہن میں نہ ہوتی ہوں۔ پھر کیا یہ خدا کی یاد ہے ہرگز نہیں۔ صاحبو! جب ایک ادنیٰ مخلوق کے ساتھ ہمارا یہ معاملہ ہے کہ جب ہم اپنے کسی محبوب کو یاد کرتے ہیں تو اس وقت دوسرا ذہن میں نہیں رہتا بلکہ یہ بھی ذہن میں نہیں رہتا کہ ہم اس کو یاد کر رہے ہیں۔ بس اسی کی یاد ہے اور اس سے مزہ لیتے رہتے ہیں۔ یاد کی یاد دوست کی یاد نہیں تو حیرت ہے کہ خدا کی یاد اس طرح نہ کی جائے۔

ذکر کا اثر محسوس نہ ہونے کا سبب

صاحبو! ذرا اس طرح سے یاد کر کے دیکھو حق تعالیٰ کو پھر دیکھو کہ ذکر اللہ کیا چیز ہے اور اس میں وہ اثر ہے یا نہیں جو حدیث میں آیا ہے کہ شیطان قلب سے ہٹ جاتا ہے ایک ہی دفعہ اللہ کہنے سے

یہ اثر محسوس ہوگا مگر کیا کیا جائے کہ قلب میں یاد کی صلاحیت ہی نہیں، قلب زخمی ہو رہا ہے حالانکہ زبان سے بھی ذکر کیا جاتا ہے جو معین ہوتا ہے ذکر قلبی کا تو چاہیے تھا کہ اس کے ذریعے سے قلب زیادہ متوجہ ہو جاتا اور غیر سے خالی ہو جاتا مگر قلب میں چونکہ غیر ضرور رہتا ہے اسی واسطے ذکر کا اثر محسوس نہیں ہوتا۔ ایک دوست نے اس مقام پر ایک کام کا سوال کیا اس کو میں بیان کرتا ہوں اور اس کا حل بھی کروں گا۔ وہ سوال یہ ہے کہ عادۃً یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی ہر وقت خدا تعالیٰ کی طرف ایسی توجہ رکھے کہ اور کسی چیز کی طرف توجہ ہی نہ ہونے پائے حتیٰ کہ اس توجہ کی طرف بھی توجہ نہ ہو۔

دل کی عجیب وغریب مثال

دل کی حالت تو موج کی سی ہے کہ ہر وقت زیروزبر ہوتا رہتا ہے۔ حدیث میں خود موجود ہے کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شکایت کی کہ جب تک ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں رہتے ہیں تو گویا دوزخ جنت آنکھ کے سامنے ہوتے ہیں پھر ہم اہل وعیال میں مشغول ہو جاتے ہیں تو یہ حالت نہیں رہتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ حالت مستمر رہتی تو تم سے فرشتے مصافحہ کیا کرتے۔ ''ولکن یا حنظلة ساعة فساعة''[1] یعنی کبھی وہ حال ہوتا ہے اور کبھی یہ۔ اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ذکر کا جس میں دوسری طرف توجہ بھی نہ ہو استمرار مامور بہ نہیں ہے بلکہ مقدور بھی نہیں قلب کو تو قلب کہتے ہی اس لیے ہیں کہ اس میں تقلب ہوتا رہتا ہے یعنی لوٹتا پوٹتا رہتا ہے، غرض یہ کہ ذکر ہر وقت نہیں رہ سکتا۔ اس کا جواب سن لو سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک ہی چیز کی طرف قلب کا ہر وقت متوجہ رہنا عادۃً ناممکن ہے اس کو ہم مانتے ہیں اور ہم خود کہتے ہیں کہ تم ایک ہی چیز دل میں نہ رکھو، مختلف چیزوں کو رکھو مگر وہ مختلف چیزیں ہوں اس ایک چیز کے تعلق کی پس خدا تعالیٰ کی یاد بھی خاص مختلف چیزوں کے ساتھ مجتمع ہو سکتی ہے یہ تو احتمال ہے باقی یہ مضمون قدرے شرح وتفصیل کا محتاج ہے جس کو ابھی عرض کرتا ہوں اور اس شرح کے لیے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ محبوب کی یاد جیسے یہ ہے کہ اس کا نام لیا جائے ایسے ہی یہ بھی اس کی یاد ہے کہ یہ تصور کیا جائے کہ اس کا چہرہ ایسا ناک ایسی ہے وہ ہاتھ ایسا ہے اور لباس ایسا ہے اور مکان ایسا ہے اور سواری ایسی ہے اخلاق ایسے ہیں عادات ایسی ہیں۔ یہ سب توجہ الی المحبوب اور ذکر محبوب ہی میں داخل ہے اسی مقام سے ایک عاشق کہتا ہے:

ہرچہ بینم درجہاں غیر تو نیست ۔۔۔ یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(تمام عالم آپ کی صفات کا مظہر ہے ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے غیر وجود ہی نہیں بلکہ ہر جگہ آپ کا ظہور ہے)

---

[1] (الصحیح لمسلم، التوبة: ۱۲)

صاحبو! ایسی تمام چیزوں کی طرف توجہ کہ جن کو علاقہ ہو محبوب سے اس محبوب کی یاد ہے۔ بشرطیکہ ان چیزوں کی طرف توجہ اسی علاقے سے ہو کہ یہ محبوب کی چیزیں ہیں اور یہ جو اوپر کہا گیا تھا کہ غیر کی طرف توجہ نہ ہو اس غیر سے مراد وہ چیز ہے جس کو محبوب سے علاقہ نہ ہو۔ صرف الفاظ پر نہ جایئے گو غیر بالمعنی المنطقی تو ہر چیز کو کہہ سکتے ہیں جو سوائے خدا تعالیٰ کے ہے مگر یہاں غیر سے مراد دوسرے معنی ہیں یعنی بے تعلق ہونے کی حیثیت سے میں نے پہلے بھی ایک وعظ میں بیان کیا تھا کہ صوفیاء کے کلام میں غیر اللہ کا لفظ معقولی اصطلاح کا لفظ نہیں ہے ورنہ لازم آئے گا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی ذکر غیر اللہ ہو اور آپ پر ایمان بھی ایمان بغیر اللہ ہو۔ حالانکہ صوفیاء حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو غیر کہاں مانتے تو وہ عالم کو بھی غیر اللہ نہیں کہتے جس سے ظاہر میں سننے والوں کو وحشت ہوتی ہوگی مگر یہ وحشت اس لیے ہے کہ آپ کے ذہن میں عین اور غیر کے وہ معنی جمے ہوئے ہیں جو اہل فلسفہ کی اصطلاح ہے ان کے یہاں عین اللہ کے معنی ذات بحت کے ہیں اور غیر وہ ہے جو ماسوائے ذات ہو۔ اس معنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا عالم کو عین کوئی نہ کہہ سکتا اور صوفیاء نے جو کہا ہے تو ان کی اصطلاح اہل فلسفہ سے الگ ہے وہ غیر اس کو کہتے ہیں جسے خدا تعالیٰ سے تعلق نہ ہو یعنی جس چیز کو قرب حق میں داخل نہ ہو جیسے دنیائے مذموم اور معاصی وغیرہ اور عین وہ ہے جس کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہو یعنی وہ قرب میں دخل رکھتا ہو اس معنی کے اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخ بلکہ تمام عالم کی ہر چیز جو خدا سے غافل نہ کرے بلکہ خدا کی یاد میں اعانت کرے کیونکہ مصنوع کو دیکھ کر صانع کا کمال قدرت معلوم ہوتا ہے عین ہے جس کے وہی معنی ہیں کہ اس کو قرب حق میں دخل ہے یہ معنی نہیں کہ یہ سب خدا ہیں (نعوذ باللہ) یہ معنی جب لازم آتے جب صوفیاء عین کا اطلاق منطقی اور فلسفی اصطلاح کے موافق کرتے مگر ان کی تو اصطلاح ہی جدا ہے ناواقفوں نے تصوف کی کتابوں میں لفظ عین دیکھ کر اس کی شرح میں نہ معلوم کیا کیا خبط کیا ہے جس کو زبان پر لاتے ہوئے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے اور یہ ساری خرابی غلط اصطلاح کی ہے کہ عین کا لفظ اہل تصوف سے سن لیا اور بدون ان کی اصطلاح کے سمجھے ہوئے ایسی واہی تباہی باتوں سے اس کا نام کر دیا۔ افسوس کیسے عالی مفہوم کو غلط اصلاح سے خراب کیا ہے یہ بڑی خیانت ہے کیونکہ قرآن وحدیث معقولی اصطلاح میں نازل نہیں ہوئے پھر صوفیاء کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ اپنے الفاظ میں معقول کا اتباع کریں۔ ہاں قرآن وحدیث محاورات اہل لسان میں نازل ہوئے ہیں تو غیر کے معنی میں بھی صوفیاء نے ان ہی محاورات کا اتباع کیا ہے چنانچہ غیر اور عین کے معنی صوفیاء کی اصطلاح میں وہی ہیں جن کو عامہ اہل لسان اپنے کلام میں روزمرہ برتتے ہیں۔

محاورات میں غیر اور عین کے معنی

چنانچہ کہتے ہیں کہ آپ تو اپنے ہی ہیں غیر تھوڑا ہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں غیر کے معنی معقولی نہیں ہیں یہ تھوڑا ہی مراد ہے کہ متکلم ومخاطب ایک دوسرے کے عین ذات ہیں بلکہ سیدھے سیدھے معنی ہیں کہ ہم اور آپ بے تعلق نہیں ہیں بلکہ ہم سے اور آپ سے تعلق خصوصیت کا ہے۔ غرض محاورات میں بے تعلق چیز کو غیر کہتے ہیں اور جس کو تعلق ہو اس کو غیر نہیں کہتے اور عالم کا تعلق حق تعالیٰ سے ظاہر ہے اور وہ تعلق یہ ہے کہ حق تعالیٰ صانع اور عالم مصنوع ہے اور عالم دلیل ہے اور حق تعالیٰ مدلول تو جب عالم اس اصطلاح کی موافق حق تعالیٰ کا غیر یعنی بے تعلق نہیں ہوا تو اگر اس کو کسی نے دوسرے لفظ میں ترجمہ کر دیا اور عین کہہ دیا اور اس کے معنی سے کہے کہ عالم غیر متعلق باللہ نہیں ہے تو اس میں کیا ظلم ہو گیا اور کفر و شرک کدھر سے ہو گیا۔ یہ ان کی خاص اصطلاح ہے جو بالکل محاورہ کی موافق ہے اور اصطلاح میں کسی کو مناقشہ کا حق نہیں ہے خصوص وہ اصطلاح جو محاورہ کی موافق ہو البتہ بعض جاہلوں نے اس لفظ کے ایسے واہیات معنی کیے ہیں جو بالکل الحاد اور زندقہ ہیں۔ اصطلاحات کے خلط سے ایسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں حالانکہ صوفیاء کی اصطلاح معلوم ہو جانے کے بعد بالکل سیدھے سیدھے معنی ہیں۔

اہل اللہ جہلاء سے نہیں الجھتے

مگر اہل اللہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں وہ ایسے معترضین سے تعرض ہی نہیں کرتے وہ معترضین ان پر فتویٰ بھی لگا دیں تو پروا نہیں کرتے وہ جس خیال میں ہیں ان کو اسی سے فرصت نہیں وہ تو ایسے لوگوں کو یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں:

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگذار تا بمیر دور رنج خود پرستی

(مدعی سے عشق و مستی کے راز نہ بتائے بلکہ چھوڑ دیجئے کہ وہ خود پرستی کے رنج میں مرجاتا ہے)

ان کی حالت کیمیا گر کی سی ہے کہ کیمیا گر کبھی اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا اور اس کو اس بات پر کبھی غیظ و غضب نہیں آتا کہ اس کو کوئی کیمیا گر نہ سمجھے بلکہ وہ کوشش کرتا ہے کہ مجھے لوگ ہرگز نہ پہچانیں اور جو جس کا جی چاہے حکم لگاتا پھرے۔ خلاصہ یہ کہ غیر کے معنی بے تعلق چیز کے ہیں اور جس چیز کو تعلق ہو وہ غیر نہیں تو ان چیزوں کی طرف متوجہ ہونا جو کہ محبوب سے تعلق رکھتی ہیں یہ سب توجہ الی المحبوب ہی ہے اور حق تعالیٰ سے تمام عالم کو تعلق ہے تو جس کی نظر میں یہ تعلق متحضر ہے اس کی توجہ ہر چیز کی طرف الی اللہ ہی ہے تو اب اس شعر کے معنی صاف ہیں:

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست　　یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(یعنی تمام عالم اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہے ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے غیر کا وجود ہی نہیں بلکہ ہر جگہ آپ کا ظہور ہے)

بعض لوگ اس تقریر سے خوش ہوئے ہوں گے کہ بس اب تو ہمارا وہ ذکر بھی کامل ہو گیا جس میں ہمارا دل دنیا کے قصوں میں بارابات رہتا ہے کیونکہ جب عالم کی ہر چیز کی طرف توجہ کرنا توجہ الی اللہ ہی ہے تو ہمارا بیوی بچوں کی طرف دھیان کرنا بھی توجہ الی اللہ ہی ہے پھر ہمارے ذکر کو خاص کیوں کہا جاتا ہے تو میں اس شبہ کا پہلے جواب دے چکا ہوں کہ اشیاء عالم کی طرف توجہ ہونا محبوب کی طرف توجہ اس وقت ہے جبکہ وہ توجہ اس علاقہ سے ہو کہ یہ محبوب کی چیزیں ہیں یعنی توجہ کے وقت یہ علاقہ مستحضر و ملحوظ ہو اور آپ کی توجہ ذکر کے وقت بیوی بچوں کی طرف اس علاقہ سے نہیں ہوتی بلکہ اس علاقہ سے ہوتی ہے کہ وہ آپ کی چیزیں ہیں اپنی چیز سمجھ کر آپ ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اس توجہ میں خدا تعالیٰ کا علاقہ ملحوظ نہیں بلکہ خود کا علاقہ ملحوظ ہے اور خود ہی مانع ہے خدا سے اور جو مانع ہے وہ غیر ہے اس لیے آپ کی توجہ غیر ہی کی طرف توجہ ہے۔

توجہ الی المحبوب کے تین درجات

تفصیل اس کی یہ ہے کہ توجہ الی المحبوب کے تین درجے ہیں توجہ الی الذات اور توجہ الی الصفات اور توجہ الی الافعال اور ذات تو ظاہر ہے اور صفات بھی ظاہر ہیں اور افعال جیسے یہ خیال کرنا کہ خدا تعالیٰ نے ہمیں پیدا کیا یہ سب توجہ الی الحق ہی ہے اور اس سے شعر کے معنی اور زیادہ صاف ہو گئے یعنی اس میں توئی سے مراد مرتبہ ذات ہے اور خوئے تو سے مراد صفات ہیں اور بوئے تو سے مراد افعال ہیں۔ پس ان سب کی طرف توجہ حق تعالیٰ ہی کی طرف توجہ ہے اب سب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ عالم کے ہر جزو کی طرف توجہ کرنا بھی توجہ الی اللہ ہو سکتی ہے کیونکہ کم از کم اس کے افعال کے ساتھ تو ہر وقت ہی تعلق ہوگا۔ حتیٰ کہ اس نیم کے درخت کو اس نظر سے دیکھیں کہ محبوب کے تصرف سے اس کی شاخیں ایسی ہیں یوں پھل آتا ہے یوں پتے پیدا ہوتے ہیں' ذائقہ پھل کا اور ہے اور پتوں کا اور خصوص بھی ہر جزو کے علیحدہ ہیں یہ بھی توجہ الی غیر اللہ نہیں ہے بلکہ نیم معرفت ہے کیونکہ مفضی الی معرفۃ الافعال ہے اور اگر اس طرح دیکھیں کہ اس کو خدا تعالیٰ نے بنایا ہے یعنی مصنوع سے ذات صانع کی طرف انتقال کریں تو پھر نیم نہیں بلکہ پوری معرفت ہے۔

عارف کا عالم سے تعلق کس قسم کا ہوتا ہے

عارف کا تعلق عالم کے ساتھ اور ہی طرح کا ہوتا ہے اس کو مصنوعات کے ساتھ تعلق رکھنے سے بھی ترقی ہوتی ہے کیونکہ وہ درحقیقت تعلق بالصانع ہے وہ ہر چیز پر خدا کے علاقہ سے نظر کرتا ہے بدون اس علاقہ کے نظر ہی نہیں کرتا اس لیے ہر چیز سے اس کو ترقی ہوتی ہے اور اسی علاقہ سے کبھی عارف کو اپنی ذات سے بھی محبت ہوجاتی ہے وہ اس وقت اپنی ذات کو سرکاری چیز سمجھتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی حفاظت کرے جیسے خزانچی کہ سرکاری روپیہ کا محافظ ہے تو اس کو روپیہ کی دیکھ بھال رکھنا اور اس کے دھندے میں لگا رہنا اور جانچ پڑتال کرتے رہنا برا نہیں بلکہ ضروری ہے اور اس کو طمع یا حرص نہیں کہہ سکتے یہ تو اس کا عین فرض منصبی ہے۔ یہ باریک بات ہے لوگ اہل اللہ کو دنیا کے تعلقات میں دیکھ کر اپنے تعلقات پر قیاس کر لیتے ہیں حالانکہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے جیسے اس خزانچی کے بار بار روپیہ شمار کرنے میں اور ایک بنئے کے شمار کرنے میں بڑا فرق ہے۔ خزانچی کو تو اجر ملتا ہے اور بنئے کو اجر نہیں ملتا بلکہ اور کچھ سرکاری ٹیکس مقرر ہوجاتا ہے کیونکہ خزانچی تو اپنے واسطے نہیں گنتا اور بنیا اپنے واسطے اپنا مال سمجھ کر گنتا ہے۔ جب آدمی کو یہ معلوم ہونے لگے کہ ہم اپنے نہیں ہیں بلکہ خدا کے ہیں (اور اس کے لیے کچھ خاص علامات ہیں) تو اس کو اپنے آپ سے بھی محبت کرنا چاہیے اور جب تک یہ حال پیدا نہ ہو تو اپنی چیز سے بھی تعلق تعلق بغیر اللہ ہے اسی حالت عدم تعلق میں کہا ہے:

بخدا رشکم آیدز چشم روشن خود   کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے

(خدا کی قسم مجھے اپنی دونوں آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ایسے حسین سے میری نظر دور رہتی ہے)

مطلب یہ ہے کہ میری آنکھ بحیثیت میری آنکھ ہونے کے یعنی جب تک میری ہے آپ کے دیکھنے کے قابل نہیں اور جب آپ کی ہوجائے تو اس حالت کا یہ حکم ہے:

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است   افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را   کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

(مجھ کو اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ انہوں نے تیرے جمال کو دیکھا ہے اور اپنے پیروں پر رشک کرتا ہوں کہ وہ تیرے کوچہ میں پہنچتے ہیں ہر گھڑی اپنے ہاتھوں کو ہزار بوسہ دیتا ہے کہ انہوں نے تیرا دامن پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے)

اس مرتبہ میں آنکھ کی طرف توجہ اور اس کی حفاظت کی تدابیر کرنا توجہ الی غیر اللہ نہیں بلکہ سرکاری چیز کی حفاظت ہے اور توجہ الی اللہ ہی ہے۔ یہ فرق اہل اللہ کے دنیوی تعلقات میں اور ہمارے دنیوی تعلقات میں گو صورۃً دونوں متشابہ ہیں۔

عالم میں مرأۃ حق بننے کی استعداد ہے

یہی معنی ہیں اس آیت کے

وَكَأَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ۝

شکایت فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ بہت سی نشانیاں عالم میں ایسی ہیں کہ لوگ ان پر نظر ڈالتے چلے جاتے ہیں اور ان کی طرف توجہ نہیں کرتے یعنی ان کو آیات اللہ اور مرأۃ حق (حق کا آئینہ) نہیں بتاتے۔ معلوم ہوا کہ اگر ان کو مرأۃ حق بنانا چاہتے تو بنا سکتے تھے کیونکہ شکایت امور اختیاریہ ہی میں ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ عالم میں قابلیت مرأۃ حق بننے کی ہے بنانے والا چاہیے۔ پس ثابت ہوا کہ عالم کی طرف توجہ اس حیثیت مذکورہ سے مذموم نہیں بلکہ محمود اور مطلوب ہے کیونکہ اس کے خلاف پر یعنی اعراض پر شکایت کی گئی ہے۔ ہاں جانچ لیا جائے کہ آیا یہ حیثیت حاصل بھی ہے جب طبعاً و ذوقاً یہ بات پیدا ہو جائے کہ

حسن خویش از روئے خوباں آشکار کردہ   پس بچشم عاشقاں خود را تما شا کردہ

(تو نے اپنی خودی کو خوبصورتی کے چہروں سے ظاہر کر دیا ہے مگر عاشقوں کی نظر میں تماشا بن گیا ہے)
تو پھر اس کے لیے ہر چیز میں نظر کی اجازت ہوگی اور توجہ الی العالم اس کے لیے توجہ الی اللہ ہی ہوگی۔

حسینان جہان میں مرأۃ ہونے کی استعداد نہیں

یہاں سے کوئی یہ خیال کرلے کہ جب تمام عالم مرأۃ حق بن سکتا ہے تو من جملہ اجزاء عالم کے حسیناں جہاں بھی ہیں تو ان کی طرف بھی نظر کرنا اس نیت سے کہ ان کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے درست ہونا چاہیے۔ سو یہ خیال محض غلط ہے کیونکہ حسینوں کو دیکھ کر خدا ایسا یاد آتا ہے کہ حسینوں کی یاد بھی ضرور اس میں شریک رہتی ہے اور شرکت بھی ایسی شرکت کہ غالب انہیں کی یاد ہوتی ہے اور خدا کی یاد مغلوب ہوتی ہے اور ایسی مغلوب کہ یہ صرف نفس کا دھوکہ ہی ہوتا ہے کہ اس میں خدا کی یاد بھی شامل ہے ورنہ یاد خدا اس وقت محض موہوم بلکہ معدوم ہوتی ہے اور اعتبار غالب ہی کا ہوتا ہے تو حسینوں کی طرف توجہ توجہ بخدا نہیں ہے اور اگر کوئی یہ بھی کرے کہ نظر کرتے وقت غلبہ خدا ہی

کی یاد کو دے دے تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس میں بھی نفس کا دھوکہ ہی ہے وہ اس وقت من، سمجھوتہ کر لیتا ہے کہ میں شہوت کا خیال نہ کروں گا بلکہ خدا کو یاد رکھوں گا پھر دیکھنے میں کیا حرج ہے اور اس طرح سے جال میں پھنسا دیتا ہے پھر اس میں یہ خاصیت ہے کہ ذرا دیر کے بعد اس کا عکس ہو جاتا ہے اور انہیں کی یاد رہ جاتی ہے' یاد خدا کا پتہ بھی نہیں رہتا۔

لہٰذا نظر بہ حسن حرام ہے جبکہ اس کی طرف وہ خاص کشش ہو جو شہوت سے ناشی ہوتی ہے جس کے معیار کے لیے صحیح بصیرت کی ضرورت ہے ہر شخص کا فیصلہ اس کے لیے کافی نہیں اور وہ معیار یہ ہے کہ اگر اس حسین میں کوئی ایسا عیب پڑ جائے جس سے وہ قبیح المنظر ہو جائے تو دیکھا جائے کہ اس کی محبت گھٹتی ہے یا بڑھتی ہے اگر گھٹ جائے تو یہ علامت ہے اس محبت میں شہوت کی شرکت کی اور اگر بڑھ جائے تو علامت ہے خلوت عن الشہوت کی اور کسی محل میں دونوں محبتیں جمع ہو جاتی ہیں وہاں دونوں آثار مختلف حیثیتوں سے جمع ہوں گے جیسے اپنی بی بی میں کوئی ایسا عیب پڑ جانے کے وقت...... اگر اس جواب کے بعد بھی کوئی یہی کہے کہ حسینوں کی طرف نظر کرنا نظر بخدا ہے کیونکہ حسن دیا ہوا تو خدا ہی کا ہے تو ان کو دیکھ کر صنعت خدا پر نظر پہنچے گی لہٰذا جائز ہونا چاہیے تو اس کے لیے ایک دوسرا جواب ہے وہ یہ کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس سے صنعت خدا کا نظارہ ہو سکتا ہے مگر اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی محبوب نے اپنے سامنے دس آئینے کھڑے کیے ہوں جس میں سے اس کا عکس دیکھا جا سکے لیکن ایک آئینہ ان میں سے آتشی بھی ہے اس سے محبوب نے منع کیا ہے کہ اس میں مجھے نہ دیکھنا کیونکہ اس میں خاصیت ہے جلا دینے کی جیسا کہ آفتاب کو معمولی شیشہ میں دیکھیں تو آنکھ کو چنداں صدمہ نہیں پہنچتا اور آتشی شیشہ میں دیکھیں تو گو اس میں بھی وہی نور آفتاب کا ہے مگر اس کی خاصیت یہ ہے کہ جس چیز پر اس کا عکس پڑ جائے گا جلا دے گا تو یہ حسین بھی جمال حق کے لیے آئینے بیشک ہیں مگر آتشی شیشے ہیں کہ نور حق کا جب ان میں ہو کر پڑے گا تو جلانے کا اثر رکھے گا۔

ہرگز نہ گندی گوں لاتقر بوا کہ زہر ست	حال پدر بہ باد از ام الکتاب دارم
نداند صاحب دلاں دل بہ پوست	وگرا بلہے داد بے مغز اوست

(حسینوں کے قریب مت جاؤ کہ زہر ہے باپ کا حال میں ام الکتاب میں رکھتا ہوں' صاحب دل اپنا دل چھلکے کے بدلے نہیں دیتے' دوسرے بیوقوف بغیر مغز کے اسے دے دیتے ہیں)

اور میں کہتا ہوں کہ محبوب نے جب خود اپنی تجلیات کے مشاہدہ کے لیے اس شیشہ کے سوا دوسرا

طریقہ اس سے اچھا اور بے خطر بتایا ہے تو خطرناک طریقہ کو اختیار کرنا۔ کیا عقل کی بات ہے یہ حسین ان تجلیات کے سامنے کیا چیز ہیں ان میں ہو کر وہ تجلیات بالکل میلی اور دھندلی ہو جاتی ہیں ان کی طرف نظر کرنا علامت ہے اس کی اصل تجلیات کی جھلک اس شخص پر نہیں پڑی ہے ورنہ آفتاب کے سامنے چراغ کو کون پوچھتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حسینان جہاں توجہ آتشی ہونے کی بناء پر خاص خاصیات عادیہ کے منظر خدا ہونے سے مستثنیٰ ہیں باقی تمام عالم منظر اور آئینہ خداوندی ہے تو ان کی طرف توجہ بھی توجہ بخدا کہی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ حیثیت منظریت کی ملحوظ رہے۔ اس تقریر سے کہ ہر صحیح منظر پر نظر اور توجہ محبوب ہی کی یاد ہے۔ اس سوال کا جواب ہو گیا کہ ذکر ایک چیز ہے اور ایک چیز کا استمرار عادۃً قلب میں نہیں ہو سکتا۔

ذکر اللہ کے مختلف طرق

جواب ظاہر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ذکر خدا کے طرق بہت ہیں ایک سے جی اکتاوے تو دوسرے طریق سے ذکر کرو۔ ایک چیز ذہن میں نہ رہے مثلاً توجہ الی الذات نہ رہ سکے تو صفات کو سوچو اور یہ بھی نہ ہو سکے تو افعال کو سوچو ہر چیز میں قدرت خدا نظر آ سکتی ہے مصنوعات میں غور کرو کہ یہ صنائع حق تعالیٰ نے رکھی ہیں اور اس سے بھی اکتاؤ تو بیوی بچوں میں رہو اور دل بہلاؤ۔ کام کرنے والا چاہے بیوی بچوں کو دیکھ کر بھی یہ سوچ سکتا ہے کہ آخرت میں اعمال صالحہ کی بدولت اسی طرح کی حوریں ملیں گی اور برے اعمال کرنے سے ان سے محرومی ہوگی اور بجائے ان کے عذاب بھگتنا پڑے گی۔ غرض اتنے طریقے خدا کی یاد کے ہیں کہ ساری عمر بھی آدمی اس سے اکتا نہیں سکتا اور یہی حکمت ہے اس میں کہ شریعت نے مختلف اوقات میں مختلف عبادتیں مقرر کی ہیں کبھی نماز ہے کبھی روزہ ہے کبھی زکوٰۃ ہے کبھی حج کبھی قربانی کبھی جہاد۔

مختلف اوقات میں مختلف دعاؤں کی حکمت

اور اسی طرح شریعت نے ہر وقت کے لیے جدا جدا خاص خاص دعائیں سکھلائی ہیں اٹھنے کی دعا الگ اور بیٹھنے کی دعا الگ اور سونے کی الگ اور جاگنے کی الگ اور کھانے سے پہلے کی الگ اور بعد کی الگ اور پینے کی الگ اور یہ سب اسی یاد کے طریقے ہیں اور اس تعدد طرق سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ دل اکتائے نہیں۔ غرض محبوب نے تم کو ہزاروں آئینے دیئے ہیں کہ خواہ اس کو دیکھو خواہ اس کو دیکھو۔

آئینہ میں محبوب کو دیکھو

مگر دیکھو محبوب ہی کو آئینہ کو مت دیکھو۔ دل میں وہی رہے اس سے غفلت نہ ہو پس یہ ایسا ہوا کہ ہم کبھی دوست کے خط کو دیکھتے ہیں اور کبھی اس کے کپڑوں کو اور کبھی اس کی صورت کو کبھی سیرت کو

اور یہ سب دوست ہی کی یاد ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کو مختلف رنگوں سے یاد کرو اپنی ضروریات میں بھی رہو اور حق تعالیٰ کو بھی مت بھولو۔ میں دنیا کے کاموں سے منع نہیں کرتا بڑی شکایت اس بات کی ہے کہ ہم لوگ وقت بہت ضائع کرتے ہیں، دنیا کے ضروری کام اتنے نہیں کہ حق تعالیٰ کی یاد کو مانع ہوں۔ واللہ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور جو شخص غور کرے گا اپنے اوقات میں وہ میرے قول کو صحیح پائے گا کہ ہم دنیا کے ضروری کام بہت تھوڑی دیر کرتے ہیں۔ ضروریات کے لیے بہت ہی تھوڑی دیر توجہ قلب کی ضرورت ہے۔ زیادہ تر فضول باتوں میں قلب لگا رہتا ہے۔ بس میں ان فضول تعلقات کے چھوڑنے کو کہتا ہوں۔ یہ نہ دنیا کے کار آمد ہیں نہ دین کے اسی کو انہماک کہتے ہیں:

شریعت میں کسب دنیا کی اجازت ہے انہماک کی نہیں

شریعت میں دنیا کے کاموں کی اجازت ہے مگر انہماک کی اجازت نہیں۔ مثلاً پیشاب، پاخانہ ضروریات میں سے ہے اور عقلاً ایک وقت ان کے واسطے دینا بھی ضروری اور واجب قرار دیا گیا ہے مگر وہ وقت ان سے فراغت کرنے کے لیے دیا گیا نہ کہ عطر کی طرح اس کو سونگھنے اور لگانے کے لیے اسی طرح دنیا کے واسطے بھی وقت دینا چاہیے مگر اس سے فراغت کے واسطے نہ کہ دلچسپی کے واسطے۔ بس اس مثال کو پیش نظر رکھئے اور اسی درجہ میں دنیا کے کاموں میں لگئے۔ یہ اصلاح کا ایک چھوٹا سا گر ہے سوچ کر دیکھو تو معلوم ہو کہ زیادہ وقت فضول کاموں میں جاتا ہے یا نہیں اگر فرضاً جوارح ظاہری بھی دین کے کام میں ہوں تب بھی قلب تو ضرور ادھر ادھر کے خیالات میں مصروف رہتا ہے۔ میں کہتا ہوں ان فضول خیالات کی ضرورت ہی کیا ہے جس ضروری کام کو کرنا ہو اس کے متعلق جو سوچنا ہے تھوڑی دیر بقدر ضرورت سوچ لیجئے۔

قلب کو فارغ رکھنے کی ضرورت

اور اس کے بعد قلب کو فارغ کر لیجئے۔ ضروریات کے لیے ہاتھ پیر سے بھی کام لینے کی اجازت ہے اور قلب سے بھی پھر رفع ضرورت کے بعد قلب میں ضروری اور مفید خیالات رہنے دو اور فضول اور مضر خیالات کو نکال دو وہ ضروری اور مفید خیالات وہ ہیں جن کی نسبت حدیث میں ہے "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ وَسَاوِسَ قَلْبِیْ خَشْیَتَکَ" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا تعلیم فرمائی ہے کہ یا اللہ میرے دل کے خیالات کو اپنے خوف کے خیالات کر دیجئے بس تم بجائے فضول خیالات اور وساوس کے حق تعالیٰ کی نعمتوں اور وعیدوں کو سوچا کرو اور وعیدوں کو سوچنا یہ سب ذکر اللہ ہی ہے۔

لیجئے آپ کے لیے بہت سے میدان ہیں' دوڑنے میں تنگی کون کرتا ہے۔ بس یہ ہے یاد اور یہ ہے ذکر اللہ اسی کی ترغیب ہے اور اس کے مقابل یعنی غفلت سے منع کیا جاتا ہے۔ یہ ہے مضمون حدیث "اِذَا ذَكَرَ اللّٰهَ خَنَسَ وَاِذَ غَفَلَ وَسْوَسَ"[1] (جب وہ دل سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب ذکر اللہ سے غافل ہوتا ہے تو وہ وسوسہ ڈالتا ہے) کا اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ فہم اور ہمت اور توفیق عمل عطا فرمائیں۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث میں دو عمل کی خاصیتیں بیان کی گئی ہیں ذکر اللہ کی خاصیت شیطان کا قلب سے ہٹ جانا اور غفلت کی خاصیت شیطان کا وسوسہ ڈالنا مقصود ان دونوں کی خبر دینے سے ذکر کی ترغیب اور غفلت سے ترہیب ہے۔

(انتھی بلفظ مولانا)

واقعہ ا

بعد ختم وعظ شیخ معشوق علی صاحب حضرت والا کو مسجد کے حجرہ میں لے گئے اور دروازہ بند کر دیا وہاں آرام فرمانے کے لیے ایک پلنگ پہلے سے تیار کر دیا گیا تھا دو ایک خادم بدن دباتے رہے اور تقریباً ایک گھنٹہ تک حضرت والا نے آرام فرمایا' ایک خادم مسجد میں ذکر کے لیے بیٹھ گیا' کچھ غنودگی سی ہوگئی' دیکھا کہ حضرت والا کے سامنے ایک پیالی چائے کی لائی گئی' فرمایا دودھ بھی لاؤ۔ میں جب چائے پیتا ہوں تو دودھ بھی پیتا ہوں اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔ اس نے یہ خواب حضرت والا سے عرض کیا۔ فرمایا چائے سے مراد شورش اور دودھ سے مراد سکون معلوم ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ نہ صرف خیال کیونکہ خیال ہوتا تو اس کا عکس نظر آتا کیونکہ میں چائے نہیں پیتا ہوں اور کبھی پیتا ہوں تو دودھ کی نہیں پیتا۔ احقر کہتا ہے کہ وعظ القاف اس سفر کا سب سے اخیر وعظ ہے اور شروع کے وعظ میں ترہیب کے مضامین تھے جو شورش اور اضطراب پیدا کرنے میں چائے کے مشابہ تھے اور اخیر کے مواعظ میں ترغیب کے مضامین ہیں جو سکون ولذت پیدا کرنے میں دودھ کے مشابہ ہیں۔ کیا عجب ہے کہ ہر دو اثر کی صورت مثالیہ دکھائی گئی ہو۔ دعا ہے کہ خدا تعالیٰ سامعین اور ناظرین کو دونوں اثروں سے مستفیض فرماویں اور رجاء وخوف دونوں کو پورا کر کے ایمان کی تکمیل فرماویں۔ امین

محمد مصطفیٰ بجنوری ضابط وعظ عفی عنہ

---

[1] (تفسیر القرطبی ۲۰: ۲۶۲)

واقعہ۲

احقر ظفر احمد نے دوسرا روز ہے کہ ایک خوب دیکھا تھا جس کی تعبیر میں تردد تھا' اتفاق سے آج اس وعظ پر نظر ثانی کرتے ہوئے وہی مضمون اس میں نظر سے گزرا جس سے حقیقت واضح ہوگئی۔ خواب یہ ہے کہ میں مولوی محمد یوسف مرحوم (برادر حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری ضابطہ وعظ ہذا) اور مخدومی استاذ مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب فرمانے لگے کہ بھائی لوگ میرے اوپر نظر کے معاملہ میں اعتراض کرتے ہیں مگر الحمدللہ میں نے کسی پر نفس کے لیے نظر نہیں کی مجھے تو اس سے بھی معرفت میں ترقی ہوتی تھی۔ مولوی یوسف صاحب کو اس بات پر بہت جوش آیا وہ فرمانے لگے کہ نظر الحسین سے ترقی ہو ہی نہیں سکتی اور اس میں یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ نفس کی آمیزش نہیں اور واقع میں نفس کی آمیزش ضرور ہوتی ہے اس پر مولانا محمد یحییٰ صاحب تو خاموش ہوگئے میں نے مولوی یوسف صاحب سے عرض کیا کہ بیشک نظر میں دھوکہ ہوجاتا ہے اور اکثر حالت یہی ہے مگر یہ ناقصین کی شان ہے کاملین کو اس میں دھوکہ نہیں ہوتا اور وہ نفس کی آمیزش سے محفوظ رہتے ہیں۔ پس آپ کا مطلقاً یہ کہنا درست نہیں کہ نظر الی الحسین سے ترقی ہو ہی نہیں سکتی اور اس میں نفس کی آمیزش ضروری ہے۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا یا مولانا محمد یحییٰ صاحب نے فرمایا کہ بھائی آج کل تو عزلت ہی بہتر ہے اسی میں سلامتی ہے۔

اس وعظ سے اس خواب کی پوری تائید ہوتی ہے چنانچہ اس وعظ میں آتشی شیشہ کی مثال سے پہلے مذکور ہوا کہ نظر بحسن حرام ہے جبکہ اس کی طرف شہوانی کشش ہو۔ اس میں فیصلہ اسی معیار سے ہوتا ہے جو اس مقام پر مذکور ہے۔ باقی کوئی خود معیار ہی کے انطباق میں دسیسہ نفسانیہ سے کام لے اس کا کچھ علاج نہیں اس معیار کے بعد قضیہ شرطیہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ بشہوت کشش نہ ہوتو وہ حرام نہیں مباح ہے اور مباح سے جبکہ وہ مقدمہ طاعت ہوجائے ترقی ممکن ہے مثلاً اگر اس سے معرفت میں کام لیا جائے اور اگر وہ کشش ہے جس میں شہوت کی بھی آمیزش ہوتو وہ حرام ہے اور اس سے معرفت تو کیا الٹا حجاب وبعد ہوتا ہے۔ ھذا و اللہ اعلم بالصواب ۱۲ظفر احمد عفا اللہ عنہ ۲۲صفر سنہ ۱۳۴۳ھ ہے۔

اشرف علی

شرط التذکر

یہ وعظ ۱۴ جمادی الاول ۱۳۴۱ھ بمقام راجپورہ ریاست پٹیالہ جو کہ حضرت والا نے بیٹھ کر ۳ گھنٹے ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی۔ مولوی عبدالکریم صاحب گمتھلوی نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُوْلُوا الۡاَلۡبَابِ○ (الزمر آیت نمبر ۹)

ترجمہ: ”وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو اہل عقل ہیں۔“

حق تعالیٰ شانہ حاکم ہونے کے ساتھ حکیم بھی ہیں

یہ سورہ زمر کی ایک آیت کا حصہ ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے دو ضروری امر بیان فرمائے ہیں اور ان کے ساتھ ہی ان کا طریقہ تحصیل بھی بتلا دیا تا کہ تحصیل میں سہولت ہو جائے۔ اس طریق تحصیل کی تقریر وعظ ہٰذا کے تین ربع کے بعد آتی ہے جہاں اس آیت کی طرف عود کیا گیا ہے اور منشاء اس کا شفقت ہے کیونکہ اصلاح کرنے والے کے ذمہ طریقہ تحصیل کا بتلانا ضروری نہیں ہے۔ مثلاً حکیم کا منصب نسخہ لکھنا ہے اور یہ حکیم کے ذمہ نہیں کہ مریض کو نسخہ ملنے کی جگہ اور اس جگہ تک پہنچنے کا طریقہ بتلا دے۔ یہ مریض یا تیماردار کا فرض ہے کہ اس کو تلاش کرے اور جس طرح ہو سکے دوا لا دے۔ بس اگر حاکم ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ فقط حکم بیان فرما دیتے تو اس کا بجا لانا بندہ پر فرض ہونا چاہیے خواہ آسانی سے کرتا خواہ بدقت لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نہایت شفیق بھی ہیں اس لیے احکام بجا لانے کی آسان آسان تدبیریں بھی ارشاد فرما دیتے ہیں جس سے مخاطب کی ہمت بڑھ جاتی ہے۔ جیسا کہ شفیق استاد بھی ایسا کرتے ہیں کہ طلبہ کو آسان تدبیریں حفظ مضامین کی بتلا دیتے ہیں۔ جلالین دو مصنفوں کی تصنیف ہے اور دونوں کا نام جلال الدین ہے اس لیے طلبہ کو یاد نہیں رہتا کہ نصف اول کس کا ہے اور دوسرا کس کا تو میں نے بعض طلبہ کو یہ ترکیب بتلائی کہ

ایک نصف تو سیوطی کا ہے اور ایک محلی کا اور سیوطی کے اول میں سین ہے اور محلی کے اول میں میم ترتیب حروف میں سین مقدم ہے اور مقدم والے کا حصہ مقدمہ اور میم مؤخر والے کا حصہ مؤخر ہے۔ پس مقدم مقدم کے لیے ہے اور مؤخر مؤخر کے لیے تو یہ سہل ناشی شفقت ہے۔

احسانات خداوندی

جب مخلوق میں یہ شفقت ہے تو حق تعالیٰ میں کس قدر شفقت ہوگی کیونکہ مخلوق جو شفقت کرتی ہے وہ اپنے ذاتی مصالح دنیویہ یا اخرویہ کی وجہ سے کرتی ہے اور حق تعالیٰ اس سے مستغنی ہے نہ مخلوق کی وجہ سے ان کی ذات پاک کو کوئی نفع پہنچ سکتا ہے نہ نقصان وہ لم یزل ولایزال ہے۔ فرماتے ہیں:

من نکردم خلق تا سودے کنم　　بلکہ تابر بندگان جودے کنم

(میں نے مخلوق کو اس لیے پیدا نہیں کیا کہ میں کوئی نفع حاصل کروں بلکہ اس لیے پیدا کیا ہے کہ اپنے بندوں پر عنایت کروں)

پس خدا تعالیٰ کی شفقت نہایت ہی کامل درجہ کی ہوگی مگر تعجب ہے کہ ہم لوگ مخلوق کا تو احسان مانتے ہیں جن میں خود ان کی بھی غرض ہوتی ہے اور احسانات خداوند کا خیال بھی نہیں کرتے (نعوذ باللہ) گویا یوں سمجھتے ہیں کہ وہ تو خدا کے ذمہ تھا کیونکہ احسان جب مانا جاتا ہے کہ کسی نے انعام دیا ہو اور جب قرض ادا کیا ہو تو احسان کی کیا بات ہے حالانکہ حدیث شریف میں تو یہ آیا ہے کہ جب کوئی تمہارا قرضہ بھی ادا کرے تو اس کو دعا دیا کرو اور راز اس میں یہ ہے کہ قرض کی خاصیت ہے کہ جب کوئی حاجت پیش آتی ہے تو اپنا دیا ہوا قرض یاد آتا ہے کہ ہائے وہ روپے ہوتے تو اس وقت کام آتے۔ حتیٰ کہ اگر پچاس مواقع پر روپیہ کی ضرورت پڑتی ہے تو پچاس ہی مرتبہ ان روپوں کا خیال آتا ہے حالانکہ وہ فقط ایک ہی جگہ کام آتے مگر طبعی بات ہے کہ قرض بار بار یاد آتا ہے اور ہر بار تکلیف ہوتی ہے اسی وجہ سے قرض دینے کا ثواب بھی زیادہ ہے۔

قرض کا ثواب صدقہ سے زیادہ کیوں ہے

حدیث شریف میں آیا ہے کہ صدقہ کا دس حصہ ثواب ملتا ہے اور قرضہ کا اٹھارہ حصہ کیونکہ قرض عادتاً وہی لیتا ہے جس کو ضرورت ہو اور خیرات تو بلاضرورت بھی لے لیتا ہے اور ظاہر ہے کہ ضرورت میں دینے کا زیادہ ثواب ہے تو اس شخص نے اس کی تکلیف تو رفع کی اور خود تکلیف اٹھائی اور دوسرے کو اس کی تکلیف رفع کر کے وہی شخص نفع پہنچا سکتا ہے جو خود تکلیف اٹھائے اس لیے قرض کا ثواب صدقہ سے زیادہ ہے اور گو صدقہ دینے میں بھی کچھ نفس کو تکلیف ہوتی ہے مگر

تھوڑی ہی دیر کے لیے یہ خیال کر کے روپے جیب سے نکل گئے مگر یکسوئی ہوگئی اور قرض میں تو بار بار یاد آنے کی سخت تکلیف ہوتی ہے۔ بس قرضہ دینے میں زیادہ اجر ہے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ صدقہ خیرات بند کر دیا جائے کیونکہ حیثیتیں مختلف ہوتی ہیں جیسا کہ ماں بہن کی محبت اور قسم کی ہے اور بیوی کی محبت اور طرح کی ہے۔ پس اسی طرح صدقہ کا اجر ایک حیثیت سے زیادہ ہے اور قرض کی فضیلت دوسری حیثیت سے۔ غرض جب قرض دار نے قرضہ ادا کیا تو قرض خواہ کو اس نے انتظار کی تکلیف سے نجات دیدی۔ اس واسطے حدیث میں تعلیم دی گئی ہے کہ قرض ادا کرنے والے کو دعا دیا کرو چنانچہ طبعاً بھی ادا کرنے کا ممنون ہوتا ہے۔ غرض مخلوق کا احسان تو ادائے قرض کے وقت بھی مانتے ہیں مگر خدا تعالیٰ کو (نعوذ باللہ) ایسا قرض دار سمجھتے ہیں کہ گویا اس سے قرض وصول کرنے میں ہم نے خود احسان کیا کہ وصول کرلیا اگر کوئی کسی کو ایک وقت عمدہ کھانا کھلا دے تو یاد رہتا ہے کہ اس نے کھانا کھلایا تھا اور تعریف کرتے رہتے ہیں لیکن خدا کی کبھی ایسی یاد نہیں آتی جس کی بے شمار نعمتیں ہم کو رات دن ملتی رہتی ہیں۔ بس یوں سمجھتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) ہم نے ہی یہ سب کچھ کمایا ہے خدا کا اس میں کیا دخل ہے۔ یہ خیال نہیں کرتے کہ ہاتھ اسی نے دیئے اور سب سامان وہی مہیا کرتا ہے۔ درحقیقت ہر چیز ملک تو خدا ہی کی ہے جیسا کہ ہل چلانے سے اناج پیدا ہوتا ہے لیکن اناج ہل کی ملکیت میں نہیں سمجھا جاتا بلکہ انسان کو مالک قرار دیا جاتا ہے اسی طرح ہم درحقیقت اس قابل نہیں کہ ہماری طرف کوئی شے بروئے ملک قرار دی جاتی ہے۔ اسی طرح ہم درحقیقت اس قابل نہیں کہ ہماری طرف کوئی شے بروئے ملک منسوب کی جائے بلکہ اپنے کو ہل کی طرح سمجھنا چاہیے یہ خدا کا انعام ہے کہ اس نے ہماری طرف محض نام کی ملک کو منسوب کر کے ہمیں مالک قرار دے دیا ورنہ حقیقت یہی ہے کہ

فی الحقیقت مالک ہر شے خداست　　　این امانت چند روزہ نزد ماست

(درحقیقت اس چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے یہ امانت چند روز ہمارے پاس ہے)

دیکھو اگر کوئی ہمیں سامان دے دے تو ہم آیا سامان کا احسان مانتے ہیں یا کہ سامان دینے والے کا پس

حق تعالیٰ شانہ کی بے شمار اور لامحدود نعمتیں

ہر شے اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے: "وَمَابِکُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰہِ" (اور تمہارے اوپر جو نعمت (بھی) ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے) اللہ ہمارا لفظ نام ہی نام ہے ورنہ حقیقت میں ہمارا دخل ہی کیا۔ چنانچہ میں کہتا ہوں تم نے غلہ بونے میں کتنا کام کیا بس یہ کہ جا کر جنگلوں میں غلہ بکھیر دیا، گھر

میں سے نکال کر باہر پھینک آئے' پھر پانی دے کر اور بھی برباد ہونے کا کام کر دیا کہ جلدی گل گلا کر خراب ہو جائے تم نے غلہ پیدا ہونے کا کونسا کافی انتظام کیا۔ یہ شاخ کس نے نکالی اور ڈھیلوں کے اندر سے اوپر لانے کی کیا کوشش کی کیا تم نے ڈھیلے میں سوراخ کیا تھا' آفتاب کو حرکت کون دیتا ہے بارش کس کے قبضہ میں ہے اور طرح طرح کی آفتوں سے کون محفوظ رکھتا ہے۔ سب کچھ خدا ہی کرتا ہے انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا اور جو کچھ تھوڑا بہت برائے نام کرتا بھی ہے وہ بھی خدا تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت پر کرتا ہے اور اس مثال سے کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ کاشتکار ہی خدا کے محتاج ہیں۔ جیسا کہ بیان کیا گیا اور نوکری پیشہ والے محتاج نہیں ہیں اس کو بھی سن لیجئے کہ اول تو ان کا وجود اور اعضاء سب خدا ہی کے عنایت کیے ہوئے ہیں اور نیز جس کے تم ملازم ہو اس سے وہی دلواتا ہے کیونکہ اس کے دل میں تمہارے ملازم رکھ لینے کا خیال خدا ہی نے پیدا کیا' بیسیوں آدمی ملازمت کی درخواست کسی سے کرتے ہیں مگر خدا تعالیٰ جب تک دوسرے کے دل میں خیال نہیں ڈالتے تو کوئی درخواست بھی منظور نہیں ہوتی پھر ہر مہینے تنخواہ دے دینے کا خیال بھی حق تعالیٰ ہی نے پیدا کیا۔ اگر وہ نہ دیوے تم کیا کر لو اور اگر نالش کرو تو سب میں نالش کی ہمت کہاں اور اگر حاکم تمہارے خلاف فیصلہ کر دے تو پھر کیا زور لگا سکتے ہو۔ غرض ہماری کوشش پر نتیجہ کا مرتب ہونا اور خود ہمیں کوشش کی توفیق ہونا نیز یہ سب خدا کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اسی طرح ایجادات میں سمجھ لو کہ تمہارا کام صرف دماغ سے سوچنا تھا مگر دماغ میں بات کا آ جانا یہ تو اختیاری نہیں اگر اختیاری ہے تو اتنی دیر تک کیوں سوچتے رہے اگر قبضہ میں تھا تو فوراً ہی دماغ میں لے آتے پھر ایجاد میں اتنا عرصہ کیوں لگاتے پھر ایجاد کی حقیقت ہے ترکیب و تحلیل اس کے سوا موجد کیا کر سکتا ہے اگر اس نے کئی چیزوں کو ملا ہی دیا مگر آخر وہ مفردات کہاں سے آئے اور ان کی جداگانہ تاثیرات پھر مرکب ہونے کے بعد نئی تاثیر کس نے پیدا کی۔ بہرحال ہر کام میں خدا کی قدرت کا اقرار کرنا لازمی ہے بس ہمارا نام کرنے کو بندہ کی طرف نسبت کی اجازت دیدی ہے مگر اس کی اجازت نہیں دی کہ خدا کو بالکل بھول ہی جائے۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے برآہوے چین بستہ اند

(مشک بکھیرنا دراصل تیری زلف کا کام ہے لیکن عاشقوں نے مصلحتاً اس کی نسبت چین کے ہرن کی طرف کی ہے)

ارشاد ہے:

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝

کیا پیداوار تم کرتے ہو یا ہم لو نشاء لجعلنه حطاما اگر ہم چاہیں تو سب کو فنا کر ڈالیں' بنا بنایا کھیت برباد کر دیں اور تم جو دعویٰ کرتے ہو آب پاشی کا کنویں سے اور نہروں سے "ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ" کیا بادل میں سے تم پانی برساتے ہو یا ہم اور اگر دیا سلائی رگڑ کر آگ لگا دی جائے تو یہ بتلاؤ کہ اس میں یہ خاصیت کس نے رکھی۔

ایک ملحد کی گستاخی کا انجام

ایک ملحد کا قصہ ہے کہ اس نے تبارک الذی کی یہ آیت سنی "قُلْ اَرَاَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ" اگر ہم پانی کو زمین کی گہرائی میں اتار دیں تو تم پانی کہاں سے لاؤ۔ اس مغرور نے کہا "ناتی به المعول والمعن" کہ ہم پھاوڑے اور مزدوروں کے ذریعے سے کھود کر نکال لیں گے۔ آخر کہیں تو نکلے گا۔ حق تعالیٰ گو بہت رحیم ہیں اور اس حلم ہی سے بیہودہ اور بے عقل لوگوں کی جرأت بڑھ جاتی ہے ورنہ عقلمند تو اور زیادہ شرماتے ہیں لیکن جب کوئی حد سے گزر جائے تو اس کو کبھی فوراً سزا بھی دے دیتے ہیں۔

حلم حق باتو مواسا ہا کند   چونکہ ازحد بگذری رسوا کند

(اللہ تعالیٰ کا حلم تجھ پر ہمدردی اور لطف کرتا ہے لیکن جب تو حد سے گزرتا ہے تو تجھے رسوا کرتا ہے)

اس گستاخ کو رات کو خواب میں آواز آئی "ذَهَبْنَا بِمَاءِ عَيْنَيْكَ فَاْتِ بِهٖ بِالْمُعْوِلِ وَالْمُعِيْنِ" یعنی ہم نے تیری آنکھوں کا پانی خشک کر دیا اور تو پھاوڑے اور مزدوروں کے ذریعے سے ذرا اس کو تو نکال لے صبح جو اٹھا تو اندھا تھا' اگر وہ کمبخت اس وقت بھی استغفار کرتا تو خدا کی رحمت حاصل کرتا کیونکہ وہ بڑے رحیم ہیں۔

قارون کا واقعہ

چنانچہ جب قارون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تہمت لگائی دراصل وہ زکوٰۃ کی وجہ سے مخالف ہو گیا تھا کہنے لگا کہ یہ مال تو میں نے اپنی تدابیر سے جمع کیا ہے کسی کا اس میں کیا حق؟ بناء مخاصمت تو یہ تھی لیکن کمبخت نے دشمنی میں یہ حرکت کی کہ ایک فاحشہ عورت کو کچھ روپیہ دے کر آمادہ کیا کہ بھرے مجمع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تہمت لگا دے۔ ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وعظ میں زنا سے ممانعت فرمائی اور تورات کا حکم سنایا کہ جو کوئی زنا کرے گا ہم اس کو رجم کریں گے۔ قارون نے کہا کہ یہ حکم عام ہے یا خاص جواب میں فرمایا' عام ہے قارون نے کہا فلاں عورت سے دریافت کیجئے کیا کہتی ہے آپ نے اس کو بلایا اس نے کہا اس کمبخت نے مجھ کو سکھایا تھا کہ حضرت پر

تہمت لگانا اب توبہ کرتی ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قارون کو بددعا کی۔ارشاد ہوا کہ میں نے زمین کو آپ کے قبضہ میں کردیا آپ نے حکم دیا یاارض خذیہ فوراً زمین نے پکڑلیا اور وہ نیچے اترنے لگا اور آپ بار بار یہی فرماتے تھے آخر غرق ہوگیا' مخالفوں نے کہا کہ اس کا مال لینے کے واسطے غرق کردیا۔آپ نے زمین کو حکم دیا کہ اس کا مال بھی لے لے تو ساتھ میں مال بھی غرق ہوگیا۔ اہل سیر نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ علیہ السلام قارون تم کو پکارتا رہا اگر وہ مجھ کو پکارتا تو اس پر رحم ہوجاتا۔صاحبو! یہ اس کی عنایت ہے کہ ہم کو بدون ہماری دعا ہی کے محفوظ کر رکھا ہے اور پیشتر یہ بھی عرض کرچکا ہوں کہ یہ شفقت ہے اللہ تعالیٰ کی کہ وہ بلا اپنی کسی غرض کے ہمارا کام کردیتے ہیں پھر ہم جب مخلوق کا احسان مانتے ہیں جو کہ سب کاموں میں اپنے اغراض کا بھی محتاج ہے تو خدا کی عنایات بے علت میں غور کرکے تو اس پر جان قربان کردینی چاہیے۔

حق تعالیٰ شانہ کے احکام کی بجاآوری کا آسان طریق

ان بیشمار عنایات میں سے ایک بڑی عنایت یہ ہے کہ حق تعالیٰ احکام کی بجاآوری کے آسان ہوجانے کا طریقہ بھی تعلیم فرمادیتے ہیں۔ چنانچہ دوسری جگہ اسی کی رعایت سے سورہ بقرہ کے پہلے موقع پر ارشاد فرمایا: ''یَابَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الایۃ'' ان کو جب ایمان لانے کا حکم دیا تو ساتھ ہی اپنی نعمتیں یاد دلائیں تاکہ نعمت کو یاد کرکے توفیق ایمان ہو پھر یا بنی اسرائیل والے موقع پر اصلاح کی سہولت کے اور طریقے بھی بتلائے جس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ان بنی اسرائیل میں دو مرض تھے حب مال اور جاہ ان کو جہلاء سے آمدنی بہت تھی وہ ڈرتے تھے کہ ایمان لے آویں گے یہ نذرانے ملنے بند ہوجائیں گے کیونکہ عوام کا اعتقاد تو جہالتوں ہی پر مبنی ہے ورنہ ان کا اعتقاد سب گاؤ خورد ہوجاتا ہے۔ چنانچہ گنگوہ کے ایک پیر صاحب حج کو جارہے تھے انہوں نے بعض اہل علم کے اثر سے بدعات ترک کردی تھیں۔ جب وہ بمبئی پہنچے تو وہاں کے سیٹھ جوان کے مرید تھے پاؤں پر گرنے لگے انہوں نے منع کیا تو وہ لوگ کہنے لگے کہ پیر ہی بگڑ گئے۔اب بھی یہ بات بکثرت دیکھی جاتی ہے کہ بہت لوگ بوجہ حب جاہ و مال کے حق کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ جس طریق میں تابعین سے نذرانے وصول ہوں وہی بات کہتے ہیں۔یہی بنی اسرائیل کے علماء خیال کرتے تھے کہ آج تو ہم سردار ہیں پھر غلام ہوجائیں گے اور غلام کو کون پوچھتا ہے۔ارے تم کو خبر نہیں ہے یہ غلامی وہ ہے جس پر ہزار سلطنتیں قربان ہیں۔ دیکھ لیجئے اب بھی جو غلام ہیں کیا وہ بھوکے یا ذلیل ہیں یہ ان کی بیوقوفی تھی حق تعالیٰ نے اس کا علاج فرمایا اور کیا عجیب علاج ہے کہ یہ

نہیں فرمایا کہ مال یا جاہ کی محبت چھوڑ دو کیونکہ خلاف طبع ہونے کے سبب اول تو اس کا سننا ہی گراں تھا ابتدائیہ دشوار بھی ہے بلکہ یہ ارشاد فرمایا کہ زکوۃ دیا کرو اور نماز پڑھا کرو، زکوۃ سے مال کی محبت کم ہو جائے گی اور نماز سے عاجزی پیدا ہو جائے گی، حب جاہ نہ رہے گی۔ دیکھئے کیسی سہل تدبیر بتلادی اور اسی تسہیل کی تکمیل کے لیے ارشاد ہوتا ہے: ''یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ'' یعنی اے مومنو! صبر اور نماز کے ساتھ مدد چاہو۔ استعینوا خود بتلا رہا ہے کہ اس میں کسی کام کو آسان کرنے کی تعلیم ہے۔ تب ہی تو استعانت کی حاجت ہوئی اور اس سہولت کی توجیہ یہ ہے کہ نماز سے خدا تعالیٰ کی عظمت بڑھ جائے گی اور اپنی عظمت یعنی حب جاہ نکل جائے گی آگے نماز میں خود ایک دشواری تھی اس لیے صبر کی تعلیم دی اس کا دخل نماز کی سہولت میں اس طرح ہے کہ نماز میں فعل ہے۔

ترک فعل سے آسان ہے

اور صبر میں ترک ہے یعنی کچھ کرنا نہیں پڑتا اور ترک آسان ہے فعل سے جیسا کہ روزہ رکھنا آسان ہے کیونکہ عادۃ ہر وقت بھوک کی طرف التفات نہیں رہتا کسی کام میں لگ کر بھوک کو بھول جاتے ہیں اور نماز میں افعال اور توجہ کا مقید ہونا پڑتا ہے تو وہ زیادہ گراں ہے اس کو آسان کرنے کے لیے صبر کی تعلیم دی جو سہل ہے اور صبر کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے قلب میں یکسوئی کی عادت پیدا ہوتی ہے اور یکسوئی سے نماز کی گرانی دفع ہو جاتی ہے کیونکہ قیود صلوٰۃ کی گرانی کا سبب قلب کی حرکت فکر یہ ہی ہے کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی خیال کی طرف چلتا رہتا ہے اس کو مقید کرنے میں دشواری ہوتی ہے اور جب یکسوئی کے رسوخ سے یہ حرکت منقطع ہو گئی تو نماز آسان ہو گئی پھر صبر گو بہ نسبت عبادات وجودیہ کے سہل تھا لیکن تاہم اپنی ذات میں کسی قدر دشواری سے خالی نہ تھا اس لیے ایک دوسرے مقام پر صبر کو آسان کرنے کے لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ جب انسان اس کو سوچے گا تو ناگوار امور میں صبر کرنا آسان ہو جائے گا و نیز صبر جس طرح بواسطہ نماز کے حب جاہ کا علاج ہے اسی طرح وہ حب مال کا بھی علاج ہے اس طرح سے کہ جب صبر کی عادت ہو جائے گی اور مال کی ضرورت بھی کم ہو جائے گی کیونکہ مال کی ضرورت تو لذات کے لیے زیادہ ہوتی ہے جب صبر سے لذات پر قابو ہوگا تو زیادہ مال کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ پھر نماز کی تسہیل کی ایک اور تدبیر فرمائی جس کے ساتھ مکلف کے جذبات کو کسی قدر تسلیم بھی کر لیا کیونکہ [illegible] اس تسلیم سے بھی سہولت بڑھ جاتی ہے اس کی تقریر یہ ہے کہ نماز جو انسان

دشوار سمجھتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کا رد نہیں فرمایا بلکہ انها لکبیرة میں ارشاد فرمایا کہ بیشک نماز مشکل ہے مگر اس کو سہل کرنے کے واسطے ایک استثناء بھی فرمایا۔ الا علی الخاشعین یعنی سب کو مشکل نہیں جس کو خشوع کی صفت حاصل ہے اس کو دشوار نہیں۔

خشوع کی حقیقت

خشوع کہتے ہیں قلب و جوارح کے سکون کو یعنی تمام حرکات کو بند کر دینا جب اس سکون کی عادت ہو جائے گی تو نماز آسان ہو جائے گی اور یہ ترکیب بتلا کر پھر بھی شفقت سے کام لیا' ضابطہ سے کام نہیں لیا' یعنی آگے الذین یظنون میں خشوع کو آسان کرنے کے لیے ایک مراقبہ بتلایا کہ خدا سے ملنے کا خیال رکھو اور اس مراقبہ کو دو وجہ سے حصول خشوع میں دخل ہے ایک تو یہ کہ جب خدا سے ملنے کا اعتقاد تازہ ہوگا تو وعدہ وعید یاد آ جائیں گے جیسا کہ ملازم خیال کیا کرتا ہے کہ اگر نوکری کا کام پورا کر دیا تو تنخواہ ملے گی اور پورا نہ ہوا تو محرومی ہوگی یا سزا ملے گی یہ تو عاقلانہ حکمت ہے۔

ہر شئی کو مقصود کے حصول سے سکون ملتا ہے

اور دوسری وجہ عاشقانہ ہے وہ یہ کہ ہر شے کو مرکز پر پہنچ کر سکون ہو جاتا ہے چنانچہ ڈھیلا پھینکو تو زمین پر آتا ہے اور توجہ الی المرکز کرتا ہے اور جب تک خاص نقطہ پر نہ پہنچے اس وقت تک تقاضائے حرکت باقی رہتا ہے اور مرکز پر پہنچ کر جنبش نہیں کرتا اب قلب کا مرکز دیکھنا چاہیے کہ کیا ہے قاعدہ یہ ہے کہ ہر شے کو اس کے مقصود کے حصول سے سکون ہوتا ہے۔ پھر مقاصد بھی مختلف ہیں ایک حقیقی اور ایک غیر حقیقی۔ غیر حقیقی میں گو سکون ہوتا ہے مگر وہ عارضی ہوتا ہے مثلاً بیٹے سے ملاقات ہوئی تو سکون واطمینان حاصل ہوا مگر کسی عزیز کے انتقال کی خبر سے وہ سکون عارضی زائل ہو گیا۔

مقصود حقیقی حاصل کرنے کا طریق

اور سکون تام مقصود حقیقی پر پہنچ کر ہو سکتا ہے اور مقصود حقیقی حق تعالیٰ ہیں پس سکون کامل حق تعالیٰ تک پہنچنے ہی پر حاصل ہو سکتا ہے اب یہ سمجھو کہ ان تک پہنچنے کے کیا معنی وہ جسم تو ہے نہیں کہ جسم چل کر جس سے جا ملے اس کا طریق یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ تام ہو جائے۔ پس یہ توجہ تام قلب کا مرکز پر پہنچ جانا ہے جب مرکز پہنچ جائیں گے تو سکون تام حاصل ہوگا اور توجہ تام کا مبداء خدا کے ملنے کا اعتقاد ہے۔ اس سے توجہ الی اللہ ہوگی اور سیر الی اللہ یہی ہے پھر اس سے سیر فی اللہ کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ پس تمام مقصود کیسے آسانی سے ختم ہو گیا' اس سے

زیادہ کوئی آسانی کا طریقہ نہیں غرض حق تعالیٰ ہمیشہ ہر حکم کے ساتھ طریق تحصیل و تسہیل بھی بتلا دیا کرتے ہیں۔ اسی طرح اس آیت ''اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ'' (وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو اہل عقل ہیں) میں دو چیزوں کا امر ہے ایسے عنوان سے کہ طریق عمل بھی ساتھ ساتھ مذکور ہے اور وہ دو چیزیں یہ ہیں علم اور عمل اور اپنے فائدہ میں ہر ایک کو دوسرے کی طرف احتیاج ہے۔ چنانچہ علم عمل کے لیے شرط ہوتا ہے اور بغیر عمل کے علم بیکار ہوتا ہے تو دونوں چیزوں کی حاجت ہوئی اور یہ کوئی دین ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر مقصود ان ہی دونوں کا دخل ہے۔ مثلاً تجارت میں خسارہ ہوتا ہے یا بوجہ عدم علم کے یا بوجہ عدم عمل کے مثلاً ہمارے وطن میں ایک نے تجارت کی تھی چاولوں کی اور گھر والوں کو حکم دے دیا کہ خوب کھایا کرو یا گنگوہ میں ایک شخص نے کپڑے کی تجارت کی تھی اور جو عمدہ تھان آتا اس میں گھر والوں کے جوڑے بنتے ایسے لوگوں کو ضرور خسارہ ہوگا کیونکہ یہ تجارت کے اصول کے خلاف تھا بلکہ تجارت کے اصول کا تو حاصل یہ ہے کہ کوئی شے گھر میں بھی بلا قیمت کے نہ جائے خلاصہ یہ ہے کہ کوئی کام بلا اصول کے نہیں ہوتا اور اصول کو دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ اصول کا علم ہو دوسرے یہ کے اس پر عمل ہو اگر علم نہ ہوا تو عمل ہو نہیں سکتا اور عمل نہ کیا تو علم کا نفع ہی نہیں ہوتا۔ پس ہر مقصود کے لیے ان دو چیزوں کے لیے ان دو چیزوں کی ضرورت مسلم ہوگی۔

مقصود کی دو اقسام

اب جانئے کہ مقصود دو ہیں ایک دین ایک دنیا اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا اصل مقصود دین ہے قرآن شریف دین ہی سکھلانے کو آیا ہے دنیا کی گو اجازت ہے مگر اس کی ترکیب بتلانا قرآن کا منصب نہیں کیونکہ دنیا تو تجربہ سے بھی سمجھ میں آسکتی لیکن یہ خدا کی عنایت ہے کہ اس کے اصول بھی اللہ تعالیٰ ہی نے ابتدائے عمارت ارض میں تعلیم فرما دیئے تھے۔ یہ ان کا احسان ہے کیونکہ عقل گو اس کے لیے کافی تھی مگر آسانی سے کافی نہ ہوتی جیسا کہ قابیل اپنے بھائی ہابیل کی لاش لیے پھرتا رہا کہ ابا جان دیکھ کر خفا ہو جائیں گے' خدا نے رحم کیا ایک کوا بھیجا اس نے سکھایا کہ اس لاش کو زمین میں دفن کر دے۔ غرض ایسے اصول بذریعہ الہام یا وحی کے بتلا دیئے تھے۔ بعض انبیاء ابتداء میں اصول معاش ہی کی تعلیم کیلئے مبعوث ہوئے تھے مگر اب اس تعلیم کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ خوشنویس شاگرد کو کل دنیا بھر کے الفاظ نہیں سکھایا کرتا بلکہ چند الفاظ کی مشق کرانے سے سب الفاظ آجاتے ہیں ایسا ہی دنیا کی ترکیبیں شریعت محمدیہ نے نہیں بتلائیں کیونکہ شریعت اسلامیہ سے پہلے

دوسرے انبیاء اس کی تعلیم اصولاً دے چکے ہیں بس وہ تعلیم فروع کے لیے کافی ہوگی۔ پس اب جو بعضے لوگ کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں ہر شے کی تدبیر تلاش کرنا چاہیے یہ ان کی سخت غلطی ہے کیونکہ قرآن طب روحانی ہے اور ظاہر ہے کہ طب اکبر میں موچی کا پیشہ نہیں ملے گا اور جو شخص اس میں اس قسم کی ترکیبوں کو تلاش کرے اس کے دماغ میں خلل ہے علیٰ ہذا سب جانتے ہیں کہ مرض افلاس کا نسخہ طب اکبر میں نہیں ملے گا البتہ طب اکبر میں یہ ضرور ملے گا کہ جوتا پاؤں میں کاٹ لے تو فلاں مرہم مفید ہے۔ اسی طرح اصول دنیا کی ترکیبیں قرآن میں نہ ملیں گی ہاں دنیا سے جو ضرر ہوتا ہے اس کا مرہم قرآن میں مذکور ہے۔ پس اس میں احکام کی حیثیت سے دنیا کا ذکر ہے۔ اصول دنیاوی ہونے کی حیثیت سے دنیا کی تعلیم نہیں۔ البتہ باوجود اس میں دنیوی تعلیم نہ ہونے کے تجربہ سے ثابت ہے کہ ان دینی اصول پر عمل کرنے والا دنیا میں کامیاب ہوتا ہے۔ بانس منڈی کانپور میں ایک دوکاندار تھا وہ اپنے بانسوں میں عیب ظاہر کر دیا کرتا تھا اور اس کے مقابلہ میں دوسرے دوکاندار اپنے مال کی تعریف کیا کرتے تھے اس لیے اس غریب کا مال کم بکتا تھا لیکن کچھ ہی دنوں میں سب لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ یہ سچ بولتا ہے اور دوسرے جھوٹی تعریفیں کرتے ہیں اس لیے سب دوکانیں پھیکی پڑ گئیں اور اس کی دوکان خوب چلنے لگی جس سے دنیا بھی حاصل ہوگئی اور دین بھی نہ بگڑا' غرض دین پر چلنے سے تبعاً دنیا کا بھی فائدہ ہوتا ہے مگر قرآن وحدیث میں دین کی تعلیم اس دنیوی منفعت کی حیثیت سے نہیں مثلاً یہ تعلیم نہیں سفر حج میں بمبئی کی سیر ہو جاتی ہے اس لیے حج فرض کیا گیا ہے گو ہم کو اس کا موقع حاصل تھا کہ حج کی حکمت میں بیان کرتے کہ اس سے تجربہ اور سیر بھی حاصل ہوتی ہے مگر ہم اس کو بے ادبی سمجھتے ہیں بلکہ یہ احکام اس واسطے بتلائے گئے ہیں کہ عذاب سے بچو' جنت میں پہنچو۔ گو قرآن پر عمل کرنے سے دنیا کی فلاح بھی خود بخود حاصل ہو جاتی ہے مگر مقصود نہیں اس طرح دین کے خلاف کرنے سے دنیوی فلاح میں بھی کمی ہو جاتی ہے جس میں راز یہ ہے کہ کسی کو خزانہ حاصل کرنا ہو تو اس کو خزانہ والے سے موافقت کرنا لازم ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ صاحب خزانہ سے دشمنی کر کے خزانہ ملے گا ہرگز نہیں۔

طالبان دنیا کو دنیا کی حقیقت معلوم نہیں

پس خزائن دنیا خدا کے ہاتھ میں ہیں یہ بھی ان کو راضی کر کے ہی مل سکتے ہیں مگر آج کل یہ عقیدہ ہوگیا ہے کہ شریعت پر عمل کرنے سے افلاس ہوتا ہے۔ صاحبو! یہ بتلاؤ کہ جب سب چیزیں خدا کے قبضے میں ہیں تو کیا اس کو ناراض کر کے کچھ مل سکتا ہے۔ کلکٹر یا منصف اپنے دوست کی

پرورش کرے گا یا دشمن کی شاید کوئی کہے کہ دلائل تو صحیح ہیں مگر مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ حضرات آپ نے دنیا کی حقیقت نہیں سمجھی اور اپنے اس معشوق کو بھی نہیں پہچانا۔ آپ کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص ایک عورت کا عمدہ لباس دیکھ کر اسی کے پیچھے ہولیا' جب پاس جا کر دیکھا تو بڑھیا تھی اور بدصورت۔ بقول شخصے

پس قامت خوش کہ زیر چادر باشد چوں باز کنی مادر مادر باشد

(بہت سی خوش قد جو چادر میں ہیں جب چادر کو ہٹاؤ تو نانی معلوم ہوں گی)

میں بقسم کہتا ہوں کہ طالبان دنیا کو دنیا کی حقیقت نہیں معلوم' فقط نام سن کر فریفتہ ہیں۔ اس کا خلاصہ کسی نے خوب کہا ہے:

عارفے خواب رفت در فکرے دید دنیا بصورت بکرے
کرداز وے سوال کاے دلبر بکر چونی بایں ہمہ شوہر
گفت یک حرف باتو گویم راست کہ مرا ہرکہ بود مرد نہ خواست
وانکہ نامرد بود خواست مرا زاں بکارت ہمیں بجاست مرا

(ایک عارف نے دنیا کو خواب میں دیکھا کہ بڑھیا ہے مگر ابھی تک باکرہ' انہوں نے پوچھا کہ اب تک کنواری ہی رہی' اس نے جواباً کہا کہ جو مرد تھے انہوں نے مجھے منہ نہیں لگایا اور جو میرے عاشق تھے وہ نامرد تھے' ان کو میں نے منہ نہ لگایا' اس لیے اب تک کنواری ہوں)

خلاصہ یہ کہ جو لوگ دنیا حاصل کر رہے ہیں ان کو حاصل نہیں اور جن کو حاصل ہے وہ منہ بھی نہیں لگاتے اس لیے دنیا ابھی تک کنواری ہے جس کی بکارت زائل نہیں ہوئی۔ دوسرے بزرگ نے اس کی حقیقت اجمالی اس طرح ظاہر کی ہے۔

حال دنیا پر سیدم من از فرزانہ گفت یا خوابیست یا بادیست یا افسانہ
باز گفتم حال آنکس گو کہ دل دروی بہ بست گفت یا غولے ست یا دیویست یا دیوانہ

(ایک عقل مند سے میں نے دنیا کا حال پوچھا' اس نے کہا یا تو خواب ہے یا ہوا یا افسانہ' پھر میں نے کہا اس شخص کا حال بیان کرو جس نے اس میں دل لگایا ہے اس نے جواب دیا کہ وہ بھتنا ہے یا شیطان یا دیوانہ)

لوگ دنیا اس کو سمجھتے ہیں کہ اسباب بہت ہوں' بیوی بچے ہوں' اگر یہی بات ہے تو امراء کو کبھی تشویش نہ ہوتی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اوروں سے زیادہ پریشان ہیں تو خود دنیا ہے۔ صاحبو! اگر

کسی رئیس کو پھانسی کا حکم ہو جاوے اور احباب کو اس کی اجازت مل گئی ہو اور سب اس کی ہمدردی کرتے ہوں اور ہر قسم کی راحت پہنچاتے ہوں خدمت واطاعت کرتے ہوں تو وہ ہر طرح کا سامان عیش کا موجود ہے مگر دل کو دیکھئے تو افسردہ ہے اگر اس وقت اس کے سامنے کوئی باجا بجانے لگے تو اسے کیا بھلا معلوم ہوگا۔ پس اگر یہ اسباب فی الواقع اسباب نشاط ہیں تو پھر اسے نشاط کیوں نہیں۔

چین وراحت صرف ذکراللہ میں ہے

پس معلوم ہوا کہ دنیا کی حقیقت یہ سامان نہیں بلکہ اس کی روح چین اور راحت ہے اور چین وراحت واللہ ایک چیز کے سوا کسی شے میں نہیں اور یہ دعویٰ قرآن شریف سے تو ثابت ہے ہی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "الا بذکر الله تطمئن القلوب" تقدیم معمول عامل پر حصر کے لیے ہوتی ہے۔ معنی یہ ہوئے سنو اللہ ہی کے ذکر سے قلوب اطمینان پاتے ہیں اس ترکیب سے صاف معلوم ہوا کہ اس کے سوا کوئی چین کی چیز نہیں۔ مگر مشاہدہ سے بھی یہ دعویٰ ثابت ہوتا ہے اور مشاہدے سے زیادہ کون شئے قاطع نزاع ہوگی ایک شخص منارہ پر کھڑا ہوا سورج کو غروب ہوتا ہوا دیکھ رہا ہے اور لوگ نیچے کھڑے ہوئے گھڑیاں دیکھ کر کہتے ہیں کہ ابھی غروب کا وقت نہیں ہوا۔ آیا اس وقت یہ گھڑیوں کو صحیح کہے گا یا اپنے مشاہدے کو ٹھیک سمجھے گا۔ یقیناً یہی کہے گا کہ مجھ کو گھڑی کی ضرورت نہیں ہے اسی طرح جو لوگ مشاہدہ کر رہے ہیں اہل اللہ کے چین کا ان کو ضرورت نہیں۔ دلائل قائم کرنے کی اور اگر ان کے خلاف دلائل سنیں گے تو ان کو ہنسی آئے گی اور جس کو شک ہو وہ مشاہدہ کر لے۔ اس طرح سے جن کو وہ دنیا کا مالک اور ترقی یافتہ جانتے ہیں ان کے ہمراز بن کر ان کی اندرونی حالت دریافت کریں کہ ان کو کتنے غم ہیں اور اس طرح اہل اللہ کی خدمت میں رہ کر دیکھیں کہ وہ کتنے خوش ہیں ان کی بالکل یہ حالت پاؤ گے:

لنگے زیرو لنگے بالا نے غم و ز دونے غم کالا

(ایک لنگی نیچے اور ایک لنگی اوپر نہ ڈاکو کا کھٹکا نہ چور کا ڈر)

دوکانداروں کا ذکر نہیں سچے اور اہل اللہ کو تم دیکھو گے تو خدا کی قسم اور مکرر خدا کی قسم تم خود کہہ دو گے کہ چین میں وہی ہیں قسم کھا کر کہتا ہوں اور تم میرا اعتبار نہ کرو خود دیکھ لو اور وجہ ... راحت اور چین کی یہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے کسی امر میں کچھ تجویز نہیں کرتے کہ فلاں کام اس طرح ہونا چاہیے بلکہ جو کچھ بھی قضا و قدر سے پیش آوے ہر حال میں اس پر خوش اور راضی رہتے ہیں اور کلفت کا راز یہی ہے کہ خلاف کا اہتمام ہے جہاں یہی نہ ہو وہاں کلفت کا کیا کام سو دنیا دار تو ہمیشہ

ادھیڑ بن میں رہتے ہیں ان کی ہزاروں توقعات اور تجویزیں ہوتی ہیں اور جب ان کی شیخ چلی جیسی امیدوں کا بنا بنایا گھر گر جاتا ہے تو ان کو رنج ہوتا ہے اس لیے وہ ہر وقت مصیبت اور رنج میں رہتے ہیں۔ بخلاف اہل اللہ کے کہ ان کا یہ مذہب ہوتا ہے:

ہرچہ از دوست میرسد نیکوست

(دوست کی طرف سے جو پہنچے اس میں خیر ہے)

وہ اپنے لیے کوئی تجویز ہی پاس نہیں کرتے نہ آئندہ کے لیے امیدیں قائم کرتے ہیں اپنے کو خدا کے حوالہ کر کے ہر حال میں ہر واقعہ کو اپنے لیے اجر سمجھتے ہیں اس لیے ہمیشہ خوش رہتے ہیں ان کو رنج کیسا جس کو یقین نہ ہو وہ تجربہ کرے انشاءاللہ خود بول اٹھے گا۔ پس ان کی یہ حالت ہوتی ہے:

موحد برپائے ریزی زرش چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش بنا شد زکس ہمیں ست بنیاد توحید و بس

(موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ سونا بکھیریں یا اِس کے سر پر تلوار رکھیں' امید اور خوف اس کو سوائے خدا کے کسی سے نہیں ہوتا' توحید کی بنیاد بس یہی ہے)

اور حالت یہ ہوتی ہے:

سپروم بتو مایہ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را

(میں نے اپنی پونجی تجھے سپرد کر دی تو حساب کم وبیش خود جانتا ہے)

حضرت بہلول نے کسی عارف سے ان کا مزاج دریافت کیا۔ انہوں نے فرمایا اس کے مزاج کا کیا پوچھنا جس کی خواہش کے مطابق تمام دنیا کا کاروبار چلتا ہو۔ بہلول نے دریافت کیا یہ کیسے فرمایا' آپ نے اپنا ارادہ فنا کر دیا اور اللہ کی تقدیر پر راضی ہو گیا پس جس کا ارادہ ارادہ خداوندی میں فنا ہو جاوے اور ظاہر ہے کہ ہر کام حق تعالیٰ کے ارادہ کے مطابق ہوتا ہو پس اسی طرح وہ اس شخص کے خواہش کے موافق بھی ہو گا' واقعی سچ ہے جو شخص دین پر پورا عمل کرتا ہے اسی کو دنیا کی کا چین بھی نصیب ہوتا ہے۔

ایک جوہری اور حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کی حکایت

میرے استاد رحمتہ اللہ علیہ نے ایک حکایت بیان فرمائی تھی کہ کوئی شخص حضرت خضر کی ملاقات کے لیے دعا کیا کرتا تھا' ایک روز خضر علیہ السلام تشریف لائے اور دریافت کیا کہ کیا چاہتے ہو۔ اس نے کہا ایسی دعا کر دیجئے کہ دنیا میں مجھے کوئی غم نہ ہو' فرمایا یہ دعا تو کر نہیں سکتا البتہ یہ ہو سکتا

ہے کہ تو دنیا میں جس شخص کو سب سے زیادہ بے غم دیکھے اس کی موافق تیری حالت ہونے کی دعا کردوں تو ایسے شخص کو منتخب کرلے۔ وہ پھرتا پھرتا حیران ہوگیا اور کوئی امیر ورئیس بے غم نہ ملا' آخر ایک جوہری کو دیکھا جو صبح کو دکان پر آتا' خوبصورت لڑکے اس کے ساتھ ہوتے بہت سے نوکر چاکر بھی ہمراہ آتے' صبح سے شام تک خرید وفروخت کرتا اور غرباء کو بہت کچھ خیرات کرتا' اس نے اس کو مجموعی حالت سے خیال کیا' یہ ضرور بے غم ہوگا' میں ایسا ہونے کی دعا کرالوں' پھر دل میں کہا کہ قبل دعا کرالینے کے اس سے تو حال دریافت کرلینا چاہیے شاید کوئی مخفی حالت ہو۔ چنانچہ اس سے تمام واقعہ بیان کیا اور کہا بھائی صاحب مجھ کو خضر علیہ السلام سے دعا کرانی ہے کہ تمہارے جیسا ہوجاؤں' بتلاؤ تو سہی تم کو تو کوئی غم نہیں ہے اس نے سرد آہ بھری اور کہا بھائی مجھ کو تو ایسا غم ہے کہ کسی دشمن کو بھی نہ ہو اور قصہ سنایا کہ ایک بار میری بیوی جو میری بڑی ہی محبوبہ تھی سخت بیمار ہوگئی' میں رونے لگا اس نے کہا روتے کیوں ہو میں مرجاؤں گی تم اور شادی کرلینا' میں نے کہا ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ وہ بولی ممکن ہے اب تو تیرا ایسا ہی خیال ہے مگر پھر نہیں رہ سکتا' بہت دیکھا یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ جب اس کو کسی طرح یقین نہ آیا میں نے شدت عشق میں اپنا عضو تناسل اس کے سامنے کاٹ ڈالا کہ اب تو یقین آ گیا' اتفاق سے وہ مری نہیں اچھی ہوگئی اور میں بیکار ہوگیا' اب وہ کم بخت نوکروں سے سازش رکھتی ہے اور یہ سب بچے دوسروں ہی سے ہیں۔ اب میں دیکھتا ہوں اور گھلتا ہوں' اس نے کہا بھائی تو تو بڑے ہی گندے غم میں مبتلا ہے اللہ بچاوے۔ آخر حضرت خضر علیہ السلام کے پاس گیا اور سارا حال سنایا۔ پوچھا اب کیا خیال ہے اس نے کہا پس دین کی دعا کردیجئے' غرض اہل دنیا کی تو یہ حالت ہے بے شک چین جس کا نام ہے دنیا اور آخرت دونوں کا دینداروں ہی کو میسر ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ لَاتَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَالْفَوْزُ الْعَظِيْمُo

''یاد رکھو کہ بلاشبہ اولیاء اللہ کو نہ خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔''

دیکھئے صاف ارشاد ہے کہ متقیوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں خوشخبری ہے اور پھر اس کی تاکید فرماتے ہیں ''لاتبدیل لکلمت اللہ'' یعنی اللہ کا کلام بدلتا نہیں ''ذالک ھو الفوز

العظیم'' یعنی یہ بڑی کامیابی ہے سو یہ برکت ہے دین کی مگر پھر بھی یہ ضرور کہوں گا کہ اس حیثیت سے ان اعمال کی تعلیم نہیں کی گئی کہ دنیا کا چین نصیب ہو بلکہ ان کی تعلیم محض دین کے لیے ہے اور عمل میں بھی خالص اطاعت خداوندی ہی کی نیت کرنا چاہیے۔

مسلمانوں کا اصل مقصود

غرض مسلمانوں کا اصلی مقصود آخرت ہے اور اس مقصود کے لیے مطابق قاعدہ عقلیہ ونقلیہ کے علم وعمل دونوں کی ضرورت ہے اور اس وقت ان دونوں میں کوتاہی ہو رہی ہے۔ پس اس آیت میں ان ہی دونوں کا ذکر ہے۔ اب ہر شخص دیکھ لے علم وعمل دونوں میں اس سے کتنی کوتاہی ہوتی ہے اور اس سے لسانی' بدنی کتنے گناہ دن رات میں ہوتے ہیں بلکہ کوتاہی علم سے بعض کا تو گناہ ہونا بھی معلوم نہیں ہوتا۔ مثلاً متاع دنیا کی طرف نظر حرص کرنا گناہ ہے۔ "لاتمدن عینیک الٰی مامتعنابه الاٰیة'' مگر اس کی کسی کو بھی خبر نہیں کہ وہ بھی گناہ ہے حرام تو کیا مکروہ بھی نہیں جانتے۔ اسی طرح علمی کوتاہی کا یہ اثر ہے کہ نماز تک کے مسائل بھی معلوم نہیں۔ ان لوگوں کا دعویٰ تو یہ ہے کہ دین تو مختصر ہے راہ نجات کافی ہے۔ دنیا حاصل کرنا چاہیے اور حالت یہ تھی کہ ایک صاحب نے جو نوکری پر سے اپنے وطن آئے تھے اپنے وطن اصلی میں امام مقیم کے ساتھ ظہر کی دو رکعت پڑھیں کیونکہ ایک دو روز کے لیے ملازمت سے آئے تھے اور بزعم خود مسافر تھے۔ دین کے معاملہ میں ایسے جاہل اور دنیا کے لحاظ سے پانچ سو روپے کے ملازم ایک بہت بڑے شخص رہبر قوم نے جو آج کل لیڈر بنے ہوئے ہیں ایک موقع پر تیمم کیا تو اپنے مٹی منہ میں لے کر تھوک دی۔ گویا مٹی کی کلی کی' لوگ جلدی سے ہنسنے لگے ورنہ خدا جانے آگے کیا کیا کرتے۔ شریعت کا تو یہ حکم ہے کہ ڈھیلے وغیرہ پر بھی ہاتھ مار کر جھاڑ دے تاکہ مثلہ نہ ہو اور ان حضرت نے مٹی سے کلی کی غرض اگر توجہ کی جاوے تو پتہ چلے کہ کن کن کوتاہیوں میں ہم مبتلا ہیں۔ بعض بستیاں ایسی ہیں کہ وہاں ہزاروں کی آبادی ہے لیکن ایک شخص بھی مسائل سے واقف نہیں۔ افسوس ہر مسافر کو ضروری قانون ریلوے کا یاد ہوتا ہے اگر یاد نہ ہو تو پاس رکھتے ہیں ورنہ دریافت کرتے ہیں اسی طرح اگر فکر ہو تو ضرور علم دین بھی حاصل کریں اور میں یہ نہیں چاہتا کہ متبحر عالم بن جاؤ کیونکہ دیگر امور کو معطل کرنا مقصود نہیں ہے۔ البتہ ضروریات سے تو واقف ہونا لازم ہے اسی واسطے بعض لوگ غیبت میں مبتلا ہیں اور اس کو برا بھی جانتے ہیں۔ لیکن جب کوئی ٹوکتا ہے تو اسی ناواقفی کی بدولت کہتے ہیں کہ ہم تو اس کے منہ پر کہہ دیں کوئی کہتا ہے یہ تو سچی بات ہے پھر غیبت کہاں حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

سے جب عرض کیا گیا کہ کیا سچی بات بھی غیبت ہے تو جواب میں فرمایا کہ غیبت تو وہی ہے جو سچی بات کسی کے پیچھے کہی جاوے اور اس کو بری لگتی ہو ورنہ جھوٹ بات تو بہتان ہے۔ اسی طرح بہت آدمی تجارت کرتے ہیں یا ضروریات خریدتے ہیں مگر ناواقفی کی وجہ سے یہ پتہ نہیں کہ کس معاملہ میں سود کا گناہ ہوگیا اور کونسا معاملہ ناجائز کررہے ہیں۔ غضب یہ کہ بعض معاصی میں لذت و منفعت تو نظر آتی ہے جیسے رشوت مگر بعض میں لذت ہے نہ منفعت مفت ہی میں عذاب پڑلیا۔ جیسا کہ چاندی ایک روپیہ کی عوض میں سوا تولہ خریدی تو گنہگار ہوگیا اور یہ سود ہوگیا۔ جس کی سخت وعید آئی ہے کیونکہ مسئلہ ہے کہ چاندی سے چاندی کا تبادلہ ہو تو برابر برابر ہونا چاہیے اگر کوئی کہے کہ اس مسئلہ پر عمل کرنے میں تو بوجہ چاندی کے ارزاں ہونے کا ٹوٹا ہوگا۔ یہ اعتراض بھی ناواقفیت سے پیدا ہوا کیونکہ غیر جنس سے تبادلہ کرنے میں کمی بیشی ناجائز ہے۔ مثلاً نو روپے کی چاندی دس تولہ نو روپیہ سے تبادلہ مت کرو بلکہ غیر چاندی کا سکہ معاملہ میں شامل کردو مثلاً یوں معاملہ کرو کہ آٹھ روپیہ نقد اور ایک روپیہ کے پیسے دے دو پھر دس تولہ کیا چاہے بیس تولہ چاندی لے لو تو گناہ سے بھی بچ جاؤ گے اور نقصان بھی کچھ نہ ہوگا اور انشاء اللہ کسی جگہ گاڑی ہرگز نہ اٹکے گی اور سنار بھی اس سے نہ گھبرائے گا۔ چنانچہ میں ایک سنار سے زیور بنوایا کرتا تھا اس نے کہا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہ ہیر پھیر کیوں کیا کرتے ہو میں نے کہا مذہبی مسئلہ ہے اور تیرا کچھ نقصان نہیں یہ سن کر اس نے کہا اب تو اس سے زیادہ مشقت ہو تب بھی سر آنکھوں پر اسی طرح بھوپال میں ایک ہندو صراف سے کسی مسلمان نے کوئی زیور کا معاملہ کیا جو قاعدہ فقہیہ پر منطبق نہ تھا۔ ہندو نے کہا کہ یہ تو تمہارے مذہب میں جائز نہیں پھر اس نے طریقہ بتلایا حضرت اگر آپ شریعت پر عمل کرنے لگیں تو مخالفین خود آپ کو مدد دینے لگیں کہ یوں کرو یوں نہ کرو۔

ایک اہل علم نے سہارنپور میں زردی دار ٹوپی خریدی۔ پانچ روپے میں اور ادھار کرنا چاہا تو دکاندار نے کہا مولوی صاحب چاندی کی مقدار میں تو ادھار جائز نہیں مولوی صاحب کو جب یاد آیا تو فرمایا اچھا پھر کسی وقت دام لاکر خریدلوں گا' دکاندار نے کہا کیا اس میں ادھار کی کوئی صورت جائز نہیں ہوسکتی۔ انہوں نے کہا کہ مجھے تو معلوم نہیں دکاندار نے خود بتلایا کہ تم مجھ سے روپیہ قرض لے کر ٹوپی کی قیمت اس وقت ادا کردو اور دوسرے وقت میرا قرض دے دینا تو بات یہ ہے کہ اس نے گو ہدایہ نہ پڑھا تھا مگر اس کی عادت تھی کہ علماء سے دریافت کرکے عمل کیا کرتا تھا۔ بعض لوگ عذر کرتے ہیں کہ ہم پڑھ نہیں سکتے' میں کہتا ہوں کہ پوچھنے میں کیا دقت ہے لوگوں کو وعظ کا تو شوق ہے کہ مزے مزے کی باتیں سن لیں اور مولویوں پر اعتراض بھی ہوسکتا ہے کہ علماء وعظ میں مسائل

ضرور یہ بیان کر دیا کریں تو کیا حرج ہے۔ یہ خیال میرے دل میں بھی پیدا ہوا تھا اور اسی خیال سے ایک دفعہ میں نے سونے چاندی کے مبادلہ کے مسائل وعظ میں مفصل بیان بھی کیے تھے اور میں خوش ہوا تھا کہ آج لوگوں کو یہ مسئلے خوب حل ہو گئے مگر تھوڑی دیر میں دو شخص جھگڑتے ہوئے میرے پاس آئے۔ وجہ غلطی کی یہ ہوئی کہ کئی مسئلے انہوں نے اک دم سے سنے تھے تو خلط ہو گیا' تب میری سمجھ میں آیا کہ پہلے علماء اس مصلحت سے مسائل فقہیہ وعظ میں بیان نہیں کرتے تھے۔

وعظ میں مسائل دریافت کرنے کی ضرورت کا بیان آنا چاہیے

البتہ ایک شکایت اب بھی باقی ہے یعنی مسائل دریافت کرنے کی ضرورت تو ظاہر کرنا چاہیے اب تو فقط ہنسانے رولانے کی حکایات کا نام وعظ ہے ویسے اگر اتفاقاً کوئی واقعہ ہنسی کا ذکر میں آ جائے تو دوسری بات ہے مگر قصداً ایسا کرنا تو گویا مضحکہ ہے جیسا ایک بزرگ سے کسی نے ذکر کیا فلاں جگہ شہادت نامہ پڑھا گیا ہے فرمایا سعادت نامہ پڑھتے تو اچھا تھا کیونکہ خود بخود رنج میں رونا آ جاوے تو دوسری بات ہے مگر رونے کا اہتمام کرنا اور منہ بنا بنا کر رونا تو شرعاً جائز ہے نہ اہل عقل کے نزدیک کوئی مفید بات ہے۔ سو وعظ کی غرض ہنسانا رولانا نہیں بلکہ اس کی غرض ترغیب و ترہیب ہے۔ پس اس میں نیک کام کا شوق دلاویں اور غفلت دور کریں۔ اسی کی فرع یہ ہے کہ وعظ میں مسائل دریافت کرنے کی ضرورت بیان کرنا لازم ہے۔ ایک غلطی عوام کو اس کے متعلق یہ ہے کہ بعض لوگ مسائل اس لیے دریافت نہیں کرتے کہ یہ کام ہم کو ضروری ہی کرنا ہے اگر پوچھنے سے ناجائز ثابت ہوا تو پھر جان کر کیا تو پکڑ ہو گی اور ویسے تو معذور ہوں گے۔ سو یہ بالکل غلط ہے جب اس کا خلاف شرع ہونا احتمالاً معلوم ہے تو یہ بھی ایک گویا علم ہے اس لیے اہل علم ہی کے برابر گرفت ہو گی۔

البتہ اگر التفات ہی نہ ہو تو نہ پوچھنے کی گنجائش ہے۔ غرض مسائل دریافت کرنا ہر حال میں ضروری ہیں گو عمل کی بھی توفیق سر دست نہ ہو کیونکہ جب ضرورت یا توفیق عمل کی نصیب ہوئی اس وقت یہ دریافت کرنا کام آوے گا ورنہ اگر اس وقت کوئی بتلانے والا نہ ملے گا تو بڑی دقت ہو گی اور ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ بار بار کان میں بات پڑنے سے عمل کی ہمت ہو ہی جاتی ہے اور اگر بالفرض نہ ہو تو اعتقاد ہی درست ہو گیا' جرم کی ایک دفعہ سے تو بچ جاؤ گے' اگر فرضاً ایک شخص پر کئی دفعات جرم کے قائم ہیں تو ایک کا ٹل جانا کیا غنیمت نہیں۔

بدعملی اور بے عملی الگ الگ گناہ ہیں

اسی طرح بدعملی الگ گناہ ہے اور بے عملی مستقل گناہ اور سخت گناہ کیونکہ عقائد اعمال سے مقدم ہیں پس علم حاصل کرنے سے دفعہ شدید تو ٹلی ایک بدعملی کی دفعہ ہی میں سزا ہو گی' دونوں تو

قائم نہیں ہوں گی اور مسائل معلوم کرنے کی آسان اور انفع تو مدرسہ قائم کرنا ہے گو چھوٹا ہی ہو جس میں کوئی عالم کامل رکھا جاوے اور ہر شخص اپنی لیاقت اور فرصت کے مطابق ان سے پڑھا کرے چاہے اردو ہی میں سہی مگر بدون پڑھے۔ بطور خود صرف کتاب دیکھنا کافی نہیں اس کی ایسی مثال ہوگی کہ ایک شخص نے اپنی گھر والی کو گلگلے پکاتے ہوئے دیکھ کر اس کے ہاتھ سے آٹا خود لے لیا تھا اور کہا تھا یہ کام تو ہم بھی کر سکتے ہیں تو آپ نے اونچے ہی سے کھڑے کھڑے آٹا کڑھائی میں ڈال دیا تمام تیل اوچٹ کر منہ پر آ گیا اور منہ پھونک لیا۔ جب اتنی موٹی بات کا صرف دیکھنا کافی نہ ہوا تو پھر تحصیل مسائل کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہر ہفتہ میں ایک دن مقرر کر کے بالالتزام کسی عالم سے مسائل سن لیا کریں اگر یہ بھی نہ ہو تو کم از کم ہر بات پوچھ کر تو کیا کریں یہ علم حاصل کرنے کا طریقہ ہے اور عمل کے متعلق یہ ہے کہ اول تو اکثر علم سے عمل بھی خود ہی ہونے لگتا ہے اور دوسری مؤثر ترتیب یہ ہے کہ بکثرت اہل اللہ کی صحبت میں رہا کرے جو کہ واقعی اہل اللہ ہوں اگر یہ نہ ہو سکے تو ان سے خط وکتابت ہی رکھے ان کی صحبت اور مخاطبت میں خاصیت ہے کہ ان کے پاس بیٹھنے سے ارادہ میں قوت ہوتی ہے۔ یہ ضروری بیان تھا علم وعمل کا ان ہی دونوں چیزوں کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُوْلُوا الْاَلْبَابِ" (وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو اہل عقل ہیں) يَتَذَكَّرُ (نصیحت حاصل کرتے ہیں) میں عمل اور اولوا الالباب میں علم مراد ہے اور ظاہری عنوان یعمل کو یتذکر سے اس لیے بدل دیا تا کہ اس کے حصول کا طریق بھی ساتھ ہی معلوم ہو جاوے یعنی یہ بتلا دیا کہ تذکر سے عمل کی توفیق ہو جاتی ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ جو چیز داعی الی العمل ہیں جیسے وعدہ وعید اور جیسے حق تعالیٰ کی نعمتیں اور ان کا قہر و غلبہ وغیرہ ان کے بار بار یاد کرنے سے طبعاً عمل کا تقاضا ہوتا ہے اسی طرح بجائے عنوان علم لفظ لب لایا گیا اس میں اسی طرح اشارہ ہے طریق تحصیل علم کا صحیح طور پر استعمال کرنا اور لب ذریعہ ہے علم کا پس اس میں علم اور عمل دونوں کی تحصیل کا طریقہ بتلا دیا گیا۔

علماء کو غیر ضروری سوالات کا جواب نہیں دینا چاہیے

اور اس دوسری تعبیر سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر شخص ہر بات جاننے کے قابل نہیں بلکہ اس کے جاننے کے لیے عقل کی ضرورت ہے مگر آج کل باوجود عقل وفہم نہ ہونے کے ہر شخص کو علمی مضامین کے سمجھنے کا دعویٰ ہے اور ایسے ایسے سوالات علماء سے کرتے ہیں کہ جن کا جواب بھی ہرگز ان کی سمجھ میں نہیں آ سکتا اور علماء بھی یہ غضب کرتے ہیں کہ ایسے شخص کے سوال کا جواب دے دیتے ہیں اور علماء

کے اس حلم ہی سے لوگ بداخلاق ہوگئے مگر جو عالم محقق ہوگا وہ ایسا کبھی نہ کرے گا۔ چنانچہ مولانا حافظ محمد نعیم صاحب لکھنوی سے کسی نے دریافت کیا کہ فلاں حافظ صاحب نے دریافت کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وحضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ میں تحقیق کیا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ وہ حافظ جی کیا کام کرتے ہیں جواب دیا کہ کپڑا بیچتے ہیں۔ فرمایا کہ اور تم کیا کرتے ہو کہا کپڑے رنگتا ہوں۔ مولانا نے ارشاد فرمایا کہ تم دونوں اپنے کام میں لگو علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جانیں معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جانیں نہ ان حضرات کے بارے میں تم سے کچھ مواخذہ ہوگا اور نہ ان کا مقدمہ تمہارے سپرد ہوگا اور اگر ہوا تو میں سفارش کر کے تمہارے اجلاس سے اٹھادوں گا۔ میرٹھ میں ایک شخص نے ایک مولوی صاحب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین شریفین کی نسبت سوال کیا' مولوی صاحب نے دریافت کیا کہ تم کو نماز کے فرائض یاد ہیں جواب دیا کہ نہیں' مولوی صاحب نے جواب دیا افسوس جس نماز کا سب سے اول سوال ہوگا اس کے تو فرائض بھی معلوم نہیں اور جس چیز کے متعلق نہ تم سے قبر میں سوال ہوگا نہ حشر میں اس کی فکر میں پڑ گئے۔ واقعی لوگوں کو جس کی ضرورت ہے اس کی فکر نہیں اور جواب دینے والے علماء کی یہ غلطی ہے کہ وہ لوگوں کی دل شکنی کا خیال کرتے ہیں اور جواب دینے بیٹھ جاتے ہیں مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ ایسی وسعت اخلاق میں لوگوں کی دین شکنی ہے جو دل شکنی سے اشد ہے۔ بعض اہل علم خیال کرتے ہیں کہ انکار میں سبکی ہوگی کہ یہ کیسا مولوی ہے جس سے ایک چھوٹا سا کام بھی نہ ہوسکا۔ جیسا ایک جاہل نے کسی مولوی سے نکاح پڑھانے کے لیے کہا تھا انہوں نے واقعہ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مرد وعورت میں باہم قرابت محرمیت ہے۔ مولوی صاحب نے کہا نکاح نہیں ہوسکتا' اس نے خوشامد کی مگر مولوی صاحب کیسے مانتے اس نے ایک مؤذن سے پڑھوالیا اور صبح کو آ کر مولوی صاحب سے کہا کہ واہ تم تو بڑے عالم مشہور ہو تم سے ایک نکاح نہ ہوسکا۔ دیکھو مؤذن نے پڑھادیا تو جو لوگ سبکی سے ڈرتے ہیں وہ ایسے ایسے نکاح پڑھادیا کریں کیا بیہودہ خیال ہے۔ سبکی کا یہ خیال اس کی بین دلیل ہے کہ آپ کے پاس کمال نہیں ورنہ کسی کی مذمت اور سبکی کی پرواہی نہ ہوتی۔ کیمیا گر تو اس سے خوش ہوتا ہے کہ سب لوگ مجھ کو جاہل سمجھتے رہیں اور چاہتا ہے کہ میرا کمال مخفی رہے اور ہر اہل کمال کی یہی حالت ہے۔

خدا اگر ظاہر کردے تو دوسری بات ہے بڑی خریداری تو خدا کی ہے بس تمہارے خریدار وہ کافی ہیں کوئی اور ہو یا نہ ہو بادشاہ جس کا سودا خریدے اور چمار نہ خریدے تو اسے کیا غم ہے۔ بس علماء کو چاہیے کہ فضول سوال کا جواب ہرگز نہ دیا کریں' چاہے کیسی ہی سبکی ہو۔ ایک شخص نے میرے پاس چند سوالات بھیجے جو محض فضول تھے اور اخیر میں دھمکانے کے لیے حدیث "من سئل عن علم

فکتم الجم بلجام من نار" بھی لکھ دی میں نے کہہ دیا کہ تم کو جواب نہ ملے گا اور جب ایسا ہوا اس وقت تم میری مدد نہ کرنا۔ افسوس آج کل علماء پر تو الزام ہے بد خلقی کا اور لوگ خود خیال نہیں کرتے کہ ہم کیسے کیسے بیہودہ امور دریافت کرتے ہیں۔ ایک انسپکٹر نے مجھے خط لکھا کہ کافر سے سود لینا کیوں حرام ہے میں نے لکھا کہ کافر عورت سے زنا کرنا کیوں حرام ہے پھر ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس سوال کا ذکر کیا اور میرے خشک جواب کی شکایت کی' میں نے پوچھا کہ کیا آپ اپنے فرض منصبی میں ہر شخص سے ایک طرح کا برتاؤ کرتے ہیں' کہا نہیں میں نے کہا بس ہمارے محکمہ میں بھی یہی ہے کہ ہر شخص سے جداگانہ معاملہ ہے جن سے خاص تعلق ہے ان سے اور معاملہ ہے اور اجنبیوں سے ضابطہ کا برتاؤ ہے مگر اب چونکہ آپ سے ملاقات ہوگئی ہے لہٰذا اب ایسا معاملہ نہ ہوگا لیکن اس ملاقات کا آپ پر بھی اثر ہوگا کہ آپ بھی ایسا بیہودہ سوال نہ کریں گے۔ غرض علماء کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ بیہودہ اور فضول امور کا جواب نہ دیا کریں اور جہلاء کو بھی لازم ہے کہ ایسے فضول سوال نہ کیا کریں مثلاً قبر میں زندہ ہو کر دم گھٹنے کا اشکال کیا جاتا ہے اس کا جواب عامی نہ دو بلکہ اس سے کہہ دو کہ جو کام کرنے کے ہیں ان کے متعلق سوال کرو۔ یہ مسئلہ عمل کے متعلق نہیں ہے۔ بس خلاصہ قاعدہ کا یہ ہوا کہ بعض بات تو کرنے کی ہوتی ہے اس کے تو احکام دریافت کرلو اور بعض بات سمجھنے کی ہوتی ہے وہ اگر صاف ہے تو سمجھ لو اگر دقیق ہے تو اس پر اجمالی اعتقاد رکھو اور تفصیلی کاوش میں نہ پڑو کیونکہ اگر عالم اسے بیان بھی کر دے تب بھی عامی کی سمجھ میں نہیں آسکتی اور سمجھ کر کوئی نفع بھی نہ ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی یہ سمجھ جاوے کہ پل صراط پر کیوں کر چلیں گے تو کیا چلنے سے بچ جائے گا یا چلنا آسان ہو جائے گا ہرگز نہیں۔ البتہ نیک اعمال کرو تو خود جو وہاں پہنچ کر چلنے کا طریقہ معلوم ہو جاوے گا اور آسانی سے پار ہو جاؤ گے۔ آخر تم نے دنیا میں بھی تو بہت سی باتیں بلا سمجھے مان رکھی ہیں۔ مثلاً زمین گول ہے اور تمام سمتوں سے آباد ہونا بلکہ فلسفہ میں بعض باتیں ایسی ہیں کہ عام لوگ ان کو تسلیم بھی نہیں کرتے اور فلاسفہ کے نزدیک وہ مسلم ہیں مثلاً یہ کہ ایک چیونٹی کی حرکت سے ساری زمین ہل جاتی ہے کوئی اس کا یقین کر سکتا ہے ہرگز نہیں۔ مگر پھر بھی فلسفہ کے معتقدین کو تقلیداً اس کو ماننا پڑتا ہے پھر کیا خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی بھی عظمت نہیں کہ ان کی باتیں تقلیداً تسلیم کرلیں۔ پس بہت سی باتیں تم نہیں سمجھ سکتے اور میں بھی فراخ دلی سے اقرار کرتا ہوں کہ بعض باتیں میں بھی نہیں سمجھ سکتا مگر میرا ایمان سب پر ہے اور بعض باتیں ہم جانتے ہیں مگر بیان نہیں کرتے کیونکہ ان کا بیان کرنا ہمارے ذمہ نہیں و نیز عوام کی سمجھ میں بھی نہیں آسکتیں۔

پل صراط کی حقیقت

مثلاً پل صراط کا بال سے باریک ہونا اور تلوار سے تیز ہونا ایک امر عقلی ہے جس کو میں عقلی طور پر ثابت کر سکتا ہوں وہ اس طرح کہ ہر شے کی ایک حقیقت ہوتی ہے اور ایک صورت پل صراط ایک صورت ہے اس کی حقیقت معلوم کرنا چاہیے تو کشف سے معلوم ہوا کہ وہ شریعت کی صورت مثالیہ ہے اور شریعت اس کی حقیقت ہے اور یہ کشف اس لیے مقبول ہے کہ شریعت کے خلاف نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ اشارات نصوص سے اس کی تائید پر استدلال بھی کیا جا سکے۔ بس یہ صراط مستقیم یعنی شریعت قیامت میں بشکل پل صراط بن جائے گی اور شریعت ہر چیز کے افراط وتفریط کے درمیان ایک وسط چیز ہے اور وسط حقیقی وہ ہے جو تقسیم نہ ہو سکے ورنہ وسط وسط نہ رہے گا اس میں خود طرفین اور وسط نکلے گا اور بال منقسم ہے پس شریعت بال سے بھی باریک ہوئی اور چونکہ اس پر چلنا دشوار ہے اس لیے تلوار سے تیز بھی ہوئی بس یہی باریک اور تیز چیز صورت پل صراط میں ظاہر ہو گی تو دیکھئے ہم نے عقلی طور پر حقیقت پل صراط کی بتلا دی مگر اب بتلایئے ہم ایسی باتیں اگر آپ کو بتا دیں تو ان کو سمجھے گا کون۔ چنانچہ اس جلسہ میں بھی بہت لوگ اس مضمون کو نہیں سمجھے ہوں گے بعض کہتے ہیں کہ بس بیان کر دیا جائے چاہے کوئی سمجھے یا نہ سمجھے اول تو اس سے نفع کیا بلکہ بعض کو غلط فہمی سے ضرر ہوتا ہے اور دوسرے کو یہ اہل کمال کا تو یہ حکیمانہ مذاق ہوتا ہے کہ

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز　　　ورنہ در رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں کہ راز آشکارا ہو جائے ورنہ رندوؤں کی مجلس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو معلوم نہ ہو)

احکام کے مصالح علماء سے نہ پوچھو

خلاصہ یہ ہے کہ علماء سے احکام پوچھو علل نہ پوچھو یعنی یہ مت پوچھو کہ یہ کیوں ہوا اور اگر ایسا ہی شوق ہے تو باقاعدہ طالب علم بنو پھر پوچھو کیوں نہ ہر شے کا ایک قاعدہ ہوتا ہے' سوالات علل کا یہی قاعدہ ہے اور اگر طالب علم نہیں بنتے تو پھر طالب و درویش بن کر ہو جس کا نام تسلیم وتفویض محض ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے ہر طالب علم کو (چوں و چرا انکند و ہر درویشے کہ چوں و چرا کند ہر دو را بچر اگاہ باید فرستاد)

درویش کا مذہب یہ ہوتا ہے کہ بلا چون و چرا تسلیم کرلے اور ہر مسلمان درویش ہے کیونکہ خدا کے طالب کو درویش کہتے ہیں یہ کبھی مت کہنا کہ ہم درویش نہیں ہیں اگر درویش ہونا سمجھ میں نہیں

آتا تو اچھا طالب علم علاج تو ہوا تو طالب علاج کو یہ جازت نہیں کہ نسخہ کے اجزاء کی تحقیق کرے اس کی تو یہ حالت ہوتی ہے:

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو   جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں یہ آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر فدا ہوں' دل آپ پر مبتلا ہے جو کچھ کریں آپ سے راضی ہوں)

ہاں طالب علم کو چونکہ فن حاصل کرنا ہے اور اس کو دریافت کیے بغیر فن حاصل نہ ہوگا اس لیے اس کو دریافت علل کا حق بھی ہے نیز اس کو دریافت کرنے کی تمیز وسلیقہ بھی ہے وہ بیہودہ و بیکار سوال کبھی نہ کرے گا۔

بیہودہ سوالات

اور اگر کوئی طالب علم بھی بیہودہ بات پوچھے تو اس کو بھی روک دیا جاوے گا۔ امام ابی یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس املا میں ایک شخص خاموش بیٹھا رہتا تھا تو آپ نے اس سے فرمایا تم کیوں نہیں بولتے' کہا اب بولا کروں گا۔ ایک روز تعجیل افطار کی حدیث کے سلسلہ میں بیان کیا گیا کہ جب آفتاب یقیناً غروب ہو جاوے پھر روزہ فوراً افطار کرلو' وہ طالب علم بولا کہ اگر کسی دن آفتاب غروب نہ ہو تو کیا کریں۔ امام صاحب نے فرمایا کہ بس تم خاموش ہی رہا کرو۔ ایک اور حکایت ہے کہ کوئی بہو چپ بیٹھی رہتی تھی اس کی ساس نے کہا کہ بات چیت کیا کرو' بہو تو بولتی ہی اچھی لگتی ہے اس نے کہا میری اماں۔ نے بولنے سے منع کر دیا تھا' ساس نے کہا تیری ماں احمق ہے تو بولا کر کہنے لگی اچھا' ایک روز بولی کہ اماں اگر تمہارا بیٹا مر جاوے تو میرا نکاح کسی دوسرے سے کر دوگی یا یوں ہی بٹھلائے رکھوگی۔ ساس نے کہا کہ بہو تیری ماں نے ٹھیک ہی کہا تھا تو خاموش رہا کر۔ تو بعض آدمی بولنے کے قابل نہیں ہوتے۔ کان پور میں ایک استفتاء آیا' مولوی محمد رشید صاحب کانپوری مرحوم کے پاس کہ گھوڑے کے جنازہ کی نماز پڑھنا کیسی ہے مولوی صاحب نے ظرافت کے پیرایہ میں تحقیقی جواب لکھا کہ اگر کسی نے اس گھوڑے کو کلمہ پڑھتے ہوئے سنا ہو تو جنازہ کی نماز پڑھنا چاہیے ورنہ نہیں' جواب کیسا مدلل دیا کہ نماز جنازہ مسلمان کی ہوتی ہے اور جب تک کلمہ نہ پڑھے مسلمان نہیں ہوتا تو گو ذہانت سے ایسے جواب ہو سکتے ہیں مگر اصل بات یہی ہے کہ جاہلوں کو فضول بات کا جواب ہی نہ دیا جاوے اور اس سے سب عوام رنجیدہ نہیں کہ ہم کو جاہل اور نا قابل قرار دیا۔

علم صرف درسیات پر موقوف نہیں

کیونکہ صحبت علماء سے بعض عوام جاہل نہیں رہتے خواص ہو جاتے ہیں۔ گو اکثر اخص الخواص نہ ہوں پس جاہل وہ ہے جو خدا کا راستہ نہ جانتا ہو اور جو واقف ہو وہ عالم ہے گو لکھا پڑھا نہ ہو البتہ ایسا شخص عالم لازم ہے عالم متعدی نہیں اس کو وعظ وغیرہ کی اجازت نہ ہوگی یا یوں کہو کہ عالم ہے معلم نہیں جیسا کہ ہر تندرست طبیب نہیں اس لیے علاج نہیں کر سکتا بلکہ علاج طبیب ہی کرتا ہے اسی طرح جو ناخواندہ صحبت علماء میں ضروریات دین سے واقف ہو گیا ہو وہ تندرست تو ہے چاہے دوسروں کو نفع نہ پہنچا سکے مگر اس کو جاہل نہیں کہہ سکتے کیونکہ علم لکھنے پڑھنے ہی پر موقوف نہیں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کثرت سے ایسے تھے جو کثرت سے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی اسی شان کے متعلق فرماتے ہیں۔ "**نحن امة امية لانكتب والا نحسب**"[1] (ہم امتی امت ہیں نہ لکھنا جانتے ہیں اور نہ حساب) اس ارشاد میں آپ نے سب فلسفہ اڑھا دیا مگر باوجود اس کے کتنے بڑے عالم تھے پس عالم ہونے کے لیے تو درسیات کا پڑھنا شرط نہیں لیکن معلوم ہونے کے لیے اس وقت شرائط شدید ہیں۔ غرض اولوا الالباب کے لفظ میں ان ہی علوم مقصود کی طرف اشارہ ہے اب میں ختم کرتا ہوں۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ وعظ یہ ہے کہ علم وعمل کی ضرورت ہے اور علم کا طریق پڑھنا اور مسائل کا سننا اور پوچھنا ہے اور عورتوں کی تعلیم کا طریقہ شاید ذکر نہیں کیا گیا وہ بھی بطور تتمہ کے بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ گھر میں رہ کر مسائل پڑھیں اور جب کسی نئے مسئلہ کے پوچھنے کی ضرورت ہو تو محرم مردوں کی معرفت علماء سے دریافت کراویں مگر کسی حال میں پردہ میں کوتاہی نہ کریں۔

والحمدلله رب العالمين والصلوٰة والسّلام على سيّدنا محمّد وآله واصحابه اجمعين.

اشرف علی (آغاز جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ)

---

[1] (مسند احمد ۲: ۱۲۲)

رطوبۃ اللسان

یہ وعظ ۷ا ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ بمقام تھانہ بھون مکان حافظ اعجاز احمد صاحب جو کہ حضرت والا نے بیٹھ کر ایک گھنٹہ تیس منٹ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۱۲۵ تھی اور مستورات کا مجمع بھی معتد بہ تھا۔ مولوی اطہر علی صاحب سلہٹی نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

فقَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَایَزَالُ لِسَانُکَ رَطْبًا مِّنْ ذِکْرِ اللّٰہِ○[۱]

ترجمہ: ''تمہاری زبان پر دائماً خدا کا ذکر رہنا چاہیے۔''

یہ ایک ٹکڑا ہے ایک حدیث کا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص عبادت کی ترغیب دی ہے اور وہ ایسی عبادت ہے جس کی طرف لوگوں کی توجہ بہت کم ہے جب اس کی طرف توجہ کم دیکھی جاتی ہے تو اس کی طرف متوجہ کرنا اور اس پر متوجہ کرنا ضروری ہے اس لیے اس وقت یہ مضمون اختیار کیا گیا نیز اس ضرورت کے لیے بھی کہ اس عبادت میں صرف اجر ہی نہیں بلکہ اجر کے ساتھ اس کا ایک خاصہ بھی ہے وہ یہ کہ اس میں مشغولی سے بہت بڑی معصیت سے حفاظت ہوتی ہے۔

عبادت کی دو قسمیں

خلاصہ یہ کہ عبادت دو قسم پر ہے ایک وہ کہ اس میں صرف ثواب ہی ہے اور ایک یہ کہ ثواب کے ساتھ وہ سپر ہے معاصی کا تو جو عبادت اس حدیث میں بیان کی گئی ہے وہ ایسی ہے کہ اس میں ثواب بھی ہے اور اس کے ذریعہ سے بہت سے معاصی سے اجتناب بھی ہوجاتا ہے۔ افسوس اتنے فائدے کی چیز کہ اس کے ذریعے سے گناہوں سے بچاؤ ہوتا ہے اور ہم کو اس کی اطلاع نہیں اور اطلاع تو کیا ہوتی اس سے بڑھ کر افسوس یہ کہ اکثروں کو بھی یہ خبر نہیں کہ زبان کا گناہ جس سے یہ عبادت مذکورہ حدیث محافظ ہوتی ہے یہ بھی کوئی گناہ ہے راز اس میں ہے کہ اس میں کوئی مشقت نہیں ہے۔ بعضے گناہ تو ایسے ہیں جن میں مشقت ہوتی ہے خواہ مالی مشقت ہو یا عملی اگر اور کچھ

---

[۱] (سنن الترمذی: ۳۳۷۵)

مشقت بھی نہ ہوتو کم از کم اتنا تو ہے کہ سوچنا پڑتا ہے اس سے طبیعت پر کچھ بار ہوتا ہے اور بعضے ایسے گناہ ہیں جن میں مشقت نہیں ہے تو ایسے گناہ کثرت سے صادر ہوتے ہیں اور ایسے معاصی سے بچانا نہایت ضروری ہے جن کی خبر ہی نہ ہو اور ان پر توجہ ہی نہ ہو اس لئے یہ مضمون اختیار کیا گیا ہے۔ اب میں بیان کرتا ہوں کہ وہ عبادت کیا ہے سو معصیت کونسی ہے سو عبادت یہ ہے کہ اس کی کوشش کرو کہ زبان ذکر اللہ سے تر رہے اور وہ معصیت جس سے اس کے ذریعے سے بچاؤ ہوتا ہے وہ معصیت زبان ہی کی ہے اگر زبان سے ذکر کرو گے اور زبان ذکر خدا میں مشغول رہے گی تو ظاہر ہے کہ اس معصیت سے بھی بچے رہو گے کیونکہ زبان سے ایک وقت میں دو فعل صادر نہیں ہو سکتے۔ اگر زبان کو ذکر میں لگائے رہو گے تو یقیناً معصیت سے بچو گے۔

زبان سے کثرت سے گناہ ہوتے ہیں

اب غور کیجئے کہ آیا زبان سے گناہ ہوتے ہیں یا نہیں تو دیکھ لیجئے کہ جتنے اعضاء ہیں وہ تو گناہوں سے کبھی کبھی رک بھی جاتے ہیں اور زبان عادتاً کبھی رکتی ہی نہیں بجز اس کے مردہ ہو کر سو رہے باقی زندگی میں تو ہر وقت کچھ نہ کچھ واہی تباہی نکلتا ہی رہتا ہے کہ کبھی اپنی تعلّی ترفع کی باتیں ہیں اور کبھی غیبت جھوٹ ہے یا کسی سے کچھ روایت کہ اس میں میل کر دیا اس قسم کا جھوٹ آج کل بہت ہی ہے تو دیکھ لیا آپ نے کہ زبان سے کس قدر کثرت سے گناہ ہوتے ہیں اور ہر وقت ہوتے ہیں سو ایک تو اس سے گناہ بہ کثرت صادر ہوتے ہیں نیز جیسا میں نے اوپر کہا ہے کہ اس کی طرف التفات بھی نہیں ہوتا اور نہ اس کو گناہ سمجھتے ہیں۔ دوسرے جو اعضاء سے جو گناہ ہوتے ہیں ان کو گناہ تو سمجھتے ہیں جیسے چوری کرنا' زنا یا ڈاکہ ڈالنا مگر زبان سے جو اکثر معاصی صادر ہوتے ہیں بالخصوص غیبت کا گناہ اس کی طرف تو التفات بھی نہیں ہوتا اور اس بلا میں عوام تو عوام خواص بھی جو کہ اولیاء میں شمار ہوتے ہیں مبتلا ہیں گویا یہ ایک عام غذا ہے کہ کوئی اس سے خالی نہیں کبھی کوئی مجلس غیبت سے خالی نہیں ہوتی چنانچہ آدمی اگر التزام کر کے بیٹھیں کہ اس جلسہ میں نیک ہی کام کریں گے معاصی سے بچیں گے۔ اب جس مضمون میں مشغولی کے لیے بیٹھے تھے وہ تو ختم ہو گیا اور جی چاہتا ہے کہ اور باتیں کریں بس اب غیبت کا دروازہ کھل گیا اور بہانہ یہ کرتے ہیں کہ بھائی چپ بیٹھے جی گھبراتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ باتیں تو اور بھی تھیں وعظ نصیحت کیا کرو بزرگوں کے اقوال واحوال پڑھا کرو مگر اس میں لذت کہاں مزہ تو اسی میں آتا ہے پھر ایک تو کسی نے ستایا ہے اس کی ہی غیبت کر کے اس پر بس کرے مگر یہ بھی نہیں کیونکہ اگر کسی نے ستایا ہو اس کا بدلہ نکالے تو خیر ایک بات بھی ہے ایسے وقت طبعی طور سے یہ شخص اس کی غیبت میں معذور ہے اور قرآن سے بھی کسی درجہ میں اس کی

اجازت ملتی ہے۔ فرماتے ہیں: "لَايُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ" بری بات کو ظاہر کرنا خدا پسند نہیں کرتا مگر مظلوم کو اجازت ہے کہ ظالم کی شکایت کرے۔

حد سے تجاوز جائز نہیں

لیکن اس کی بھی ایک خاص حد تک اجازت ہے یہ تھوڑا ہی ہے کہ ایک دن اس نے ایک بات کہہ دی تھی اس کی وجہ سے ساری عمر کے لیے دھندا لے بیٹھے اس کی بھی ایک حد ہے وہ حد یہ ہے کہ جو حدیث شریف میں آئی ہے "اَلْبَادِیْ اَظْلَمُ مَالَمْ یَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ"[1] جو شروع کرتا ہے ظالم زیادہ وہی ہے جب تک مظلوم زیادتی نہ کرے لیکن اگر یہ حد سے نکل جائے تو یہ بھی ظلم ہوسکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے اس سے تجاوز جائز نہیں۔ پس یہ دیکھو کہ اس نے کتنا ستایا تھا اور کتنی تکلیف دی تھی پھر استفتائے شرعی طلب کرو کہ ایک شخص نے مجھ کو اتنی تکلیف پہنچائی ہے اس کی سزائے شرعی کیا ہونا چاہیے اور کہاں تک بدلہ لینا جائز ہے اور پوچھو بھی کسی محقق سے جو وہ بتلا دیں اس سے اپنے دل کی بھڑاس نکالو۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ ظالم کی غیبت کو ساری عمر کا وظیفہ بنالو خواہ اس بے چارے نے اس کا تدارک بھی کرلیا ہو قول سے یا فعل سے قول سے تو یہ ہے کہ معاف کرالیا اور فعل سے یہ کہ برتاؤ ایسے کرنے لگا جو معذرت پر دال ہیں۔ غرض یہ مرض غیبت کا سب کے اندر ہے خصوص عورتوں میں خاص کر جب یہ لڑتی ہیں گو یہ عورتیں تھوڑی ہی دیر میں صلح بھی کرلیتی ہیں۔ بس ابھی لڑیں اور ابھی ساتھ کے ساتھ کھانا کھا رہی ہیں' مردوں میں اگر لڑائی ہوجاتی ہے تو اس کا اثر مدتوں تک رہتا ہے۔

عورتوں کی ایک نامعقول حرکت

عورتوں میں یہ تو اچھی بات ہے کہ صفائی جلدی ہوجاتی ہے مگر ایک بڑی لغو حرکت ان میں یہ ہے کہ اگر اس نے قولاً یا فعلاً اپنی خطا کو معاف بھی کرالیا ہو یعنی زبان سے معافی چاہ لی یا برتاؤ سے لیکن اس کے بعد اگر اور کسی بات میں کسی روز لڑائی ہوجائے تو پچھلے مردے پھر اکھیڑیں گی پھر ان پرانی باتوں کو دہراتی ہیں کہ تو نے یہ کیا تھا وہ کیا تھا سو یہ نہایت ہی نامعقول حرکت ہے' مردوں میں گو صفائی بدیر ہوتی ہے مگر ایک بار صفائی کے بعد پھر پچھلے واقعات کو دہراتے نہیں۔ سو یہ عورتوں کی بہت ہی نامعقول حرکت ہے عقلاً بھی اور شرعاً بھی یہ طریقہ زیادہ دل دکھاتا ہے۔ بہرحال کسی درجہ میں ظالم کی شکایت کی تو اجازت ہے لیکن اگر کسی نے ستایا نہ ہو محض اپنا وقت گزارنے کے لیے کسی کی غیبت کرنا جیسے گنجفہ شطرنج وقت بہلانے کے لیے ہوتا ہے یہ کہاں جائز ہے اور یہ مرض غیبت کا صرف عورتوں ہی میں نہیں بلکہ مردوں

---

[1] (مسند الربیع بن حبیب ۱: ۱۸)

میں بھی ہے گو قلت کے ساتھ ہے مگر یہ قلت اس درجہ کے اعتبار سے ہے جو عورتوں میں بھی ہے۔ گو
قلت کے ساتھ ہے مگر یہ قلت اس درجہ کے اعتبار سے ہے جو عورتوں میں ہے ورنہ یہاں بھی کثرت
ہے اور یہ ایسا مرض ہے کہ اتقیاء اور مولویوں میں بھی ہے مجلس میں بیٹھے اور کسی کی غیبت ہو رہی ہو کسی کی
شکایت ہو رہی ہے کیونکہ جب تک اِدھر اُدھر کی باتیں نہ ملا دیں اس وقت تک مجلس کی رونق نہیں ہوتی
لوگ مجالست مقصود سمجھتے ہیں کہ مجالست میں فرق نہ آوے خواہ کتنے ہی گناہ ہو جاویں حالانکہ مجالست
مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ مقصود بالعرض ہے کسی بزرگ کے پاس جاؤ تو دین کی باتیں پوچھو' مسئلے
دریافت کرو' اس میں کوئی حرج نہیں ہے مگر اب تو یہ آفت ہے کہ بزرگوں کی مجلس بھی دل بہلانے کے
لیے ہو گئی ہے' بس جہاں جی گھبرایا اور خیال ہوا کہ وہاں چلو شاہ صاحب کے پاس باتیں بتائیں گے دل
بہلے گا یہ تو ایسا ہوا جیسے رندلوگوں کا بازاری عورت کے پاس جانا تو گویا بزرگ اس درجہ میں ہوئے۔

بزرگوں کی مجالس میں شرکت کی نیت

صاحبو! مجالست میں نیت یہ ہونا چاہیے کہ وہاں دین کی باتیں سنیں گے وعظ نصیحت کی باتیں
کان میں پڑیں گی اور بزرگوں کی نیت بھی دین کی باتیں سنانے کی ہونا چاہیے۔ ہاں مباح باتوں
کی اجازت ہے اس کا مزاج پوچھ لیا' گھر کی حالت پوچھ لی یا اس کی طبیعت کے موافق اور کوئی
بات کر لی۔ خواہ ظاہر میں فضول ہی ہو مگر اس خیال سے کہ اس کا دل کھلے گا انس ہو گا وحشت دور
ہو گی تو اس غرض کے بعد وہ فضول نہ رہے گی اور یہ باتیں اس طرح کرے کہ وہ سمجھ جائے کہ شیخ کو
ایسی باتوں سے ہماری رعایت مقصود ہے ان باتوں کے بعد پھر کام کی باتیں شروع کر دے' دین کی
باتیں سناوے' اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اپنا فرض منصبی پورا نہ کیا۔ ایک وزیر ایک درویش کے پاس گیا
وہ اس سے بادشاہ کی حالت اور اس کے متعلق باتیں کرنے لگے' وزیر رونے لگا اور کہا حضرت دین
کی باتیں سنایئے' بادشاہ کی باتیں تو ہر وقت ہی سنتا ہوں' کہا میں نے تو تمہاری خاطر سے پوچھا
ورنہ مجھ کو بادشاہ سے کیا واسطہ۔ دیکھئے پہلے لوگ کیسے تھے کہ خود درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں دین
کی باتیں سنایئے ان کو یہ خیال تھا کہ جس غرض سے میں یہاں آیا ہوں وہ پوری ہونا چاہیے اس
وقت ہمارے مذاق کے موافق کیوں باتیں کریں بلکہ اپنے مذاق کے موافق باتیں کرنا چاہئیں اور
واقعی یہی ہونا چاہیے مثلاً اگر کوئی مریض کسی طبیب کے پاس جائے اور طبیب دو گھنٹہ اِدھر اُدھر کی
باتیں ملاوے اور نسخہ لکھ کر نہ دے تو وہ پھر کبھی اس کے پاس نہ جاوے گا۔ اگر اس سے کہو میاں آج
طبیب کے پاس نہ گئے وہ کہے گا کیوں جاؤں وہ تو ایران کی توران کی گپیں کرتے ہیں اور نسخہ نہیں

دیتے ہمیں یہ گپیں کیا نفع دیں گی اور اگر وہ باتوں کے بعد نسخہ بھی لکھ دے تو خوش ہوتا ہے اور تعریف کرتا ہے کہ بڑا خلیق ہے کہ ہماری رعایت بھی کی اور اپنا فرض بھی ادا کیا تو دونوں طبیبوں میں فرق کیا ہے۔ فرق یہی ہے کہ یہ نسخہ لکھنے والا ہے اور وہ محض دل بہلانے والا اس طرح جو دین کے لیے جاتا ہے اس کا ان زائد باتوں سے جی گھبراتا ہے کہ کیا واہی تباہی ہے۔

طلب دین میں بعض کا غلو

مگر اس طلب دین میں بھی بعض کو غلو ہو جاتا ہے ایک مرتبہ بعض مہمان میرے یہاں آئے ہوئے تھے میں اس زمانہ میں ریل کے قواعد اردو میں لکھ رہا تھا اور مقصود اس سے صرف اس کا علم ہی نہ تھا بلکہ اس کے متعلق مسائل کا تحقیق کرنا تھا۔ مثلاً تھرڈ میں پندرہ سیر اسباب کی اجازت ہے اب اگر کوئی اس کے متعلق حکم شرعی دریافت کرے تو اس مسئلہ کی تحقیق موقوف اس پر ہے کہ پہلے یہ جان لیں کہ کتنا مال لے جانے کی قانوناً اجازت ہے لہٰذا یہ شرعی حکم کہ اتنے کی تو اجازت ہے اس سے زیادہ لے جانا جائز نہیں اس قاعدے کے جاننے پر موقوف ہے کہ تھرڈ میں کتنے اسباب کی اجازت ہے چنانچہ اس جلسہ میں بعض لوگ تھے جو انگریزی کتاب کا ترجمہ کر کے مجھے سناتے تھے اور دو ایک اہل علم بھی تھے ان سے کہیں کہیں مشورہ لیتے تھے تو وہ مہمان اس سے گھبرائے اور باہر جا کر کہا میں تو درویشی کی باتیں سننے کے لیے آیا تھا یہاں تو ریلوے قواعد ہو رہے ہیں۔

حقوق العباد کی ادائیگی درویشی میں داخل ہے

میں نے کہا کہ یہ بھی درویشی ہی کی باتیں ہیں' کیا حقوق العباد کا اہتمام درویشی سے خارج ہے یہ بھی درویشی میں داخل ہے چنانچہ کسی نے امام محمد صاحب سے کہا کہ حضرت آپ نے سب فنون میں کتابیں لکھی ہیں اور فن تصوف میں کوئی تصنیف نہیں ہے امام محمد صاحب کی نو سو ننانوے یعنی ایک کم ہزار تصانیف ہیں' فرمایا کہ میاں لکھی تو ہے پھر ایک فقہ کی کتاب کا نام لیا اور فرمایا کہ کیا یہ کتاب لکھی نہیں' تصوف میں سائل نے کہا حضرت یہ تو فقہی کتاب ہے فرمایا میاں یہ بھی تصوف ہے اس کے ذریعے سے حلال وحرام کی تمیز ہوگی' حرام سے بچیں گے اس سے نور پیدا ہوگا' علم وعمل کی توفیق ہوگی اور اس سے قرب الٰہی نصیب ہوگا۔ یہی تو تصوف ہے اور تصوف میں کیا رکھا ہے اسی طرح ریلوے مسائل کی تحقیق بھی تصوف ہی ہے۔ مقصود ان کی تحقیق سے یہ ہے کہ کسی کا حق اپنے ذمہ نہ رہے اس زمانہ میں تو بڑے بہادر لوگ ہوئے ہیں جو بلا ٹکٹ سفر کرتے ہیں پرانے لوگ بھی دغا فریب کرتے تھے مگر ان کا مکر سادہ ہوتا تھا جو چھپتا نہیں تھا چنانچہ ایک سفر

میں دو آدمی ساتھ ہوئے' ایک نے تو ٹکٹ لیا اور دوسرے کو اسٹیشن پر پہنچنے سے پہلے بستر میں باندھ کر اسباب بنا کر سر پر رکھ کر چلے۔ جب بابو کو ٹکٹ دینے لگے اتفاق سے جو بستر میں بندھا ہوا تھا اس کو چھینک آ گئی' بابو نے کہا اسباب میں چھینک کیسی' پھر ان کو گرفتار کر لیا تو پرانے لوگوں کو مکر نہ آتا تھا اور یہ نئی روشنی والے بڑے استاد ہیں یہ تو مکر کے فن داں ہیں بالخصوص جنٹل مین ان کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں کہ تمہارے پاس ٹکٹ ہے یا نہیں کیونکہ قیمتی اور فیشن کا لباس دیکھ کر بابو ان سے یہ کہتے ہوئے شرماتا یا بعض دفعہ ڈرتا ہے کہ ٹکٹ لاؤ حالانکہ سب سے زیادہ یہی لوگ بے ٹکٹ سفر کرتے ہیں مگر لباس کی وجہ سے کوئی ان کو نہیں پوچھتا اور غریب وسادہ لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ ٹکٹ دکھاؤ حالانکہ یہ لوگ بے ٹکٹ سفر نہیں کرتے اسی وجہ سے ایسے موقع پر بعض لوگ جنٹل مینوں کے کپڑے پہن کر چلے جاتے ہیں اور خیر مرد تو ہوتے ہی ہیں چالاک' ہم نے ایک عورت کو بھی دیکھا ہے جس کے ساتھ ایک بکری کا بچہ بھی تھا جس کا محصول نہیں دیا تھا اس نے کمال کیا کہ بابو جب جا بجا ٹکٹ چیک کرنے کو آتا تھا تو وہ بکری کے بچہ کو تخت کے نیچے کر لیتی تھی مگر جیسے اس کو چھینک آتی تھی (یعنی بستر والے کو) ایسے ہی بکری کا بچہ بھی اس دفعہ بولا اس نے یہ چالاکی کی کہ اپنے بچہ کے ایک چپت لگایا کہ کیوں رے بکری کی بولی بولتا ہے میں نے کہا سچ ہے ان کیدکن عظیم (ان کا عذاب کم نہ کیا جائے گا) بابو کو اول تو عورت سے بولتے ہوئے شرم آتی ہے نیز وہ سمجھا کہ بچے ایسی شرارت کیا ہی کرتے ہیں اس کو کیا خیر یہ اس کا مکر ہے پھر میں تو پہلے اتر گیا تھا نہ معلوم منزل مقصود تک کیا کیا ہوا۔ شاید وہاں بھی کوئی ایسا ہی عزیز قریب آن کر لے گیا ہوگا تو کیا اس کا مواخذہ نہ ہوگا ضرور ہوگا۔

غدر وسرقہ کافر سے بھی حرام ہے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ کافر کا مال جس طرح ہو لوٹ لو' کیوں صاحب کافر کو کیوں لوٹیں کیا یہ بھی کوئی قاعدہ شرعی ہے' شریعت نے غدر وسرقہ کو کافر کے ساتھ بھی تو حرام کیا ہے بلکہ مولانا محمد قاسم صاحب فرماتے تھے کہ کافر کا حق رکھنے سے تو مسلمان کا حق رکھ لینا اچھا ہے کیونکہ نیکی اگر جاوے تو اپنے بھائی مسلمان ہی کے پاس جاوے' دشمن کے پاس کیوں جاوے۔ اگر ہماری مغفرت نہ ہو تو بھائی ہی کی سہی اور وہاں تو دشمن کے پاس تمہارے سب کیا کرایا جاوے گا جس میں نہ اس کا نفع نہ اس کا البتہ ہاں اس کی نیکی سے اس کافر کا عذاب کچھ کم ہو جائے گا مگر یہ کم کہنا بھی اضافہ ہے ورنہ حقیقتاً کم کسی کافر کا بھی نہیں' عذاب سب کا کامل ہے بس کسی کا شدید ہے کسی کا اشد ہے۔ چنانچہ اس معنی کو ارشاد ہے: ''لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ'' (فرمائے گا بلکہ ہر ایک کے لیے

دونا عذاب ہے) اور ارشاد ہے: "قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ" ہاں اس اشد کے مقابلہ میں کچھ خفیف ہوگا مگر اس کو خفیف کہنا لغۃً تو صحیح ہے محاورہ میں صحیح نہیں، محاورہ میں خفیف وہ ہے جس کا اثر معتد بہ درجہ میں خفیف ہو ورنہ اس کو محاورہ میں خفیف نہیں کہتے۔

قرآن اصطلاحات فنون پر وارد نہیں

اس لیے اہل علم کو چاہیے کہ محاورہ کو دیکھ کر قرآن کو سمجھا کریں کیونکہ قرآن اصطلاحات فنون پر وارد نہیں ہے اور اگر اصطلاح ہے بھی تو اصطلاحات شرعیہ پر ہے اور نہ فنون کی اصطلاح پر ہے۔ مثلاً حدیث شریف میں ہے کہ قرآن کے ہر ہر حرف کے بدلے دس دس نیکیاں ملتی ہیں مثلاً اگر کسی نے الم پڑھا تو اس کو تیس نیکیاں مل گئیں۔ آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "لَا اَقُوْلُ الٓمٓ حَرْفٌ بَلْ اَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَمِيْمٌ حَرْفٌ"[1] تو دیکھئے الف اور لام اور میم کو حرف فرمایا گیا حالانکہ اصطلاح نحاۃ کے نزدیک حرف ہے اور الم میں جو الف ہے وہ اسم ہے مگر محاورہ یا اصطلاح شرع کے اعتبار سے یہ الف بھی حرف ہے یہ ایسی اصطلاح ہے جیسے عام محاورہ ہے یہ محاورہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق ہے غرض شارع علیہ السلام کے کلام میں الف حرف ہی ہے گو نحاۃ کے نزدیک اسم ہو بعض اہل علم حدیث میں اس الف سے بھی مسمی سمجھ گئے اور مسمی بالالف مراد لیا یعنی الف جو نام ہے حرف کا اس میں جو تین جزو ہیں الف اور لام اور فاء حدیث میں یہ الف مراد ہے اور اس پر محمول کر کے کہنے لگے کہ اس حساب سے الم میں نوے نیکیاں ہوئیں اور یہ محض تکلف ہے اگر حساب بڑھانے کے لیے یہ توجیہ کی ہے تو میاں وہاں کا تو تھوڑا بھی کافی ہے اس تکلف کی کیا ضرورت ہے حاجی صاحب فرماتے ہیں:

گرچہ کرتے ہیں بہت نالہ و فریاد ہم — بس ہے اپنا ایک نالہ بھی اگر پہنچے وہاں

اور ذوق سے اگر کام لیا جاتا تو صاف معلوم ہوتا ہے اگر الف سے مسمی مراد ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح فرماتے بل الف حرف لام حرف فا حرف اسی طرح لام، حرف والف ومیم حرف ایسا ہی میم حرف ویا حرف ومیم حرف جب آپ نے اس طرح نہیں فرمایا تو معلوم ہوا کہ مراد شارع علیہ السلام کی وہ نہیں ہے جو تم کہتے ہو اور اگر اختصار کی وجہ سے تین ہی حرف کا بتلانا تھا اور پورے نو کو بیان فرمانا تطویل کی وجہ سے مد نظر نہیں تھا تو اسم اول ہی کے تین حرف بیان فرما دیتے یہ کیا کہ ہر ایک سے ایک ایک حرف لیا گیا کہ الف سے الف لیا اور لام سے لام اور میم سے میم۔ یہ تو کچھ جی کو نہیں لگتا

---

[1] (الترغیب والترھیب ۲: ۳۴۲)

اور یوں تو ''ملاں آں باشد کہ چپ نہ شود'' (مولوی وہ ہے جو خاموش نہ ہو) کچھ نہ کچھ جواب نکال ہی لیں گے مگر ہمارے جی کو تو نہیں لگتا ہمارے جی کو تو وہی لگتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں مسمی کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ اسم کا ذکر فرمایا ہے اور محاورہ کے لحاظ سے اسم نحوی کو حرف فرمایا گیا ہے غرض محاورہ اور اصطلاح کے خلط سے یہ ہوتا ہے کہ مطلب اور مراد متکلم میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔

کسی ناری کا عذاب کم نہ ہوگا

اسی طرح قرآن پاک محاورہ پر نازل ہوا ہے اب محاورہ کو دیکھنا چاہیے تو محاورہ میں خفیف وہ ہے جس کی تکلیف معتدبہ درجہ میں کم ہو سو اس لحاظ سے کسی ناری کا عذاب بھی کم نہ ہوگا یہاں تک کہ جہنمیوں کو دوزخ میں صرف ایک جوتہ آگ کا پہنایا جاوے گا اور اس کا سر ہانڈی کی طرح پکے گا تو وہ سمجھے گا کہ مجھ سے زیادہ عذاب کسی کو نہیں ہو رہا کوئی اس عذاب کو برداشت نہیں کر سکے گا' تحمل کی تاب نہ ہوگی اور شدید وہی ہے جس کے تحمل کی تاب نہ ہو تو محاورہ کو دیکھنا چاہیے نہ کہ اصطلاحات فنون کو نہیں تو کوئی بات بھی صحیح نہ ہوگی۔

اصطلاحات کے غلبہ سے دماغ خراب ہو جاتا ہے

مثلاً کسی کے دانت میں درد ہے تو پوچھتے ہیں کہ میاں کیا حال ہے درد میں کچھ کمی ہے وہ کہتا ہے کہ جی ہاں آج تو کچھ کم ہے تو محاورہ میں درد کو کم زائد کہنا صحیح ہے اور اگر اصطلاح فلسفہ پر کلام ہو تو یہ پوچھنا ہی غلط ہے کہ درد کم ہے یا زائد کیونکہ زیادت و نقصان کمیات کی صفات سے ہے نہ کہ کیفیات کی اور درد مقولہ کیف سے ہے لہٰذا یہاں قوت وضعف سے سوال ہونا چاہیے اور ایسی اصطلاحوں سے تو ایسی گڑبڑ ہوتی ہے کہ آدمی کو بات کرنا بھی دشوار ہو جاتی ہے اور اصطلاحات کے غلبہ سے دماغ ہی خراب ہو جاتا ہے۔ فارابی اتنا بڑا شخص ہے اس کا ایک واقعہ ایک طب کی کتاب میں مالیخولیا کی بحث میں لکھا ہے' قصہ کو بھی وہاں لکھا ہے جہاں جنوں کی بحث ہے واقع مناسب موقع تھا قصہ یہ ہے کہ ایک لڑکا حلوہ بیچ رہا تھا اس نے اس لڑکے سے پوچھا کیف تبیع الحلوا کہ حلوہ کس طرح بیچتے ہو اس نے کہا کذا بدانق مثلاً دو آنہ کا پاؤ تو فارابی اس سے لڑنے لگے کہ میں تو کیفیت سے سوال کر رہا ہوں تو کمیت بتلاتا ہے تو یہ خبط نہیں تو اور کیا ہے دماغ ہی بگڑ گیا تھا ان کو ہر جگہ اصطلاحات ہی سوجھتی تھیں جیسے کسی بھوکے سے کسی نے پوچھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں تو حالانکہ سائل نے معدود کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا کہ آدمی یا روپیہ یا جانور عام رکھا مگر اس نے تخصیص کے ساتھ جواب دیا کہ دو اور دو چار روٹیاں ہوتی ہیں تو ان کے نزدیک خواہ دو اور دو آدمی ہوں یا ہاتھی ہوں یا

گھوڑے ہوں سب چار روئیاں ہی ہیں یہ خبط کا ہے سے ہوا بھوک کے غلبہ سے ایسا ہی معقول کے غلبہ سے ہر جگہ ان کی مصطلحات ہی نظر آتی ہیں۔ایسا ہی دیو بند کے ایک طالب علم کا قصہ ہے وہ ایک دن سنار کے پاس زیور لینے گئے جو اس کو بنوانے کے لیے دے رکھا تھا یہ لوگ کچھ ٹال مٹول کرتے ہی ہیں وہ بھی وعدہ خلافی پہلے سے کر رہا تھا اس روز بھی کہا کل دے دوں گا آپ فرماتے ہیں کہ بتلا کل کے کون سے جزو میں دے گا تعین کر کیونکہ کل کا اطلاق تو تمام دن پر آتا ہے وہ بے چارہ تعین اور اطلاق کیا جانے ان کے منہ کو تک رہا تھا ایسے ہی ایک شخص لغات بولنے والے تھے' گاؤں کے کسان ان کے پاس آئے تو آپ ان سے پوچھتے ہیں کہ امسال تمہارے ''کشت زار گندم پر تقاطر امطار ہوا یا نہیں'' (اس سال گندم کی فصل میں بارش ہوئی یا نہیں) وہ بے چارے کیا سمجھتے مگر گاؤں کے لوگ بڑے ذہین ہوتے ہیں ایک بولا میاں اس وقت قرآن پڑھ رہے ہیں چلو پھر آویں گے اس پر آپ فرماتے ہیں کہ میں نے تو مبتذل لغت بولا تھا کوئی مغلق الفاظ تو استعمال نہیں کیے وہ غریب مبتذل و مغلق کو کیا سمجھتے تو یہ بھی خبط ہے کسی کو کسی بات کا خبط ہے اور کسی کو کسی کا ہم نے اپنے اساتذہ کو دیکھا ہے حالانکہ وہ بڑے بڑے علامہ تھے جیسے مغلق لغت بھی چاہتے بول سکتے تھے مگر ان کی گفتگو نہایت سادہ ہوتی تھی جیسا کہ مخاطب ہوتا تھا اسی کی لیاقت کے موافق بولتے تھے۔حضرت مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس ایک گاؤں کا آدمی آیا کہ اجی ہمیں مرید کر لو تو مولانا نے فرمایا مرید ہو کر کیا کرے گا جیسے اس نے کہا تھا ویسا ہی مولانا نے فرمایا' بچپن میں ایک دفعہ والد کے ساتھ میں کچہری چلا گیا ایک بیرسٹر انگریز تھا' وہ ایک گنوار سے کہتا ہے کہ تم اس کا مطبل سمجھا (یعنی مطلب سمجھا) چونکہ دیہاتی لوگ مطلب کو مطبل کہتے ہیں اس لیے بیرسٹر بھی مطبل ہی کہہ رہا تھا تو ہمیشہ کلام میں مخاطب کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ سمجھتا بھی ہے یا نہیں تو اس طرح اگر کسی پر معقول کے غلبہ سے اضافیات و حقیقیات کی تخلیق کا غلبہ ہو تو وہ مریض سے درد کی کی کو سن کر کہے گا کہ میاں درد میں کیسی کمی ہے کمی بیشی تو امور اضافیہ میں سے ہے اس کی تعین کیجئے کیونکہ ہر درد کا ہر درجہ مافوق کے اعتبار سے کم اور ماتحت کے لحاظ سے زیادہ ہے مگر ساری دنیا اسے احمق کہے گی۔

چنانچہ ایک طالب علم ایک تیلی کے ہاں تیل لینے کے لیے گئے اس کا بیل چل رہا تھا اور اس کے گلے میں ایک گھنٹی پڑی ہوئی تھی آپ نے تیلی سے پوچھا کہ یہ گھنٹی کیوں ڈالی ہے اس نے کہا ہم غریب آدمی ہیں دس کام میں اگر ہوتے ہیں بس گھنٹی گلے میں ڈال دی ہے جہاں گھنٹی کی آواز رکی معلوم ہو گیا کہ بیل کھڑا ہے آ کر ایک؟؟ مدد دیا جائے' طالب علم نے کہا یہ تو کچھ دلیل چلنے کی نہیں ممکن ہے کہ وہ ایک ہی جگہ کھڑا سر ہلاتا رہے' اس سے تم کو آواز آتی رہے تیلی نے کہا مہربانی کر کے

آپ یہاں تشریف لے جایئے اگر میرا بیل کہیں یہ سن کر منطقی ہوگیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ دیکھئے یہ خبط منطق کا نتیجہ ہے تیلی کے یہاں سے نکالے گئے اور تیل بھی نہیں ملا۔ الحاصل قرآن تو محاورات وعادات ناس پر وارد ہوا ہے نہ کہ اصطلاحات فنون پر پس جس تخفیف عذاب کی نفی آئی ہے وہ وہ ہے جو معتدبہ مقدار میں پس اگر کسی مسلمان کے حسنات کا فر کو مل گئے اور بہ نسبت دوسرے کافروں کے اس عذاب میں کچھ تفاوت ہو گیا تو اس کو تخفیف مفید نہ کہیں گے اس لیے میرا یہ کہنا صحیح رہا کہ کافر کا حق مارنے سے تمہارا تو ضرر ہو گیا اور اس کو کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس مضمون کو میں نے اس لیے بسط دیا کہ بعض اہل علم اصطلاحات ہی میں کھپ جاتے ہیں اور محاورات کا لحاظ نہیں کرتے اس سے ان کو تفسیر میں مشکلات پیش آتی ہیں اس کے واسطے دو باتوں میں سے ایک بات ہونی چاہیے اول اور اول تو یہ ہے کہ صرف ونحوادب کے بعد فنون عقلیہ پڑھنے سے پہلے ترجمہ قرآن کسی محقق عالم سے پڑھ لے اس وقت مزاج میں سادگی ہوگی سمجھ میں آتا جاوے گا کیونکہ اصطلاحات کا غلبہ اب تک نہیں ہوا اس سادگی کے رسوخ کے بعد پھر اگر فن پڑھنے کے بعد بھی تفسیر پڑھے گا تو غلط نہ ہوگا کیونکہ قرآن پہلے ایک دفعہ پڑھ چکا ہے وہ طبیعت کے اندر راسخ ہو گیا ہے اب اصطلاحیں اس کو نکال نہیں سکتیں کیونکہ ترجمہ پڑھتے وقت ضروری ضروری تفسیر آ چکی ہے اب غلط نہ ہوگا اور اگر اس کا موقع نہ ملے دوسرے درجہ میں تو کم از کم یہ ہو کہ تحصیل علم کے معقول کے ساتھ منقول کا سبق ضرور پڑھتا رہے۔ اس سے غلبہ معقول کا نہیں ہوتا بلکہ تعدیل ہو جاتی ہے بہرحال قرآن محاورہ پر نازل ہوا ہے محاورہ کے موافق کسی کافر کو عذاب خفیف نہیں ہوگا کیونکہ محاورہ میں خفیف وہی ہے جس کی برداشت ہو سکے اور وہاں برداشت نہیں ہوگی۔ اس معنی کو ہلکا کسی کا بھی عذاب نہ ہوگا۔ نیز یہاں دنیا میں تو کسی کو کوئی تکلیف زیادہ دنوں سے ہو تو کچھ دنوں کے بعد ایک عادت سی ہو جاتی ہے اس سے برداشت ہونے لگتی ہے مگر وہاں یہ بھی نہیں ہو سکے گی: "كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا" یعنی وہاں ایک کھال ہی نہ رہے گی بلکہ جہاں ایک گلی معاً دوسری کھال نئی پیدا کر دی جائے گی تاکہ احساس زیادہ ہو ورنہ پہلی کھال جلتے جلتے عادت ہو جاتی پھر تکلیف نہ ہوتی مگر وہاں تو یہ بھی نہیں آگے تبدیل کی وجہ بتلاتے ہیں۔ "لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ" تاکہ عذاب کو چکھیں بلکہ ایک جگہ فرماتے ہیں: "زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ" یعنی عذاب زیادہ ہی ہوتا چلا جائے گا مگر پھر بھی شدید واشد کا فرق ضرور ہوگا۔ گو نفی تخفف مشترک ہو تو کسی مسلمان کی نیکیاں جو کافر کو ملیں گی یہ نہیں کہ وہ عبث اور بیکار ہوں گی نہیں ہر چیز کا ایک اثر ہے ان سے عذاب میں کچھ کمی ہوگی مگر اس

کمی سے وہ خفیف نہ ہوگا لہٰذا نہ اس کا بھلا ہوا نہ اس کا بھلا اور اگر مسلمان کو یہ نیکی ملتی تو نفع ہوتا اس واسطے کہ قیامت میں تین قسم کے لوگ ہوں گے ایک وہ جن کی نیکیاں زیادہ ہوں اور بدی کم ہو وہ تو جنتی ہے اور ایک وہ جن کی نیکی کم اور بدی زیادہ وہ دوزخی ہے۔

اہل اعراف

تیسرے وہ جن کی نیکی اور بدی دونوں برابر ہوں گی وہ اہل اعراف ہیں چنانچہ ابن عباسؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں اہل اعراف وہ ہے کہ "مَنِ اسْتَوَتْ حَسَنَاتُهُ وَسَيِّئَاتُهُ'' (جن کے نیکیاں اور گناہ برابر ہوتے ہیں) چندروز اعراف میں رہ کران کی نجات ہو جائے گی کیونکہ جب بہت سے اہل کار کو نجات ملے گی اور وہ جنت میں داخل ہوں گے تو اہل اعراف کو تو بدرجہ اولیٰ نجات ودخول جنت ہونا چاہیے۔

کفار ذی اخلاق کے اہل اعراف ہونے کی کوئی دلیل نہیں

بعض لوگوں نے بلا دلیل کہہ دیا کہ اعراف میں کفار ذی اخلاق جائیں گے اور ان میں سے نوشیرواں اور رستم اور حاتم کو بھی شمار کرلیا ہے کیونکہ نوشیرواں عادل تھا اور رستم شجاع اور حاتم کی سخاوت کے سب ہی معتقد ہیں مگر یہ سب واہیات ہے اس کی کچھ اصل نہیں ہے رستم میں اول تو جو کچھ کمال ہے صرف شاہ نامہ اس کی دلیل ہے تو سنئے خود ہی شاہ نامہ والے نے اس کا فیصلہ کیا ہے کہتے ہیں کہ

منش کردہ ام رستم پہلواں   وگرنہ یلے بود درسیستاں

(میں نے اس کو رستم پہلوان بنا دیا ورنہ سیستان (رستم کے علاقے کا نام) کے اندر صرف نام کا بہادر تھا (یعنی درحقیقت بہادر نہ تھا)

تو اس کے کمال کی حقیقت اس شعر ہی سے ظاہر ہے کہ رستم کس قدر شجاع تھا' دوسرے شجاعت کا نفع تو عدل وسخاوت کے برابر بھی نہیں اب عدل وسخاوت کو سنو۔ نوشیرواں کی بابت کہا جاتا ہے کہ بڑا عادل تھا تو دیکھنا یہ ہے کہ عدل کہتے کس کو ہیں' عدل کے معنی ہیں حقوق کو حدود پر رکھنا' پھر یہ دیکھو کہ حدود کیا ہیں سو حدود وہ ہیں جن کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے کیونکہ بغیر ان کے بتلائے ہم کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ حدود ہیں یا نہیں تو جو ان حدود سے متجاوز ہوگا وہ عادل نہیں بلکہ ظالم ہے اس کو عادل کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہاں ظلم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ظالم بقصد ظلم دوسرا ظالم بلا قصد ظلم تو اگرچہ نوشیرواں ظالم بقصد ظلم تو نہیں مگر عادل بھی نہیں ہاں یہ کہہ

سکتے ہو کہ نیت سے عادل تھا اور عمل سے ظالم تو نیت سے حقیقت تو نہ بدلی رہی سخاوت حاتم تو اس کے مخالف کوئی روایت اب تک نظر سے نہیں گزری۔

انفاق کے لیے محل کا ہونا ضروری ہے

لیکن یہ دیکھنا چاہیے کہ سخاوت کی حقیقت کیا ہے آیا مطلق انفاق سخاوت ہے یا اس کا کوئی محل بھی ہے اگر اس کے لیے کوئی محل نہیں تو اگر دریا میں کوئی شخص ایک لاکھ روپیہ پھینک دے تو کیا اس کو بھی سخی کہو گے حالانکہ اس کو کوئی سخی نہیں کہتا بلکہ جاہل محض سمجھتے ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ انفاق کے لیے محل کا ہونا ضروری ہے اگر محل میں خرچ ہو تو سخی ہے "والا فلا" اور محل معلوم ہوتا ہے شریعت سے جب اس کو محل ہی معلوم نہ تھا اور شریعت کی اس کو خبر ہی نہ تھی تو وہ سخی کیسے ہوا۔ پس اول تو وہ سخی نہیں اور اگر ہو بھی تو کیا ہوا جب باغی تھا اور باغی کا کوئی کمال کمال نہیں۔ پھر وہ سخاوت کس کام کی دیکھئے۔ اب جو شورش ہوئی تھی اس میں اگر کوئی باغی ہوا اور وہ بہت بڑا تعلیم یافتہ تبحر عالم ہو تو کیا سرکار کے نزدیک اس کے کمال کی کوئی وقعت ہوئی تھی ہرگز نہیں بلکہ اس پر تو اور زیادہ غیض ہوا کہ جان بوجھ کر اس نے بغاوت کی ایسے ہی جو خدا تعالیٰ سے بغاوت کرے اس کا کوئی کمال مقبول نہیں جب تک کہ ایمان نہ ہو پھر وہ دوزخ سے کیوں بچے گا اور جب اس سے نہ بچا پھر اعراف میں کیوں جائے گا بس اعراف میں تو وہی لوگ جائیں گے جن کو دوزخ سے نجات مل چکی ہے اور جنت میں جلدی جانے کا سرمایہ پاس نہیں چنانچہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے جو اوپر مذکور ہوئی اور وہ روایت غر مدرک بالقیاس ہے اس لیے وہ حکم میں مرفوع کے ہے اور اہل اعراف کی مغفرت کی ایک عام دلیل تو اوپر مذکور ہوئی ہے کہ جب اہل نار کی مغفرت ایمان کے سبب ہو جائے گی تو اہل اعراف کی بدرجہ اولیٰ ہوگی۔ دوسری خاص دلیل قرآن کی ایک آیت ہے ایک خاص تفسیر پر وہ یہ ہے: "وَنَادٰٓی اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالاً یَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ الآیة" کہ اہل اعراف پکاریں گے چند لوگوں کو جن کو وہ پہچانتے ہیں۔ ان کے نشان سے اس کے آگے ہے: "اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَاخَوْفٌ عَلَیْکُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ○" ایک تفسیر اس کی یہ ہے کہ "قِیْلَ لَهُمْ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ" کہ اہل اعراف کو کہا جائے گا کہ جنت میں چلے جاؤ تو وہ جنت میں چلے جائیں گے' علماء نے اس تفسیر پر بھی نکیر نہیں کیا تو عدم نکیر (انکار نہ کرنا) سے اجماع ہوگا ان کے دخول جنت پر یہ مضمون مناسبت کے سبب مذکور ہو گیا اس سے پہلے میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر کسی مسلمان کو نیکی ملے تو خیر اپنے ایک بھائی کا تو بھلا ہو گیا ممکن ہے کوئی مسلمان ایسا ہو جس کے

حسنات وسیئات برابر ہوں وہ ایک نیکی تم سے لے کر بہشت میں فوراً چلا جائے گا۔ چنانچہ قیامت میں ایک شخص ایسا بھی آئے گا جس کی نیکی بدی بالکل برابر ہوں گی کہ اگر ایک نیکی مل جائے تو وہ فوراً جنت میں چلا جائے وہ بیچارہ سب کے پاس جائے گا کوئی اسے نیکی نہ دے گا کہ تیرا تو ایک نیکی کی کمی کی وجہ سے یہ حال ہے اور یہاں تو کتنے گناہ کے انبار ہیں ہم پر نہ معلوم کیا کیا مصیبتیں آنے والی ہیں ہم کیونکر نیکی دے دیں' آخر اس کو ایک شخص صاحب درد ملے گا وہ کہے گا کہ میرے پاس کل ایک ہی نیکی ہے اس کو تو ہی لے جا کیونکہ جب تیرا ایک نیکی کے کم ہوجانے سے کام نہیں چلا پھر میرا ایک نیکی سے کیا بھلا ہوگا' اتنے معاصی کے مقابلہ میں لے بھائی اسے تو ہی لے جا' تیرا تو بھلا ہوجائے وہ نیکی لائے گا اور جنت میں چلا جائے گا اس واقعہ میں اس دینے والے کی بھی اس سخاوت کی وجہ سے بخشش ہوجائے گی کیونکہ اس نے بہت بڑی ہمت اور ہمدردی کی تو دیکھو ایک نیکی کے مل جانے سے وہ مسلمان پار ہوگیا' غرض وہاں پر نیکیاں مومنین کے کام آئیں گی' کفار کو کچھ کام نہ دیں گی اس کا یہ مطلب نہیں کہ لہٰذا کفار کے حق دبا لینے کی بجائے مسلمانوں کے ہاں چوری شروع کردو بلکہ مطلب یہ ہے کہ چوری دغا بازی تو مسلمانوں کے مال میں بھی کرنا بہت بری بات ہے مگر کفار کے مال کی اس سے بھی زیادہ برا ہے۔

حقوق کی تین اقسام

مگر آج کل بعض لوگ ریل کا سفر کرتے ہیں اور کرایہ نہیں دیتے مگر خوب سمجھ لو کہ یہ مالی حق ہے بدون ادا کیے معاف نہیں ہوگا بہر حال حقوق العباد کا بہت اہتمام سے لحاظ کرنا چاہیے خواہ کسی قسم کے ہوں کیونکہ ان میں بعض حقوق مالیہ ہیں' بعض بدنیہ ہیں بعض عرضیہ ہیں اب لوگ حقوق مالیہ کی اور کسی درجہ میں بدنیہ کی تو کچھ رعایت کرتے بھی ہیں مگر حقوق عرضیہ کا تو بالکل ہی لحاظ نہیں کرتے اس سے بالکل ہی لاپروائی ہے حتیٰ کہ اس میں مشائخ بھی مبتلا ہیں چنانچہ غیبت سے خواص تک محفوظ نہیں ہیں اور ان کا نفس کسی تاویل کی بناء پر یہ سمجھا دیتا ہے کہ اس میں گناہ ہی نہیں ہوا اور یہ وہی بات ہے جو ایک گاؤں کا آدمی کہتا تھا (یہ گاؤں کے لوگ بڑے ہوشیار ہوتے ہیں) کہتا تھا کہ اگر لکھے پڑھے جھوٹ بولیں تو کہتے ہیں مبالگہ ہے مبالگہ (یعنی مبالغہ ہے مبالغہ) اور اگر ہم اس کام کو کرتے ہیں تو کہتے ہیں لعنت لی لعنت لی (یعنی لعنت اللہ لعنت اللہ) واقعی اگر ہم گناہ بھی کرتے ہیں تو اس پر جھول پھیر کر جیسے وہی تانبے پر سونے کا جھول پھیر کر اسے سونا بنا لیتے ہیں' دیکھنے سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید سونا چاندی ہے مگر آگ یا کسوٹی پر حقیقت کھل جاتی ہے اسی طرح ہم لوگ گناہ کرتے ہیں مگر رنگ

طاعت کا چڑھا کرتا کہ معتقدین نہ بگڑیں چنانچہ وہ غریب دھوکہ میں آ جاتے ہیں اور یہی کہتے ہیں کہ حضرت کوئی گناہ تھوڑا ہی کرتے ہیں، عوام تو اپنے گناہ کو گناہ بھی سمجھتے ہیں مگر خواص کی یہ مصیبت ہے کہ وہ اس کو طاعت بتاتے ہیں ان کا حال اور ابتر ہے۔ جامی خوب فرماتے ہیں:

گناہ آمرز رندان قدح خوار   بطاعت گیر پیراں ریا کار

(رند شراب خور کے گناہوں کو بخشتا ہے اور ریاکاروں کی طاعت کو پکڑتا ہے)

آدمی گناہ کرے اور اپنے کو گناہگار سمجھے یہ اچھا ہے اس سے کہ گناہ کو رنگ عبادت میں ظاہر کرے۔ یہ بہت ہی برا ہے گناہ کو گناہ تو سمجھو۔ الغرض جیسے عوام اس گناہ میں مبتلا ہیں خواص کا بھی یہ ہی مشغلہ ہے کہ جہاں دو آدمی بیٹھے کسی بات کو لے کر گو وہ مباح ہو اب وہ تو ختم ہو گئی پھر غیبت شروع ہو جاتی ہے۔ صاحبو اور بھی تو وعظ و نصیحت کی باتیں ہیں وہ کرو مگر نہیں کرتے کیونکہ لذت اسی میں ہے وعظ و نصیحت میں مزہ کہاں ہے اسی کو میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ زبان کے گناہ میں آج کل کثرت سے مبتلا ہیں کسی کو تو اس میں مزہ آتا ہے اور کوئی اس کو گناہ ہی نہیں سمجھتا۔

زبان چلنے سے کبھی نہیں تھکتی

اور باقی جتنے اعضاء ہیں وہ کبھی نہ کبھی گناہ سے تھک جاتے ہیں مثلاً اگر ہاتھ سے گناہ کے مضامین لکھو کچھ دیر کے بعد لکھتے لکھتے ہاتھ میں درد ہو جائے گا اور رک جائے گا۔ اسی طرح اور اعضاء بھی مگر یہ بے حیا زبان تھکتی ہی نہیں نہ اس میں کوئی بیمار ہوتی ہے، دماغ ہے اگر اس سے زیادہ کام لو درد ہونے لگتا ہے ایسا ہی سارے اعضاء کا حال ہے مگر زبان میں درد بھی نہیں ہوتا۔ وجع اللسان کوئی بیماری نہیں ہے، زبان میں خواہ چھالے پڑ جائیں مگر تکلم میں کمی نہیں آتی اس لیے اس سے کثرت سے گناہ ہوتا ہے غیبت ہی کی کوئی تخصیص نہیں، کذب، کبر و دعویٰ شیخی، چغلی، بہتان، تہمت یہ بھی سب زبان ہی سے ہوتے ہیں، غرض زیادہ فساد اسی سے ہوتا ہے۔

عورتیں زبان کے گناہوں میں بکثرت مبتلا ہیں

خصوص عورتوں کو اس میں بہت ہی ابتلاء ہے کیونکہ مرد تو کبھی کاروبار میں بھی لگ جاتے ہیں کھیت کیار پر چلے جاتے ہیں اور یہ ہر وقت گھر میں رہتی ہیں، محلہ سے بھی نکلنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بس ہر وقت گھر میں بیٹھی ایسے کام کرتی رہتی ہیں کبھی لڑتی بھی رہتی ہیں بعض دفعہ یہ اپنے گھر سے اور وہ اپنے گھر سے گالیاں اور گالیوں کے رسالے سناتے ہیں۔ پھر گالیوں پر کوسنے الگ، خدا کی مار، خدا کی

کاراور جانے کیا کیا الفاظ کہتی ہیں۔ یہ بھی خبر ہے کہ خدا کی مار پھٹکار یہ الفاظ لعنت کے ہیں اور بہت بڑا کلمہ ہے اور لعنت کی وعید اور حال معلوم ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب کسی کو لعنت کی جاتی ہے تو اول تو وہ وہاں پہنچتی ہے جہاں بھیجی گئی ہے اگر وہ اس کا محل ہے تو اس پر پڑتی ہے نہیں تو تمام جگہ ٹکریں کھاتی پھرتی ہے۔ آخر لاعن کے ہی اوپر آتی ہے جیسے جادو کی ہنڈیا روانہ کی تھی اتفاق سے وہ وہاں نہ ہوا تو لوٹ کر جس نے یہ ہنڈیا جادو کی چلائی تھی اسی پر آتی ہے اور وہ ہلاک ہو جاتا ہے اسی طرح لعنت بھی پھر پھرا کر متکلم ہی پر پڑتی ہے اور وہی مردود ہو جاتا ہے اور خاص کر اپنے بچوں کو تو ایسے الفاظ ہرگز نہ کہنے چاہئیں۔ غضب ہے کہ عورتیں اپنی اولاد کو بھی بری طرح کوستی ہیں پھر جب یہ اپنے دوست کے حقوق کو ان الفاظ میں ادا کرتی ہیں تو دشمن کے تو کیوں نہ کریں پھر کیونکر نہ کریں اور کوئی کام بھی تو نہیں سوائے روٹی پکانے کے بس روٹی پا کر بھٹیاریوں کی سی لڑائی شروع کر دیتی ہیں بلکہ اس وقت بھی پکاتی جاتی ہیں اور گالیاں دیتی جاتی ہیں کیونکہ اس کام کے لیے توجہ کی ضرورت نہیں بعض امور تو ایسے ہیں کہ بغیر یکسوئی اور توجہ کے نہیں ہو سکتے مگر اس میں توجہ کی کچھ بھی ضرورت نہیں بلکہ روٹی پکانے میں تو آنکھ کی بھی ضرورت نہیں' کیرانہ میں ایک اندھی عورت کو سنا ہے وہ سوانکھی سے بھی اچھی روٹی پکاتی تھی چونکہ اس کام میں توجہ کی ضرورت نہیں لہٰذا روٹی پکاتے ہوئے دوسرا کام بخوبی ہو سکتا ہے۔ غرض عورتوں میں یہ مرض کثرت سے ہے میں زبان کے گناہوں کی فہرست کہاں تک بیان کروں' زبان کے گناہ بہت ہی کثرت سے ہوتے ہیں اور پھر وہ خفیف بھی سمجھے جاتے ہیں اور ان کے کرنے میں بھی کچھ تکلیف نہیں ہوتی ہے۔ پس وہ وقوع میں کثیر اور اثر میں اسی لیے حدیث میں ہے کہ اکثر لوگ جہنم میں زبان کے گناہ کی بدولت جائیں گے بس تو یہ ثابت ہو گیا کہ زبان کے گناہ کثیر ہیں اور ان کا اثر شدید ہے اب اگر کہو کہ اس کو روکیں کیسے۔

کثرت کلام کا ذکر لسانی سے امالہ:

کیونکہ تجربہ سے کہ زبان روکنے سے چین نہیں آتا بار بار تقاضا ہوتا ہے کہ کچھ بولو کچھ کہو قربان جایئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آپ کتنے بڑے حکیم ہیں آپ کو حقائق پر کس قدر اطلاع ہے ہمارے جذبات اور ملکات سے کس قدر واقف ہیں جانتے ہیں کہ اگر زبان کی روکنے کا حکم کروں گا تو ان سے رکنے کی نہیں لہٰذا اس کی تدبیر فرماتے ہیں: ''لَا یَزَالُ لِسَانُکَ رَطْبًا مِنْ ذِکْرِ اللّٰهِ[1]'' کہ زبان چلتی بھی رہے اور گناہ بھی نہ ہو۔ مزید برآں ثواب بھی لو اس لیے فرمایا: ''لَا یَزَالُ لِسَانُکَ رَطْبًا مِنْ ذِکْرِ اللّٰهِ'' کہ تمہاری زبان خدا کی یاد سے ہمیشہ تر رہے۔ تو

---

[1] (سنن الترمذی: ۳۳۷۵)

دیکھئے اب زبان جاری بھی ہے اور گناہ سے بھی حفاظت ہوگئی۔ تیسرا نفع یہ کہ اس سے قلب میں ایک نور پیدا ہوگا جس کی پہچان یہ ہے کہ پچھلی حالت کو یاد کرنے سے معلوم ہوگا کہ پہلے ہم مردہ تھے اب زندہ ہوگئے چنانچہ جو لوگ اس میں لگے ہوئے ہیں وہ تجربہ کر رہے ہیں اور رات دن دیکھ رہے ہیں کہ فضول باتیں کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلب پر بہت سا زنگ چڑھ گیا بالکل چوپٹ ہوگیا ہے وہ نور اور صفائی ہی نہیں رہی جو بولنے سے پہلے تھی اور اس وقت بے حد قلق ہوتا ہے۔ بہت پچھتاتا ہے کہ کڑھتا ہے ہم نے یہ باتیں کیوں کہیں جیسا مولانا فرماتے ہیں:

بردل سالک ہزاراں غم بود گرز باغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم وارد ہوتے ہیں اگر ذرا برابر بھی اس کے باطنی حالات میں کمی واقع ہوتی ہے)

اللہ اللہ کیا ٹھکانا ہے اس غم کا بعض نے تو اس میں خودکشی تک کرلی ہے اور کسی رہبر نے دستگیری نہ کی اور واقعی اگر دولت مندوں کے ہاں چوری ہو ان کو ضرور قلق ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ دولت کیا چیز ہے اور جس کا یہ حال ہو:

لنگلے زیرو لنگلے بالا نے غم دزد نے غم کالا

(ایک لنگی نیچے ایک لنگی اوپر نہ چور کا کھٹکا نہ مال ومتاع کا غم)

اس کے یہاں چوری ہو تو کیا نہ ہو تو کیا بیچارہ کی دولت ہی کی خبر نہیں ہے اسی طرح جس کو نور نصیب ہوا ہے۔ جس کے قلب میں صفائی ہے وہ ظلم کو جانتا ہے اس کو احساس ہوتا ہے کہ اس گناہ سے کس قدر تاریکی چھا گئی اور جو ظلمت ہی میں رہتا ہے گناہ کے اندر نشوونما پاتا ہے وہ کیا سمجھے اس کو تمیز ہی کیا اسے نور کبھی نصیب ہی نہ ہوا اور ہو کیسے جو ہونے کا طریقہ ہے اس کو کبھی اختیار نہیں کیا نور ہوتا ہے دو چیز سے ایک ذکر سے دوسرے طاعت سے اور اس نے کبھی یہ کام نہیں کیا' پھر نور کیسے پیدا ہو اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ نور صرف ذکر ہی سے ہوتا ہے ان میں طاعت بھی آگئی کیونکہ جو مطیع ہے وہ ذاکر بھی ہے۔ صاحب حصن حصین کا قول ہے "كُلُّ مُطِيعٍ لِلّٰهِ فَهُوَ ذَاكِرٌ" یعنی ذکر جیسے زبان سے ہوتا ہے اور اعضاء سے بھی ہوتا ہے دیکھو محاورہ ہے اگر کوئی روپیہ بانٹتا ہے اور تمہیں نہیں دیا تو کہتے ہو اجی کبھی ہمیں یاد کرلیا کرو یا کسی نے کھانا تقسیم کیا اور تمہیں حصہ نہیں ملا تو کہتے ہو کبھی فقیر کو بھی یاد کرلیا کیجئے' یہاں یاد کرنے کے معنی کیا ہیں' یاد لسان مراد ہے یا ان چیزوں سے حصہ دینا اگر اس کے جواب میں وہ تم سے یہ کہے ہاں بھائی ہم تو تمہیں یاد کرتے ہیں اور اس

کے بعد خدا بخش خدا بخش تین دفعہ کہہ لوتو کیا یہ اس کا جواب ہو گیا' ساری دنیا اس کو بے وقوف کہے گی۔ معلوم ہوا کہ یاد وہ جس کے ساتھ کوئی کام بھی ہوا گر صرف یاد کر لیا اور کام کچھ نہ کیا تو اس یاد سے کیا فائدہ اس کا نتیجہ ہی کیا ہے۔ یاد یہ ہے کہ وہ تم کو بلائے اور روپیہ بھی دے صرف زبانی یاد سے کیا ہوتا ہے جیسے کسی نے کہا تھا کہ گھر یار تمہارا مگر کوٹھری کٹھلے کو ہاتھ نہ لگانا جب کوٹھی کٹھلا اپنے حصہ میں لگا لیا تو پھر رہا کیا جو اس غریب کو دیتے ہو اس طرح ذکر کی بھی صورتیں ہیں' زبان سے بھی ہوتا ہے اور اعضاء سے بھی۔ گو اس حدیث شریف میں بظاہر ذکر لسانی ہی کا بیان ہے: "لَایَزَالُ لِسَانُکَ" اس کی صریح دلیل ہے مگر بصد غور خود اس حدیث میں بھی سب اعضاء کا ذکر مراد ہے کیونکہ آپ نے فرمایا: "لَایَزَالُ لِسَانُکَ رَطْبًا مِنْ ذِکْرِ اللّٰهِ"[1] (تمہاری زبان ہر وقت اللہ کے ذکر سے تر رہے) کہ ہر وقت زبان سے ذکر کو ایک مقدمہ یہ ہوا۔

ذکر اللہ کا دوام بغیر اصلاح اعمال کے ممکن نہیں

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ واللہ دوام ذکر نور افزا بغیر اصلاح اعمال عادۃً نہیں ہوتا یہ تو ممکن ہے کہ ایک دن بیٹھ کر کچھ دیر تک ذکر کر لو مگر دوام ذکر نور بخش بغیر اصلاح کے نہیں ہوتا اور یکسوئی اور ہر وقت کی توجہ جو کہ شرط نورانیت ہے بغیر اصلاح کے نہیں ہوتی کیونکہ اس کی توجہ خدا تعالیٰ کی توجہ سے ہوتی ہے یعنی مذہب جو کہ خدا کے اختیار میں ہے ورنہ توفیق بھی نہیں ہوتی اس کی حقیقت اہل دل ہی خوب سمجھتے ہیں۔ عوارف میں لکھا ہے یہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی کتاب ہے اس میں ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ ایک دن وہ ذکر کرنا چاہتے تھے مگر زبان نہیں اُٹھتی تھی ارادہ بھی تھا شعور بھی تھا مگر زبان نہیں چلتی' بڑے پریشان ہوئے' گریہ وزاری کے ساتھ التجا کی کہ یا اللہ کیا قصور ہوا۔ مطلع فرمائیے تاکہ توبہ استغفار سے اس کا تدارک کروں' الہام ہوا کہ فلاں وقت گستاخی سے ایک بڑا کلمہ کہا تھا آج اس کا خمیازہ بھگت رہے ہو' بہت روئے پیٹے گریہ وزاری کی تب زبان چلی تو حضرت کبھی سالکین کو یہ بھی پیش آتا ہے۔ اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ زبان ہی نہ چلے خیر اگر بالکل بند ہونا سمجھ میں نہ آئے مگر کمی بیشی تو ضرور معلوم ہو سکتی ہے تجربہ کر لو کہ جس دن گناہ ہوتا ہے اس دن عبادت بھی ہو جاتی ہے' وحشت بھی جاری ہو جاتی ہے اور جس دن گناہ سے اجتناب ہوتا ہے اس دن معمولات پورے ہوتے ہیں' جی ابھرتا ہے زبان بھی جاری ہوتی ہے تو ہر وقت ایسا ذکر کرنا بغیر اصلاح کل اعمال کے نہیں ہو سکتا تو اس حدیث میں ادھر بھی اشارہ ہے

---

[1] (سنن الترمذی: ۳۳۷۵)

کہ اپنے اعمال کی اصلاح کرو اور اشارہ کیا بلکہ صراحتہً ہے کیونکہ دوام ذکر موقوف ہے اصلاح اعمال پر اور اصلاح موقوف علیہ ہے اور موقوف بدون موقوف علیہ کے پایا نہیں جاتا اور موقوف کا اس جگہ حکم ہے کہ ایسا ہونا چاہیے "ای لَایَزَالُ لِسَانُکَ رَطْبًا مِنْ ذِکْرِ اللّٰہِ" (تمہاری زبان ہر وقت اللہ کے ذکر سے تر رہے) اور یہ بغیر اصلاح اعمال ہوتا نہیں تو گویا حکم ہے کہ اعمال[1] کی اصلاح کرو پھر دائم الذکر ہو جاؤ گے۔ غرض "لَایَزَالُ لِسَانُکَ رَطْبًا مِنْ ذِکْرِ اللّٰہِ" (تمہاری زبان ہر وقت اللہ کے ذکر سے تر رہے) تحقق ہو نہیں سکتا جب تک معاصی سے اجتناب نہ ہو یہ توقف کی تحقیق تو خاص لوگوں کے واسطے ہے اب عام لوگوں کو کہتا ہوں کہ توقف سے قطع نظر کر کے گناہ سے بچنے کا اہتمام کرو اور اس کی آسانی کے لیے ہر وقت زبان پر خدا کا نام جاری رہے کوئی وقت غفلت سے نہ گزرے پھر اس کی برکت سے گناہ بھی نہیں ہوگا' آسانی کی تحقیق یہ ہے کہ اگر مستقلاً یوں کہا جائے کہ ذکر کے ساتھ زبان بھی چلاتے رہو اور معاصی سے بھی بچتے رہو تو معاصی کہاں تک یاد رہیں گے کہ یہ غیبت ہے یہ جھوٹ ہے یہ حسد ہے یہ بغض ہے یہ ریا ہے یہ سمعہ ہے الی غیر ذلک ان کی فہرست پر ہر وقت کہاں تک یاد رہے گی کہ یہ غیبت ہے اس سے بچنا چاہیے۔ یہ دعویٰ ہے اس سے احتراز لازم ہے ابتداء میں یہ امر بہت مشکل ہے کہ ایک ایک گناہ پر متنبہ فوراً ہو جائے اور اس سے بچ جائے پھر انتہاء میں تو ملکہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا قبل ملکہ پیدا ہونے کے اس وقت تم یہ کر لو کہ اہتمام کے ساتھ ایک کام کو اختیار کرو جس میں کوئی دقت نہیں' معاصی کی فہرست تو کئی مضمون تھے' کذب' سمعہ' حسد' بغض' غیبت وغیرہ ان سب پر ایک دم سے نظر رکھنا مشکل تھا اس لیے تم ایک مضمون لے لو اسی کی برکت سے ان سب باتوں سے حفاظت ہو جائے گی اور وہ ایک مضمون ذکر اللہ ہے خواہ کلمہ ہو خواہ استغفار ہو یا ورد ہو اس کو اپنا اصل کام سمجھو اس کو عارضی کام مت سمجھو اور ظاہر بات ہے کہ اصلی کام میں خلل پڑنے سے بہت ناگواری ہوتی ہے اور جو چیز خلل انداز ہوتی ہے اس سے بہت نفرت ہو جاتی ہے مثلاً تم سینے بیٹھی ہو اب کوئی آن کر کہے کہ روٹی پکا دو تو ناک چڑھاؤ گی اور نہیں اٹھو گی کیونکہ اس وقت اصلی کام سینے کو سمجھی ہوئی ہو حالانکہ دوسرے وقت پانچ پانچ سیر دس دس سیر آٹے کی روٹی شوق سے پکا دیتی ہو اور اس وقت اس سے نفرت ہو رہی ہے تو کیوں اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اصلی کام سینے کو سمجھ لیا ہے اور یہ اس میں مخل ہے لہٰذا اس سے تنفر ہے۔

---

[1] (سنن الترمذی: ۳۳۷۵)

معاصی ذکر اللہ میں مخل ہیں

اسی طرح جب ذکر اللہ کو اپنا اصلی کام سمجھ لوگی تو جو کام اس میں مخل ہوگا اس سے جی گھبرائے گا اور معاصی سب اس میں مخل ہیں اس لیے ان سب سے نفرت ہو جائے گی پھر رفتہ رفتہ فضول مباحات سے بھی نفرت ہونے لگے گی اب تو ہر وقت چق چق کرتی ہو چندے مداومت ذکر کے بعد ملنا جلنا سب برا معلوم ہوگا اگر کوئی آ گیا تو کھوگی جانے یہ کیوں آیا میرے اوقات برباد کرنے کے لیے کہاں سے آیا' روزانہ مثلاً بیس تسبیح پڑھتے تھے اب اس کو آنے سے اٹھارہ ہوئیں تو قلق ہوگا اور ملنے ملانے آنے جانے سے گھبراؤ گی خلوت میں سب سے زیادہ راحت ہوگی۔ اس طرح بہت آسانی سے معاصی سے بچ جاؤ گے اب ایک بات رہ گئی کہ ہر وقت اللہ اللہ کیسے کریں یہ بھی تو یاد نہیں رہتا کہ اب اللہ اللہ کریں' گھنٹوں غفلت میں گزر جاتی ہے اس طرف توجہ بھی نہیں ہوتی کہ میرا ایک کام ذکر تھا تو اس کے یاد رکھنے کی کیا صورت ہے۔

تسبیح کا نام مذکرہ ہے

تجربہ ہے کہ تسبیح ہاتھ میں رکھنے سے لوگ ہنسیں گے جواب یہ ہے کہ لوگ چاہے ہنسیں لیکن تم نہ روؤ گے اب لوگ تم پر ہنسیں گے اور کل قیامت میں تم ان پر ہنسو گے پس ان کو اب ہنسنے دو اور میں پوچھتا ہوں تم کو کہیں سے ہزار روپیہ ملتے ہوں مگر ان کے لینے میں لوگ ہنستے ہوں تو انصاف سے کہو کہ وہاں سے روپے لیتے ہو یا ہنسی کی خیال سے چھوڑ دیتے ہو یقیناً لے لیتے ہو ان کی ہنسی کی کوئی پروا نہیں کرتے آخر وجہ کیا اب ہنسی کی پروا کیوں نہیں۔ بات یہ ہے کہ اس کو اپنے نفع کی چیز سمجھتے ہو اور نفع کی چیز میں کسی کی ہنسی کی پروا نہیں کی جاتی پھر کیا یاد خدا نافع نہیں ہے اگر نافع ہے تو اس کی کیا وجہ کہ روپیہ کے لینے میں ہنسی مانع نہیں ہے اور ذکر خدا میں مانع ہے اور یہ ہنسی جب تک ہے کہ پہلے پہلے کام کر رہے ہو پھر چند روز کے بعد کوئی بھی نہیں ہنستا اور یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ ہنسی کیوں ہوتی ہے اصل میں ہنسی ہوتی ہے غفلت پر غفلت پر کیسے ہوتی ہے یعنی پہلے جو تم کو غفلت تھی وہی سبب اس وقت ہنسنے کا ہے ذکر پر ہنسی نہیں ہوتی بلکہ اس غفلت کو یاد کر کے ہنستے ہیں چنانچہ جو شخص پہلے سے غفلت میں نہ ہو بلکہ فیصلہ سے ذاکر ہو اس پر کوئی نہیں ہنستا تو خدا کے بندے جس بات پر ہنسی ہوئی تھی تم اب پھر اسی میں رہنا چاہتے ہو تسبیح ہاتھ میں لو چند روز کے بعد کوئی نہیں ہنسے گا بلکہ جب یہ معلوم ہو جائے گا کہ اب اس کی غفلت جاتی رہی تو اب ہنسنا کہاں اب تو اس کے پاؤں

چومیں گے لہٰذا سب تسبیحیں بنالو۔ مردوں کے پاس تو اکثر تسبیح ہوتی ہے عورتیں بھی بنالیں اور ہر وقت پڑھتی رہیں ان کو تو اور کوئی کام نہیں سوائے روٹی اور بوٹی کے اور بوٹی بھی مردہ کی کیونکہ غیبت کے بارے میں ''اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا'' (کیا تم میں سے کوئی ایک یہ پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے) آیا ہے تو یہ بوٹی تو چھوڑنے ہی کی چیز ہے رہی روٹی پکالو اور فارغ ہو جاؤ پھر کام ہی کیا ہے بس تسبیح پڑھا کرو اگر لمبی تسبیح بری لگے کہ کون سانپ سا رکھے تو لمبی مت بناؤ' پچاس دانوں کی بنالو بیس کی بنالو یہ کوئی حساب کے لیے تو نہیں ہے صرف یاددہانی کے لیے ہے جبھی تو صوفیاء نے اس کا نام مذکرہ رکھا ہے۔

حکایت حضرت جنید بغدادیؒ

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے کہا اب تو آپ کامل ہو گئے اب آپ کو تسبیح ہاتھ میں رکھنے کی کیا ضرورت ہے اب تو منتہی ہو اور ذکر منتہی کی غذا ہو جاتی ہے۔

خلوت و چلہ برو لازم نماند

اس کو تسبیح رکھنے کی ضرورت نہیں رہتی فرمایا کہ اس ہی نے تو ہم کو خدا تک پہنچایا ہے کیا ایسے رفیق کو اب چھوڑ دیں' غرض تسبیح ہاتھ میں رکھو اگر کوئی کہے ریا ہو گی ہونے دو۔ اسلام میں ریا کیوں نہیں ہوئی نماز روزہ میں کبھی یہ خیال نہ ہوا کہ ریا ہو گی۔ یہ شیطانی وسوسہ ہے ایک دفعہ ایک خیر خواہ اسلام مجھے ملے وہ کہتے تھے کہ میں نے ریل میں نماز اس لیے نہیں پڑھی کہ ہندو ہنسیں گے کہ یہ اونچا نیچا کیسا ہو رہا ہے اس میں سب ہندو ہی تھے۔ واقعی کسی نے سچ کہا ہے:

دوستی بے خرد چوں دشمنی ست حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی ست

(بے عقل کی دوستی دشمنی کی طرح ہے' حق تعالیٰ ایسی خدمت سے غنی ہے)

سبحان اللہ کیا عقل ہے آپ کی کہ اسلام کو ہنسی کا موجب سمجھے۔ مولانا نے ایک باز کا قصہ لکھا ہے کہ ایک بڑھیا کے یہاں ایک شاہی باز آ بیٹھا تھا اس نے پکڑ لیا اس کی لمبی چونچ دیکھ کر کہتی ہے کہ ہائے یہ دانہ کیسے اٹھائے گا کیسے کھائے گا' معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی مربی نہیں۔ بس قینچی لاکر چونچ الگ کر دی پھر کہتی ہے ہائے اس کے ناخن تو اتنے بڑھ گئے اس کی کوئی ماں نہیں جو اس کے ناخن کاٹے ان کی بھی صفائی کر دی تو جیسے اس بوڑھیا کے ہاتھ باز آ گیا تھا ایسے ہی اس وقت ان نامعقولوں کے ہاتھ اسلام آ گیا ہے کوئی ان سے پوچھے کہ اعمال اسلام سے ہندو کیسے ہنستے کیا ان کو خبر نہیں کہ مسلمانوں کے یہاں نماز فرض ہے اور ہنستے بھی تو کیا کسی کے ہنسنے سے اسلام چھوڑ دیں' اگر

ہنسی کی پروا کی باقی تو آج اسلام ہم تک کہاں پہنچتا کیونکہ حضرت کے زمانہ میں کفار اسلام پر ہنستے تھے اور قرآن پر ہنستے تھے: "اِتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلِعِبًا" اس کو کھیل کود بنا رکھا تھا تو کیا ان کے ہنسنے سے صحابہ نے اسلام چھوڑ دیا تھا احکام اسلام پر کفار کا ہنسنا ایک تو کلیتاً آیت مذکورہ میں مذکور ہے۔

حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ

دوسرا ایک جزئیہ حدیث میں ابو محذورہ کا قصہ آیا ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ حنین سے واپس تشریف لا رہے تھے مؤذن نے راستہ میں اذان دی۔ ابو محذورہ اور چند لڑکے اس کی ہنسی اڑانے کے لیے نقل اتارنے لگے اور کانوں میں ہاتھ ڈال کر اذان کہنے لگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان کو پکڑ لاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم سے بلند آواز والا کون ہے سب نے ابو محذورہ کی طرف اشارہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلند آواز سے کہو اللہ اکبر یہ لفظ تو زور سے کہہ دیا کیونکہ وہ لفظ کفار کے عقیدہ کے بھی خلاف نہ تھا جب کلمہ شہادتین پر پہنچے تو پست آواز سے کہا کیونکہ یہ ان کے دین کے خلاف تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر کہو اذان ختم نہ ہونے پائی تھی کہ قلب میں نور ایمان آ گیا پھر وہ مکہ کے مؤذن مقرر ہو گئے۔ یہی قصہ مستدل ہے شوافع کا ترجیع اذان میں اور حنفیہ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ کلمہ شہادت کا مکرر کرنا عارض کی وجہ سے تھا' رہا یہ کہ باقی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ابو محذورہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ترجیع سے کیوں نہیں منع کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں سے سیکھ کر آئے ہیں ہمیں کیا کام بال کی کھال نکالنا' کیا ضرور وہ ان قصوں میں زیادہ نہ پڑتے تھے ان کا تو یہ حال تھا:

زباں تازہ کرد بہ اقرار تو ۔ نینگیختن علت از کار تو

(زبان سے آپ کا ذکر کرنا چاہیے نہ کہ آپ کے کاموں کی علتیں ڈھونڈتے پھرنا)

بہر حال احکام اسلام سے کفار اس طرح ہنستے تھے مگر اس سے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اسلام سے بیزار نہیں ہوئے اور کسی فرض کی ادا کرنے میں ان کی عار دامنگیر نہ ہوئی' کفار قرآن پر ہنستے تھے مگر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ" کیا تمہاری ان زیادتیوں کے سبب ہم قرآن کا اتارنا چھوڑ دیں گے۔ نوری فشاند وسگ بانگ می کند چاند دیکھ کر کتا بھونکتا ہے مگر اس سے چاند چھپتا نہیں تم اپنا کام کرو دوسرے کی ہنسی کو کیوں دیکھتے ہو اگر اپنی بیٹی کا نکاح کسی امیر کے گھر کر دیا اور محلہ والے ہنسیں تو امیر کے پیغام کو کبھی نہیں چھوڑتے کہ اچھا ہم ایک بھیک منگے لنگوٹے بند سے کر دیں گے وجہ یہ کہ اس کو نافع سمجھتا ہے تو کیا

ذکر اللہ اس درجہ میں بھی نفع کی چیز نہیں ہے۔ صاحب کام کیے جاؤ خواہ کوئی ہنسے یا روئے بلکہ تسبیح کو خوب حرکت دے خوب جھنجھائے تا کہ لوگ خوب ہنسیں اگر کوئی کہے کہ مجھے ہنسنے کی تو چنداں پروا نہیں بالقصد ریا کا خیال ہے تو اس کے لیے حضرت حاجی صاحبؒ کا علاج کافی ہے۔

محض خوف ریاء کو مانع عبادت نہ سمجھو

حضرت فرماتے تھے کہ عبادت جیسے ہی ہو کئے جاؤ خواہ ریا ہی سے ہو کیونکہ ریا اول اول ریا ہوتی ہے پھر عادت ہو جاتی ہے اس کے بعد عبادت ہو جاتی ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ ریا کی اجازت ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ محض خوف خدا ریا کو مانع مت سمجھو باقی جب اس کا وقوع ہو دفع کر دو ایک بزرگ کے سامنے ایک شخص نے شکایت کی کہ فلاں جماعت کی فلاں عبادت بے نتیجہ ہی کیا فائدہ ہوا انہوں نے اس کے جواب میں یہ شعر پڑھا:

سودا قمار عشق میں مجنوں سے کوہ کن　　بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز　　اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

خلاصہ یہ ہے کہ نیک کام کرتے رہو جیسے بھی ہو لشٹم پشٹم کیے جاؤ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اول اول انتظام سے نہیں ہوتا جی نہیں لگتا تو اس کی پروا مت کرو جیسے ہو کرو جس دن توفیق ہو کرو یہ خیال نہ کرو کہ کل تو کیا نہیں آج کرنے سے کیا فائدہ ہوگا جیسے بھی بنے کیے جاؤ۔ مولانا فرماتے ہیں:

دوست دارد دوست ایں آشفتگی　　کوشش بیہودہ بہ از خفتگی

(محبوب حقیقی اس آشفتگی کو پسند فرماتے ہیں سعی اگرچہ بے ثمر ہو لیکن تعطل سے بہتر ہے)

کیا اچھی تعلیم ہے کوشش اگرچہ بے انتظامی سے ہو کافی ہے مگر شرط وہی ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں:

اندریں رہ می تراش و می خواش　　تادم آخر دمے غافل مباش

(اس راستہ میں آخر وقت تک تراش وخراش (محنت ومشقت سے فارغ مت رہ تا کہ تیرا آخری سانس آخر وقت تک شاید اللہ کی مہربانی سے کارآمد ہو جائے)

دھن ہونا چاہیے اگرچہ عمل میں کوتاہی ہو جائے ناغہ ہو جائے ہونے دو ممکن نہیں کہ راہ پر نہ آؤ۔ یہ جو دھن ہے ضرور کسی نہ کسی وقت مرکز پر لے آئے گی پھر راہ پر پڑ جاؤ گے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ التزام ہو یا نہ ہو دھن ہونی چاہیے بس آج ہی سے تسبیح بنالو اور اللہ اللہ کرنے لگو۔ غرض یہ سب سے اچھا طریقہ ہے زبان روکنے کا اور اسی طرح دوسری معصیت سے بھی بچے رہو گے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس سے نور بھی پیدا ہوگا چونکہ اس موقع کے لیے اس بیان کی ضرورت تھی اور

یہاں ہی کی کیا خصوصیت ہے یہ مضمون تمام مواقع اور ہر شخص کے لیے مفید ہے اس لیے اس کو مختصر سا بیان کر دیا بلکہ یہ اختصار نافع زیادہ ہے کیونکہ زیادہ مضامین لادنے سے سب برباد ہو جاتے ہیں۔ایک بھی یاد نہیں رہتا جیسے بعض لطائف کی مشق کرنے والوں کی حالت ہے کہ ایک آیا دوسرا گیا اس لیے حاجی صاحب نے فرمایا کہ ایک ہی لطیفہ جو کہ قلب ہے اس کو درست کرلو بقیہ لطائف آپ ہی درست ہو جائیں گے۔جیسا قلب کی نسبت حدیث میں ہے:

اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ[1]

''جب وہ درست ہوگا تمام جسم درست ہو جائے گا۔''

دھن کی ضرورت

بس اس وقت میں نے صرف ایک ہی بات بتلادی کہ زبان سے ہر وقت اللہ اللہ کرو کوئی وقت خالی نہ جائے دل چاہے حاضر ہو یا نہ ہو اور وہ انشاء اللہ حاضر ہی ہوگا مگر دھن ہونی چاہیے اس سے سب کام بن جائیں گے۔جیسا اوپر بیان کیا گیا اور یہ مطلب نہیں کہ ترک معاصی کے لیے ارادہ کی بھی ضرورت نہ رہے گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ عزم خفیف بھی کافی ہو جائے گا اور اس میں قوت آجائے گی۔اب دعا کرو کہ خداوند تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔فقط

اشرف علی (۷ ذیقعدہ سنہ ۱۳۵۱ ہجری)

---

[1] (الصحیح للبخاری ۱: ۲۰)

شرف المکالمہ

یہ وعظ بمقام جامع مسجد تھانہ بھون ۶ جمادی الاخری سنہ ۱۳۳۰ ہجری ارشاد فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَاِقَامَ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءَ الزَّکٰوۃِ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْہِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ط لِیَجْزِیَھُمُ اللّٰہُ اَحْسَنَ مَاعَمِلُوْا وَیَزِیْدَھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ○ (النور آیت نمبر ۳۶)

ترجمہ: ’’یعنی وہ ایسے گھروں میں (جا کر عبادت کرتے ہیں) جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کا ادب کیا جائے اور ان میں اللہ تعالیٰ کی پاکی (نمازوں) کا بیان کرتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے (بالخصوص) نماز پڑھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے نہ خرید غفلت میں میں ڈالنے پاتی ہے اور نہ فروخت (اور) وہ ایسے دن (کی داروگیر) سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں اُلٹ جائیں گی انجام ان لوگوں کا یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا بہت ہی اچھا بدلہ دے گا (یعنی جنت) اور (علاوہ جزاء کے) ان کو اپنے فضل سے اور بھی زیادہ دے گا اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بیشمار دیتے ہیں۔‘‘

خسران اور حرمان دونوں قابل قلق ہیں

یہ ایک بڑی آیت ہے جس میں قلق کا ایک جزو خاص مجھ کو اس وقت بیان کرنا مقصود ہے اور وہ مضمون نہ کسی دوسرے مضمون کا متمم ہے اور نہ کسی کا توطیہ و تمہید ہے بلکہ ایک مستقل مضمون ہے۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ ان آیات میں حق تعالیٰ نے ایک بہت بڑی ایسی نعمت کا ذکر فرمایا ہے کہ اس کی طرف ہم کو بالکل التفات نہیں ہے اور وہ نعمت کم وبیش سب کو حاصل ہے زیادہ بعید وعجیب وافسوسناک امر یہ ہے کہ ایک نعمت حاصل ہو اور اس کے حصول تک کی اطلاع نہ ہو اس لیے کہ جب اطلاع نہ ہوگی تو اس کے حقوق کی طرف التفات نہ ہوگا اور اس کا شکر نہ کیا جائے گا اور جب شکر نہ کیا جائے گا تو یہ کفران نعمت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِىْ لَشَدِيْدٌ" (اگر تم شکر کرو گے تو تم کو زیادہ نعمت دوں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو (یادرکھو) میرا عذاب بڑا سخت ہے) كَفَرْتُمْ کو شَكَرْتُمْ کے مقابلہ میں فرمایا ہے کہ كَفَرْتُمْ سے مراد لم تشكروا (تم شکرادانہ کرو) شکر پر وعدہ مزید ہے اور ان کفران کی وعید ہے خواہ وہ عاجل ہو یا آجل عاجل یہ ہے کہ وہ نعمت سلب ہوجائے۔ یعنی کم از کم اس کی برکت وحلاوت برباد ہوجائے اور آجل آخرت کا عذاب ہے گو یہاں ایک احتمال عقلی اور بھی ہے وہ یہ کہ حصر نہ ہو بلکہ شکر اور کفران میں واسطہ نکلے۔

وہ یہ کہ کوئی حالت ایسی بھی ہو نہ شکر ہو نہ کفر ہو لیکن یہ خلاف اصل ہے دوسرے اگر تسلیم بھی کیا جائے کہ واسطہ ہے اور اس پر وعید نہیں ہے لیکن حالت شکر کے مضاد تو ضرور ہوگی اور جب شکر کے مضاد ہوئی تو گو خسران کا ترتب اس پر نہ ہو لیکن حرمان تو ضرور ہوگا حرمان کیا قابل قلق وافسوس نہیں ہے۔ضرور ہے اس واسطے کہ جس طرح یہ بات قابل حسرت ہے کہ ذخیرہ ہو اور اُلٹ جائے اسی طرح یہ بھی افسوسناک حالت ہے کہ اصل ہی سے سرمایہ نہ ہو اور اس کا افسوسناک ہونا اس وقت ظاہر ہو۔ جب اجر کے انبار دوسروں کو ملتے ہوئے نظر آئیں گے اور منہ تکے گا جیسے ایک بازار ہو اور اس میں رنگا رنگ اور انواع وانواع کی اشیاء بیش قیمت موجود ہوں جو شخص تہی دست ہے اس کو بجز حسرت وافسوس کے کیا ہاتھ آئے گا۔

کہ بازار چندانکہ آگندہ تر　　تہی دست رادل پراگندہ تر

(جس طرح بازار طرح طرح کی چیزوں سے بھرا ہوگا اسی قدر تنگدست شخص کا دل زیادہ پریشان ہوگا)

غرض خسران ہو یا حرمان دونوں قابل قلق ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ ہر نعمت کی حقیقت کو سمجھا جائے تا کہ اس کی حقوق پر اطلاع ہو۔ قبل اس کے کہ میں بیان کروں کہ وہ نعمت کیا ہے اس کی مثال عرض کردوں تا کہ یہ معلوم ہوجائے کہ وہ نعمت کس درجہ قابل قدر ہے اس لیے کہ ایک دم اس کا نام لینے سے بغیر اس کے کہ مثال سے اس کی توضیع نہ ہو اس کی بے قدری ہوگی اور

وجہ بے قدر ہونے کی یہ ہے کہ ہزاروں مرتبہ آپ کے کان میں اس کا نام پڑا ہوگا لیکن چونکہ اس کی حقیقت سے آگاہی نہیں اور پورا متنبہ اس کی ماہیت پر نہیں اس لیے اس کی عظمت قلب میں اس درجہ کی نہیں کہ جیسی ہونا چاہیے اس لیے پہلے ایک مثال عرض کرتا ہوں اس سے آپ کو اس نعمت کا موازنہ ہوگا کہ کس درجہ عظیم القدر ہے۔

حق تعالیٰ شانہ کی عظمت میں کوئی شریک نہیں

آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں جو بڑے حکام ہیں ان کے برتاؤ آپ کے ساتھ کیا ہیں اگر آپ کو ان سے کچھ کہنا ہوتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ آپ ان سے بلاواسطہ ہم کلام ہوں بلکہ بواسطہ خانساماں یا اردلی یا کسی مصاحب کے عرضی پیش کی جاتی ہے اور اس عرضی کے بھی شرائط وضوابط ہیں اگر ایک شرط بھی فوت ہو جائے تو وہ عرضی پیش نہیں ہو سکتی' ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ بلاواسطہ گفتگو ہو اگر ہوتا بھی ہے تو اعلیٰ طبقے کے لوگوں کو گا ہے ایسا موقع مل جاتا ہے اور وجہ بلاواسطہ ہم کلام نہ ہونے کی حکام کی عظمت ہے اور ظاہر ہے کہ عظمت کے مراتب مختلف ہوتے ہیں جس درجے کی عظمت ہوتی ہے اسی درجے میں ہمکلامی دشوار ہوتی ہے سرشتہ دار سے بات کر لینا آسان ہے اور کلکٹر سے اس کی نسبت مشکل اور کلکٹر سے زیادہ صعب گورنر سے ہے اور گورنر سے زیادہ وائسرائے ہے اور وائسرائے سے بڑھ کر بادشاہ سے غرض عظمت کے تفاوت سے مکالمہ میں بھی فرق ہوتا چلا گیا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ وجہ اس دشواری کی عظمت ہے اب آپ اپنی نظر کو اور وسعت دیجئے اور غور فرمائیے کہ حق تعالیٰ شانہ سے زیادہ کسی کی عظمت نہیں اور نہ ہو سکتی ہے۔ محال ہے کہ کوئی حق تعالیٰ کی برابر عظمت رکھتا ہو اس لیے کہ اگر کوئی ایسا ہو تو وہ اس کا شریک ہوگا اور شرکت محال ہے پس عظمت حق تعالیٰ کی سب سے زیادہ ہوئی اور عظمت میں کوئی اس کا شریک نہیں بلکہ شرکت تو درکنار اس کی عظمت سے تدانی وتقارب بھی کسی کو نہیں اس لیے کہ خدا تعالیٰ کی عظمت غیر متناہی ہے اور دوسروں کی عظمت متناہی تو متناہی سے تقارب کیسے ہو سکتا ہے اور ابھی ثابت ہو چکا ہے کہ حکام دنیا سے ہمکلامی کا دشوار ہونا عظمت کے تفاوت سے ہے لیکن چونکہ عوام اور حکام میں عظمت کا تفاوت زیادہ ہے اور خواص اور حکام میں کم ہے اس لیے عوام کو بہت شاذ و نادر اور خواص کو کسی وقت بلاواسطہ ہم کلامی میسر ہو بھی جاتی ہے اور حق تعالیٰ کی عظمت چونکہ غیر متناہی ہے اس لیے اس کے ساتھ کسی مخلوق کی عظمت کو کوئی نسبت نہیں کہ ہم کلامی ہو سکے۔ پس اس عظمت غیر متناہیہ کا مقتضا یہ تھا کہ حق تعالیٰ سے ہم کلامی کی کسی کو اجازت نہیں ہوتی نہ کسی نبی کو

نہ فرشتے کو شاید آپ کو یہ خیال ہو کہ بلاواسطہ ہم کلامی نہ ہوتی تو بواسطہ تو ہوسکتی تھی جیسے حکام دنیا سے عوام کو بواسطہ خواص ہوسکتی ہے تو یہ خیال صحیح نہیں اس لیے کہ واسطہ وہ بن سکتا تھا جس کو بلاواسطہ کلام کرنے کی اجازت ہوتی لیکن ابھی ثابت ہو چکا ہے کہ حق تعالیٰ کی عظمت غیر متناہی ہے اس لیے کوئی واسطہ ایسا نکلنا محال ہے کہ اس کی عظمت کو کوئی نسبت حق تعالیٰ کی عظمت کے ساتھ ہو پس اس سے یہ لازم آتا ہے کہ کوئی شخص بھی ہم کلامی سے مشرف نہ ہوتا۔

محبّ اپنے محبوب سے ہم کلام ہونے اور دیکھنے کے لیے تڑپتا ہے

صاحبو! اگر خدا تعالیٰ اسی کے موافق برتاؤ فرماتے تو کیا آپ کو ہم کلام ہونے کی اجازت نہ ہوتی اور جب نہ ہوتی تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا ہوتا کوئی خشک مغز کہہ سکتا ہے کہ کچھ بھی نہ ہوتا اس لیے مجھے اس کی ضرورت ہے کہ یہ بیان کروں کہ نہ ہونے سے کیا جان پر بنتی اور وہ مقدموں پر مبنی ہے۔ اول یہ ہے کہ دنیا میں دیکھ لیجئے کہ جب کسی کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کے دیکھنے اور ہم کلام ہونے کے لیے اپنے جان و مال، آبرو سب کچھ برباد کر دیتا اور کچھ پروا نہیں ہوتی تو اگر وہ محبوب یہ کہہ دے کہ خبردار! ہم سے مت بولنا تو اس وقت دیکھ لیجئے کہ عاشق پر کیا گزرے گی کسی وقت اس کو چین نہ آئے گا اور یہ چاہے گا کہ بلاواسطہ ہم کلامی نصیب نہ ہو تو بواسطہ ہی ہو جائے کوئی خط ہی پہنچا دے کوئی پیغام ہی اس کو جا کر سنا دے۔ اس سے ثابت ہوا کہ محبّ کو اپنے محبوب سے ہم کلامی کی تمنا ہوتی ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ یہ سمجھئے کہ ہر شخص کو خصوص مومن کو حق تعالیٰ کے ساتھ محبت ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" یعنی جو لوگ مومن ہیں وہ اللہ کی محبت میں بہت سخت ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ کفار کو تو نہیں ہے ورنہ وہ کفر نہ کرتے۔ اگر غور کیا جائے تو ان کو بھی ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ٥" (یعنی بیشک اس دن (قیامت کے دن) وہ کفار اپنے رب سے حجاب میں ہوں گے) اس آیت کے اشارے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بھی محبت ہے ورنہ یہ وعید ان کو کیوں سنائی جاتی یہ تو دلیل نقلی ہے محبت کی اور واقعات میں اگر غور کیا جائے تو بہت واضح ہے کہ ہر شخص کو اپنے خالق سے تعلق جبی ہے۔ دیکھو! جس وقت آدمی سب کاموں سے فارغ ہوتا ہے اس کو ایک توجہ اپنے مولیٰ کی طرف ہوتی ہے اور اگر یہ سمجھ میں نہ آئے تو یوں سمجھئے کہ ہر شخص کو کسی نہ کسی شے سے یا آدمی سے محبت ہے کسی کو عورت سے کسی کو اولاد سے کسی کو باغ سے کسی کو جانوروں سے اور یہ ظاہر ہے کہ منشاء محبت کا یہ اشیاء من حیث ہی نہیں ہیں بلکہ محبوب ان کا کوئی وصف ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کو حسن

محبوب ہے کسی کو علم کی وجہ سے محبت ہے کسی کو محسن ہونے کی وجہ سے محبت ہے۔ اس کے بعد سمجھئے کہ تمام کمالات حق تعالیٰ کے لیے بالذات ثابت ہیں اور مخلوق کے لیے بالعرض جو کمال جس کے اندر ہے حق تعالیٰ کی ذات پاک اس کے لیے واسطہ فی الاثبات جیسے کسی نے کہا:

چہ باشد آں نگار کہ بندد ایں نگارہا

(وہ محبوب کس قدر حسین ہوگا جس نے ایسی اعلیٰ درجہ کی حسین صورتیں بنائی ہیں)

اور بعض کے کلام سے واسطہ فی العروض بھی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردہ　　　پس بہ چشم عاشقاں خود را تماشا کردہ

(اپنے حسن کو محبوبان دنیا کے ذریعہ آشکارا کر کے تو نے عاشقوں کی آنکھ سے خود ہی اس کا نظارہ کیا ہے یعنی حقیقتاً حسن اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے محبوبان دنیا مظہر ہیں)

جملہ کمالات حق تعالیٰ شانہ کیلئے بالذات ثابت ہیں

حدیث شریف میں ہے: "اِنَّ اللّٰہ جَمِیْلٌ وَیُحِبُّ الْجَمَالَ"[1] (بیشک اللہ تعالیٰ جمیل ہیں اور جمال ہی کو پسند فرماتے ہیں) علیٰ ہذا جس قدر کمالات ہیں وہ بالذات حق تعالیٰ کیلئے ثابت ہیں چنانچہ بہت سے کمالات نو دو نہ اسماء میں ہیں وہ سب بالذات حق تعالیٰ کے لیے ثابت ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ جس کو جس سے کسی کمال کی وجہ سے محبت ہے تو حقیقت میں اس کا محبوب وہ کمال ہے اور وہ کمال بالذات حق تعالیٰ کے لیے ہے۔ پس اس کا محبوب حقیقی حق تعالیٰ ہوا مثلاً کسی سے جمال کی وجہ سے محبت ہے تو اس کا محبوب حقیقی جمال ہے خود وہ شخص من حیث ہو ہی نہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے آفتاب طلوع ہوا اور اس کی شعاعیں دیوار پر واقع ہوئیں تو کوئی شخص دیوار کے منور ہونے کی وجہ سے اس کا عاشق ہو کر اس کو تکنے لگے تو واقع میں دیوار کا محب نہیں ہے بلکہ آفتاب اس کا محبوب ہے اور یہ اس کی غلطی ہے کہ دیوار کو مقصود اپنا سمجھتا ہے۔

عشق بامردہ نباشد پائدار　　　عشق را باحی وبا قیوم دار

(مرنے والے کے ساتھ عشق نہیں ہے اس لیے حی و قیوم کا عشق اختیار کرو جو ہمیشہ باقی ہے)

عشق ہائے کز پئے رنگے بود　　　عشق نبود عاقبت ننگے بود

(جو عشق و محبت محض رنگ و روپ پر ہوتا۔ ہے وہ واقع میں عشق نہیں بلکہ وہ انجام اور عاقبت کی بربادی ہوتا ہے)

---

[1] (مشکوۃ المصابیح: ۵۱۰۸)

عاشقی بامردگان پائندہ نیست زانکہ مردہ سوی ما آئندہ نیست
(مردوں کے عشق کو بقاء نہیں ہے اس لیے کہ وہ مردہ پھر ہمارے پاس آنے والا نہیں ہے)
غرق عشقی شو کہ غرق است اندریں عشقہائے اولیں و آخریں
(عشق حقیقی میں غرق ہو جاؤ کہ اس میں اولیں و آخریں کا عشق انجام کو پہنچا)

غرض جس قدر صفات و کمالات ایسے ہیں کہ جن سے محبت ہوتی ہے وہ سب حقیقتاً حق تعالیٰ کے لیے ہیں پس حق تعالیٰ ہی سب کے محبوب ہوئے اور جب محبوب ہوئے تو اپنے محبوب سے ہم کلامی کی ہر ایک کو تمنا ہوتی ہے۔ پس ان مقدمات سے ثابت ہوا کہ اگر حق تعالیٰ سے ہم کلامی نہ ہوتی تو سخت حسرت و افسوس ہوتا بلکہ بہت سے تو اس کو سن کر اپنی جانیں تلف کر دیتے اور چونکہ عظمت اور محبوبیت دونوں حق تعالیٰ کے اندر غیر متناہی ہیں اس لیے اول کا مقتضی تو یہ تھا کہ ہم کلامی صرف ممتنع ہی نہیں بلکہ ہم کلامی کا قصد بھی جرم ہوتا اور ثانی کا مقتضی یہ تھا کہ ایسا ہوتا تو بندوں کی پوری ہلاکت تھی۔ صاحبو! نہایت غور کا مقام ہے کہ اگر مقتضائے قیاس و عقل کے موافق ہمارے ساتھ برتاؤ ہوتا تو ہمارا ٹھکانا تھا۔ پس یہ معاملہ ہمارے ساتھ نہیں فرمایا بلکہ ہمارے ضعف و عجز و ذلت و ہیچ اور بے بس و بے کس ہونے پر نظر فرمائی اور وہ بھی اس طور سے کہ ہماری طرف سے کوئی خواہش نہیں ہوئی اس لیے کہ ہمارا تو اس وقت وجود بھی نہ تھا' معدوم محض تھے اپنی وسعت علم سے یہ نظر اور رحمت ہوئی ہے۔

مانبودیم و تقاضا مانبود لطف تو ناگفتہ مامی شنود
(یعنی ہم پہلے بالکل نہ تھے نہ ہمارا تقاضا و سوال تھا مگر آپ کا لطف ہماری ان کہی باتیں سنتا تھا)

سبقت رحمتی علی غضبی کی عجیب مثال

خود رحمت ہی ہماری شفیع ہوئی کہ عدم تحمل و ضبط و ضعف و بے صبری ملحوظ رکھ کر اس کے موافق معاملہ فرمایا اور اپنی عظمت کے مانع ہونے کا لحاظ نہیں فرمایا۔ اسی واسطے تو حدیث شریف میں آیا ہے: ''سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ''[1] (میری رحمت میرے غضب سے بڑھ گئی) اس کی مثال بلاتشبیہ ایسی ہے جیسا ایک شخص بڑا فصیح و بلیغ ہو اور وہ کسی گنوار کے ساتھ ہم کلام ہوتا ہے اور اپنے درجہ فصاحت سے گزر کر اور متنزل ہو کر اس سے اسی زبان میں گفتگو کرتا ہے یا جیسے بڑا آدمی بچہ سے توتلا بن کر بات کرتا ہے اس لیے کہ مخاطب نہایت کم درجہ کا ہے جیسے میرٹھ میں میں نے

[1] (مسند الحمیدی: ۱۱۲۶)

ایک انگریز وکیل کو ایک گنوار سے کہتے سنا کہ تیرا یہی مطبل (مطلب) ہے اس لیے کہ اگر وہ اپنے درجے پر رہ کر اپنی استعداد کے موافق کلام کرے تو کسی شخص کی سمجھ میں نہ آئے۔ تفضل حسین خان ایک زمیندار تھے' لغت بہت بولتے تھے' گاؤں والے ایک مرتبہ ان کے پاس آئے تو آپ ان سے کہتے ہیں امسال تمہاری کشت زار گندم پر تقاطر امطار ہوا یا نہیں' گاؤں والے آپس میں کہنے لگے کہ اس وقت چلو میاں قرآن پڑھ رہے ہیں اور بلاتشبیہ میں نے اس لیے کہا کہ یہاں تو بڑے لوگوں کی چھوٹوں سے اغراض بھی وابستہ ہوتی ہیں اس لیے اگر وہ ایسا کریں گے تو خود اپنا بھی نقصان ہے بخلاف خداوندی تعالیٰ شانہ کے کہ اگر وہ اپنی عظمت کے موافق بھی ہمارے ساتھ معاملہ فرماتے تو عین عدل تھا اور ان کا کچھ نقصان نہ تھا اس لیے کہ وہ غنی بالذات ہیں مخلوق کی ان کو کسی درجے میں بھی احتیاج نہیں ہے' باوجود اس کے اپنی علو شان کے موافق برتاؤ نہیں فرمایا بلکہ ہم کو اپنی ہم کلامی کی اجازت دے دی اور پھر رحمت پر رحمت یہ ہے کہ کسی زبان کی قید نہیں رکھی بلکہ جو زبان جس کی ہو اسی زبان میں اپنی درخواست پیش کر سکتے ہیں۔

ہندیاں را اصطلاح ہند مدح　　　سندیاں را اصطلاح سند مدح

(ہندوستانیوں کی مدح وثناء ہند کے اصطلاح ومحاورہ میں ہے اور سند والوں کی مدح وثناء سند کے اصطلاح ومحاورہ کے موافق ہے)

ہر کسے را سیرتے بنہادہ ایم　　　ہر یکے را اصطلاحے دادہ ایم

(ہر شخص کی خو بو ہم نے جدا رکھی ہے اور ہر ایک کو ایک اصطلاح وزبان ہم نے عنایت فرمائی ہے)

حق تعالیٰ شانہ کی وسعت رحمت

دنیا میں دیکھئے کہ چھوٹے چھوٹے حکام کے یہاں بجز حضور اور سرکار کے کوئی بات نہیں کر سکتا بلکہ اب تو بعض حکام بجز انگریزی کے کسی زبان میں نہ بات کرتے ہیں نہ عرضی لیتے ہیں اور وہاں یہ ہے کہ نہ زبان کی قید ہے اور نہ الفاظ خاصہ والقاب وآداب کی ضرورت ہے صرف اے اللہ اے رب کافی ہے پس یہ خداوند تعالیٰ کی وسعت رحمت ہے کہ ہر شخص اپنی اصطلاح کے موافق ان سے ہم کلام ہو سکتا ہے ورنہ قانونی الفاظ تو بہت نپے تلے ہوتے ہیں اور یہ زبان کی قید نہ ہونا وہاں سے جہاں ہم کلامی ہی محض مقصود ہو اور اپنی درخواست کا پیش کرنا منظور ہو اس کے لیے کسی خاص اصطلاح ولسان کی ضرورت نہیں بخلاف نماز واسماء توفیقیہ کے اس میں اذکار معینہ کی قید لازم ہے باقی جہاں محض ذکر ودعاء ہو وہاں کوئی روک ٹوک نہیں خواہ عربی ہو یا فارسی ہو' انگریزی اردو سب برابر ہیں اور نماز میں گو زبان کی قید ہے

لیکن اس میں بھی یہ وسعت ہے کہ جب تک وہ نہ آئے اور کچھ سبحان اللہ وغیرہ پڑھتے رہو اگر یہ بھی نہ آئے تو ساکت کھڑے رہو اور اگر آ جائے تو لب و لہجے کی تخصیص نہیں ہے جس طرح جس کو آ سکتا ہو پڑھے' یہ شرط نہیں ہے کہ عرب کا لہجہ ہو یا مصری لہجہ ہو۔ ابوداؤد میں حدیث ہے کہ کچھ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جن میں آدھے عربی عجمی تھے قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور فرمایا "اِقْرَاءُ وَاَفْکُلٌّ حَسَنٌ"[1] (پڑھتے رہو سب ٹھیک ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب ایک درجے میں نہیں پڑھتے تھے اس لیے کہ ان میں عجمی بھی تھے اور وہ سب کے سب مجود نہ تھے تو آپ نے اس لیے یہ فرمایا تا کہ یہ لوگ شکستہ دل نہ ہوں کہ ہم قرآن اچھا نہیں جانتے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ

ماٰبروں رانگریم و قال را   مادروں رابنگریم و حال را

(یعنی ہم ظاہر اور قال کو نہیں دیکھتے بلکہ باطن اور حال کو دیکھتے ہیں)

ناظر قلبیم اگر خاشع بود   گرچہ گفت لفظ ناخاضع بود

(ہم قلب کے دیکھنے والے ہیں اگر فروتنی و عاجزی کرنے والا ہوئے' اگر چہ لفظ خاضع یعنی عاجزی و فروتنی کرنے والا نہ ہو یعنی قلب کا اعتبار ہے الفاظ کا اعتبار نہیں)

بر اشہد تو خندہ زند اسہد بلال

(یعنی تمہاری اشھد ان لا الہ الا اللہ پر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اشہدان لا الہ الا اللہ کو خندہ آتا ہے کیونکہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ خشوع و خضوع سے کہتے تھے اور تمہارے الفاظ ہی الفاظ ہیں)

حکایت حضرت حبیب عجمیؒ

حضرت حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اُدھر سے گزر ہوا' دیکھا تو ان کے الفاظ درست نہیں ہیں اس لیے ان کی اقتداء نہ کی' خواب میں حق تعالیٰ کو دیکھا تو پوچھا کہ اے اللہ بہترین اعمال کیا ہے حکم ہوا کہ حبیب عجمی کے پیچھے پڑھنا اس سے معلوم ہوا کہ اصل شے اخلاص ہے' کوئی یہ نہ کہے کہ فقہاء نے تو یہ لکھا ہے کہ "اَوْلٰھُمْ بِالْاِمَامَۃِ اَقْرَاءُ ھُمْ" کہ اولیٰ امامت کے لیے وہ ہے جو اقرء ہو بات یہ ہے کہ یہاں اقتداء اور امامت کی بحث نہیں ہے کیونکہ وہ پہلے سے کھڑے پڑھ رہے تھے اس حکایت کی غرض یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کے یہاں وہ عمل مقبول ہے جو دل سے ہو البتہ حروف کی تصحیح بے شک واجبات سے ہے سو ان کی اقتداء جائز ہو گی تو مطلب یہ نہیں کہ حرفوں کو بھی صحیح نہ کرے لیکن شکایت تو اس کی

---

[1] (سنن ابی داؤد: ۸۳۰)

ہے کہ اصلاح قلب کو لوگوں نے بالکل ہی پس پشت ڈال دیا ہے اس کی طرف مطلق التفات نہیں ہے حالانکہ مدار قلب پر ہے بہت سے اللہ کے بندے ایسے ہیں کہ ظاہری حالت انکی اچھی نہیں ہوتی ہے لیکن چونکہ قلوب ان کے اللہ تعالیٰ کی محبت سے پر ہیں اس لیے وہ مقبول ہیں اور بہت سے ایسے ہیں کہ ظاہران کا بہت اچھا ہے لیکن قلب میں چونکہ حب دنیا ہے اس لیے مطرود ہیں۔

اصلاح کا زیادہ مدار قلب پر ہے

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کو صرف اپنے اعمال ظاہرہ پر نظر کر کے اس کی بناء پر اپنی حالت کو دوسرے سے اچھی نہ سمجھنا چاہیے اس لیے کہ زیادہ مدار قلب پر ہے اور قلب کا حال اکثر خود کو بھی معلوم نہیں ہوتا تو اپنے کو کیسے اچھا سمجھ لے اسی طرح دوسرے کے قلب کا حال معلوم نہیں تو اس کو کیسے برا سمجھ لے۔ مثنوی شریف میں شبان موسیٰ کی حکایت اس کی شاہد ہے کہ بظاہر وہ کلمات بے ادبی کہہ رہا تھا لیکن چونکہ دل سے اور محبت سے کہتا تھا اس لیے موسیٰ علیہ السلام سے بوجہ ان کو روک دینے کے پرسش ہوئی اور ارشاد ہوا کہ

ہندیاں را اصطلاح ہند مدح سندیاں را اصطلاح سند مدح

(ہندیوں کے لیے ہند کی اصطلاح مدح ہے اور سندیوں کے لیے سند کی اصطلاح مدح ہے)

حق تعالیٰ شانہ کی حمد وثناء کا کوئی حق ادا نہیں کر سکتا

اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ ہم جو ادب کے ساتھ تسبیح و تقدیس کرتے ہیں واقع میں ان کی شان کے لائق وہ بھی نہیں کیونکہ ہماری تسبیح سے اس کی ذات عالی کہیں زیادہ ہے۔ مولانا نے اس کی عجیب مثال بیان فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں:

شاہ را گوید کسی جولاہہ نیست ایں نہ مدح اوست مگر آگاہ نیست

یعنی اگر بادشاہ کو کوئی کہے کہ وہ جولاہہ نہیں ہے تو یہ مدح نہیں ہے لیکن چونکہ اس شخص کو بادشاہ کے علو مرتبہ کی خبر نہیں تو اپنے نزدیک اس نے مدح کی ہے مگر واقع میں ذم ہے۔ پس یہی حالت ہمارے تنزیہ کی ہے کہ وہ ان کے اظہار عظمت کے لیے کافی نہیں حتیٰ کہ سید الحامدین فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام پر فرماتے ہیں: "لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ"[1] (یعنی میں تیری تعریف نہیں کر سکتا تو اسی تعریف کے لائق ہے جو تو نے اپنی ذات کے لیے کی ہے) وجہ یہ ہے کہ ہم ممکن ہیں اور ممکن سے واجب کے کمالات کا احاطہ نہیں ہو سکتا ہے خوب کہا ہے:

---

[1] (مسند احمد ۶: ۵۸)

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں!

(عنقا کسی سے شکار نہیں ہوتا جال کو سمیٹ لو)

حتیٰ کہ قیامت کے دن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت کریں گے تو فرماتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کی حمد ایسے الفاظ سے کروں گا کہ اس وقت وہ الفاظ میرے ذہن میں نہیں ہیں۔

ای برادر بے نہایت در گہیست ہرچہ بروی میرسی بروی مایست

(اے بھائی بے نہایت درگاہ جس درجہ پر پہنچو اس پر مت ٹھہرو بلکہ آگے کو ترقی کرو)

کسی نے خوب کہا:

كُلُّ مَاخَطَرَ بِبَالِكَ لَهُوَ هَالِكٌ وَاللّٰهُ اَجَلُّ مِنْ ذٰلِكَ

"جو تصویریں تمہارے ذہن میں گزرتی ہیں سب فنا ہونے والی ہیں۔ خدا تعالیٰ اس سے بہت برتر ہیں۔"

مگر باوجود اس کے اسی حالت میں ہم کو ہم کلامی کی اجازت بخشی یہ کتنی بڑی رحمت ہے ورنہ جب اس کی ذات پاک ایسی عظیم ہے تو بتلائیے کیا صورت تھی اس سے ہم کلامی کی پس قیاس کے موافق یہ تھا کہ کسی شخص کو بھی اس کے یاد کرنے کی اور اس سے ہم کلام ہونے کی مطلقاً بھی اجازت نہ ہوتی اگر ایسا معاملہ ہوتا تو ہماری کیا حالت ہوتی کہ نہ تو بدون یاد کے تسلی ہوتی اور اگر یاد کریں تو مجرم بنتے۔

دوگونہ رنج وعذاب است جان مجنوں را بلائے فرقت لیلیٰ و صحبت لیلیٰ

(یعنی مجنوں کی جاں کو دوگونہ رنج وعذاب ہے ایک لیلیٰ کی جدائی کی مصیبت دوسرے صحبت لیلیٰ کی مصیبت)

اور بزبان حال یہ کہتے:

من شمع جانگدازم تو صبح دلکشائی سوزم گرت نہ بینم میرم چوں رخ نمائی

(یعنی اے محبوب! میں شمع ہوں تو صبح ہے اگر تجھے دیکھ لوں تب بھی موت ہے کہ لوگ بجھا دیں گے اور اگر نہ دیکھوں تب بھی ہلاکت ہے کہ جل جاؤں گا)

نزدیک آنچنانم دور آں چناں کہ گفتم نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

(اس محبوب کی نزدیکی ایسی ہے اور جدائی جیسا کہ ذکر کیا نہ میں جدائی کی طاقت رکھتا ہوں نہ وصل کی تاب ہے)

بلکہ ممکنات تو پیدا کرنا ہی محض رحمت ہے اور عظمت بظاہر اس سے بھی مانع اس لیے کہ عظمت تو اس کو مقتضی ہے۔

چو سلطان عزت علم برکشد | جہاں سربہ جیب عدم درکشد

(جب محبوب حقیقی کی تجلی وارد ہوتی ہے تو سب چیزیں فنا ہوجاتی ہیں)

اگر آفتاب ست یک ذرہ نیست | وگرہفت دریاست یک قطرہ نیست

(اگر تمام مخلوق مثل آفتاب کے ہے خدا تعالیٰ کے سامنے ایک ذرہ کی برابر نہیں اور مثل سات دریاؤں کے ہے تو اللہ تعالیٰ کے روبرو ایک قطرہ کے برابر بھی نہیں)

ممکن واجب کے سامنے کوئی چیز نہیں پس خود پیدا کرنا ہی اس کے غنا اور عظمت کے ہوتے ہوئے عجیب ہے پھر پیدا کرکے اس رحمت کو ملاحظہ فرمایئے اجازت دے دی تصور کی حالانکہ وہ ہمارے تصور سے بدرجہا بڑھ کر ہے اور اس اعتبار سے یہ ہمارا تصور بھی اس کے عظمت وجلال کے سامنے ذنب ہونا چاہیے۔

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم | وزہر چہ گفتہ اند وشنیدیم وخواندہ ایم

(اے اللہ! آپ ہمارے خیال وقیاس وگمان اور وہم سے برتر ہیں اور جو کچھ ہم نے سنا اور پڑھا ہے اس سے بھی آپ برتر ہیں)

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر | ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

(یعنی دفتر ختم ہوگیا اور عمر اختتام کو پہنچ گئی ہم ایسے ہی آپ کی پہلی خوبی بیان کرنے میں رہے)

ان سب امور پر نظر کرکے ملاحظہ فرمایئے کہ ہم کو ہم کلام کرنے کی اجازت دیدی' کیا ہمارا یہ منہ تھا ہرگز نہیں۔

چہ نسبت خاک رابا عالم پاک

(خاک کو عالم پاک سے کیا نسبت ہے)

پھر حکام کو دیکھئے کہ اگر کبھی اجازت بات کرنے کی ہوتی ہے تو بڑے القاب وآداب کے ساتھ ہوتی ہے حاکم کا نام کوئی نہیں لیتا بلکہ سخت جرم ہے۔

حق تعالیٰ شانہ نے اپنا نام کیلئے القاب وآداب کی شرط نہیں لگائی

صاحبو! اگر حق تعالیٰ بھی اپنے نام پاک کے ساتھ القاب وآداب کی شرط لگاتے تو بتلایئے کہ ہم وہ القاب وآداب جو اس بارگاہ کے لائق ہیں کہاں سے لاتے اگر ازل سے ابد تک ان القاب وآداب کے لانے میں مشغول رہتے تو ان کو ہمارے القاب کی حق تعالیٰ کے اوصاف کے مقابلہ میں وہ نسبت بھی نہ ہوتی جیسی ایک قطرہ کو سمندر سے ہوتی ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّىْ لَنَفِدَالْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّىْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا٥

''آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے سمندر کا پانی روشنائی کی جگہ ہوتو رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے (اور باتیں احاطہ نہ آئیں) اگرچہ اس سمندر کی مثل ایک دوسرا سمندر اس کی مدد کے لیے ہم لے آئیں۔''

نہ حسنش غایتی دارد نہ سعدی راسخن پایاں بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

(یعنی نہ محبوب حقیقی کے حسن کی انتہا ہے نہ سعدی کے کلام کی جیسے جلندر والا مر جاتا ہے اور دریا باقی رہ جاتا ہے ایسے محبوب کے حسن کا بیان باقی رہ گیا)

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گلچین بہار تو زداماں گلہ دارد

(نگاہ کا دامن تنگ ہے تیرے حسن کے پھول بہت ہیں۔ تیرے بہار کے پھول چننے والا کوتاہی دامن کی شکایت کرتا ہے یعنی محبوب حقیقی کے کمالات واوصاف کی انتہا نہیں بہت ہی ہیں ہماری زبان ونظر کے ان کے بیان کرنے سے قاصر و عاجز ہے)

اللہ تعالیٰ کا نام لینے کیلئے وضو وغیرہ کی بھی شرط نہیں

تو جب یہ شان ہے تو بتلایئے وہ کون ساذہن تھا جو القاب کا احاطہ کر سکتا تھا۔ پس قیامت تک بھی اجازت نام لینے کی نہ ہوتی تو اس رحمت بے انتہا کو دیکھئے کہ اجازت نام لینے کی دی اور پھر القاب وغیرہ کی شرط نہیں فرمائی۔ اس کے بعد ملاحظہ فرمایئے کہ سلاطین دنیا سے اگر کوئی ان کے دربار میں حاضر ہو کر بات کرتا ہے تو حتی الوسع پاک صاف ستھرا ہو کر اچھا لباس پہن کر ہم کلام ہوتا ہے اگر میلا ہوگا بدبو آتی ہوگی تو نکال دیا جائے گا اگر حق تعالیٰ بھی اپنا نام لینے کے لیے پاک ہونے کی شرط فرماتے تو اگر لاکھوں سمندروں سے ہم غسل کر لیتے تو اس وقت بھی لائق اس کے نہ ہوتے کہ نام لیں۔

ہزار بار بشویم دہن بہ مشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

(اگر ہزاروں مرتبہ منہ کو مشک وگلاب سے دھویا جائے تو بھی اللہ تعالیٰ کا نام لینا کمال بے ادبی ہے)

مگر یہ رحمت فرمائی کہ جو طہارت قانونی ہے نام لینے اور ہم کلام ہونے میں اس کی بھی قید نہیں۔ پاک ناپاک وضو بے وضو ہر حالت میں اجازت نام لینے کی دیدی۔ دیکھئے کہ حکام دنیا سے اگر کچھ عرض معروض کرنا ہوتا ہے تو ادب سے بیٹھ کر عرض کرتے ہیں یہاں اس کی بھی قید نہیں بلکہ فرماتے ہیں۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ۝

کہ کھڑے بیٹھے لیٹے ہر حالت میں اللہ کو یاد کرو۔ صاحبو! کیا کہیں ایسی اجازت اور اتنی رحمت دیکھی ہے پھر غضب ہے اور اندھیر ہے اور قیامت ہے کہ ایسی عظیم الشان نعمت کی طرف التفات تک نہ ہو

بہت ہی افسوس ہے کہ اِدھر سے تو یہ رحمت اور اُدھر سے یہ اعراض واللہ العظیم (قسم اللہ تعالیٰ بزرگ اور برتر کی) ایک مرتبہ اللہ کہنا دونوں جہان کی نعمتوں سے افضل ہے وہاں تو جو کچھ ملے گا مر کر معلوم ہوگا خود دنیا میں وہ حلاوت ولذت اس نام میں ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت بھی اس کے مقابلہ میں گرد ہے۔

اللہ کا نام لینے سے منہ میٹھا ہونا

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ دیوبند کے ہمراہ میں ایک مرتبہ شاہ توکل شاہ رحمۃ اللہ انبالوی کی خدمت میں حاضر ہوا تو شاہ صاحب نے مولوی صاحب سے فرمایا کہ مولوی جی جب اللہ کا نام لیتا ہوں منہ میٹھا ہو جاتا ہے اور یہ نہ سمجھنا کہ میں تاویل سے کہتا ہوں واقعی سچ مچ ایسا میٹھا ہوتا ہے جیسا شکر سے میٹھا ہوتا ہے۔

اللہ اللہ ایں چہ شیریں است نام ۔۔۔۔ شیر و شکر میشود جانم تمام

(اللہ اللہ کیا شیریں نام ہے کہ اس کے کہنے سے تمام جان شیر وشکر ہو جاتی ہے)

اللہ تعالیٰ کا نام ہر صورت میں نافع ہے

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ حضرت میں اللہ کا نام لیتا ہوں مگر کچھ نفع نہیں، حضرت نے فرمایا کہ یہ تھوڑا نفع ہے کہ نام لیتے ہو یہ تمہارا نام لینا یہی نفع ہے اور کیا چاہتے ہو۔

گفت آں اللہ تو لبیک ماست ۔۔۔۔ ویں نیاز وسوز و دردت پیک ماست

(یعنی وہ تمہارا اللہ کہنا ہمارا لبیک ہے اور یہ دنیا سوز اور درد تیرا ہمارا قاصد ہے)

ہمارے ذکر کی قبولیت کی عجیب مثال

پس دنیا میں تو رحمت کا نام لینے کی اجازت دی اور آخرت میں اس پر قبول و رضا مرحمت فرمائیں گے۔ حالانکہ جو ذکر کے ضروری آداب ہیں وہ بھی ہم سے نہیں ہو سکتے ہیں ذکر کر رہے ہیں ہزاروں معاصی اور شہوات میں آلودہ ہیں پھر اس پر قبول عجیب در عجیب ہے۔

ایں قبول ذکر تو از رحمت است ۔۔۔۔ چوں نماز مستحاضہ رخصت است

(یعنی جیسے مستحاضہ عورت کو نماز پڑھنے کی رخصت ہے اسی طرح تمہارے ذکر کو قبول کرنا جو گناہوں اور ریاوغیرہ سے آلودہ ہے رحمت کی وجہ سے ہے)

اگر ذکر کو اسی شرط سے مشروط فرما دیتے کہ ہمارا نام جب لو کہ گناہ سے پاک ہو تو شاید کسی کو بھی نام لینا نصیب نہ ہوتا مگر یہ نہیں کیا بلکہ گنہگار کو نام لینے کی اجازت بھی ہے اور باوجود گناہ کے

نام لینے پر ثواب کا بھی وعدہ کیا اور یہ قاعدہ مقرر فرمایا۔ "فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ" (جو شخص ذرہ بھر (دنیا میں) نیکی کرے گا وہ آخرت میں اس کو دیکھ لے گا) دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی کارگزار ہو لیکن جب وہ کوئی جرم کرتا ہے تو اس کی سب کارگزاریاں نظر سے نکل جاتی ہیں اس قاعدے کے موافق تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ گناہ نیکیوں کے مزیل ہو جائیں حق تعالیٰ کی رحمت یہ بھی کہ اس نے برعکس حسنات کو مزیل سیئات بنا دیا۔ فرماتے ہیں: اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّئَاتِ (بے شک نیکیاں گناہوں کو فنا کر دیتی ہیں) غرض باوجود اس کے کہ گناہوں میں سر سے پاؤں تک غرق ہیں اور حالت یہ ہے:

سبحہ بر کف توبہ برلب دل پر از ذوق گناہ　　　معصیت راخندہ می آیدز استغفار ما

(تسبیح ہاتھ میں ہے لب پر توبہ اور دل گناہوں کے ذوق پر ہے ہمارے استغفار کرنے پر گناہ کو بھی ہنسی آتی ہے)

وجدان کا اثر

لیکن اس پر بھی اگر کوئی نیکی کرتے ہیں تو ضائع نہیں جاتی حالانکہ وجدان اس بات کو چاہتا ہے کہ گناہوں سے حسنات مٹ جائیں۔ چنانچہ اس وجدان کا یہ اثر ہے کہ جو لوگ طریقہ باطن میں مشغول ہیں ان سے اگر کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو اس پر درجہ ندامت سوار ہو جاتی ہے کہ بعض کی تو یہ بھی ہمت نہیں پڑتی کہ پھر ذکر و طاعت میں مشغول ہوں اور حسنات سابقہ کے نور پر وہ معصیت ان کو غالب ہوتی ہے۔ اسی مضمون کو کسی نے کہا:

احب مناجات الحبیب باوجه　　　لکن لسان المذنبین لکیل

(یعنی میں چاہتا ہوں کہ محبوب سے نوع بنوع انداز سے باتیں کروں لیکن نہیں ہو سکتیں اس لیے کہ گناہگاروں کی زبان درماندہ و عاجز ہے اور بظاہر یہ حالت اچھی نہیں ہے کہ گناہ کر کے طاعت سے بھی محروم رہا)

لیکن الحمدللہ کہ حق تعالیٰ نے مجھ کو یہ منکشف فرما دیا کہ یہ حالت بھی بعض کے لیے رحمت ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو عوام جنہوں نے اس طریق میں قدم ہی نہیں رکھا اور طلب کی شان ہی ان کے اندر پیدا نہیں ہوئی ان کی حالت تو یہ ہے کہ جس وقت قلب ان کا پاک صاف ہوا اللہ کا نام لے لیا اور جب قلب کو دنیا کے تعلقات کی طرف توجہ ہوئی تو چھوڑ دیا' بے توجہی سے نام لیا ان کو تو اس کی کچھ پرواہ ہی نہیں اس لیے استحضار معصیت ان کو طاعت سے مانع نہیں ہوتا۔

ترکِ ذکر پر عمل ہرگز نہ کرنا چاہیے

ورایک وہ لوگ جو اس کی راہ کو قطع کر رہے ہیں اور کچھ ذوق ان کو حاصل ہو گیا ہے ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جو ان کے قلب کی تعلق مع اللہ کی وجہ سے کیفیت ہے اس میں کسی غفلت و معصیت کی وجہ سے اگر ذرا بھی فرق آ جائے تو ان کو بے حد غم ہوتا ہے اور خود ذکر و طاعت سے بھی ہمت پست ہو جاتی ہے اور آئندہ کو ذکر و طاعت کی جرأت نہیں ہوتی نہ اس وجہ سے کہ اپنے مولیٰ تعالیٰ شانہ سے ان کو غفلت ہوتی ہے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ اب ہم کس منہ سے نام لیں۔ سو یہ حالت بظاہر اچھی نہیں اس لیے کہ مانع ذکر ہے لیکن یہ بھی بعض حالات میں رحمت ہے اس لیے کہ اس کا اثر بعض دفعہ یہ ہوگا کہ پھر ان سے وہ معصیت کبھی نہ ہوگی سو اس کا طریان تو رحمت ہے لیکن اتنی بات قابل تنبیہ ہے کہ اس حالت کے مقتضاء یعنی ترک ذکر پر عمل ہرگز نہ کرے بلکہ ایسی حالت والے کو یہ ضروری ہے کہ ذکر سے ایک دم کو غافل نہ ہو اور ہمت نہ ہارے۔ اگرچہ سینکڑوں گناہ ہوتے رہیں مگر ذکر نہ چھوڑے کیونکہ جو ظلمت مانع ہوئی تھی ذکر سے وہ زائل اس ذکر سے ہی ہوگی اور کوئی اس کا مزیل نہیں ہے کہ اس سے زائل کر کے پھر ذکر میں لگے۔ اگر ذکر میں لگے رہو گے تو انشاء اللہ تعالیٰ ایک روز اس بلا سے بھی خلاصی ہو جائے گی اس کے مناسب مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک ناپاک کا دریا پر گزر ہوا' دریا نے کہا آ جا میں تجھے پاک کر دوں' اس شخص نے کہا میں ناپاک ہوں تیرے پاس آتے ہوئے شرم آتی ہے دریا نے کہا یاد رکھ جب پاک ہوگا میرے پاس ہی آنے سے ہوگا ورنہ اگر دور دور پھرا تو ناپاک ہی رہے گا تو اسی حالت میں آ جا مجھ سے ایک موج اُٹھے گی کہ تجھ کو پاک صاف کر دے گی۔ پس اسی طرح تم کو بھی حکم ہے کہ باوجود غرق معاصی ہونے کے اس کے ذکر و طاعت میں لگے رہو۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ   گر کافر و گبرو بت پرستی باز آ

(یعنی ہماری درگاہ کی طرف ضرور واپس آ ؤ جو کچھ بھی ہو تم ہو واپس آ ؤ' اگر کافر و بت پرستی ہو تو بھی واپس آ ؤ)

ایں درگہ مادر گہ نومیدی نیست   صد با اگر توبہ شکستی باز آ

(ہماری درگاہ نا اُمیدی کی درگاہ نہیں' سینکڑوں بار اگر توبہ توڑ چکے ہو تو پھر ہماری درگاہ کی طرف واپس آ ؤ اور توبہ کرو ہم قبول کریں گے)

حق تعالیٰ شانہ کا نام کتنا آسان اور مختصر ہے

دیکھا آپ نے حق تعالیٰ کی وسعت رحمت کہ ہر حالت میں اجازت دے دی کہ ہم سے باتیں کرلو ہمارا نام لے لو ہر حالت میں سماعت ہوگی کوئی حاکم ایسا دیکھا ہے اور پھر نام بھی کیسا سہل عظمت کا مقتضا تو یہ تھا کہ نام بھی اس کا بہت بڑا ہوتا ہے لیکن اس قدر مختصر اور اتنا آسان کہ بچے کہ جن کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکلے وہ بھی تلفظ کرلیں ذات اتنی بڑی اور نام اتنا مختصر ہے۔ دنیا میں ذرا ذرا سے آدمیوں کے القاب اتنے طویل ہیں کہ کئی سطروں میں آتے ہیں۔ ایک شخص نے کسی سے پوچھا کہ تمہاری کنیت کیا ہے کہا "**ابو عبداللہ السمیع العلیم الذی یمسک السماء ان تقع علی الارض الا باذنہ**" یعنی ایسے اللہ تعالیٰ کے بندہ کا باپ جو آسمان کو روکے ہوئے ہے اس بات سے کہ بلا اس کی اجازت کے زمین پر گر پڑے۔ اس نے کہا "**موحبا بک یا ابا نصف القرآن**" (آفرین تجھ کو اے آدھے قرآن کے باپ) اور اللہ کا نام ایسا سہل کہ کوئی شخص خواہ دیہاتی ہو یہ قصبات کے بھی لام اور ہ کے ادا سے قاصر نہیں ہے ان عنایتوں کی کیا انتہا ہے۔ اب قابل غور امر یہ ہے کہ ان عنایات اور رحمت بے انتہا سے مقصود کیا ہے کہ ذکر میں قیود مذکورہ میں سے کوئی قید نہیں مقصود یہ ہے کہ کثرت سے ذکر ہو کوئی وقت ذکر سے خالی نہ ہو اسی واسطے سب عبادتوں میں قیود ہیں لیکن ذکر میں کوئی قید نہیں ہے آپ نے دیکھا کہ کتنی بڑی دولت و نعمت تم کو ہر حالت حاصل ہے اور تم کو اس طرف التفات بھی نہیں۔

یک سبد پرنان ترابر فرق سر توہمی جولی لب ناں در بدر

(یعنی روٹیوں کا ایک ٹوکرہ بھرا ہوا سر پر ہے اور تو روٹی کا ٹکڑا در بدر ڈھونڈتا ہے)

سب سامان دولت حاصل کرنے کے باوجود یعنی زبان و قلب سب موجود اور اس پر بھی حاصل نہیں کرتے یہاں تک اس ہم کلامی کا نعمت عظمیٰ ہونا واضح ہوگیا۔

ذکر اللہ کی اجازت بہت بڑی نعمت ہے

اب میں آیات کی تفسیر کرتا ہوں جو آیتیں میں نے تلاوت کی ہیں ان سے پہلے حق تعالیٰ نے اپنے نور کی ایک مثال بیان فرما کر یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی طرف جس کو چاہیں ہدایت فرمائیں سن کر طالبین کو بے چینی ہوئی کہ وہ نور کہاں ہے۔ آگے جواب میں ارشاد ہے: "فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ" یعنی وہ نور ان گھروں میں ہے۔ بیوت سے مراد بقول مشہور مساجد ہیں اور باعتبار عموم لفظ وہ گھر بھی ہیں جو کثرت ذکر کی وجہ سے مثل مساجد کے ہیں کہ جن میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی

ہے کہ ان گھروں کو بلند کیا جائے اور ان میں اس کا نام ذکر کیا جائے۔ اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں ان میں صبح وشام ایسے مرد کہ جن کو تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے اور نماز کے قائم کرنے اور زکوۃ دینے سے نہیں روکتی۔ یہ ترجمہ ہوگیا آیت کا اب آپ کو معلوم ہوا کہ وہ نعمت کیا ہے اس کو اگر اول وہلہ میں بیان کر دیا جاتا تو اس کی قدر نہ ہوتی' تمہید مذکور کے بعد ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اجازت دینا کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ مضمون آج سے پہلے کبھی ذہن میں نہیں آیا تھا۔

نعمت ذکر کے حقوق

اب معلوم کرنا چاہیے کہ ہر نعمت کے کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ اس نعمت کا حق کیا ہے جو ہم کو ادا کرنا چاہیے ان حقوق کو ایک مثال سے سمجھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ دیکھو جو شخص کسی حاکم سے ہم کلام ہوتا ہے وہ کیا انداز اختیار کرتا ہے وہ یہ کرتا ہے کہ اس حاکم کے خلاف مزاج وطبیعت نہیں کرتا' بدن پر کپڑے ہر وقت صاف رکھتا ہے کہ ایسا نہ ہو حاکم کی طبیعت مجھ سے مکدر ہو جائے منہ کو صاف رکھتا ہے کہ بدبو نہ آنے لگے' الفاظ کی رعایت رکھتا ہے کہ کوئی بے ادبی کا کلمہ نہ نکل جائے۔ چنانچہ ان امور میں اگر کچھ فروگذاشت ہو جاتی ہے تو دھکے دے کر نکال دیا جاتا ہے اس لیے اس کو ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ اس طور سے رہنا چاہیے کہ حاکم خفا نہ ہو جائے جبکہ آپ کو معلوم ہو گیا کہ قرآن پڑھنا' دعا کرنا ذکر کرنا یہ سب اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی ہے اور یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر ظاہری صورت وشکل اور لباس پر نہیں ان کی نگاہ قلب پر ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے: "اِنَّ اللّٰهَ لَايَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَلٰكِنْ يَّنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ"[1] یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتے بلکہ تمہارے دلوں کو دیکھتے ہیں تو کیا یہ شرم کی بات نہیں اور کیا قابل ترک نہیں کہ قلب میں معصیت کی نجاست لے کر اللہ تعالیٰ سے باتیں کرو کیا بے حیائی نہیں ہے کہ جس منہ سے جھوٹ بولو غیبت کرو پھر اسی منہ سے اللہ کا ذکر کرو' ایسی مثال ہے کہ ایک ہی چمچے سے فیرنی اسی سے گوہ نکالو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نعمت کی قدر ہی نہیں جانی۔ "وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ" (جیسی اللہ تعالیٰ کی عظمت وقدر کرنی چاہیے ویسی اللہ کی قدر نہ کی) جب آپ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہیں تو آپ کو ہر وقت صاف لطیف نجاست ظاہری اور باطنی سے شستہ رہنا چاہیے اور اوامر ونواہی جو عبادات اور معاصی کے بارے میں آئے ہیں وہ تو حامل علی الاطاعت ہیں ہی لیکن اگر صرف اتنی ہی بات پر نظر ہو کہ ہم احکم الحاکمین سے ہم کلام ہوتے ہیں تو

---

[1] (مشکوۃ المصابیح: ۵۳۱۴)

اس کے خیال سے انشاء اللہ تمام معاصی چھوٹ جائیں اور طاعت کی رغبت ہو جائے مگر افسوس ہے کہ ہم نے اس نعمت کی قدر نہ جانی اور اپنے کو ضائع کر دیا۔ اب یہاں ہلکا سا شبہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں وہ سب صحیح ہے کہ ہم کو بولنے اور بات کرنے کی اجازت ہوگئی اور اس کا نعمت ہونا بھی معلوم ہوا لیکن وہ خود تو ہماری بات کا جواب نہیں دیتے اس لیے ہم کو شگفتہ کرنے والی اور نشاط میں لانے والی کوئی شے نہیں ہے تو جواب یہ ہے کہ شگفتہ کرنے کے واسطے اس کا تصور کافی ہے کہ ہم کلام ہیں باقی رہی یہ تمنا کہ اللہ تعالیٰ خود ہم سے بلا واسطہ بات کریں تو صاحبو! ذرا پہلے اپنی حالت کا اندازہ کرلو کیا اس حالت کا اقتضا یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ شانہ بلا واسطہ آپ سے بات کریں یہی بڑی نعمت ہے کہ انہوں نے عرض معروض کرنے کی اجازت دیدی۔ پس اس حالت کے ہوتے ہوئے یہ تمنا سخت گستاخی و بے ادبی ہے۔ چنانچہ اور بات کرنے کی اسی طرح روایت کی درخواست کو بے ادبی قرار دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَايَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا لَقَدِاسْتَكْبَرُوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيْرًا

اور ارشاد ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَا اٰيَةٌ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ٥

یعنی جو لوگ ہمارے سامنے پیش ہونے سے اندیشہ نہیں کرتے وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں آتے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیں یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنے کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں اور یہ لوگ حد سے بہت دور نکل گئے۔ یعنی جاہل لوگ کہتے ہیں کہ ہم سے اللہ تعالیٰ کیوں نہیں بات کرتے یا ہمارے پاس کوئی (فرمائشی) نشانی کیوں نہیں آتی جو لوگ ان سے پہلے ہوئے ہیں وہ بھی ایسے ہی کہا کرتے تھے۔ ان سب کے دل یکساں ہیں ہم نے آیتیں بیان کر دیں اس قوم کے لیے جو یقین کرتے ہیں یعنی بولنے سے مقصود احکام بتانا ہے سو ہم احکام بتا چکے۔ اب ہم کلام ہونے کی ضرورت نہیں پس جو ضرورت تھی کلام کرنے سے وہ رفع ہو چکی ہے اب رہی لذت وہ جب ہو کہ یہ ملذذ صاحب حق تعالیٰ کے بولنے کے وقت باقی بھی رہیں سو ہم کلام ہونا تو بہت دور ہے اگر اپنا کلام بھی کسی شے پر نازل فرمائیں تو وہ فنا ہو جائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ

"یعنی اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو (اے مخاطب) تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا۔"

تجلی اور استتار دونوں نعمت ہیں

اور اسی طرح روایت کے متعلق ارشاد ہے: "فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا" پس ان کے رب نے جو اس پر تجلی فرمائی (تجلی نے) اس پہاڑ کے پرخچے اڑا دیے اور موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے) دیکھئے پہاڑ کو اور موسیٰ علیہ السلام جیسے نبی کو جب کلام اور تجلی کا تحمل نہ ہوا تو ہماری اور آپ کی کیا ہستی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ہمارے لیے یہی بڑی نعمت ہے کہ ہم اپنی سب کچھ کہہ لیں اور اس طرف سے جواب نہ ملے اگر جواب ملتا تو عدم تحمل کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے اسی واسطے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ تجلی اور استتار دونوں نعمت ہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہوتا تھا تو اونٹ کھڑا نہ ہو سکتا تھا اور آیا ہے کہ نزول وحی کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک پسینہ پسینہ ہو جاتا تھا اور سانس بڑھ جاتا تھا اور ہوش اس طرح کا نہ رہتا تھا اور فرماتے ہیں کبھی مجھ پر وحی مثل صلصلۃ الجرس یعنی مثل جھنجھاہٹ جرس کے اور وہ مجھ پر سخت تر ہے اور یہ بھی داخل ہے اس بارے میں کہ جس کے بارے میں فرمایا: اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ یعنی کیا ہم نے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے لیے آپ کے سینے کو نہیں کھول دیا اور جس بوجھ نے آپ کی کمر توڑ دی تو ہم نے اس کو ہٹا دیا۔ جب سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارکلام سے یہ حالت تھی حالانکہ یہ بواسطہ ہم کلامی تھی تو کیا ہر بازاری کا منہ ہے جو اس کا حوصلہ کرے۔

سالک کی دو قسمیں

یہاں ایک اور شبہ کا بھی حل کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ سالک کی دو قسمیں ہیں ابن الحال و ابو الحال۔ ابن الحال تو وہ ہے جس پر حال غالب ہو اور ابو الحال وہ ہے جو حال پر غالب ہو یعنی جو حال چاہے پیدا کرے۔ مثل انس شوق وغیرہ تو یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب انبیاء پر کلام الٰہی کا بار ہوا تو وہ ابن الحال ہوئے حالانکہ انبیاء علیہم السلام بلکہ صدیقین ابو الحال ہوتے ہیں تو جواب اس کا یہ ہے کہ وحی کی حقیقت حال نہیں ہے اس لیے حال تو ثمرہ مجاہدہ اور ریاضت کا ہے اور نبوۃ موہبہ محضہ ہے چنانچہ ارشاد ہے: "اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ" (اس موقع کو تو خدا ہی خوب جانتا ہے جہاں اپنا پیغام بھیجتا ہے) اور جس حالت کے اعتبار سے ابو الحال اور ابن الحال کہا جاتا ہے اس کے اعتبار سے وہ ابو الحال ہوتے ہیں۔ وحی اس مبحث سے خارج ہے۔

اللہ تعالیٰ سے ہم کلام نہ ہونے میں حکمت اور مصلحت

الحاصل کلام یا رویت کی دنیا میں تمنا کرنا غیر ضروری ہی نہیں بلکہ مصلحت بھی نہیں ہے اور جن سے کلام ہوا ہے وہ بھی بلا واسطہ نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ○

یعنی کسی بشر کی مجال نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے بات کرے مگر بطور وحی کے یا پس پردہ یا فرشتہ بھیج دے پس جو چاہے وحی کرے اس لیے کہ وہ اس سے برتر ہے کہ بشر سے کلام فرمائے اور چونکہ حکیم ہے اس لیے مصلحت بھی اسی میں ہے۔ پس ثابت ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کا ہم سے ہم کلام نہ ہونا عین مصلحت اور حکمت ہے۔

حصول حظ کے لیے رویت اور ہم کلامی کی ضرورت نہیں

رہا یہ کہ اس کے نہ ہونے سے حظ میں کمی ہے سو یاد رکھو کہ یہ کمی ہماری طرف سے ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو اس طرف التفات نہیں ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتے ہیں اور وہ ہماری پکار سنتے ہیں۔ آپ تجربہ کر لیجئے اور قرآن شریف پڑھنے اور دعاء اور ذکر کے وقت اس کا تصور کیا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ سن رہے ہیں، دیکھئے کس قدر حظ ہوتا ہے دیکھو اگر کوئی کسی پر عاشق ہو جائے اور معشوق یوں کہے کہ تم عرض حال کرو ہم پس پردہ بیٹھے سنتے ہیں تو عاشق صادق کو اپنا اذن ایک دولت معلوم ہوگا کہ میری ایسی قسمت کہاں کہ میں کچھ کہوں اور وہ سن لے اور رو رو کر اور نوع بنوع سے اپنا عرض حال کرے گا اور اس میں اس کو وہی لطف ہوگا کہ جس طرح سامنے بیٹھ کر سنتا ہے۔ پس حظ کے حاصل کرنے کے لیے رویت اور ہم کلامی کی ضرورت نہیں اور اصل وجہ رویت و کلام کے یہاں نہ ہونے کی یہ ہے کہ ہمارا وجود بوجہ تعلق ناسوت کے اس کی استعداد نہیں رکھتا ہے اور جس وقت اس کی استعداد اور تحمل اللہ تعالیٰ پیدا فرما دیں گے یعنی قیامت کے دن اس وقت انشاء اللہ تعالیٰ رویت و ہم کلامی کی دولت بھی نصیب ہوگی اور اس وقت زبان حال سے یہ درخواست کرو گے:

بنمائے رخ کہ خلقے والہ شوند و حیراں   بکشائے لب کہ فریاد از مرد و زن برآید

(اے محبوب! اپنا چہرہ انور دکھا دیجئے کہ ایک مخلوق سرگشتہ و حیران ہو رہی ہے اور اپنا لب مبارک کھول دیجئے مرد و عورت فریاد کر رہے ہیں)

ہمہ تیم بس کہ داند ماہرویم   کہ من تیز از طلب گاران اویم

(یعنی یہی کافی ہے کہ ہمارے محبوب کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہم بھی اس کے طلب گاروں میں ہیں اور اب تو اس پر کفایت کیجئے)

حق تعالیٰ شانہ کے دیکھنے اور سننے کا مراقبہ

پس ہمت باندھ کر اپنے ہر فعل میں اس کا مراقبہ کرو کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ دیکھتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں وہ سنتے ہیں پھر دیکھئے کہ اس کا کیا ثمرہ ہوتا ہے تمام کلفتیں اور مشقتیں آپ کو سہل ہو جائیں گی اور لطف دائم آپ کو ملے گا اور اسی کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے: ''وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ '' (یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے حکم کے لیے جمے رہیے اس لیے کہ آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور اپنے پروردگار کی تسبیح حمد کے ساتھ کیجئے یعنی آپ ہم سے باتیں کیجئے) جب محب کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ محبوب مجھ کو دیکھتا ہے تو مصیبت میں بھی اس کو لطف آتا ہے۔

بجرم عشق توام میکشند وغوغایست　　　تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشایست

(یعنی اے محبوب! آپ کے عشق کے جرم میں مجھ کو لوگ مارے ڈالتے ہیں اور ایک بھیڑ لگا رکھی ہے آپ بھی سر بام آ جائیے اس لیے کہ خوب تماشا ہے)

ایک عاشق کو لکڑیاں مار رہے تھے ننانوے لکڑیاں کھائیں اور اُف نہیں کیا اور ننانوے کے بعد ایک لگی تو آہ نکلی' لوگوں نے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہا کہ ننانوے تک تو میرا محبوب بھی تماشائیوں میں تھا تو مجھ کو تکلیف نہ ہوئی اور آخر میں چلا گیا اس لیے تکلیف محسوس ہوئی۔ پس معلوم ہوا کہ دنیا میں ہمارا حصہ یہی ہے کہ ہم اس کی یاد میں رہیں اور ہم کو اس کا یقین ہو کہ وہ ہم کو دیکھ رہے ہیں اور سنتے ہیں۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ یہ ہے کہ یہ ہم کلامی کی دولت بڑی نعمت ہے اس کے حقوق کی رعایت کا خاص اہتمام ہونا چاہیے یعنی اپنی حالت ایسی بنالو کہ محبوب حقیقی کی پسند کے خلاف نہ ہو اور اس کا تصور کیا کرو کہ وہ ہماری طرف ہر وقت متوجہ ہیں' کسی حالت میں بے خبر نہیں ہیں اور نیز اس کے متمنی و امیدوار ہو کہ ایک وقت خاص میں انشاء اللہ تعالیٰ رویت و ہم کلامی کی دولت سے بھی مشرف ہوں گے۔ الحمد للہ رویت و کلام کے متعلق خوب بسط سے ایسا بیان ہو گیا کہ سب پہلوؤں پر تقریر ہو گئی۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ توفیق عطا فرمائے۔ آمین

راحت القلوب

یہ وعظ ۲۳ صفر المظفر ۱۳۳۴ ہجری بروز جمعۃ المبارک بمقام جامع مسجد قصبہ جلال آباد ضلع مظفر نگر بیان فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

اَلَابِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ○ (الرعد:۲۸)

ترجمہ: ''اللہ کے ذکر ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں۔''

دین اور دنیا کی ایک اہم ضرورت

یہ ایک جملہ ہے جو ایک آیت کا جزو ہے اس میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے ایک بڑی ضرورت کی چیز بتلائی ہے۔ وہ ایسی ضرورت کی چیز ہے کہ فقط دین ہی کی ضرورت کی چیز نہیں بلکہ دنیوی ضرورت کی بھی چیز ہے۔ مجھ کو اس حیثیت سے کہ میں یہاں احکام الٰہی پہنچانے کے لیے حاضر ہوں دنیوی ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی مگر کیا کیا جائے' ہمارے بھائیوں کا مذاق ہی کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ جب تک ان کو دین کے ساتھ دنیا کی چاٹ نہ دی جائے دین کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔

امور آخرت سے لاپروائی

چنانچہ خالص دین کی طلب کو اکثر نظر تحقیر وانکار سے دیکھتے ہیں اور اگر کوئی بیچارہ مولوی محض آخرت کی طرف بلاتا ہے تو اس کو بے وقوف بنایا جاتا ہے اور اعتراض کرتے ہیں کہ بس مولویوں کو تو آخرت ہی آخرت یاد رہ گئی ہے۔ دوسری قومیں دنیا میں کیا کیا ترقی کر رہی ہیں اور مسلمان ہیں کہ روز بروز گرتے ہی چلے جا رہے ہیں لیکن ان مولویوں کو اس سے کچھ بحث نہیں۔ انہوں نے تو بس ایک آخرت ہی یاد کر لی ہے یہ تو خوش عقیدوں کا حال ہے ورنہ بہت سی جماعتیں مسلمانوں میں اب ایسے لوگوں کی بھی پیدا ہو چکی ہیں جو صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ ہمیں آخرت ہی میں

شک ہے اور پھر بھی اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔ معلوم نہیں کیا چیز ہے کہ کفر بھی اس کا ایک فرد ہے خیر ان کا تو ذکر ہی نہیں کیونکہ عام لوگ بھی انہیں مسلمان نہیں سمجھتے لیکن ان کی بھی جو آخرت کے قائل ہیں یہ حالت ہے کہ آخرت اور امور آخرت کو گو اعتقاد کے درجہ میں خفیف نہیں سمجھتے لیکن معاملہ کے درجہ میں ضرور خفیف سمجھتے ہیں یعنی جو وقعت اور اہتمام دنیا کا ہے آخرت کا نہیں اس قدر تو کیا معنی اس کا دسواں حصہ بھی نہیں۔ پھر غضب یہ ہے کہ اس عدم اہتمام کا کچھ غم بھی نہیں اگر اس حالت پر تاسف ہی ہوتا اپنی کوتاہی کا احساس ہی ہوتا اس کی تمنا ہوتی کہ کوئی ایسی صورت ہو کہ طلب آخرت پیدا ہو جائے تو خیر غنیمت تھا کبھی اہتمام کی بھی نوبت آ جاتی۔

لیکن افسوس تو یہ ہے کہ آخرت سے بھی بے فکری اور اس کے فکر سے بھی بے فکری اس پر بھی افسوس نہیں کہ ہم کو اس کی فکر نہیں۔ چنانچہ آخرت کی تعلیم پر بھی اعتراض کرتے ہیں اور اس کی ذرا وقعت نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں کہ مولویوں نے تو آخرت ہی آخرت یاد کر لی ہے۔ بچوں کو آخرت کی تعلیم دینے کے وہ یہ معنی سمجھتے ہیں کہ وہ بچہ دنیا سے بالکل ہی بیکار ہو جائے گا یہ ایک بڑی کمی ہوگئی ہے ہم میں کہ آخرت کے متعلق یہ خیال جم گیا ہے کہ اس میں لگ کر آدمی دنیا سے بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔ بخلاف دنیا کے کہ اس کی طلب میں دن رات منہمک ہیں اور اس مشغولی میں دین سے جو کچھ غفلت ہے ظاہر ہے لیکن وہاں کبھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ اس میں پھنس کر آدمی دین سے بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔ غرض دنیا کو ہم لوگوں نے ایسا قبلہ توجہ بنا رکھا ہے کہ مصلح کو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ جب آخرت کی ترغیب دی جائے تو اس میں دنیا کا بھی نفع بتلایا جائے اور جب اعمال کے فضائل بیان کیے جائیں تو ان میں بھی دنیاوی منافع بھی دکھلائے جائیں کہ شاید اسی لالچ میں آخرت کی طرف توجہ ہو جائے جیسے بچے کہ انہیں پہلے پہلے جب گلستان بوستان پڑھاتے ہیں ان کو چاٹ مٹھائی کی دی جاتی ہے۔ شروع میں سبق پڑھتے ہیں مٹھائی کے لالچ میں لیکن جب پڑھتے پڑھتے ایک ذوق علم کا پیدا ہو جائے گا تب وہی کہیں گے کہ ہمارے کپڑے اتار لو تم ہمیں سے مٹھائی لے لو لیکن سبق پڑھا دو۔ ایک وہ دن تھا کہ مٹھائی کے لالچ سے پڑھتا تھا آج وہ نوبت ہے کہ جب کتاب کا سبق ہوتا ہے تو نہایت شوق سے پہنچتا ہے اور استاد سے منتیں کرتا ہے کہ اللہ میری طرف توجہ کیجئے کہیں راضی کرنے کے لیے مٹھائی پیش کرتا ہے کہیں طرح طرح کی خدمتیں کرتا ہے۔ کبھی استاد اس پر ناخوش بھی ہوتا ہے لیکن ذرا ناگوار نہیں ہوتا بلکہ جس قدر اپنے معلوم کو دیکھئے کہ مارتا ہے جھنجھلاتا ہے خوش ہوتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے بہت توجہ ہے وہ اس کو علامت توجہ کی قرار

دے کر اور اُلٹا مٹھائی پیش کرتا ہے۔ دیکھئے یہ وہی بچہ ہے کہ مٹھائی لے لے کر بمشکل پڑھتا تھا آج وہ دن ہے کہ خود مٹھائی دے کر پڑھ رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ اب اس کو علم کا چسکا لگ گیا ہے۔

حضرت حکیم الامت کے بچپن کے چند واقعات

میرٹھ کا ذکر ہے والد صاحب نے میرے استاد کو جن سے میں قرآن شریف یاد کرتا تھا علیحدہ کرنا چاہا ہمیں حفظ کا شوق ہو گیا تھا' نہایت شاق گزرا۔ بس شور واویلا کرنا شروع کر دیا ہر چند والد صاحب نے سمجھایا کہ دوسرے حافظ جی بلا دیں گے ڈانٹا بھی لیکن ایک نہ سنی کہ میں تو انہیں سے پڑھوں گا' آخر عاجز ہو کر چلے گئے کہنے لگے کہ خدا جانے لونڈے کو کیا کھلا دیا ہے کہ مسخر ہی ہو گیا۔ غرض مغلوب ہو کر ہار کر چلے گئے حالانکہ وہ حافظ جی ایسے خفا ہوتے تھے کہ اس زمانہ میں جبکہ مولویت کا نام بھی ہو گیا تھا اور سچ مچ کی مولویت تو اب بھی نصیب نہیں ہوئی۔ میں ایک دفعہ میرٹھ گیا تھا اور ان کو دور میں کلام مجید سنا رہا تھا۔ متشابہ لگا' حافظ جی کو جوش آ گیا' بس اُٹھ کر ایک زور سے دھپ دیا منہ پر۔ الحمدللہ ذرا نا گوار نہیں ہوا۔ نیچی نگاہ کیے چپ بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد حافظ جی ہاتھ جوڑ کر سامنے بیٹھ گئے کہ للہ معاف کر دو میں نے سخت بے ادبی کی تم مولوی ہوئے میں نے کہا حضرت یہ آپ کیا فرماتے ہیں یہ جو کچھ حاصل ہوا ہے سب آپ ہی کا طفیل ہے آپ کو ساری عمر مارنے کا حق ہوگا واقعی مجھے مطلق نا گوار نہیں گزرا۔ لیکن حافظ جی بیچارے ایسے شرمندہ تھے کہ نگاہ نہیں اُٹھتی تھی۔ میں نے بہت کچھ عرض و معروض کیا مگر نہیں مانے' معاف ہی کرا کر چھوڑا تو جناب میں نے اس پٹنے پر ایسا فخر کیا کہ آج اپنی اس ذلت کو سب کے سامنے بیان کر رہا ہوں' محض یہی بات تھی کہ جس چیز کے سبب یہ سب کچھ ہوا اس کا شوق تھا اگر اس سے زیادہ بھی کر لیتے سب گوارا ہوتا۔ ہندی مثل بھی تو ہے کہ دودھ دیتی گائے کی لات بھی اچھی معلوم ہوتی ہے۔

حضرت عطار اسی کو فرماتے ہیں:

گرم گوید سرد گوید خوش بگیر

(گرم کہے سرد کہے خوش رہتا ہے)

جس شخص کو کسی ایسی چیز کی طلب ہو جس کو وہ ضروری سمجھتا ہے اس کو اس کے حاصل کرنے کے لیے سب ہی کچھ گوارا ہوگا۔ بچوں کے ساتھ یہ گھیر گھار تو جبھی تک ہے جب تک انہیں سمجھ نہیں۔ جب اپنا نفع سمجھنے لگے تو پھر خود پیچھے پیچھے پھرتے ہیں اس کے قبل تو کچھ لالچ ہی دینے سے رستہ پر آ سکتا ہے۔ جب فہم درست ہوگئی تو پھر ضرورت ہی کیا ہے۔ لالچ دینے کی پھر ضابطہ کا برتاؤ ہوتا ہے

پھر ہم کیوں خوشامد کریں اور کیوں انکے پیچھے پھریں انہیں کی غرض ہے وہی ہماری خوشامد کریں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں تعلیم کے اندر تدریج کا بہت اہتمام فرمایا ہے۔ اول میں مضامین اور طرح کے ہیں یعنی احکام بہت ہی کم بس تھوڑے تھوڑے اور کہیں کہیں ہیں۔ شروع میں زیادہ تر عقیدوں کی درستی کی گئی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ جس قدر سہار ہوتی گئی احکام نازل ہوتے گئے جیسے اول بچہ کو دودھ دیتے ہیں پھر کچھ دن جب معدہ میں قوت آ چلی تو کچھ حلوا دینے لگے پھر کچھ روز روٹی چور کر کھلائی اتنے میں دانت نکل آئے اور کچھ چلے اب ایک آدھ ریشہ بوٹی کا بھی دینا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ خوب گوشت روٹی پلاؤ زردے سب ہی کچھ کھانے لگا۔ پھر تو ماشاء اللہ یہ حالت ہوگئی کہ جو کچھ بھی اور جتنا کچھ بھی کھالیا بس بیٹھے بیٹھے سب ہضم اگر اول ہی بچہ کو حلوا اور گوشت روٹی کھلا دی جائے تو بجز اس کے کہ غریب کی امعا پھٹ جائیں اور کیا ہوگا اسی طرح حق تعالیٰ نے تعلیم میں نہایت تدریج اختیار فرمائی جیسا مزاج مکلّف کا دیکھا ویسی ہی اس کو ترغیب دی ہے۔

اعمال آخرت میں دنیاوی منافع

چنانچہ حق تعالیٰ نے جابجا جہاں ثمرات آخرت کا ذکر فرمایا ہے وہاں طاعات پر جو دنیاوی ثمرات مرتب ہوتے ہیں ان کو بھی بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ الآية

یعنی اگر یہ لوگ احکام کا پورا اتباع کرتے تو ان کو اوپر سے بھی کھانے کو ملتا اور نیچے سے بھی کھانے کو ملتا یعنی اوپر سے بارش نیچے سے پیداوار تو دیکھئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کھانے پینے کے لیے نہیں ہے کھانا تو کافروں کو بھی ملتا ہے بلکہ بہائم کو بھی کسی قدر بلا مشقت مگر پھر بھی کیوں ذکر فرمایا۔ اسی واسطے کہ خیر کوئی کھانے پینے کا لالچی اسی طرح آ جائے اس طرف دیکھئے ارشاد خداوندی سے معلوم ہوا اعمال آخرت کے اندر دنیاوی منافع بھی ہیں۔

گناہوں سے دنیا کا نقصان

اسی طرح معاصی کے اندر دنیا کی مضرت بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں وارد ہے: ''اِنَّ الْعَبْدَ لَيُحْرَمُ الرِّزْقَ بِخَطِيْئَةٍ يَعْمَلُهَا''[1] دیکھئے بسبب گناہ کے رزق کا گھاٹا بھی ہو جاتا ہے۔ اس سے تمام حدیثیں بھری ہوئی ہیں اس کی تفصیل بقدر ضرورت میرے رسالہ

---

[1] (مسند احمد ۵: ۲۸۰)

جزاء الاعمال میں ملے گی۔ اس میں یہ دکھلا دیا گیا ہے کہ طاعات میں دنیا کے کیا کیا نفع ہیں اور معاصی میں دنیا کی کیا کیا مضرت ہے اس کے لکھنے سے میری یہی غرض تھی کہ لوگ دنیا ہی کے نفع نقصان کو سوچ کر دین کی طرف متوجہ ہو جائیں اسی طور پر حق تعالیٰ نے یہاں بھی ایک چیز بتلائی ہے جو دنیا کے نفع کی بھی ہے اور دین کے نفع کی بھی۔ ظاہر بات ہے کہ جو دین اور دنیا دونوں کے نفع کی ہو وہ بڑی ہی ضرورت اور کام کی چیز ہوگی۔

تلاوت کردہ آیت کی تفسیر

فرماتے ہیں: اَ لَابِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ o یاد رکھو سمجھ رکھو (یہ مدلول ہے کلمہ الا کا) حصر کے ساتھ فرماتے ہیں (یہ مدلول ہے تقدیم معلول کا) کہ خدا ہی کی یاد کے ساتھ دلوں کو چین ملتا ہے۔ فقط ایک چیز ہے جس سے دلوں کو چین ملتا ہے۔ تمام عالم میں چراغ لے کر ڈھونڈ آؤ۔ کوئی دوسری چیز نہ ملے گی کیونکہ ظاہراً حصر سے مراد حقیقی ہی ہے اس کے بعد حصر حقیقی اور حصر اضافی کی نفیس بحث تھی اور اصل حصر میں حقیقی ہی ہوتا ہے بلاضرورت دلیل اضافی مراد نہیں لیا جاتا اور یہاں حصر کے اضافی ہونے کی کوئی دلیل ہے نہیں نیز اور کسی چیز کا موجب اطمینان ہونا بھی ثابت نہیں۔ جیسا کہ عنقریب واضح ہو جائے گا۔ جب مشاہدہ ہے حصر کے حقیقی ہونے کا پھر اضافی کیونکر ہوا۔ غرض یہاں کوئی دلیل نہیں کہ عدول کیا جائے حصر کے حقیقی ہونے سے جب کوئی دلیل نہیں اور مشاہدہ بھی اس کا موید ہے تو اس کو حقیقی ہی کہا جائے گا۔

قرار و سکون صرف ذکر اللہ میں ہے

لہٰذا خدا کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ سوائے اس کی یاد کے چین کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ قرار وسکون اگر ملتا ہے تو خدا ہی کی یاد سے۔ اس کے بیان فرمانے میں بہت اہتمام فرمایا ہے۔ چنانچہ الا سے کلام شروع کیا یعنی دیکھو ہوشیار ہو کر سن لو اور سمجھ لو یاد رکھو خدا ہی کی یاد ایک ایسی چیز ہے جس سے قلوب کو چین ملتا ہے دنیا بھر میں کوئی اور چیز ایسی نہیں جو قلب کو راحت پہنچا سکے۔ واقعی بہت بڑا دعویٰ ہے کہ یہی وہ چیز ہے جس میں قلوب کا چین منحصر ہے۔ اس ترجمہ سے آج کے بیان کا مقصد معلوم ہو گیا ہوگا۔ غرض حصر کے ساتھ فرماتے ہیں: اَ لَابِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ o کہ سوائے یاد خدا کے کسی چیز میں قلوب کا چین نہیں اور ہر چند کہ ترجمہ سے مقصود ترغیب ہی ہے ذکر کی لیکن قرینہ مقام سے خود ترغیب سے مقصود اس کا امر کرنا اور اس کا ضروری بتلانا ہے۔ اس بناء پر اس کے متعلق میرے ذمہ دو باتیں ثابت کرنا ہیں ایک تو یہ کہ ذکر اللہ ضروری چیز ہے دوسرے یہ کہ

اس کے سوائے اور کوئی چیز ایسی نہیں جس میں قلوب کو چین حاصل ہو سکے اول جز ضروری ہوتا ہے۔ سو ضرورت اس کی بالکل ظاہر ہے کیونکہ یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس میں دنیا کا بھی نفع ہے اور دین کا بھی نفع ہے پھر اس سے زیادہ کیا ضرورت کی چیز ہوگی۔ ذرا توجہ کرے تو ہر شخص اس کی ضرورت کو سمجھ سکتا ہے کیونکہ جو چیز دنیا اور آخرت دونوں کے کام کی ہو ظاہر ہے کہ وہ بہت ہی ضرورت کی چیز ہے خیر آخرت کو ابھی رہنے دیجئے دنیا ہی کے نفع کو دیکھئے۔ اسی سے شاید آخرت کی رغبت ہو جائے حالانکہ آخرت اور دنیا میں مسلمان کو ایسا علاقہ رکھنا چاہیے تھا کہ اگر کسی چیز میں دنیا کا نفع بتلایا جاتا تو جب تک آخرت کا نفع نہ معلوم ہو جاتا مسلمان کو اس کی طرف رخ بھی نہ کرنا چاہیے تھا۔ اگر دنیاوی چیزوں کے طالب کو حق کی رغبت دلائی جاتی تو وہ یہ سوال کرتا کہ اس میں کچھ دین کا بھی فائدہ ہے اور اگر دین کا فائدہ کچھ نہ بتلایا جاتا تو وہ یہ کہتا کہ جب دین ہی کا نفع نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں اور اس طرف توجہ بھی نہ ہوتی۔ اسی طرح اگر کسی کام میں یہ کہا جاتا کہ اس میں دین کا فائدہ تو ہے لیکن دنیا کا نفع کچھ بھی نہیں تو طالب حق کی یہ شان تھی کہ فوراً اس کی زبان سے نکلتا کہ خیر بھائی دین کا فائدہ چاہیے دنیا کا نفع نہیں ہے تو نہ سہی اور بے تامل اس کام کو کر لیتا۔ اب معاملہ بالکل برعکس ہو رہا ہے یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ آج اگر ہم آخرت کی تعلیم کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور اعمال آخرت کی ترغیب دیتے ہیں تو ہم سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیوں صاحب کچھ دنیا کا بھی نفع ہوگا۔ اب اس کے جواب کی فکر ہوتی ہے واللہ مجھے تو بہت ہی شرم آتی ہے کہ اعمال آخرت میں دنیاوی منافع بیان کروں لیکن کیا کروں مذاق ہی بگڑ گیا ہے۔

ایک سب انسپکٹر کی حکایت

ہمارے ایک عزیز تھے سب انسپکٹر نہ نماز نہ روزہ۔ ان کی بیوی بیچاری بڑی نیک بخت اور نمازی تھی۔ اس نے جو اپنے میاں سے نماز پڑھنے کے لیے کہا تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ تو اتنے دن سے نماز پڑھتی ہے تجھے کیا وصول ہوا جو مجھ ہی کو وصول ہوگا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) وہ وصول ہونا اسے سمجھتے تھے جیسا کہ ایک صاحب کو وصول ہوتا تھا' کوئی عہدیدار تھے بڑے وظیفچی ایک بزرگ سے بیعت تھے ان کے یہاں بالائی آمدنی کا خوب بازار گرم رہتا تھا جس کا مبارک نام رشوت ہے بالائی آمدنی دست غیب اس کے آداب' القاب ہیں۔ دست غیب تو کیا ہوتا دست عیب کہئے۔ طلوع صبح صادق سے طلوع آفتاب تک گویا مابین الطلوعین اس کا وقت مقرر تھا۔ صبح کی نماز پڑھ کر مصلے پر بیٹھ کر ادھر انہوں نے وظیفہ شروع کیا ادھر روپیوں کا مینہ برسنا شروع ہو گیا' موٹے موٹے دانوں کی تسبیح کھٹ کھٹ کر رہے ہیں اور خادم لوگوں کو لا لا کر پیش

کررہا ہے' اشاروں سے سب معاملات طے ہوتے جاتے ہیں کیونکہ اگر بول پڑیں تو وظیفہ نہ خراب ہوجائے' رشوت سے تو وظیفہ نہ بگڑا اور بولنے سے بگڑتا ہے۔ انگلیوں کے اشاروں سے بتلاتے تھے کہ دوسو یا تین سو یا کس قدر مگر بولتے نہیں تھے کیونکہ اگر بول اُٹھیں تو وظیفہ نہ بگڑ جائے۔ بعضوں کا تقویٰ کلابی ہوتا ہے یعنی کتے کا سا تقویٰ کہ منہ کو نجاست سے بچاتا نہیں مگر پیشاب جب کرے گا تو ٹانگ اٹھا کر کہ کہیں چھینٹیں نہ پڑ جائیں بیچارہ بہت ہی محتاط اور متقی ہے' ٹانگ کی تو اتنی حفاظت کہ پیشاب کے چھینٹے بھی نہ پڑنے پائیں اور منہ سے گوہ کھاتا ہے تو بعضوں کے تقویٰ کی یہی حالت ہوتی ہے۔ چنانچہ ان صاحب کا بھی ایسا ہی تقویٰ تھا کہ رشوت سے تو وظیفہ نہ بگڑتا تھا لیکن بولنے سے بگڑتا تھا اس لیے اشاروں سے معاملات طے کیے جاتے تھے۔ اہل مقدمہ آیا سلام کیا کہا حاضر لایا ہوں زبان سے بول نہیں سکتے۔ مصلیٰ اٹھا دیا کہ نیچے رکھ دو۔ پچاس ساٹھ جیسی قسمت ہوئی' یہ تھی نماز بار آور۔ وہ سب انسپکٹر بھی ایسی ہی نماز چاہتے تھے۔ بیوی سے پوچھتے ہیں کہ تمہاری بھی ایسی ہی نماز ہے یا خالی خولی ٹکر ہی ہیں۔ ایسی نماز سے سوائے اس کے گھر بار کے کاروبار کا حرج ہو اور کیسا حال ہوا۔ یہی ہمارے بھائیوں کا حال ہے کہ جب دین کی رغبت دی جاتی ہے تو پوچھتے ہیں کہ دنیا بھی ملے گی۔

دنیا و آخرت میں بھی فرق مراتب کا لحاظ ضروری ہے

میں دنیا کی تحصیل سے منع نہیں کرتا لیکن یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ مقصود اصلی کیا چیز ہے۔ کیوں صاحب میں کہتا ہوں ہر شے اپنے مرتبہ پر ہونی چاہیے۔ یہ مسئلہ تمام عقلاء کا مسلمہ ہے جب یہ ہے تو دنیا اور آخرت میں بھی فرق مراتب ضروری ہے۔ دونوں کو اپنے مرتبہ پر رکھو۔ دیکھئے ایک چیز تو ایسی ہو جو صرف دس دن کام آئے اور دوسری چیز ایسی ہو جس کی عمر بھر ضرورت پڑے تو کیا دونوں کو ایک ہی مرتبہ پر رکھو گے۔ ہرگز نہیں ایک تو مستقل رہنے کا مکان ہوتا ہے اور ایک سرائے ہوتی ہے دونوں کے ساتھ ایک ہی سا معاملہ ہوتا ہے۔ مظفر نگر میں مقدمہ ہے یا کچھ اور کام ہے تو سرائے میں تین چار دن کے لیے قیام کرتے ہیں اگر وہاں کی چارپائی کی پٹی ٹوٹی ہوئی ہو تو پٹی بنوائیں گے لیکن یہ نہ دیکھیں گے کہ سال ہی کی ہو اور رندا بھی کی ہوئی ہو اور چارپائی کا بان بھی باریک ہو' اس کی بناوٹ میں پھول بھی پڑے ہوئے ہوں۔ بہت سے بہت یہ ہوگا کہ ضرورت سے گزر کر آسائش پر بھی نظر کرلیں گے کہ ذرا کسی ہوئی ہو' قبرسی نہ ہو' غرض ضرورت پر نظر ہوگی زینت پر نہ ہوگی کیونکہ تین دن کا گھر ہے' ایک اپنا وطن ہے وہاں مکان بناتے ہیں تو اس میں چالیس پچاس ہزار روپیہ صرف کرتے ہیں' نہایت عالی شان عمارت بنتی ہے اس میں زینت بھی

تجمل بھی کبھی کچھ ہوتا ہے اگر کوئی مظفرنگر کی سرائے میں اپنے وطن کے مکان کا سارا ساز و سامان لا کر لگا دے اور اگر سرائے کو سجا دے تو کیا نتیجہ ہوگا۔ اگلے دن سرائے کا نوکر اس کو نکال باہر کرے گا اور تمام جہاں اس کو احمق کہے گا کہ دیکھو اپنے اصلی گھر کے سامان کو چندروزہ سرائے کی نذر کر دیا۔

ہمارا اصلی گھر

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارا اصلی گھر کونسا ہے ظاہر ہے کہ آخرت ہی ہمارا اصلی گھر ہے۔ اگر آخرت پر عقیدہ نہ ہو تب بھی موت کا تو انکار ہی نہیں ہوسکتا۔ دیکھئے بعض فرقوں نے خدا کا بھی انکار کیا لیکن موت کا سب کو قائل ہونا پڑا اور وہ بھی اختیار میں نہیں کہ کب موت آ جائے تو طوعاً و کرہاً دنیا کو چھوڑنا پڑے۔ موت ایسی زبردست چیز ہے کہ اس کا سب کو قائل ہونا پڑا اور بالخصوص مسلمان کہ وہ تو موت کے بعد آخرت کی زندگی کے بھی قائل ہیں جو یقینی پیش آنے والی ہے اور زندگی طویل بھی اتنی ہے کہ جس کا کبھی خاتمہ ہی نہیں۔ بس وہیں کی زندگی اصلی زندگی ہے اور وہی ہمارا اصلی گھر ہے۔ اس کا سامان ہمارے اعمال ہمارا دین ہماری طاعات ہیں ان کو ہم عارضی گھر یعنی دنیا جو وہاں کے مقابلہ میں سرائے سے بھی بدرجہا کم ہے اس کے نذر کر رہے ہیں اور ہم نے جو کم کہا وہ اس لیے کہ فرض کیجئے اگر گھر پر پچاس برس عمر ہوئی تو سرائے کے چار دن کو پچاس برس کے ساتھ کچھ تو نسبت ہے لاکھواں کروڑاں کوئی حصہ ہوا۔ آخر دونوں متناہی ہیں۔ برخلاف اس کے دنیا اور آخرت میں وہ بھی تو نسبت نہیں' بہت سے بہت دنیا کی عمر سو برس آخرت کی ہزار کروڑ سنکھ مہاسنکھ جتنا بھی گن سکیں گے لیکن اس سے بھی زیادہ وہاں کی عمر۔ بس اتنی بڑی عمر جس گھر میں گزارنی ہے اس کے سامان کو اس چندروزہ سرائے دنیا پر نثار کر رہے ہیں۔ اسی طرح سے کہ اگر کسی نے مکان تعمیر کر دیا تو حلال حرام کی مطلق پروانہ کی' ایمان بھی گھر میں لگا دیا' دین بھی سامان بہم پہنچانے میں صرف کر دیا' نماز بھی اس کی نذر کر دی۔

دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کی عجیب مثال

غرض بالکل ایسی مثال ہے کہ گھر کی ساری ریاست کو مظفرنگر کی سرائے میں لگا دیا۔ دوسرے' تیسرے دن سرائے کے بھٹیارہ نے کان پکڑ کر باہر نکال دیا اور پھر اپنے کو سمجھتے ہیں کہ بڑے عاقل ہیں۔ اتنا بڑا مکان بنوا ڈالا اور اگر کوئی مولوی اس کی برائیاں بیان کرتا ہے تو اس کا نام زاہد خشک رکھا جاتا ہے اور ایسے مولویوں کو نئے نمازی' ہدیوں کے پلٹن' نکمے اپاہج' ضرورت زمانہ سے ناواقف' بیوقوف' بدتہذیب نہ معلوم کیا کیا لقب دیئے جاتے ہیں' کہتے ہیں کہ یہ لوگ کسی کام کے

نہیں۔ ایک صاحب نے مجھے لکھا تھا کہ مسلمانوں نے پانی سے صرف یہ کام لیا' وضو کرلیا' غسل طہارت کرلی' نہ بھاپ نکال کر مشینیں چلائیں نہ انجن ایجاد کیے' ان سے خدا تعالیٰ کے یہاں باز پرس ہوگی۔ لو صاحب خدا تعالیٰ اس پر بھی مواخذہ کریں گے کہ کلیں کیوں نہیں جاری کی تھیں تو جنہوں نے سائنس سے کام لیا انہوں نے خدا کی مرضی کو سمجھا' مسلمانوں نے کچھ بھی نہیں سمجھا۔ خدا کی پناہ (نعوذ باللہ) یہاں تک مذاق بگڑ گیا ہے کہ دنیا ہی کی ضرورت کو ضرورت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اعمال آخرت میں بھی یہ پوچھتے ہیں کہ دنیا کا بھی نفع ہے یا نہیں جیسے میں نے ابھی سب انسپکٹر کی حکایت بیان کی کتنی کایا پلٹ ہوگئی ہے حالانکہ مسلمان کی شان یہ ہونی چاہیے تھی کہ اگر اس کو کسی چیز میں دنیا کے نفع کی ترغیب دی جاتی کہ بھائی اس میں دنیا کا یہ نفع ہے فلانی غذا یا فلانی دوا بڑی طاقت بخش ہوتی ہے تو وہ فوراً سوال کرتا کہ طاقت حاصل کر کے مجھے کیا کرنا ہے یہ بتلاؤ کہ کچھ دین کا بھی بھلا ہوگا اور جب اس کو یہ بتلا دیا جاتا کہ طاقت حاصل ہوگی تو عبادت کی قوت ہوگی پہلے سے زیادہ عبادت ہو سکے گی تب راضی ہوتا کہ اگر یہ بات ہے تو لاؤ کھالوں گا۔ آج یہ سوال ہوتا ہے کہ نماز' روزہ کرنے میں کچھ ٹکے بھی ملیں گے' چنانچہ دنیا حاصل ہونے کے وظیفے اگر بتلائے جاتے ہیں تو نہایت شوق سے ان کو کیا جاتا ہے کیونکہ ان میں یہ امید ہے کہ ٹکے بھی ملیں گے۔

بے نمازیوں کو وظیفہ بتانے کی ایک ضروری شرط

مجھ سے تو اگر کوئی بے نمازی دنیا کا وظیفہ پوچھتا ہے تو میں ایسا وظیفہ تجویز کر دیتا ہوں جس میں پانچوں نمازوں کے پڑھنے کی قید ہوتا کہ اسی بہانہ سے نماز کی پابندی نصیب ہو جائے اور دنیا ہی کے طفیل آخرت کی طرف توجہ ہو جائے۔ اسی طرح یہاں بھی ایسی چیز حق تعالیٰ نے بتلائی ہے جس میں دین اور دنیا دونوں کا نفع ہے' وہ چیز ذکر اللہ ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ آیا اس کی ضرورت ہے یا نہیں دین کی حیثیت سے اس کا ضروری ہونا تو ظاہر ہے دیکھنا یہ ہے کہ دنیا کے اعتبار سے بھی ضروری ہے یا نہیں۔ دوسری بات یہ دیکھنی ہے کہ یہ ضرورت کسی اور چیز سے بھی حاصل ہو سکتی ہے یا نہیں۔

دنیا میں ہر شخص بس چین کا طالب ہے

اس کا ضروری ہونا تو اس سے ظاہر ہے کہ ہر شخص کسی نہ کسی چیز کا طالب ہے اور غور کر کے دیکھا جائے تو سب لوگ اپنی اپنی طلب میں صورۃً مختلف ہیں معنیً نہیں' دیکھئے ایک شخص اولاد کا طالب ہے وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح میں صاحب اولاد ہو جاؤں دوسرا کسی بڑے عہدہ کا طالب

ہے وہ اس دھن میں ہے کہ کسی صورت سے میں ڈپٹی کلکٹر ہوجاؤں یا جج ہوجاؤں۔ تیسرا ترقی کا طالب ہے وہ اس فکر میں ہے کہ کوئی ایسی تدبیر ہو کہ دو چار گاؤں ہاتھ آجائیں اور رئیس اعظم ہوجاؤں۔ ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ میرے پاس مکان بڑا عالیشان ہوجائے' ایک شخص ہے کہ وہ رات دن اسی کوشش میں ہے کہ میری حکام میں وقعت ہوجائے' آنریری مجسٹریٹ ہوجاؤں' درباروں میں کرسی ملنے لگے' غرض دنیا ہی کے مقاصد کو دیکھ لیجئے کہ ان میں کس قدر اختلاف ہے۔ کوئی کسی چیز کا طالب ہے کوئی کسی چیز کا اور ہر شخص دوسرے کے مقصد کو بے وقعتی کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ یہ بھی کوئی طلب کرنے کی چیز ہے تو بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص ایک جدا چیز کا طالب ہے لیکن یہ بات نہیں بلکہ ان مقاصد کے محض نام مختلف ہیں' معنی مختلف نہیں۔ غور کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ جملہ مقاصد صورۃً مختلف ہیں معنیً ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ درحقیقت یہ سب ایک ہی چیز کے طالب ہیں۔ وہ چیز کیا ہے اس کا نام ہے چین ہر شخص بس چین کا طالب ہے جو شخص بے قرار ہے اولاد کے لیے وہ سمجھتا ہے کہ اولاد ہوجائے گی تو میرے قلب کو چین ہوجائے گا جو ترقی کا طالب ہوگا وہ خیال کرتا ہے کہ میرے پاس دس گاؤں ہوجائیں گے تو مجھے چین ہوجائے گا۔ غرض جو شخص جس چیز کا طالب ہے اسی لیے کہ اس کے مل جانے پر اس کے قلب کو سکون اور راحت ہوجائے گی۔ خلاصہ یہ کہ چین اور راحت ہی کے سب طالب ہیں لیکن اس راحت کے حصول کے لیے سامان اور ذرائع ہر شخص نے اپنے زعم کے موافق مختلف تجویز کر رکھے ہیں۔ ان کا اختلاف محض نام کا اختلاف ہے۔

اختلاف خلق از نام اوفتاد　　چوں بمعنی رفت آرام اوفتاد

(مخلوق کی زبان کے اعتبار سے اس کے نام مختلف ہوگئے اور مقصود سب کا راحت یعنی آرام ہی ہے)

حکایت از مثنویؒ

حضرت مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ نے اس اختلاف کی عجیب مثال دی ہے کہ ایک سفر میں چار شخص کہیں رفیق ہوگئے تھے چاروں مختلف ملکوں کے رہنے والے' ایک ترکی' ایک فارسی' ایک عرب اور ایک رومی۔ کسی نے ایک درم جو چوانی کے برابر ہوتا ہے سب کی خدمت میں پیش کیا۔ سب کا انگور کھانے کو جی چاہا لیکن لغت مختلف بولے۔ عرب بولا میں تو اس درم کا عنب لوں گا۔ فارسی نے کہا نہیں میں تو انگور لوں گا۔ رومی نے کہا میں استافیل لوں گا' رومی زبان میں انگور کو استافیل کہتے ہیں۔ چوتھے نے اور کچھ کہا جو یاد نہیں' ترکی کی زبان میں انگور کو جو کچھ کہتے

ہوں۔ غرض آپس میں جھگڑا ہونے لگا' ایک شخص آیا جو سب زبانیں جانتا تھا' اس نے کہا کہ اچھا صبر کرو میں اسی درم میں تم سب کو چیزیں خرید لاؤں گا۔ چنانچہ وہ درم لے کر بازار سے انگور خرید لایا' عرب سے کہا کہ لو یہ ہے عنب یا نہیں' اس نے کہا کہ نعم' فارس سے کہا کہ یہ لو انگور اس نے کہا آرے بلے بیشک' اسی طرح سب نے اقرار کیا' انگور ہی سب کا مقصود تھا لیکن لغت کے اختلاف سے اس کے نام مختلف ہو گئے۔ اس مقام پر مولانا فرماتے ہیں:

اختلاف خلق از نام اوفتاد چوں بمعنی رفت آرام اوفتاد

(مخلوق کی زبان کے اعتبار سے اس کے نام مختلف ہو گئے اور مقصود سب کا راحت یعنی آرام ہی ہے)

ایک نے اپنے مقصود کا نام اولاد رکھا۔ دوسرے نے جائیداد گاؤں' ملکیت تیسرے نے حکومت عہدہ اعزاز لیکن معنی مقصود سب کے ایک ہی ہیں یعنی راحت ہر شخص راحت ہی کا طالب ہے۔

اہل دین بھی دراصل طالب راحت ہیں

راحت کی طلب وہ چیز ہے کہ اہل دنیا تو اہل دنیا اہل دین بھی اسی کے طالب ہیں۔ چنانچہ آخرت کی راحت کا مقصود ہونا ظاہر ہے۔ خلاصہ اس تمام تقریر کا یہ ہوا کہ ہر شخص کو بالذات راحت اور چین ہی مقصود ہے۔ گو بظاہر ہر شخص ایک مختلف چیز کا طالب نظر آتا ہو ظاہر کا اختلاف تو یہاں تک ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص ایک چیز کا طالب ہوتا ہے اور دوسرا طالب ہوتا ہے اسی چیز کے عدم کا کیونکہ دنیا میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں' آزاد بھی ہیں پابند بھی' بعضے لوگ تو ایسے ہیں کہ انہیں کہیں سے مثلاً بیس ہزار روپے مل جائیں تو وہ زندہ ہو جائیں اور مارے خوشی کے پھولے نہ سمائیں۔ برخلاف اس کے دوسرے کو اگر اتنا روپیہ ایک ساتھ مل جائے تو اسے تو ہونے لگے وحشت کہ اتنے سارے روپے کو آخر کروں گا میں کیا' یہ کہاں کا بکھیڑا پیچھے ہو گیا تو بظاہر ایک شخص بیس ہزار کا طالب ہے دوسرا طالب نہیں بلکہ اس کے عدم کا طالب ہے۔ لیکن حقیقت میں نہ وہ طالب ہے زر کا نہ یہ بے زری کا۔ دونوں راحت کے طالب ہیں اسے راحت ہے زر میں اسے راحت ہے بے زری میں۔ اسی طرح ایک شخص تو ایسا ہے کہ آنریری مجسٹریٹی اس کے سر مڑھی جاتی ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ خدا کے لیے ہمیں معاف رکھو ہم نہیں چاہتے آپ کی آنریری مجسٹریٹی۔ وہ سنتے ہی کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے کہ للہ مجھے معافی دیجئے میں یہ جھگڑا اپنے سر نہیں لینا چاہتا۔ دوسرا کوشش کر کے اس کو حاصل کرتا ہے اور حکام کی خوشامدیں کرتا پھرتا ہے کہ کسی طرح یہ عہدہ مجھے مل جائے بظاہر دونوں متضاد چیزوں کے طالب معلوم ہوتے ہیں لیکن درحقیقت دونوں

ایک چیز کے طالب ہیں' یعنی دونوں راحت کے طالب ہیں۔ اس نے دیکھا کہ راحت اسی میں ہے کہ اس بکھیڑے سے الگ رہوں' کہاں کی مصیبت ہے خواہ مخواہ اپنا چین بھی کیوں کھویا۔ دوسرا اس میں راحت سمجھتا ہے کہ مجسٹریٹی مل جائے گی تو خوب تماشا مخلوق کا دیکھنے کو ملا کرے گا۔ طرح طرح کے مقدمے' قسم قسم کے معاملات ایک کو اس میں راحت ہے کہ تماشا مخلوق کا دیکھے ایک کو اس میں راحت ہے کہ کسی کا تماشا نہ دیکھے۔ حکام نے ایک مسلمان رئیس کو نظر بند کرنا چاہا' اس سے پوچھا کہ تم کہاں رہنا چاہتے ہو اس رئیس نے کہا کہ میں مکہ میں رہنا چاہتا ہوں چنانچہ اس کو مکہ میں نظر بند کر دیا گیا وہاں وہ رئیس کمبخت حج کے موسم میں سڑک پر کھڑے ہو کر عورتوں اور مردوں کو دیکھا کرتا' ایک تو یہ حضرت تھے اور ایک وہ شخص ہے عورتوں اور مردوں سے بچنے کیلئے بستی کو چھوڑ کر جنگل میں رہنا اختیار کرتا ہے۔

بزرگے دیدم اندر کوہسارے نشستہ از جہاں درکنج غارے
چرا گفتم بشہر اندر نیائی کہ بارے بندئے از دل برکشائی
بگفت آنجا پریر ویان نغزند چو گل بسیار شد پیلاں بلغزند

(میں نے ایک بزرگ کو پہاڑوں میں دیکھا کہ وہ دنیا سے الگ ہو کر ایک غار میں بیٹھا ہوا ہے اس سے میں نے کہا کہ تم شہر میں کیوں نہیں آتے' یہ اس نے کہا وہاں خوبصورت لوگ ہیں اور جب کیچڑ زیادہ ہوتا ہے تو ہاتھی بھی پھسل جاتے ہیں)

دیکھئے یہ کہتا ہے کہ اس میں راحت ہے کہ کسی کو نہ دیکھوں اور وہ کہتا ہے کہ اس میں راحت ہے کہ سب کو خوب دیکھو۔ یہ بات ہے رائے کس کی صحیح ہے اس کی اس وقت گفتگو نہیں' میں ابھی یہ ثابت کر رہا ہوں کہ ہر شخص دراصل راحت کا طالب ہے اور لیجئے خلفاء کو' خلافت سے گھبراتے تھے' بعضے سلطنت کے لیے لڑتے مرتے ہیں' کسی نے سلطنت حاصل کرنے کے لیے باپ کو مار ڈالا' کسی نے بھائی کو قتل کر دیا' ان میں راحت ہے ان کو اس میں گو ایک راحت خیال ہی ہوا اور سنئے ایک بزرگ فرماتے ہیں:

زاہد نداشت تاب جمال پری رخاں کنجے گرفت وترس خدارا بہانہ ساخت

(عبادت گزار میں خوبصورتوں کے جمال کی تاب و برداشت نہ تھی لہٰذا اس نے تنہائی اختیار کی اور خدا کے خوف کو بہانہ بنایا)

باہر نکلے ہیں تو حسینوں پر نظر پڑتی ہے جس سے دل کے ٹکڑے ہوئے جاتے ہیں کہاں کی

مصیبت ہے عافیت تو اسی میں ہے کہ کونہ میں بیٹھ رہو۔ اسی گوشہ نشینی کو کسی دوسرے پیرایہ میں شیخ شیرازی فرماتے ہیں:

آنانکہ بہ کنج عافیت بہ نشستند — دنداں سگ و دہان مردم بستند
کاغذ بدریدند و قلم بشکستند — وزدست و زباں حرف گیراں رستند

(جن لوگوں نے تنہائی اختیار کر لی تو انہوں نے کتوں کے دانتوں اور لوگوں کے منہ کو بند کر دیا' کاغذ کو پھاڑ ڈالا اور قلم کو توڑ دیا اور اعتراض کرنے والوں کی زبان اور ہاتھ سے چھٹکارا پایا)

اسی طرح بعضے روپیہ پیسے کے عاشق ہوتے ہیں اور بعضے ایسے ہیں کہ وہ اس کے ذکر سے بھی گھبراتے ہیں۔

حکایت حضرت سلیم چشتی اور شاہجہان

حضرت سلیم چشتی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں شاہجہان بادشاہ ایک مرتبہ حاضر ہوا اور ایک بہت بڑی رقم نذر کی۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں اس کا کیا کروں گا۔ اول تو میرا خرچ ہی کچھ نہیں پھر جو کچھ تھوڑی بہت حاجت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ مجھے بھجوا دیتے ہیں میں اسے لے کر کیا کروں گا۔ شاہ جہان کے دل میں اس انکار سے شاہ صاحب کی بڑی وقعت ہوئی۔ ایک مولوی صاحب ہمراہ تھے۔ ایسے حضرات پر خشک ذی علم کو حسد ہوتا ہے انہوں نے سوچا کہ ان کی تو بادشاہ کی نظر میں بڑی وقعت ہوگئی لاؤ کوئی عیب نکالو۔ عیب نکالنے میں ایسے لوگ بڑے ماہر ہوتے ہیں جس وقت شاہ صاحب نے انکار کیا آپ کہتے ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَشِيْبُ الْمَرْءُ وَيَشِيْبُ فِيْهِ خَصْلَتَانِ اَلْحِرْصُ وَطُوْلُ الْاَمَلِ۝[1]

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ آدمی بوڑھا ہوتا ہے اور اس کے اندر دو خصلتیں جوان ہوتی ہیں۔ حرص اور طول امل آپ بوڑھے ہیں۔ لہٰذا آپ میں یہ دونوں خصلتیں ہونا لازمی ہیں کیونکہ حدیث کا غلط ہونا محال ہے۔ لہٰذا یہ آپ کا تصنع ہے کہ باوجود حرص کے روپیہ لینے سے انکار کر رہے ہیں۔ شاہ صاحب حرف شناس بھی نہ تھے لیکن سبحان اللہ کیا دنداں شکن جواب دیا فی البدیہہ یہ فرمایا کہ مولانا آپ حدیث کا مطلب ہی نہیں سمجھے' نرے پڑھنے سے کیا کام چلتا ہے۔ ''مولوی گشتی وآ نکہ نیستی'' حضور نے فرمایا ہے تو جوان وہی ہوگا جو پہلے سے پیدا ہوا

---

[1] (میزان الاعتدال: ۸۲۹۱)

ہو۔ الحمدللہ میرے اندر حرص کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی جو آج جوان ہوتی تم اپنی خبر لو کہ شروع ہی سے حرص تمہارے اندر پیدا ہوئی اور پرورش ہوتے ہوتے اب اس پر جوانی کا عالم ہے' دیکھو آج تمہارے بڑھاپے میں اس پر کیا جوبن چڑھ رہا ہے۔ میرے اندر تو بفضلہٖ حرص کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی جو آج بڑھاپے میں اس کے جوان ہونے کی نوبت آتی۔ اللہ اکبر کیا گہری بات فرمائی ہے۔ علم حقیقی انہیں حضرات کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کا مولوی صاحب سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ شاہ صاحب کا بس منہ دیکھ کر رہ گئے۔ بہرحال ایک وہ لوگ بھی ہیں جو روپیہ پیسے سے گھبراتے ہیں۔

حضرت سیدنا غوث پاک اور شاہ سنجر کی حکایت

ایک اور حکایت یاد آئی سیدنا غوث پاک کی' خدمت میں بادشاہ سنجر نے عریضہ لکھا کہ ایک حصہ میرے ملک کا ہے نیمروز' وہ میں آپ کی نذر کرتا ہوں کیونکہ آپ کی خانقاہ کا خرچ بہت زیادہ ہے مہمانوں کی کثرت رہتی ہے واردین صادرین کثرت سے آتے رہتے ہیں۔ حضرت غوث پاک اس کے جواب میں نہایت بے پروائی کے ساتھ لکھتے ہیں:

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد | دردل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبراز ملک نیم شب | من ملک نیمروز بیک جونمی خرم

(یعنی آدھی رات کو اٹھ کر جو نفلیں پڑھتا ہوں اور اللہ کی یاد میں مشغول رہتا ہوں' اس کے لطف کے سامنے سب گرد ہے حکومت اور سلطنت میں ملک نیمروز کو ایک جو کی برابر نہیں سمجھتا)

حضرت تو وہ کیا بات ہے ان کو اسی میں چین ملتا تھا تو دیکھئے ظاہر میں سب کے الگ الگ مطلوب ہیں لیکن حقیقت میں سب ایک ہی چیز کے طالب ہیں یعنی چین کے۔ یہ دوسری بات ہے کہ واقعی چین کس میں ہے جو آگے ثابت ہو جائے گا۔ جب یہ بات ہے تو دنیا کے طالب بھی واقع چین کے طالب ہیں تو چین دنیوی ضرورت کی چیز ہے کوئی ایسا نہیں جس کو راحت اور چین مطلوب نہ ہو۔ رہی آخرت سو آخرت کے چین کا مطلوب ہونا بالکل ظاہر ہے۔ کسی کو اس میں کلام ہی نہیں۔ بفضلہٖ ایک مقدمہ تو بخوبی ثابت ہو گیا کہ چین دنیا اور آخرت دونوں کی ضرورت کی چیز ہے۔ دوسرا مقدمہ یہ باقی رہا کہ چین کس چیز میں ہے۔ سو حق سبحانہ وتعالیٰ دعویٰ فرماتے ہیں کہ خدا ہی کی یاد میں چین منحصر ہے اب ذکر کے ضروری ہونے میں کیا شبہ رہا۔ اب اس کا ثابت ہونا رہا کہ چین صرف ذکر اللہ ہی میں ہے۔ سو یہ بات مشاہدہ سے معلوم ہو سکتی ہے کہ دنیا دار ہرگز راحت میں نہیں۔ ٹٹول لیجئے طالبان راحت اور اسباب راحت جمع کرنے والوں کو یعنی ایک وہ شخص ہے کہ

جس کی عمر گزر گئی سامان راحت جمع کرنے میں اور سامان جمع بھی ہو گیا۔ اول تو سب سامان جمع ہوتا نہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَاتَمَنّٰی" (عربی شعر)

ماکل ما یتمنی المرء یدرکه تجری الریاح بمالا تشهی السفن

(ہر وہ چیز جس کی انسان تمنا کرے اسے نہیں مل جایا کرتی کبھی ہوائیں کشتیوں کی خواہش کے خلاف چلتی ہیں)

یعنی کبھی ہوائیں مخالف ہوتی ہیں جو کشتی کے مقتضا کے خلاف ہے لیکن اگر ہر شخص اپنی سب تمنائیں حاصل بھی کرلے تب بھی راحت نہیں یعنی فرض کرو ایک شخص ایسا ہے کہ اس کی سب تمنائیں پوری ہو گئیں یعنی سامان راحت جسے وہ سمجھتا تھا وہ سب جمع ہو گیا لیکن خود راحت تو خدا ہی کے قبضہ میں ہے یعنی دیکھنا یہ ہے کہ سعی سے کیا چیز جمع ہو سکتی ہے راحت یا سامان راحت۔

دنیا میں کوئی شخص فکر و غم سے خالی نہیں

ایک شخص ہے کہ اس کا عہدہ بھی بڑا ہے، گاؤں بھی ہیں، نوکر چاکر بھی ہیں، حشم و خدم بھی ہیں، حکومت بھی، غرض سارا سامان راحت اور عیش کا جمع ہے۔ اول تو بہت کم ایسے ہوتے ہیں لیکن خیر آخر کوئی ایسا ہو بھی تو اس کو پیش نظر رکھ کر اس کی حالت دیکھئے اور تفتیش کیجئے کہ آیا اسے چین میسر ہے یا نہیں۔ میں سچ عرض کرتا ہوں چین پھر بھی اسے نصیب نہیں کوئی نہ کوئی پریشانی وہاں بھی ضرور پاؤ گے۔ اپنی عمر میں کوئی دنیا دار آرام میں نہیں۔ ایک شخص ہے کہ اس کے اولاد نہیں ہوتی، مدتوں تو اس غم میں رہا کہ اولاد نہیں ہوتی خیر اولاد بھی ہو گئی تو پھر اولاد کے اولاد نہیں ہوتی۔ اب اس غم میں ہے غرض کسی وقت فکر و غم سے خالی نہیں۔ یہ مسلم ہے اہل دنیا کے نزدیک بھی مشہور ہے کہ کسی مجرد شخص نے کسی عیالدار سے پوچھا کہ خیریت بھی ہے۔ اس نے بگڑ کر کہا کہ میاں خیریت ہوتی تمہارے یہاں کہ نہ گھر نہ بار۔ اکیلی جان آخر نکھٹو ٹھہرے۔ بس خیر ہمارے یہاں کیوں خیریت ہونے لگی، خیریت ہوتی ہے تم جیسے منحوسوں کے یہاں ہمارے یہاں تو اللہ کے دیئے ہوئے بیوی بچے بھی ہیں، پوتے پڑپوتے بھی، نوکر چاکر بھی، کسی کا سر دکھ رہا ہے، کسی کو دست آ رہے ہیں، کسی کی آنکھ دکھ رہی ہے، ہمارے یہاں کیسی خیریت تم اکیلے اپنی جان لیے ہو۔ اس لیے تمہارے یہاں ہمیشہ خیریت ہی خیریت رہتی ہے۔ خدا نہ کرے وہ دن کہ ہمارے یہاں ایسی خیریت ہو سو واقعی بالکل سچ ہے کہ جتنا سامان بڑھتا ہے غم بھی بڑھتا جاتا ہے۔ ایک حکایت ہے گلستان میں کہ کسی فقیر کو بادشاہت مل گئی تھی کسی نے مبارک باد دی تو اس نے کہا کہ میاں مبارک آباد کاہے کی دیتے ہو،

دی روز غم نانے داشتم امروز غم جہانے ۔ بچوں کو کہا کرتے ہیں کہ بادشاہ ہیں سبحان اللہ بادشاہی کی حقیقت کیا ہے بچپن کے زمانہ کے سامنے بادشاہوں کو تو ہم سے زیادہ فکر ہے ان سے تو غیب ہی زیادہ بےفکر ہیں' بچے تو بالکل ہی بےفکر ہوتے ہیں ان سے نسبت کیا' بادشاہوں کو۔ خلاصہ یہ کہ جتنا سامان بڑھتا جاتا ہے اتنی ہی پریشانی بڑھتی چلتی جاتی ہیں۔ خوب فرماتے ہیں ایک بزرگ:

ومن یحمدالدنیا لعیش یسرہ فسوف لعمری عن قلیل یلومھا

(یعنی جو آج دنیا کی مدح تعریف کر رہا ہے واللہ وہ بہت جلد اس کی مذمت کرے گا)

اذا ادبرت کانت علی المرء حسرۃ

وان اقبلت کانت کثیرا ھمومھا

(دنیا ایسی چیز ہے کہ جب یہ آتی ہے تو سینکڑوں پریشانیوں کو اپنے ساتھ لاتی ہے اور جب یہ جاتی ہے تو حسرت وافسوس چھوڑ جاتی ہے نہ اس کا آنا پریشانی سے خالی نہ اس کا جانا پریشانی سے خالی' شروع سے اخیر تک بس پریشانی ہی پریشانی ہے)

دنیا کا زیادہ ہونا پوری مصیبت ہے

سو واقعی حضرت خدا تکلیف سے تو بچا دے' دنیا ہو مگر بقدر ضرورت۔ لیکن اس کا زیادہ ہونا پوری مصیبت۔ مثلاً کسی نے ایک ہزار روپیہ دے دیا بس قبضہ میں آتے ہی سبق شروع ہو گیا اب اس کی حفاظت کی فکر میں ساری ساری رات نیند نہیں آتی۔ غرض اس کے آتے ہی پریشانی تو نقد موجود ہے۔ چور صاحب اگلے ہی دن ساری کی ساری رقم ایک ساتھ اڑا ہی لے جائیں اور ان صاحب کو اسے برتنے کا موقع بھی نہ ملے پھر اس کے چور جانے کے بعد جو غم اور پریشانی ہوئی وہ نفع میں رہی۔ مشہور ہے کہ ایک چور کسی کا گھوڑا چرا کر لایا' راستہ میں ایک اور چور ملا جو اس سے بھی زیادہ شاطر تھا اس نے پوچھا کہ میاں گھوڑا بیچتے ہو' انہیں بھلا ایسا موقع کہاں ملتا کہ ادھر چرا کر لائے ادھر خریدار موجود۔ پکڑے جانے کا بھی کھٹکا نہ رہے' کہا ہاں بیچتے تو ہیں' دوسرے چور نے کہا کہ بھائی پہلے سوار ہو کر دیکھ لیں کہ کوئی عیب تو نہیں تو تم میری جوتیاں تھاموں میں آٹھ دس قدم اسے چلا کر دیکھ لوں۔ جوتیاں تو اس کے ہاتھ میں دیں اور رکاب میں پاؤں رکھ کر اوپر چڑھ ایڑی مار یہ جا اور وہ جا۔ چور صاحب جوتیاں ہاتھ میں لیے دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ کسی نے پوچھا میاں جو تم گھوڑا لیے جاتے تھے وہ کیا ہوا۔ کیا بیچ دیا' کہا ہاں بیچ دیا' پوچھا کتنے میں گیا کہا جتنے میں لائے تھے اتنے میں گیا اور یہ جوتی نفع میں رہی' مفت لیا تھا مفت گیا یہ جوتیاں نفع میں ملیں خیر بھاگتے چور کی لنگوٹی

ہی سہی۔ اسی طرح وہ ایک ہزار کیا آئے ایک مصیبت اپنے ساتھ لائے اور گئے تو ایسی برکت کر گئے ایک تو روپیہ جانے کا غم اوپر سے یہ پریشانی مفت کی کہ پولیس میں رپٹ لکھاؤ۔ مستغیث نہ بنو تو جرم اور بنو تو سینکڑوں جھگڑے ایسے موقعوں پر بعض پولیس الٹا مستغیث سے وصول کرتی ہے نہ تو رپٹ کو جھوٹا قرار دے کر الٹا مستغیث کا چالان کر دے یہ پریشانی اور پولیس کا خوف گھاٹے میں رہا جیسے اس چور کو جوتیاں نفع میں رہی تھیں۔ بڑے جوتے تو یہ ہیں کہ ہزاروں طرح کے غم روپیہ کے آنے کی اتنی خوشی نہ ہوئی تھی جتنا کہ جانے کا غم ہوگیا۔ رات بھر تو حفاظت کی فکر میں چین نہ آیا اور صبح دیکھتے ہیں تو صندوقچہ ندارد۔ میں اپنی ہی کہتا ہوں۔ میرے پاس کوئی چیز ہدیہ آتی ہے تو آتے ہی بس غم سوار ہو جاتا ہے کہ اس کو کس کام میں لاؤں۔ جب تک اس کی ضرورت ذہن میں نہیں آ جاتی۔ ہمیشہ اس کی فکر رہتی ہے کہ کہاں استعمال کروں، ڈر بھی لگتا ہے کہ کہیں حق تعالیٰ کی ناشکری نہ ہو کہ نالائق ہم تو تجھے دیتے ہیں اور تو گھبراتا ہے۔ بعضی چیز تو ایسی ہوتی ہے کہ آتے ہی کام میں آ جاتی ہے لیکن بعضی چیز ایسی آتی ہے کہ سوچنا پڑتا ہے کہ آخر اس کا کروں کیا یا تو کسی کو دیدی یا اگر بخل کا غلبہ ہوا تو سوچا کہ اجی مفت کسی کو کیوں دیں۔ لاؤ بیچو جی بیچ کر دام کھرے کر لیے اور ضروری موقعوں پر خرچ کر لیا، اللہ اللہ خیر صلا، اس کا موجود رہنا بار ہوتا ہے۔

زیادہ اسباب کی خرابیاں

میں دیکھتا ہوں کہ گھروں میں سامان کثرت سے بھرا پڑا ہے اور اس کے استعمال کی کبھی عمر بھر بھی نوبت نہیں آتی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قلب پر ایسے فضول سامان کا بار ہے یا نہیں اگر نہیں ہے تو میں ضرور کہوں گا کہ قلب بے حس ہو گیا ہے ورنہ ضرور الجھن ہوتی۔ مجھے تو اس تصور ہی سے وحشت ہوتی ہے کہ میری ملک میں بھی ضرورت سے زیادہ چیزیں ہوں چاہے ان چیزوں سے خود مجھے سابقہ کبھی نہ پڑتا ہو لیکن خیال ہوتا ہے کہ میری ملک ہی میں ایسی فضول چیزیں کیوں ہوں۔ آخر ان کا ہوگا کیا، بہت ہی الجھتی ہے طبیعت کہ جو چیز کام میں نہ آئے وہ گھر میں کیوں رہے۔ مفت میں پہرہ کی چوکی دینا، حمال ہونا، مزدور بنا، فضول کا دردسر خوب کہا ہے صائب نے

نفس قانع نیست صائب ورنہ اسباب معاش
آنچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست کو

(اے صائب حرص کی وجہ سے قناعت حاصل نہیں ہوئی ورنہ دنیوی اسباب جن کو ہم اپنے استعمال میں رکھتے ہیں اکثر غیر ضروری ہیں)

واقعی ہر شخص ٹٹول کر دیکھ لے کہ جتنی چیزیں گھر میں موجود ہیں ان میں اکثر ضرورت کی نہیں ہیں بلکہ بعض اوقات تو چیز کے آنے پر ضرورت تصنیف کی جاتی ہے کہ فلانے کام میں لگالیں گے۔ چیز کیا آئی ایک کام بڑھ گیا۔ اب تک جو نہ تھا لیجئے آج وہ شغل بھی تیار ہے۔ اے اللہ جن کے یہاں سامان بے حد بھرا پڑا ہے انہیں کیسے چین آتا ہوگا۔ وہ سامان کہ جس کی فہرست بھی نہیں کہ کیا کیا چیز ہے اور جس کی خبر بھی نہیں کہ کہاں پڑا سڑ رہا ہے اور جو اس طرح حاصل کیا گیا کہ کسی کا گلا کاٹ کر کسی کا حق مار کر، سینکڑوں گناہ سمیٹ کر وہ آج یوں ہی بیکار پڑا پڑا دیمک لگ کر ختم ہو گیا اور مالک صاحب کو پتہ بھی نہیں۔ ایچولی ضلع میرٹھ میں ایک دلہن جہیز میں پندرہ سو کے کپڑے لائی تھی۔ بھلا کس کام آئیں گے ان سب کے استعمال کی کبھی نوبت نہ آئے گی کیونکہ وہ تو اتنے ہیں کہ پرنواسی بلکہ سکڑ واسی تک بھی ختم نہ ہوں۔ بس ہمیشہ ہوا اور دھوپ دیا کرو اور پھر ویسے کے ویسے ہی بند کر کے رکھ دو۔ بھلا کیا فائدہ نکلا سوا اس کے کہ ایک شغل بڑھ گیا۔ یہ ابا جان نے سلوک کیا کہ ایک اچھی خاصی مصیبت عمر بھر کے لیے جان کو لگا دی ہے۔ یہ ہے زیادہ اسباب کی خرابی، یہ دوسری بات ہے کہ کسی کی حس ہی باطل ہو گئی ہو اور اس کو یہ مصیبت مصیبت ہی نہ معلوم ہوتی ہو جیسے حس باطل ہو جاتی ہے کہ کوکین سے جیسے کوکین کھاتے کھاتے زبان بے حس ہو جاتی ہے اسی طرح چونکہ خرافات کے عادی ہو رہے ہیں اس لیے قلب بے حس ہو گیا ہے۔

مرتے وقت انہماک فی الدنیا کے خسارہ کا احساس

لیکن ایک وہ وقت بھی آنے والا ہے کہ یہ سن اترے گی اس وقت یہ افکار سانپ اور بچھو کا کام دیں گے، وہ کونسا وقت ہوگا وہ ہوگا موت کا وقت۔ چنانچہ حدیث میں ہے: "اَلنَّاسُ نِیَامٌ فَاِذَا مَاتُوْا اِنْتَبَھُوْا"[۱] مرتے وقت آنکھ کھلے گی اس وقت ادراک درست ہوگا اس وقت معلوم ہوگا کہ یہ غم جائیداد کا، ساز و سامان کا، گھر کا لیکن فضولیات کا ضروریات کا نہیں کیسا ستاتا ہے اس وقت احساس ہوگا کہ قلب پر ان کی جدائی سے کس قدر بار اور گرانی ہوتی ہے کوئی غم سانپ کی خاصیت رکھے گا کوئی بچھو کی خاصیت کہ ہائے میں چلا۔ ہائے یہ ساری چیزیں مجھ سے چھوٹیں ہائے میرے بعد نہ جانے اس کا کیا حال ہوگا۔ "وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِ نِ الْمَسَاقُ" خدا بچائے جس نے تعلقات ضروریات سے زیادہ بڑھا رکھے ہیں اور انہیں میں رات دن انہماک ہے۔ اس کو سخت کشاکشی پیش آنے والی ہے مرنے کے وقت سانپ

---

[۱] (اسرار المرفوعہ: ۳۶۸)

بچھوؤں کا قبر میں تو عذاب ہو ہی گا اس کا نمونہ مرنے کے وقت دنیا ہی میں دیکھ لے گا۔ جن صاحبزادہ کے واسطے جائیداد چھوڑ جانے کی فکر میں حلال حرام کی تمیز نہ کی وہ خوش ہیں کہ ابا مر رہے ہیں خوب گل چھرے اڑادیں گے' باواجان کی مصیبت ہے کہ چاروں طرف کے خیالات سانپ بچھو بن کر لپٹ رہے لیکن اے صاحب آپ ہی نے تو یہ سانپ بچھو لپیٹے ہیں۔ خود بخود تو جمع نہیں ہوگئے۔ میں پھر کہے دیتا ہوں اور بار بار کہے دیتا ہوں کہ یہ سب تقریر فضولیات کے متعلق ہے۔ ضروریات اس سے بالکل مستثنیٰ ہیں لیکن ضروریات وہ جو واقعی ضرورت ہو۔ تصنیفی ضرورت نہیں۔ یعنی بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے پاس وہ چیزیں نہیں ہیں ان کا ان کے بغیر کچھ بھی حرج نہیں۔ بعضی چیزوں کے تو نام بھی ہمیں نہیں معلوم مثلاً جواہرات ہمارے پاس نہیں ہیں تو بدوں ان کے ہمارا کونسا کام اٹکا ہوا ہے ان کے حصول کے درپے ہوتا ہے فضول حرکت ہے یا نہیں۔ البتہ جو چیزیں فضول نہیں ان سے ہم تعرض نہیں کرتے۔ اب تقریبات میں جو محض نام ونمود اور شان کے لیے فضولیات میں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے ان کی بھلا کون سی ضرورت ہے۔ یہ سب تصنیف کی ہوئیں ضرورتیں ہیں۔ اول ایسی ضروریات تصنیف کیں پھر ان کے پورا کرنے کے لیے جائز ناجائز بٹورنا شروع کردیا۔ پھر اسی طرح سلسلہ وار لاکھوں ضرورتیں اپنے سر لپٹا لی ہیں ہر ہر چیز عذاب ہے۔ اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ○

یعنی آپ کو خوشنما نہ معلوم ہوں ان کے اموال واولاد کیونکہ اللہ تعالیٰ یوں چاہتا ہے کہ اولاد اور اموال سے انہیں دنیا ہی میں عذاب دیں' آخرت میں عذاب الگ ہوگا۔ دنیا ہی میں اولاد واموال کو آلہ تعذیب بنادیں' دنیا ہی میں عذاب ہوجائے۔ حقیقت میں یہ عذاب ہی ہے' بعضوں کو تو مال کی حفاظت کی فکر میں سونا نصیب نہیں' جیسے سانپ خزانہ پر جاگتا ہے ویسے ہی یہ لوگ رات بھر جاگتے ہیں اس بہانہ سے تہجد بھی شروع کردیا' ذکر وشغل بھی کررہے ہیں اور غرض وہی ہے حفاظت مال۔ اگر آج سارا ذخیرہ جاتا رہے تو پھر تہجد بھی ختم پھر کہاں کا ذکر اور کس کا شغل۔ تو رات بھر خود اس طرح پہرہ دیتے ہیں کیونکہ چوکیداروں پر بھی کیا بھروسہ کیا اگر جائیداد ہوئی تو مقدمہ بازی سے فرصت نہیں کبھی تو اس کی فکر کہ فلانے نے نالش کردی ہے ایک جگہ جیتے دوسری جگہ ہارے اسی طرح ہائیکورٹ پہنچتے پہنچتے ہزاروں کے وارے نیارے ہوگئے۔ اگر

ہائیکورٹ تک پہنچ کر اخیر میں نالش خارج بھی ہوگئی تب بھی پورا کورٹ تو ہو ہی گیا۔ کبھی اس کا غم کہ ہائے اتنا خرچ کیا پھر بھی مقدمہ خارج ایک مصیبت ہے۔

چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد

(جب مرتا ہے مبتلا مرتا ہے جب اٹھتا ہے مبتلا اٹھتا ہے)

یہی اولاد کی کیفیت ہے اول تو مدتوں کی آرزوؤں کے بعد خدا خدا کر کے اولاد ہوئی پھر کوئی بچہ بیمار اہوا یہاں تک کہ مایوسی تک نوبت پہنچ گئی۔ اب پریشان ہیں کہ اے اللہ کیا ہوگا' اگر یہ مر گیا تو میں کیونکر زندہ رہوں گا' ہائے کیا ہوگا' قبل از مرگ واویلا مرے' سنا غم بھی نہ ہوگا۔ جیسی تکلیف اس سوچ میں ہے کہ ہائے اگر مر گیا تو کیا ہوگا غرض کسی طرح چین نہیں' بے چین ہیں پریشان ہیں۔ یہ مزا ہے اولاد کا اور اموال کا' فرمایئے یہ مصیبت ہے یا نہیں۔ اسی کو فرماتے ہیں: "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ بِهَا" (جب مرتا ہے تو اپنے خیالات میں آلودہ ہوتا ہے اور جب سنتا ہے تو اپنے خیالات میں آلودہ ہوتا ہے)" فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا" دنیا ہی میں آلہ عذاب ہے جس کے اس مال اور اولاد کی کثرت ہے اس کی حالت یہ ہے کہ ہر وقت ایک عذاب جان میں مبتلا ہیں پھر بتلایئے ایسے شخص کی بابت کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ چین میں ہے ہرگز نہیں۔ دنیا دار کوئی چین میں ہو ہی نہیں سکتا۔

ایک مطلب خیز حکایت

میں نے ایک حکایت نہایت مطلب خیز اور میرے اثبات مدعا میں واضح اور صریح اپنے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب سے سنی ہے کہ کسی شخص کو جو دلی کا رہنے والا تھا۔ حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کی بڑی تمنا تھی کیونکہ سنا تھا کہ حضرت خضر علیہ السلام بڑے مقبول الدعوات ہیں ان سے دعا کرائیں گے بعضوں کو یہ خبط بھی ہوتا ہے اور اس خبط میں ان کی حیات اور موت کو پوچھتے ہیں۔ چنانچہ جب میں دیوبند میں پڑھتا تھا ایک صاحب کا خط حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں آیا تھا۔ اس میں پوچھا تھا کہ آیا حضرت خضر علیہ السلام ابھی تک زندہ ہیں۔ مولوی صاحب تھے بڑے زندہ دل جواب لکھوایا کہ بھائی ان کا میرے پاس بہت دن سے کوئی خط نہیں آیا خبر نہیں زندہ ہیں یا مر گئے۔ بہت دن سے خیریت نہیں آئی جب کوئی خط آئے گا تو اطلاع دوں گا۔ لوگ بھی کیا فضول سوال کرتے ہیں۔ مطلب کیا ہمیں اس تحقیق سے ہمارے خضر علیہ السلام اور ہمارے عیسیٰ علیہ السلام کون ہیں؟ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم جن کی وہ شان ہے کہ اگر اس زمانہ میں سارے انبیاء دوبارہ دنیا میں تشریف لے آئیں تو سب آپ کے اُمتی

ہوکر رہیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب آسمان سے تشریف لائیں گے تو ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شریعت کے تابع ہوں گے پھر بھی ہم کو خضر علیہ السلام کی ڈھونڈ ہے بس ہمیں تو ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کافی ہیں ہمیں کسی کی تلاش نہیں چاہیے۔ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حضرت خضر علیہ السلام خود ایک بار تشریف لائے اور مصافحہ کیا۔ مصافحہ کر کے حضرت ابراہیم بن ادھم پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ یعنی اللہ کی یاد میں' حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ نے مجھے پہچانا نہیں' حضرت ابراہیم بولے کہ میں نے اس کی کچھ ضرورت نہیں سمجھی' انہوں نے فرمایا کہ میں خضر علیہ السلام ہوں۔ آپ نے کہا ہوں گے' یہ کہہ کر پھر مشغول ہو گئے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ بھائی تم تو بڑی بے پروائی سے ملے' لوگ تو برسوں میرے ملنے کی آرزو میں رہتے ہیں اور ملاقات نصیب نہیں ہوتی۔ فرمایا بڑے نادان ہیں جو خدا کی طلب کو چھوڑ کر آپ کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا نہیں خدا ہی کے واسطے مجھے ڈھونڈتے ہیں مجھ سے دعا کراتے ہیں۔ حضرت ابراہیم بن ادھم نے فرمایا کہ اچھا آپ میرے لیے یہ دعا کر دیجئے کہ میں نبی ہو جاؤں' فرمایا یہ تو نہیں ہو سکتا' کہاں یہ نہیں ہو سکتا تو آپ مہربانی کر کے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے' میرا حرج ہوتا ہے خیر یہ تو ان کا ایک حال ہے' ایک وہ لوگ ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں لیکن ملتے نہیں ایک یہ تھے کہ خود ان کے پاس آئے اور انہوں نے پروا بھی نہ کی۔ وہ شخص بھی وظیفے پڑھتا تھا' دعا کراتا تھا لیکن حضرت خضر علیہ السلام ملتے ہی نہ تھے' اتفاق سے ایک روز کہیں ملے گئے اس شخص نے پہچانا نہیں کیونکہ ظاہری کوئی علامت تو تھی نہیں اور یہ جو عوام میں مشہور ہے کہ ان کے ہاتھ کے انگوٹھے میں ہڈی نہیں ہوتی لاحول ولاقوۃ یہ بالکل واہیات لغویات ہے۔ غرض حضرت خضر علیہ السلام نے خود ہی اس شخص سے کہا کہ میں خضر علیہ السلام ہوں' کہہ کیا کہتا ہے میری اس قدر کیوں تلاش تھی۔ احمق نے طلب بھی کیا تو کیا کہتا ہے کہ حضرت میرے لیے یہ دعا کر دیجئے کہ میں دنیا میں بے فکر ہو کر زندہ رہوں۔ حضرت آپ دعا تو کر دیں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے پھر وہی کہا ارے بھائی میں ایسی دعا نہیں کر سکتا' ایسے کام کے لیے کیا دعا کروں جو ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر بیٹا کہے کہ میرے لیے یہ دعا کر دو کہ میں اپنے باپ کا باپ ہو جاؤں تو بھلا یہ ہے لغو فرمائش کہ نہیں؟ کیونکہ ایسا ممکن ہی کہاں ہے۔ جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے اخلاق سے یہ جواب دیا کہ خیر ایسی دعا مانگنا تو بے ادبی کی بات ہے کیونکہ ایسا ہونا عادت اللہ کے خلاف ہے ہاں

تم تمام ولی میں جس کو اپنے نزدیک بے فکر سمجھو اسے منتخب کرلو پھر میں یہ دعا کروں گا کہ اے اللہ یہ شخص بھی ایسا ہی ہو جائے جیسا فلانا۔ میں تمہیں چھ مہینے کی مہلت دیتا ہوں اس درمیان میں اطمینان سے تلاش کر رکھنا میں چھ مہینے کے بعد پھر تم سے ملوں گا اس وقت اپنی رائے سے مطلع کرنا وہی شخص دل میں بڑا خوش ہوا کہ یہ کیا مشکل بات ہے دلی میں ہزاروں امراء ہیں شاہی کارخانہ ہے بڑے بڑے دولت مند اور رئیس موجود ہیں ایسا شخص مل جانا بہت آسان ہے۔ چنانچہ اس نے دلی میں گھومنا شروع کیا اور ایک ایک رئیس کو دیکھنا شروع کیا جب کسی شخص کے بارے میں رائے قائم ہوتی کہ اس جیسا ہونے کی دعا کراؤں گا اندرونی حالات تفتیش کرنے پر وہ بھی کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا نکلتا' یہاں تک کہ چھ مہینے کی میعاد ختم ہونے کو پہنچی۔ اب انہیں بڑا تردد ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام کو کیا جواب دوں گا۔ معلوم ہوتا ہے واقعی دنیا میں کسی کو آرام نہیں' چین جس کا نام ہے کسی کو میسر نہیں' اخیر میں ایک جوہری پر اس کا گزر اہوا' دیکھا کہ لاکھوں کا کارخانہ ہے' بڑا ساز وسامان' سینکڑوں مکان اور دکانیں عالیشان فرش فروش حشم خدم' اولاد بھی کثرت سے غرض سارا سامان عیش کا موجود ہے اور خود گاؤ تکیہ لگائے نہایت اطمینان کے ساتھ ہٹا کٹا سرخ سفید بیٹھا ہوا ہے کچھ کام بھی نہیں' کارندے ایسے معتمد کہ سب کام انہیں کے ذریعے سے نہایت خوبی اور انتظام کے ساتھ ہو رہے ہیں اس جوہری کو دیکھ کر یہ حضرت بڑے خوش ہوئے کہ الحمدللہ جیسا شخص میں چاہتا تھا ویسا مل گیا۔ بس اسی جیسا ہونے کی دعا کراؤں گا' لیکن سوچا کہ بھائی احتیاطاً اس سے مل تو لو چنانچہ ملے سارا قصہ خضر علیہ السلام کی ملاقات کا اور اپنی دعا کی درخواست کا سنایا اور کہا کہ ساری دلی میں بس تم ایک شخص ملے ہو جن کو کوئی فکر نہیں۔ اب میں حضرت خضر علیہ السلام سے یہی دعاء کراؤں گا کہ تم جیسا ہو جاؤں۔

یہ سن کر اس جوہری نے ایک آہ سرد کھینچی اور کہا کہ للہ مجھ جیسا ہونے کی دعا ہرگز نہ ہو۔ اس کو بڑا تعجب ہوا کہا میاں تم صاحب جائیداد ہو' صاحب اولاد ہو' تندرست ہو' ہر طرح کا آرام' ساز و سامان' حشم و خدم' نوکر چاکر' دنیا بھر کی نعمتیں موجود ہیں اور پھر کوئی کام بھی نہیں اب اور کیا چاہیے' پھر بھی کہتے ہو کہ ایسی مصیبت خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے' بڑی ناشکری حق تعالیٰ کی ہے۔ جوہری نے کہا کہ خیر اب تم سے کیا چھپاؤں' بھائی میری تو بڑی دردناک حکایت ہے۔ ماجرا یہ ہے کہ جب میری شادی ہوئی تو قسمت سے بیوی مجھے نہایت حسین جمیل ملی' اس سے مجھے بے حد محبت ہوگئی' شادی ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد وہ سخت بیمار ہوئی' یہاں تک کہ نوبت مایوسی تک پہنچ گئی میں

رونے لگا' اس نے کہا کہ یہ سب جیتے جی کی محبت ہے' مردوں کو کبھی باوفا نہیں دیکھا' یہ لوگ بڑے بیوفا ہوتے ہیں' میں مرجاؤں گی تم دوسری شادی کرلو گے' میں نے کہا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا' میری محبت تمہارے ساتھ بھلا ایسی ہے؟ تمہارے بعد میں کہیں دوسری بیوی کرسکتا ہوں' یہ تم کیا خیال کرتی ہو' اس نے کہا یہ سب باتیں ہیں کہیں آج تک کوئی بھی رُکا ہے جو تم رُکے رہو گے۔ چونکہ مجھے اس سے واقعی بے حد محبت تھی میں نے کہا کہ اچھا تمہیں یوں یقین نہیں آتا تو لو میں ضرورت ہی کو حذف کیے دیتا ہوں اور وہیں استرا لے کر میں نے اپنا اندام نہانی کاٹ کر الگ کردیا اور کہا کہ اب تو تمہیں یقین آئے گا کیونکہ جڑ ہی نہ رہی تو ضرورت شادی کی ہو۔

اس بھلے مانس نے بھی کمال ہی کیا کہ اڈا ہی اڑا دیا جیسا ایک افیونچی نے کیا تھا۔ ایک افیونچی صاحب پینک میں بیٹھے مزے لے رہے تھے ایک مکھی بار بار اس کی ناک پر آبیٹھتی' وہ جھنجھلا کر اسے اڑا دیتا پھر آبیٹھی پھر اڑا دیتا' پھر آبیٹھی بعضی کبھی کچھ ہوتی ہی ہے ایسی ضدی' آپ کو جو غصہ آیا تو استرا لے کر اپنی ناک ہی اڑا دی اور مکھی کو خطاب کر کے بڑے اطمینان سے کہتے ہیں کہ لے سسری اب بیٹھ کہاں بیٹھتی ہے۔ اب تیرا اڈا ہی نہیں رہا جہاں بیٹھے اسی طرح ان حضرت نے بیوی کے سارے احتمالات کی جڑ ہی کو اڑا دیا۔ قصہ مختصر کہ وہ کمبخت پھر مری نہیں اچھی ہوگئی اور اب تک زندہ ہے ادھر میں بیکار ہو ہی چکا تھا ادھر اس کی جوانی۔ بس اس نے میرے نوکروں سے ساز باز کرلیا' اب یہ جس قدر اولاد تم دیکھتے ہو یہ سب میرے نوکروں کی عنایت ہے' ایک مدت ہوئی اس بے حیائی کو کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں لیکن کچھ نہیں کہہ سکتا بھلا کیا منہ لے کر روکوں اور کس بوتے پر منع کروں' رات دن اسی غم میں گھلتا ہوں اور کچھ نہیں کرسکتا۔

یہ سن کر وہ شخص انگلی منہ میں داب کر حیرت میں رہ گیا اور افسوس کرنے لگا جوہری نے کہا کہ میں تو تم سے پہلے ہی کہتا تھا کہ مجھ جیسے ہونے کی ہرگز دعا نہ کرانا لیکن تمہاری سمجھ میں آتا ہی نہ تھا۔ اب تو معلوم ہوگیا اور میں یہ بھی تم سے کہے دیتا ہوں کہ دلی تو دلی دنیا میں کوئی شخص ایسا نہ ملے گا جو بے فکر ہو۔ تم کس خبط میں مبتلا ہو۔ اس خیال کو چھوڑ دو اور جاؤ آخرت کی درستی کی دعا کراؤ۔ میعاد مقرر ختم ہونے کے بعد حضرت خضر علیہ السلام پھر اس شخص کو ملے' دریافت فرمایا کہو کیا رائے ہے کونسا شخص تم نے منتخب کیا اسے بڑی ندامت ہوئی۔ عرض کیا کہ حضرت کیا عرض کروں واقعی حضرت سچ فرماتے تھے' اب مجھ کو اس کا عین الیقین ہوگیا کہ دنیا میں کوئی چین سے نہیں' حضرت خضر علیہ السلام ہنسے اور فرمایا کہ ہم نہ کہتے تھے لیکن تمہیں یقین ہی نہیں آتا تھا۔ اب تو دیکھ لیا خیر

اب بولو کہ کیا چاہتے ہو۔ عرض کیا کہ حضرت بس آخرت کی درستی کی دعا کر دیجئے۔ چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام نے دعا فرمادی اور وہ شخص ولی کامل ہو گیا۔ سو حضرت واقعی دنیا میں کہیں چین نہیں ہے تلاش کر کے دیکھو تب میرے کہنے کا یقین آئے۔ یہ میرا دعویٰ ویسے لفظاً تو مختصر سا ہے لیکن باعتبار تحقیق کے بہت بڑا ہے۔ بالکل سچی بات ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں میں تم کو کیسے یقین کرادوں محض دلائل عقلیہ اس کے لیے کافی نہیں ہیں بلکہ یہ تو مشاہدہ کے متعلق ہے۔

آپ ایک سرے سے سب سے بڑے بڑے بڑے دنیا داروں کو دیکھنا شروع کیجئے کبھی کسی کو چین سے نہ پائیں گے اگر اس میں بکھیڑا سمجھیں تو میں ایک بات مشابہ دلیل عقلی کے عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ ہر شخص اپنے معاملات میں غور کر لے کہ اول تو کسی کی ہر تمنا پوری ہوئی نہیں کچھ نہ کچھ کسر رہ جاتی ہے لیکن خیر اگر کسی طرح سارا سامان راحت بہم پہنچا بھی لیا جائے تب بھی چین جس کا نام ہے وہ ہرگز کسی کے قبضہ میں نہیں بڑے بڑے سامان والوں کو بھی دنیا میں راحت میسر نہیں عادت اللہ یوں ہی جاری ہے اب دوسری حالت کو لیجئے یعنی جو خدا کی یاد میں مشغول ہیں کیا معنی کہ جو اس کے دھیان میں رہتے ہیں اور اس کی پوری پوری اطاعت کرنے والے ہیں کیونکہ بیٹھ کر اللہ اللہ کر لینا محض یہی نہیں اللہ کی یاد۔

حق تعالیٰ شانہ کی اصلی یاد

پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ یاد کسے کہتے ہیں یاد میں سب داخل ہے نام جپنا دھیان رکھنا اس کے ساتھ تعلق پیدا کرنا اور اصلی یاد یہی ہے اس کو حکیم سمجھنا یعنی اس کی حکمت کا اعتقاد رکھنا اس کو رحیم سمجھنا یعنی اس کی رحمت کا اعتقاد رکھنا یہ سب خدا کی یاد میں داخل ہے جس نے اس طریقہ سے اللہ کی یاد کی واللہ آپ دیکھ لیجئے گا اور میں تو بعد دیکھنے ہی کے کہتا ہوں کہ وہاں ایسا سخت قرنطینہ ہے کہ گو جسم پر اثر ہو لیکن ان کے قلب تک پریشانی نہیں پہنچتی۔

اہل اللہ ہر کے رنج والم میں مسرور رہنے کا سبب

میں نہیں کہتا کہ وہ کسی مصیبت میں مبتلا نہیں ہوتے یا ان کا کوئی دشمن نہیں ہوتا یا ان کی کوئی غیبت نہیں کرتا ان کو کوئی برا بھلا نہیں کہتا۔ یہ سب قصے ہوتے ہیں اور ان قصوں سے انہیں غم بھی ہوتا ہے رنج بھی ہوتا ہے تکلیف بھی پہنچتی ہے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن پریشانی اور الجھن نہیں ہوتی جو کہ اصل چیز ہے تکلیف کی اگر کوئی ظاہری تکلیف بھی انہیں پہنچتی ہے تو اس میں بھی ان کے قلب کو چین ہی ملتا ہے وہ عین غم کی حالت میں بھی مسرور رہتے ہیں آپ کہتے ہوں گے کہ یہ شخص عجب اُلٹی تقریر کر رہا ہے اجتماع ضدین ثابت کرنا چاہتا ہے جو کہ تمام عقلاء کے نزدیک محال ہے لیکن نہیں۔

میں انشاء اللہ تعالیٰ آپ ہی کے منہ سے کہلوالوں گا کہ یہ حالت ممکن ہے اور دنیا میں بکثرت واقع ہے۔ فرض کیجئے آپ کا کوئی محبوب ہے جس کی جدائی میں گھل گھل کر آپ کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ صرف ہڈیاں اور پسلیاں باقی رہ گئی ہیں اسی حالت میں مدتوں کے بعد دفعتاً کہیں وہ آنکلا اور مشتاقانہ آپ کو بغل میں لے کر زور سے دبایا' ادھر آپ غایت درجہ کمزور اور ناتواں ادھر وہ ہٹا کٹا۔ بھلا میں اب آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کو اس کے دبانے سے تکلیف نہیں ہے۔ تکلیف تو ایسی ہے کہ ہڈی اور پسلی ٹوٹی جاتی ہے لیکن یہ سوچئے کہ اس تکلیف کا اثر قلب تک بھی ہے یا نہیں اگر آپ واقعی عاشق ہیں تو واللہ تکلیف تو کیسی قلب میں آپ محسوس کریں گے کہ گویا رگ رگ میں جان آرہی ہے اور یوں کہیں گے:

ایں کہ می بینم بہ بیداری ست یا رب بخواب

(یہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں نہ معلوم خواب کی حالت ہے یا بیداری کی)

ہائے یہ میری قسمت کہ جس کو ایک نظر دیکھنا بھی نصیب نہ ہوتا تھا وہ اسی طرح آ کر بغلگیر ہو حتیٰ کہ وہ محبوب اگر یوں کہے کہ میرا دبانا اگر تم کو ناگوار ہو تو یہ تمہارا رقیب موجود ہے جو میرا اشتاق ہے اور میرے ساتھ ہم کنار ہونے کا بہت آرزومند ہے تمہیں چھوڑ کر اس کے ساتھ یہی معاملہ کرنے لگوں اگر تمہیں کچھ تکلیف ہو رہی ہو تو کہہ دو۔ ایسی حالت میں عاشق کیا کہے گا یہ کہے گا:

نہ شود نصیب دشمن کو شود ہلاک تیغت — سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(خدا کرے دشمن کو یہ بات میسر نہ ہو کہ وہ تیری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے)

بلکہ اگر سچ مچ قتل بھی کردے تب بھی وہ بزبان حال یہی کہے گا:

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے — یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

(قتل سے بھی اس کو کلفت نہ ہوگی اگرچہ تکلیف سے کراہے بھی تڑپے بھی مگر وہ تکلیف طبعی ہوگی قلب کے اندر پریشانی نہ ہوگی)

اسی طرح اہل اللہ کو اگر کوئی صدمہ پیش آتا ہے تو ان کی وہی حالت ہوتی ہے۔ جیسی میں نے ابھی بیان کی کہ عاشق کو معشوق کے دبوچنے سے تکلیف تو ہے لیکن اندر سے قلب نہایت راضی ہے نہایت خوش ہے اس کے جسم کو تکلیف ہے لیکن روح کو آرام ہے اگر ان کا بیٹا مرجائے تو وہ محزون بھی ہوں گے آنکھ سے آنسو بھی جاری ہوجائیں گے لیکن قلب کے اندر پریشانی نہ ہوگی کہ ہائے یہ کیا ہوگیا اب کیسی ہوگی۔ ایسا نہ ہوتا تو اچھا ہوتا میں بقسم کہتا ہوں پھر بقسم کہتا ہوں

اور پھر بقسم کہتا ہوں کہ یہ نہیں ہوتا کہ حسرت ہو اور ارمان ہو کہ ہائے یہ رہتا بلکہ ان کا قلب نہایت مطمئن ہوتا ہے کہ یہ بالکل مناسب ہو۔ الحمد للہ جو کچھ ہوا بہت ٹھیک ہوا بالکل حکمت ہے سراسر رحمت ہے بلکہ انہیں تفصیلاً حکمتیں معلوم ہو جاتی ہیں ایمان ان کا درجہ حال میں ہوتا ہے۔ درجہ اعتقاد میں تو سب مسلمانوں کا ہے ان کو حال کا درجہ حاصل ہوتا ہے یہی راز ہے کہ انہیں خدا سے زیادہ محبت ہوتی ہے بہ نسبت مخلوق کے یہ نہیں کہ انہیں مخلوق کی محبت نہیں ہوتی۔ مخلوق کی محبت بھی ہوتی ہے لیکن واللہ ثم واللہ مخلوق کی محبت محبت حق کے مقابلے میں بالکل مغلوب۔ گویا معدوم ہو جاتی ہے۔ موازنہ کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ غالب غالب ہی ہے اور مغلوب مغلوب۔

چو سلطان عزت علم برکشد ‎ ‎ ‎ جہاں سر بجیب عدم درکشد
اگر آفتاب است یک ذرہ نیست ‎ ‎ ‎ دگر ہفت دریاست یک قطرہ نیست

(جب عزت کا بادشاہ یعنی خداوند عالم ظاہر ہوتا ہے تو تمام دنیا معدوم ہو جاتی ہے۔ جب سورج نکلا ہو اس وقت ذرہ کی سوئی حقیقت نہیں اور جس وقت سات سمندر موجود ہوں تو ایک قطرہ قابل توجہ نہیں)

جس وقت محبوب حق کا غلبہ ہوتا ہے چاہے محبت مخلوق بھی ہو اور مخلوق کے کسی صدمہ سے کلفت بھی ہو لیکن اندر سے پریشانی نہیں ہوتی وہ کلفت پر بھی راضی ہے اور وہ خوش ہے کہ ہمارے لیے یہی مصلحت ہے اسی میں حکمت ہے یہی حال اس کا دعا کے ساتھ ہے کہ عین دعا کے وقت بھی تقاضا نہیں ہوتا کہ ایسا ضرور ہو ہی جائے اگر نہ ہو تو بھی تنگی نہیں ہوتی وہ اس پر بھی دل سے راضی ہے کہ خدا کی یہی رحمت ہے۔ غرض مذہب اس کا یہ ہے:

چونکہ برمیخت بہ بندو بستہ باش ‎ ‎ ‎ چوں کشاید چابک و برجستہ باش

(جس وقت تجھ کو میخ پر باندھ دیں تو بندھا رہ اور جس وقت کھول دیں اچھل کود)

اور اس کا یہ مذہب ہوتا ہے:

ناخوش تو خوش بود برجان من ‎ ‎ ‎ دل فدائے یار دل رنجان من

(اس کی ناخوشی بھی مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ میرے دل کو رنج پہنچانے والے معشوق پر قربان ہوتا ہے)

خواہ غم ہو یا خوشی راحت ہو یا تکلیف ہر حالت میں وہ راضی اور خوش ہے اس کا مذہب یہ ہوتا ہے:

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ‎ ‎ ‎ دل شد مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(اگر تو مجھے زندہ کرے تو یہ تیری بخشش ہے اور اگر مار ڈالے تو میں تجھ پر قربان، میرا دل تیری محبت میں مبتلا ہے جو کچھ تو کرے تیری مہربانی ہے)

اب اس سے بڑھ کر کیا ہے کہ سب سے زیادہ اپنا مرنا ہے۔ آدمی زبان سے تو کہتا ہے کہ مجھے مرنے کی کچھ پروانہیں لیکن امتحان کے وقت اس کا دعویٰ غلط ثابت ہوتا ہے تو سب سے بڑھ کر اپنی موت کا معاملہ ہے لیکن اللہ والوں کو اپنی موت کی بھی پروانہیں اور ایک حیثیت سے اپنے مرنے سے بھی زیادہ اہم اپنی اولاد کا مرنا ہے کیونکہ وہ محبوب ہوتی ہے اور محبوب کی جان اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے مگر ان کی حالت موت اولاد کے وقت بھی یہ ہوتی ہے کہ

اکابرین کے صدمات میں صبر جمیل کے چند واقعات

ہمارے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جوان صاحبزادے کا عین عین عید کے دن انتقال ہوا۔ ادھر جوان بیٹے کے نزع ہو رہی ہے ادھر نماز کا وقت قریب ہے۔ مولانا نے ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ لو بھائی خدا کے سپرد ہم تو اب جاتے ہیں کیونکہ ہمیں نماز پڑھنی ہے۔ انشاء اللہ اب قیامت میں ملاقات ہوگی۔ یہ کہہ کر رخصت ہو گئے اور نماز کا اہتمام شروع کر دیا' آنکھ سے تو آنسو جاری تھے لیکن ایک کلمہ بھی بے صبری کا زباں سے نہیں نکلا' خوش تھے کہ اللہ کی یہی مرضی ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے جوان صاحبزادے کا انتقال ہو گیا 'لوگ تعزیت کے لیے آئے لیکن چپ بیٹھے ہیں کہ کیا کہیں۔ اہل اللہ کا رعب ہوتا ہے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ کچھ کہے اور آخر کہتے بھی تو کیا کہتے۔ اگر کہے کہ رنج ہوا تو اس کے اظہار کی کیا ضرورت اگر کہے کہ صبر کیجئے تو وہ خود ہی کیے بیٹھے ہیں۔ آخر ہر جملہ خبر یہ کہ کوئی نہ کوئی غایت تو ہونی چاہیے بڑی دیر کے بعد آخر ایک نے ہمت کر کے کہا کہ حضرت بڑا رنج ہوا۔ فرمایا معلوم ہے کہنے کی کیا ضرورت ہے' پس پھر سارا مجمع چپ' لوگ آتے تھے اور کچھ دیر چپ بیٹھ کر چلے جاتے تھے۔ حضرت حاجی صاحبؒ کے انتقال کا صدمہ حضرت مولانا کو اس درجہ ہوا تھا کہ دست لگ گئے تھے اور کھانا موقوف ہو گیا تھا لیکن کیا مجال کہ کوئی کچھ ذکر کر دے۔ میں بھی اس موقع پر حاضر ہوا اب میں وہاں پہنچ کر متحیر کہ یا اللہ کیا کہوں۔ آخر چپ ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ ایک مولانا ذوالفقار علی صاحب تھے' حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے والد بڑے عاشق مزاج اور حضرت حاجی صاحب کے والہ وشیدا۔ ان کا یہ رنگ تھا کہ جب میں حضرت حاجی صاحب کے انتقال کے بعد اول مرتبہ ان سے ملنے گیا تو میری صورت دیکھتے ہی بڑے جوش کے ساتھ کہا:

بنال بلبل اگر بامنت سر یاری ست ۔۔۔ کہ مادو عاشق زاریم کار ما زاری ست

(اے بلبل اگر تجھ کو میری دوستی کا خیال ہے تو رو کیونکہ ہم دونوں لاغر عاشق ہیں اور ہمارا کام رونا ہی ہے)

اور آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے میں آبدیدہ ہو گیا' خیر وہاں کچھ دل کی بھڑاس نکلی۔

حضرت مولانا گنگوہی پر اتنے بڑے بڑے صدمات پڑے لیکن کیا ممکن کہ کسی معمول میں ذرا فرق آ جائے' چاشت' تہجد' اوابین کوئی معمول قضا تو کیا کبھی مؤخر بھی نہیں ہونا پایا۔ یہاں تک کہ کھانا بھی جب سامنے آیا تو اسے بھی خدا کی نعمت سمجھ کر کھالیا۔ آنے والے کو یہ حالت دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ انہیں کچھ بھی رنج نہیں۔ حالانکہ رنج اس قدر ہوتا تھا کہ میں نے ایک عریضہ صاحبزادہ کی تعزیت کا لکھا تھا اس کے جواب میں مجھے فقط یہ لکھا کہ شدت ضبط سے قلب و دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ مجھ کو حیرت ہوئی تھی کہ یہ بھی کیسے ظاہر فرما دیا' بے حد عنایت تھی کہ اتنا لکھ دیا ورنہ وہاں ضبط کی یہ شان تھی کہ کسی طرز سے پتہ نہ چلتا تھا نہ چہرہ سے نہ زبان سے وہی معمولات وہی اذکار اشغال وہی تعلیم' تلقین کسی معمول میں ذرا فرق نہیں۔ واللہ یہ تعلق مع اللہ کی قوت ہے' یہ وہ قوت ہوتی ہے کہ:

موحد چہ برپائے ریزی زرش   چہ فولاد ہندی نہی برسرش

امید و ہراسش نباشد زکس   ہمیں ست بنیاد توحید وبس

(موحد کے پیروں میں روپیہ کا خواہ ڈھیر لگا دیا جائے یا اس کے سر پر ہندوستانی تلوار رکھی جائے اس کو کسی سے امید و خوف نہ ہوگا توحید یہی ہے بس)

ان کا اعتقاد اور حال یہ ہوتا ہے کہ لا معبود الا اللہ' لا حکیم الا اللہ' لا مقصود الا اللہ کسی چیز کا اثر ان پر نہیں ہوتا۔ یعنی عقل کو اور حواس کو پریشان نہیں کرتا باقی اثر کیوں نہ ہوتا وہ بے حس تھوڑا ہی ہو جاتے ہیں بلکہ ان کی سی حس تو کسی میں نہیں ہوتی۔ قلب پر بھی ان کے اثر ہوتا ہے مگر وہ اثر پریشانی کی حد تک نہیں پہنچتا۔ بات یہ ہے کہ وہ سب شقوق پر رضا مندر ہتے ہیں کہ یوں ہو جائے بہت اچھا یوں ہو جائے بہت اچھا کسی حال میں ناراضی نہیں۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں اس کیفیت کے بیان کرنے کی' خدا نصیب کرے تو معلوم ہو۔

قدر ایں مے نہ شناسی بخدا تانہ چشی

(اس شراب محبت کی قدر خدا کی قسم اس وقت تک نہیں پہچان سکتے جب تک کہ اسے خود ہی نہ چکھ لو)

نہایت ہی اطمینان ہوتا ہے قلب کو ذوقی امر ہے بیان سے سمجھ میں نہیں آ سکتا تاہم لوگوں کو اگر خود وہ کیفیت حاصل نہیں ہے تو اس کے آثار کو تو دیکھ لیں۔ آگ نہ نظر آئے تو اس کا دھواں تو نظر آتا ہے۔ دیکھئے سب سے بڑی چیز اپنی موت ہے اس کے ساتھ دیکھ لیجئے ان حضرات کا کیا

معاملہ ہے۔ حضرت حافظ فرماتے ہیں اور کس ذوق وشوق سے فرماتے ہیں:

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے تا در میکدہ شاداں وغزل خواں بروم

(وہ کیا ہی خوشی کا دن ہے کہ میں اس اجاڑ دنیا سے چلا جاؤں اور جان کی آرام وآسائش کو تلاش کروں اور معشوق کے پیچھے چلا جاؤں میں نے منت مانی ہے کہ اگر غم ایک روز آخر ہو جائے گا تو میں شراب خانہ کے دروازہ تک شاداں اور غزل پڑھتا ہوا جاؤں گا)

حکایت حضرت فرید الدین عطار

حضرت فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ پہلے عطاری کی دکان کیا کرتے تھے ایک دن اپنی دوکان پر بیٹھے نسخے باندھ رہے تھے۔ ایک درویش کمبل پوش دوکان کے آگے کھڑے ہو کر انہیں تکنے لگے دیر تک اسی حالت میں دیکھ کر حضرت عطار نے فرمایا کہ بھائی جو کچھ لینا ہو لو کھڑے کیا دیکھ رہے ہو درویش نے کہا میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری دوکان میں خمیرے شربت معجونیں بہت سی چمکتی ہوئی چیزیں بھری پڑی ہیں میں سوچ رہا ہوں کہ مرتے وقت تمہاری روح کیسے نکلے گی جو اتنی چمکتی ہوئی چیزوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس وقت حضرت عطار کو باطن کا تو چسکا تھا ہی نہیں بے دھڑک کہہ بیٹھے کہ جیسے تمہاری نکلے گی ویسے ہی ہماری بھی نکل جائے گی درویش نے کہا کہ میاں ہمارا کیا ہے اور کمبل اوڑھ کر وہیں دوکان کے سامنے لیٹ گیا۔ اول تو حضرت عطار یہ سمجھے کہ مذاق کر رہا ہے لیکن جب بہت دیر ہو گئی تو شبہ ہوا پاس جا کر کمبل اٹھایا تو وہ درویش واقعی مردہ تھا۔ بس ایک چوٹ دل پر لگی اور وہیں ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو کر گر پڑے افاقہ ہوا تو دیکھا کہ دل دنیا سے بالکل سرد ہو چکا تھا اسی وقت دوکان لٹا کر کسی پیر کی تلاش میں نکلے پھر وہ طریق کے اندر کتنے بڑے عارف ہوئے ہیں کہ مولانا فرماتے ہیں:

ہفت شہر عشق را عطار گشت ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

(حضرت عطار رحمۃ اللہ علیہ نے عشق کے ساتوں ملکوں کی سیر کروائی اور ہم ابھی تک ایک ہی گلی میں پڑے ہوئے ہیں)

سلاطین کو اولیاء اللہ کی روحانی دولت کا علم نہیں

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اگر سلاطین کو اس دولت کی خبر ہو جائے جو ہمارے پاس ہے تو تلواریں لے کر ہم پر چڑھ آئیں کہ لاؤ ہمیں دو۔ واللہ یہی بات ہے اس دولت کے سامنے کچھ حقیقت نہیں سلطنت کی۔ حضرت حافظ فرماتے ہیں اور مجھ سے سوائے اس کے کہ جن کا یہ حال تھا

ان کے اقوال نقل کروں اور کیا ہوسکتا ہے۔فرماتے ہیں:

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے   بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہاؤ ہوئے

(دل کے اطمینان کے ساتھ تھوڑی دیر نظر ایک معشوق پر کرنا اس سے بہتر ہے کہ بادشاہت کی چھتری سر پر ہو اور دن رات شوروغل مچا ہو)

اسی کو خاقانی کہتے ہیں:

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بہ خاقانی   کہ یکدم باخدا بودن بہ از ملک سلیمانی

(خاقانی کو تیس سال کے بعد اس بات کی تحقیق ہوئی کہ خدا کے ساتھ ایک گھڑی مشغول ہونا حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت سے بہتر ہے)

بالکل سچ بات ہے میں کس طرح آپ کو یقین دلاؤں۔ ہاں ایک تدبیر بتلاتا ہوں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر یوں سمجھ میں نہ آئے تو خود امتحان کر لیجئے اور جن کی یہ حالت ہے کہ کچھ دن ان کے پاس رہ کر دیکھئے میرے دعویٰ کا یقین آجائے گا۔اس کام کے لیے چھ مہینے خالی کرو تین ماہ تو دنیا کے متمول لوگوں میں جا کر رہو اور تین مہینے اللہ والوں میں اور ان دونوں کی اندرونی حالت کی تفتیش کرو کہ کس کی زندگی کس طرح گزر رہی ہے واللہ آپ دوزخ اور جنت کا فرق پائیں گے۔ یہ میں نہیں کہتا کہ حضرات اہل اللہ کبھی بیمار نہیں پڑے یا ان کا کبھی کوئی بیٹا نہیں مرتا یا ان پر کوئی مصیبت نہیں آتی اول تو واقعی ان پر مصیبتیں کم آتی ہیں اور اگر ایسا موقع ہوتا بھی ہے تو وہ پریشان نہیں ہوتے صورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً پریشان نہیں ہوتے اور یوں تو آخر وہ بھی بشر ہیں۔ واقعات سے ان کو بھی گرفت ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات ان سے بعض معاصی بھی صادر ہو جاتے ہیں یہ نہیں ہے کہ وہ فرشتے ہو جاتے ہیں اور ان کو گناہ کا میلان ہی نہیں ہوتا جیسا کہ بعض عوام کا اعتقاد ہے اور واقعی میلان کا ہونا یہی تو کمال ہے۔ گناہوں سے بچنے میں فرشتوں کا کیا کمال ہے کیونکہ انہیں میلان ہی نہیں ہوتا اس غرہ میں نہ رہنا۔ حضرت ان کو میلان ہی ایسا ہوتا ہے جیسا اوروں کو بلکہ بعض دفعہ اوروں سے بھی زیادہ کیونکہ ان کی حس نہایت لطیف ہو جاتی ہے مگر وہاں اس کے ساتھ ہی چونکہ اللہ تعالیٰ سے پورا تعلق ہے اس لیئے تقاضائے نفس کے روکنے میں جو کلفت ہوتی ہے اس کو برداشت کرتے ہیں اور واللہ اس کلفت میں بھی ایک لذت ہوتی ہے سلطنت کی لذت کچھ حقیقت نہیں مثلاً ابتلاء ہو گیا کسی صورت کے ساتھ بلا قصد و باوجود اہتمام احتراز ہوتا ہے ایسا کیونکہ ادھر تو ان کا ادراک لطیف ہوتا ہے اور پھر کسی کی تحقیر قلب میں ہوتی نہیں اس لیے ان کو جس سے ہوتا ہے بے حد میلان ہوتا ہے۔بس یہ حالت ہوتی ہے:

درون سینہ من زخم بے نشان زدہ　　　بحیرتم کہ عجب تیرے بے کماں زدہ

(میرے سینہ کے اندر تو نے ایسا زخم لگایا جس کا نشان نہیں ظاہر میں حیرت میں ہوں کہ تو نے عجیب بے کمال تیر لگایا ہے)

مگر ساتھ ہی چونکہ انہیں محبت کا تعلق حق تعالیٰ سے ہوتا ہے طبعی بھی اور عقلی بھی اس لیے وہ محبت اس محبت پر غالب ہوتی ہے اور وہ اس کو غالب کرتے ہیں عمل کر کے یعنی اس کے مقتضا پر عمل نہ کرنا۔ کف عن المعصیت (گناہ سے روکنا) نظر کو روکنا خیال کو رونا۔ تصورات کو روکنا گو اس میں سخت ضیق پیش آتی ہے لیکن اس کو برداشت کرتے ہیں اپنے محبوب حقیقی کے واسطے۔ پھر ایک وجدانی حلاوت محسوس ہوتی ہے اس کی بدولت قول سعدی کے عموم میں وہ بھی داخل ہیں۔

خوشا وقت شوریدگان غمش　　　اگر ریش بینند دگر مرہمش

دمادم شراب الم درکشند　　　دگر تلخ بینند دم درکشند

(اس کے غم میں شوریدہ حال لوگوں کا کیا ہی اچھا وقت ہوتا ہے خواہ زخم دیکھیں یعنی مصیبت پہنچے خواہ مرہم دیکھیں یعنی ان کو سامان راحت نصیب ہو۔ وہ ہر وقت تکالیف کی شراب پیتے ہیں اور اگر وہ کڑوی ہو تو چپ رہتے ہیں شکایت نہیں کرتے)

اس ضبط کا کیا اثر ہوتا ہے بس تھوڑے ہی دنوں کے بعد لذت آنے لگتی ہے کہ یہ ساری کلفت تھی کسی کے لیے اور وہ بزبان حال کہتے ہیں:

بجرم عشق تو ام میکشند غوغایست　　　تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشایست

(تیرے عشق کے جرم میں لوگ مجھے کھینچ رہے ہیں اور ایک شور برپا ہے آپ بھی اے معشوق ذرا چھت پر آ کر دیکھیں کہ کیا تماشا ہے)

بس اس سے ان کو حظ ہوتا ہے کہ محبوب حقیقی کے لیے یہ سب کلفتیں برداشت کر رہے ہیں۔

خوردن از برائے گلے خارہا　　　برنداز برائے دلے بارہا

(ایک پھول کے واسطے بہت کانٹے کھاتے ہیں اور ایک دل کے واسطے بہت بوجھ برداشت کیے جاتے ہیں)

اور وہ کبھی ہمت نہیں ہارتے ان کا عمل اس پر ہوتا ہے

طلب گار باید صبور و حمول　　　کہ شنیدہ ام کیمیا گر ملول

(طالب کو صابر اور متحمل ہونا چاہیے میں نے نہیں سنا کہ کیمیا گر آزردہ ہو)

اوران کا یہ مذہب ہوتا ہے جیسا کہ کہتے ہیں: حضرت عارف شیرازی

ہمینم بس کہ داند ماہ ردیم — کہ من نیز از خریداران ادیم

(ہمارے لیے یہی بہت ہے کہ میرا معشوق یہ جان لے کہ میں اس کے چاہنے والوں میں سے ہوں)

چاہے کوئی لذت بھی نہ ہو، فرحت بھی نہ ہو، اگر لذت اور فرحت کے لیے امتثال کیا تو کب امتثال کیا لذت اور فرحت کچھ بھی نہ ہو پھر بھی وہ کہتے:

ہمینم بس کہ داند ماہ ردیم — کہ من نیز از خریداران ادیم

(ہمارے لیے یہی بہت ہے کہ میرا معشوق یہ جان لے کہ میں اس کے چاہنے والوں میں سے ہوں)

بس محبوب حقیقی کے راضی کرنے کے لیے اب سب کلفتوں کو برداشت کرو۔ پھر خواہ وہ ان کلفتوں کو مٹا دیں، نفس و شیطان پر غالب کر کے اور راحت فرمادیں یا اسی طرح کشاکشی میں مبتلا رکھیں مگر اپنی طرف سے اپنے لیے کوئی حالت تجویز نہ کرے۔ نفس کے روکنے میں جو کلفتیں پیش آئیں برداشت کرو اور کچھ نہیں تو وہ تو دیکھیں گے کہ میرے راضی کرنے کے لیے کیسے کیسے تقاضوں پر غالب آ رہا ہے، باقی میں بشارت دیتا ہوں کہ چند روز تو امتحان ہوگا پھر ادھر سے مدد شروع ہوگی اور انشاء اللہ آپ کو سب تقاضوں پر غالب کر دیا جائے گا۔ کیوں صاحب پہلوانوں کو کشتی لڑتے نہیں دیکھا۔ پہلوان پورا زور صرف کرتا ہے تب مقابل کو پچھاڑتا ہے، بیکار ہو کر تو نہیں کھڑا ہوتا۔ اسی طرح تمہارا نفس و شیطان سے مقابلہ ہے اور تم یہ چاہتے ہو کہ دل کے اوپر کوئی مار نہ ہو اور غلبہ ہو جائے۔ پوری کوشش کرو، سرکار عالی ہمت دیکھ کر اگر تم میں قوت بھی نہ ہوگی غالب آنے کی تب بھی غالب کر دیں گے جب دیکھیں گے کہ عاجز آ گیا ہے خود مدد فرمادیں گے، تم اپنا سارا زور صرف کر کے تو دیکھو، اگر کہو کہ صاحب اختیار میں نہیں تو یہ صریح قرآن و حدیث کی تکذیب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو گناہ سے بچنے کی قدرت عطا فرمائی ہے

قرآن و حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ نے گناہ سے بچنے کی قدرت عطا فرمائی ہے اس قدرت سے کام لو جب تم عامل ہو گے تو تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ واقعی ہمیں قدرت حاصل ہے۔ رہا شیطان سو بخدائے لایزال میں سینکڑوں قسمیں کھاتا ہوں کہ مومن پر شیطان کا غلبہ نہیں ہو سکتا۔ ہر مومن ہر شیطان پر غالب ہے۔ مثلاً نظر حرام کے موقع پر آنکھ اپنی نیچی رکھیں۔ پھر شیطان کیا زبردستی اس پر کرے گا۔ ہاں شاید کوئی شیطان الانس ایسا بھی کر دے تو آنکھیں بند کر لے اور اگر اس پر بھی نہ مانے اور زبردستی آنکھیں چیر کر کھولے تو نظر کی شعاع کو

آگے نہ بڑھنے دے۔ یہ تو اس جابر کے اختیار میں نہیں۔ غرض کوئی بات نہیں جو انسان نہیں کر سکتا' ہاں تکلیف ضرور ہوتی ہے سو اس کو برداشت کرنا چاہیے' خدا کے ساتھ تو نسبت اور پھر تکلیف سے بچنا چاہو۔ حضرت بلا تکلیف اٹھائے تو کچھ ہی نہیں ہو سکتا۔

ناز پروردہ تنعم نہ برد راہ بدست　　　عاشقی شیوہ رنداں بلا کش باشد

(عیش وعشرت میں پرورش پائے ہوئے دوست تک راہ نہیں لے جاتا یعنی راہ قطع کر کے دوست تک نہیں پہنچ سکتا۔ عاشقی تو مصیبت جھیلنے والے رندوں کا شیوہ ہے)

اپنی طرف سے تو ساری عمر تکلیف میں رہنے کے لیے آمادہ ہو جانا چاہیے پھر مالک چاہے دو دن بھی تکلیف میں نہ رکھے تم کو تجویز کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔ یہ خدائی ہے یا بندگی ہے۔ جناب یہ بندگی ہے کوئی کھیل نہیں ہے۔ بس اپنا مذہب یہ رکھنا چاہیے۔

چونکہ بر میخت بہ بندو بستہ باش　　　چوں کشاید چابک و برجستہ باش

(جس وقت تجھ کو میخ باندھ دیں' بندھ جا اور جس وقت کھول دیں تو اچھل کود)

سوچو تو کہ اگر خدانا کردہ ساری عمر کے لیے کوئی بیماری لگ جائے مثلاً اندھا ہو جانا ہے تو کیا مر رہو گے' آخر برداشت کرو گے اور عمر اسی طرح ختم کر دو گے۔

شہید اکبر

اسی طرح اگر حق تعالیٰ کسی باطنی مصیبت میں مبتلا کر دے تو صبر کرو انشاء اللہ غالب آؤ گے اور اگر کلفت برابر بھی رہے گی تو کیا ہے اگر اسی میں مر گئے تو شہید اکبر مرو گے۔ حدیث شریف میں ہے: "مَنْ عَشَقَ فَكَتَمَ وَعَفَّ مَاتَ شَهِيْدًا"[1] اگر کوئی عشق میں مبتلا ہو جائے اور عفت اختیار کرے اور دوسرے کو رسوا نہ کرے بلکہ اپنے عشق کو چھپائے یہاں تک کہ وہ اسی حالت میں مر جائے تو وہ شہید مرتا ہے' تصور بھی خلاف شریعت نہ کرے چاہے اس گھٹن اور تکلیف سے مر ہی جائے لیکن خلاف شریعت کوئی کام نہ کرے۔ سنو تو آخر کسی دن تو مرو گے یہ کیوں چاہتے ہو کہ نیت باندھ کے مریں' یعنی مریں بھی جیسے ہم چاہیں جب پیدا نہیں ہوئے اپنی مرضی کے موافق تو موت اپنی مرضی کے موافق کیوں چاہتے ہو۔ (کاتب وعظ کرتا ہے کہ بیان نہایت جوش وخروش کے ساتھ ہو رہا تھا اور مجمع میں ایک سکتہ کا سا عالم تھا بالخصوص ایک صاحب پر جو عشق مجازی میں مبتلا تھے بے حد اثر تھا اور ان پر نہایت شدت کے ساتھ گریہ طاری تھا۔ ان کو ایک دوسرے صاحب بار بار

---

[1] (کنز العمال: ۱۱۲۰۳)

دیکھتے تھے۔ حضرت نے ان کو جھڑکا کہ یہ کیا لغو حرکت ہے' تم اپنے کام میں لگو) تو یہ کیوں چاہتے ہو کہ جیسے ہم چاہیں ویسے زندہ رہیں اور جیسے ہم چاہیں ویسے مریں تمہیں تجویز کرنے کا حق کیا ہے۔ خدا تعالیٰ جیسے چاہیں گے رکھیں گے آرام میں یا تکلیف میں اور جس حالت میں چاہیں گے ماریں گے لیکن میں بشارت دیتا ہوں کہ اگر تم اپنی طرف سے عمر بھر تکلیف میں رہنے کے لیے آمادہ ہو جاؤ گے تو اس تفویض کی برکت سے انشاء اللہ بہت جلد راحت نصیب کر دیں گے اور ایسی راحت نصیب کریں گے جس کو تم بھی راحت سمجھو گے' ہمت کر کے تو دیکھو۔

چند روزے جہد کن باقی بخند

(کچھ دن محنت کر پھر ہنس)

بس چند روز کی مصیبت ہے پھر ہنسنا ہے' کھیلنا ہے وعدہ ہے

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً

''جو شخص نیک عمل کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو اس کو دنیا میں پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے۔''

دل کھول کر گناہ کرنے سے ارمان نہیں نکلتا

نافرمانی میں خاص اسی وقت تو لطف آ جاتا ہے لیکن پھر بعد کو بس پوری مصیبت کا سامنا ہے۔ مثلاً دن کو ایک حسین عورت سامنے سے گزری۔ نفس نے دیکھنے کا بہت تقاضا کیا لیکن فوراً آنکھیں بند کر لیں' نظر کے روکنے میں اس وقت تو بہت تکلیف ہوگی لیکن جب الگ ہو گئے تو واللہ دیکھو گے کہ دل میں ایک بہار ہوگی اور سارا دن ساری رات آرام میں گزرے گا اور اگر نظر بھر کر دیکھ لیا اور پھر چار دن نظر نہ آئے تو دوزخ کی زندگی گزرے گی۔ کہتے ہیں کہ صاحب نظر کے روکنے کی کلفت نہیں اٹھتی۔ میں کہتا ہوں کہ ایک منٹ کی کلفت نہ اٹھائی اور چار دن کی کلفت اٹھا لو گے' یہ تو وہی ہوا کہ گنا نہ دے بھیلی دے بعض کو بعض معاصی کی نسبت یہ غلطی ہوگئی ہے کہ ایک مرتبہ اچھی طرح دل کھول کر گناہ کر لینے سے ارمان نکل جائے گا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اس سے قلب کے اندر جڑ اور زیادہ جمتی ہے گو اس وقت کچھ تسکین کی سی ہو جائے۔

تمباکو کی سی لت ہے کہ جتنا یہ پیو گے اتنی ہی اور لت بڑھے گی اور اگر ہر بار خواہش کو روک لو گے تو کچھ دن بعد بالکل بجھ جائے گی' یونہی نفس کو مارو۔ انشاء اللہ مادہ فاسد جڑ پیڑ سے نکل جائے گا۔ خلاصہ عذر کا یہ ہوتا ہے کہ صاحب ہمت نہیں ہوتی' دین کے واسطے تو ہمت نہیں ہوتی اور دنیا

کے واسطے بڑی ہمتیں کرتے ہو۔ حضرت اگر کوئی حاکم آپ پر ایک شخص کو مسلط کردے کہ جس وقت یہ نامحرم پر نظر کرے فوراً اس کی آنکھوں میں تکلے دے دینا تو سچ کہئے کیا پھر بھی نظر کو نہ روک سکو گے۔ دیکھیں تو پھر نظر کیسے نہیں رکتی۔ پھر افسوس ہے اللہ تعالیٰ کے تکلوں کا ڈر نہیں۔ بات یہ ہے کہ تکلیف اٹھانا گوارا نہیں ورنہ سب کچھ ممکن ہے۔ خدا کے طالب نہیں راحت کے طالب ہیں مگر راحت حقیقی بھی تو اللہ ہی کے ذکر سے حاصل ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں: "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" (یادرکھو دلوں کو اطمینان اللہ کے ذکر ہی سے حاصل ہوتا ہے)

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست   جز بہ خلوت گاہ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ جال اور درندوں سے خالی نہیں سوائے اللہ کی خلوت گاہ کے اور کہیں آرام نہیں)

جدھر جاؤ مصیبت

گر گریزی بر امید راحتے   زاں طرف ہم پیش آید آفتے

(اگر تم کسی راحت کی امید پر کسی مصیبت سے بھاگو تو اس کی طرف سے بھی تمہارے آگے ایک ہی آفت اور مصیبت آئے گی)

پس بجز خلوت گاہ حق کے کہیں آرام نہیں۔

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست   جز بہ خلوت گاہ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ جال اور درندوں سے خالی نہیں سوائے اللہ کی خلوت گاہ کے اور کہیں آرام نہیں)

اطمینان قلب کہیں میسر نہیں ہوسکتا۔

کامل اطمینان قلب حاصل کرنے کی تدبیر

اگر اطمینان قلب چاہتے ہو تو قلب کے اندر اللہ کی یاد بسالو یہ میں نہیں کہتا کہ ذکر شروع کرتے ہی اطمینان کا درجہ کامل ہوجائے گا بلکہ ذکر سبب ہے اطمینان کا تو جتنا ذکر بڑھے گا اتنا ہے اطمینان کا درجہ بڑھے گا۔ جب ذکر کامل ہوجائے گا اطمینان بھی کامل ہوجائے گا۔ پھر اس دولت سے مشرف ہوگے مرتے وقت اور صاحب سچ یہ ہے کہ ہزاروں زندگیاں قربان ایسے مرنے پر کہ ارشاد ہوگا:

يَآيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ

"اے جان اطمینان والی جس کو ذکر اللہ میں چین تھا آجا اپنے رب کی طرف اور لفظ ارجعی میں ایک لطیفہ ہے یعنی اس میں اشارہ ہے کہ تم تو خدا ہی کے پاس تھے یہاں تو تم آکر اجنبیوں میں مبتلا ہوگئے تو تمہارا مرنا اصل کی طرف واپس جانا ہے۔"

اسی کوفرماتے ہیں:

ہر کسے کو دور ماند از وصل خویش　　باز جوید روزگار وصل خویش

(ہرشخص کا قاعدہ ہے کہ جب اپنی اصل سے جدا ہوتا ہے تو اس زمانہ وصول کا جویاں ہوتا ہے)

حضرت عارف جامی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

دلاتا کے دریں کاخ مجازی　　کنی مانند طفلاں خاک بازی

چرازاں آشیاں بیگانہ گشتی　　چو دوناں چغد ایں ویرانہ گشتی

(اے دل تو کب تک اس مجازی یعنی عارضی محل میں لڑکوں کی طرح مٹی سے کھیلتا رہے گا اور اس آشیاں میں آخرت سے تو کیوں اجنبی بن گیا اور نااہلوں کی طرح سے اس دنیا کے ویرانہ کا اُلو بن کر رہ گیا)

دنیا سے حصہ آخرت لے جانے کی عجیب مثال

اب اس سے یہ بھی سمجھ لو کہ پھر تم کو دنیا و آخرت کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے اور اس کو اس مثال سے سمجھو کہ تم کبھی جلال آباد سے مظفر نگر جاتے ہو تو جو چیز وہاں اچھی ہوتی ہے اس کو یہاں لاکر برتتے ہو پھر یہاں دنیا میں آ کر آخرت سے کیوں اجنبی ہو گئے۔ چاہیے یہ کہ دنیا بھی ملے تو آخرت ہی کے واسطے لے جاؤ۔ قارون کو خطاب ہے:

وَابْتَغِ فِيْمَا اٰتَاکَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَکَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ کَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْکَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ الاية

ترجمہ: دنیا میں سے کچھ حصہ آخرت کیلئے لے لے اور بھول مت اپنے اس حصہ کو باہر جلال آباد کے تلاش معاش میں جاتے ہو وہاں سے کما کر لاتے ہو اور یہاں کھاتے ہو اس طرح آخرت کے لیے یہاں سے کمائی کر کے اور بٹور بٹار کر وہاں لے جاؤ۔ یہاں سے ذخیرہ آخرت جمع کر کے اپنے رب کے پاس لوٹ جاؤ' دنیا میں آخرت کی فکر سے غافل مت رہو کیونکہ جہاں سے آئے تھے وہیں لوٹ کر جانا ہے اور یہاں سے لوٹ کر وہاں جاؤ تو کس طرح جاؤ جس طرح آ گئے اس نفس کے خطاب میں فرماتے ہیں:

اہل اللہ سے تعلق کی ضرورت

تم اللہ سے راضی ہو اللہ تم سے راضی' دیکھئے بہت لوگ لاکھوں روپیہ حکام کی خوشنودی طلب کرنے کو خرچ کرتے ہیں۔ کیا ہر حاکم کی خوشنودی تو مطلوب ہو اور حاکم حقیقی ہی کی خوشنودی مطلوب نہ

ہو۔ پھر ارشاد ہوتا ہے. فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ میرے خاص بندوں میں داخل ہوجاؤ اسے نفس مطمئنہ اور داخل ہوجا میری جنت میں حق تعالیٰ نے یہاں دوثمرے ذکر فرمائے ہیں۔ خاص بندوں میں شامل ہونا اور جنت میں داخل ہونا۔ ذرا غور تو کیجئے خاص بندوں میں داخل ہونے کو پہلے فرمایا ہے پھر جنت میں داخل ہونا مذکور ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز خاص بندوں میں شامل ہونا ہے جس کی بدولت جنت ملے گی۔ اس جگہ اشارۃً یہ بات بھی ظاہر فرما دی کہ اگر ہمارے خاص بندوں کے ساتھ لگے لپٹے رہو گے تو جنت میں داخل ہونا نصیب ہوجائے گا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

بے عنایات حق و خاصان حق　　　　گر ملک باشد یہ ہتش ورق

(اللہ تعالیٰ اور اس کے خاص لوگوں کی مہربانی کے بغیر اگر فرشتہ بھی ہو تو اس کا ورق سیاہ رہے گا)

بہت لوگ اس غرہ میں ہیں کہ کتابیں دیکھ کر ہم کر سکتے ہیں اپنی اصلاح کیونکہ کتابوں میں سب طریقے مذکور ہیں، یہ بالکل غلط خیال ہے۔ واقفان فن اور اہل تجربہ سب اس پر متفق ہیں کہ عادتاً ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا بدوں ماہر فن شیخ کامل کے آدمی تنہا اپنی اصلاح نہیں کر سکتا محض کتابیں دیکھ کر۔ تربیت باطن تو بڑی چیز ہے دنیا ہی میں نظیریں دیکھ لو بلا استاد کے کوئی فن نہیں آ سکتا، کتاب خوان نعمت موجود ہے اس میں سب کھانوں کی ترکیبیں مفصل درج ہیں۔ یعنی پلاؤ کس طرح پکایا جاتا ہے، شامی کباب کس طرح بنتا ہے، بھلا کوئی پلاؤ اور شامی کباب پکا تو لے بے استاد کے محض کتاب کے ترکیب دیکھ کر اسی طرح تربیت باطن ہو نہیں سکتی۔ بدوں شیخ کے مولانا فرماتے ہیں:

یار باید راہ را تنہا مرو　　　　بے قلاؤ زاندریں صحرا مرو

(راستہ کے لیے رفیق کی ضرورت ہے تنہا اس جنگل کو نہ قطع کرنا چاہیے)

کوئی رفیق ڈھونڈ و بدوں رہبر کے اس صحرا میں قدم مت رکھو۔

آگے فرماتے ہیں:

ہر کہ تنہا نادر ایں راہ رابرید　　　　ہم بعون ہمت مرداں رسید

(اگر شاذ و نادر کسی نے اس کو قطع بھی کرلیا ہے تو یہ محض ظاہر میں ایسا معلوم ہوتا ہے ورنہ دراصل کسی نہ کسی مرد خدا کی توجہ اس کے ساتھ متعلق رہتی ہے)

یعنی اگر شاذ و نادر کسی نے اس راہ کو تنہا قطع بھی کرلیا ہے تو یہ محض ظاہر میں ایسا معلوم ہوتا ہے ورنہ دراصل کسی نہ کسی مرد خدا کی توجہ اس کے ساتھ بھی متعلق رہتی ہے۔ گو خود اس کو اس کی خبر بھی نہ ہو کہ کدھر سے یہ فیض آ رہا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مرید ہوجاؤ، یہ پکھنڈ ہے بیعت برکت کی چیز

ضرور ہے اس سے انکار نہیں لیکن اصل چیز محبت اور اتباع ہے اس کے ہوتے ہوئے اگر عمر بھر بھی مرید نہ ہو تو مطلق حاجت نہیں بڑا ناس کیا ہے۔ پیری مریدی کا بہت سے پیروں نے لوگوں کو یہ سکھلایا ہے کہ بغیر مرید ہوئے کچھ نفع ہی نہیں ہوتا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ان سے اگر کوئی مرید ہوگیا پھر چاہے اس کی کیسی ہی بری حالت ہو تب بھی اس سے راضی اور اگر مرید نہ ہو تو بعضے اس کی تعلیم تلقین ہی نہیں کرتے۔ یعنی وہ لوگ عام طور پر اذکار اشغال بتلانے سے بخل کرتے ہیں۔ جیسے کوئی طبیب ہو جس کو کچھ آتا جاتا نہ ہو وہ اپنے مطب کے نسخوں کی بڑی حفاظت کرتا ہے۔ اگر مطب کے نسخے ہی بانٹ دیئے تو پھر اس کے پاس کیا رہ جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ مرید چاہے ہو یا نہیں لیکن کسی محقق سے تعلق پیدا کرو اگر منزل مقصود تک پہنچنا چاہتے ہو تو پہلے راستہ ڈھونڈو۔ اول تو بعضے تعلق ہی نہیں پیدا کرتے اور بعضے تعلق پیدا کرتے ہیں تو صرف یہ کہ مرید ہو گئے۔ بس اس کو کافی سمجھتے ہیں رہا ذکر شغل وغیرہ اور اصلاح نفس اس کو پیر کے ذمہ سمجھتے ہیں۔ گویا جس کو استاد بنایا اسی کے ذمہ سبق بھی یاد کرنا ہوگیا۔ ارے اگر استاد نے سبق بھی یاد کرلیا تو اس کے یاد کر لینے سے تجھے تو یاد نہیں ہوگیا۔ یہ سمجھ رکھا ہے کہ مرید ہوتے ہی بس سب ٹاٹ پالان پیر کے ذمہ ہوگیا۔ بقول کسی جاہل دیہاتی کے پیر کے۔ ایک گاؤں کا پیر اپنے ایک دیہاتی مرید کے پاس پہنچا' پیر صاحب کسی بیماری سے اٹھے' اس لیے دبلے بہت ہو رہے تھے۔ دیہاتی نے دیکھ کر کہا ارے پیر توں (یعنی تو) دبلا بہت ہو رہا ہے۔ پیر صاحب کو موقع مل گیا' کہا ارے بھائی دبلا نہ ہوں تو کیا ہوں' روزے تم نہیں رکھتے وہ مجھے رکھنے پڑتے ہیں' تمہارے بدلے نماز (تم نہیں پڑھتے) وہ مجھے پڑھنی پڑتی ہے۔ تمہارے روزے نماز نے مجھے دبلا کر رکھا ہے اور سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ مجھے تمہاری عوض پل صراط پر چلنا پڑتا ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ دیہاتی نے یہ سن کر کہا کہ واہ واہ تجھے بڑی محنت ہمارے لیے کرنا پڑی۔ جا میں نے تجھے اپنا مونجی کا کھیت دیدیا۔ پیر صاحب نے سوچا کہ یہ دیہات کے لوگ ہیں ان کا کیا اعتبار اب تو دے رہے ہیں پھر کہیں نیت نہ بدل جائے۔ اس لیے ابھی چل کر کھیت پر قبضہ کر لینا چاہیے' کہا تم چل کر قبضہ کرادو' دیہاتی ساتھ ہولیا اور پیر کو آگے کیا کہ اچھا چل میں تجھے وہ کھیت دکھلا دوں' راستہ میں کھیتوں کی ڈولیں پڑیں' چلتے چلتے پیر صاحب کا پیر جو پھسلا تو مینڈھ کے نیچے جا رہے' دیہاتی نے اوپر سے ایک لات اور رسید کی کہ سہری تو تو کہتا تھا کہ میں تمہارے عوض پل صراط پر چلتا ہوں جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے چار انگل کی مینڈھ پر تجھ سے چلا ہی نہ گیا پل صراط

پر تو کیا چلتا ہوگا تو جھوٹا ہے' جا ہم کھیت نہیں دیتے یہ کہہ کر رستہ ہی سے لوٹ آیا' لات ماری الگ اور کھیت چھین لیا سو الگ۔ اب ایسے جھوٹے پیروں نے صدیاں گزر گئیں یہ ذہن نشین کرا رکھا ہے کہ پیر سارا بوجھ اٹھا لیتا ہے آخرت کا بوجھ بھی اسی کے سر پر اور دنیا کا بوجھ بھی اسی کے سر پر۔ تو وہ پیر کا ہے کا ہوا پلہ دار ہوا آخرت کا اور دنیا کی مثال بھنگی کی سی ہوئی کہ ہگو تم اور اٹھاوے وہ' مقدمہ بھی اسی کے ذریعے فتح ہو جائے گا۔ بیٹا بھی اسی کے ذریعہ ہو جائے گا۔ جی وہ تو دنیا کا اپنا بوجھ بھی نہیں اٹھاتے تمہارا تو کیا اٹھاویں گے۔ یہاں پر میں ایک مثال دیتا ہوں جو دوستوں کے کام آئے گی۔ پیر اور مرید کا تعلق بالکل مریض اور طبیب کا سا ہے مریض اگر طبیب سے صرف یہ کہہ دے کہ میں آج سے تمہارا مریض ہوں اور طبیب اس سے اقرار کر لے کہ میں آج سے تیرا طبیب ہوں تو کیا محض اس عہد و پیماں ہی سے شفا ہو جائے گی ہرگز نہیں' علاج تو کرانا ہی ہوگا۔

طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جا کر طبیب سے خود مرض کو بیان کرتے ہیں خود کہتے ہیں کہ یہ روگ ہے مجھے یہ نہیں کرتے کہ گئے اور چپ بیٹھ گئے اسی طرح روز چار گھنٹے بیٹھ آئے نہ کچھ حال کہنا نہ نسخہ لکھوانا نہیں بلکہ ہاں وہ تو بار بار ایک ایک حال کو بالتفصیل طبیب کے سامنے بیان کرتے ہیں وہ کہتا بھی ہے کہ میں سمجھ گیا لیکن اصرار ہوتا ہے کہ ذرا اور سن لیجئے تسلی نہیں ہوتی کہ شاید کوئی اور بات بیان کرنے سے رہ گئی ہو۔ لیکن پیر کم بخت کی یہ کم بختی کہ اس سے کوئی حال اپنے امراض باطنی کا نہ کہا جائے بلکہ تمہارے اندر جو امراض ہیں ان کو وہ خود ہی بیان کرے اور خود ہی بدوں تمہاری طلب کے ان کا علاج کر دے۔ تو گویا وہ فوٹو گراف ہوا کہ تمہارے دل کے اندر جو کچھ ہے وہ خود بخود اس کے دل میں آ جائے اور اگر کشف کا بھروسہ ہو تو خوب سمجھ لیجئے کہ اول تو کشف اختیاری نہیں کہ جس وقت چاہا دوسرے کے دل کا حال معلوم کر لیا۔ دوسرے اگر کشف ہو بھی گیا تو بدوں تمہارے طلب کیے اس کی جوتی کی غرض پڑی ہے کہ زبردستی سر ہوتا پھرے وہ محتاج نہیں ہے وہ خود محتاج ہے مانگے گا تو دیں گے اور اگر مانگتے بھی عار آتی ہے تو ان کی جوتی سے پھر یہ بھی ہے کہ کشف کی ان کے نزدیک کوئی قدر نہیں وہ نہ اس کو کمال سمجھتے ہیں نہ اس پر اعتماد رکھتے ہیں۔ کشف را بر کفش می زنند اور واقعی کشف کوئی چیز قابل قدر کے ہے بھی نہیں۔ کافروں تک کو کشف ہوتا ہے جوگیوں کو کشف ہوتا ہے' شیطانوں کو کشف ہوتا ہے بلکہ جانوروں تک کو کشف ہوتا ہے۔ یہ حدیث شریف سے ثابت ہے کہ بہائم کو قبر کا عذاب منکشف ہوتا ہے۔ لو صاحب یہ حقیقت ہے کشف کی جس کو بڑا کمال سمجھتے ہیں پیروں کا۔ غرض یہ ہے کہ طبیب سے جس طرح رتی رتی اپنا حال ظاہر کر دیتے ہو اور اپنے روگ چھپانا نہیں چاہتے اسی طرح پیر سے بھی اپنا کچا چٹھا بیان کرو۔

شیخ سے اپنا عیب بیان کرنے کی ضرورت

یہاں تو یہ حال ہے کہ خود تو کیا بیان کرتے اگر کوئی پیر خود ہی کسی بات پر ٹوکتا ہے تو باتیں بنانے بیٹھ جاتے ہیں۔ کسی غلطی پر متنبہ کیا تو وہیں اس کی توجیہ کرنا شروع کر دی۔ جب تم کہتے ہو کہ ہمارے اندر عیب نہیں تو دوسرا کس چیز کی اصلاح کرے۔ جب تم بیمار ہی نہ ہو تو طبیب علاج کیا کرے۔

اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

(اے خواجہ درد ہی نہیں ورنہ معالج موجود ہے)

مولانا فرماتے ہیں:

ہر کجا دردے دوا آنجا ردد ہر کجا رنجے شفا آنجارود
ہر کجا مشکل جواب آنجا رود ہر کجا پستی ست آب آنجارود

(جہاں درد ہوتا ہے وہاں دوا پہنچ جاتی ہے جہاں بیماری ہوتی ہے وہاں شفاء پہنچ جاتی ہے جہاں مشکل ہوتی ہے اس کا حل وہاں موجود ہوتا ہے اور جہاں پستی ہوتی ہے پانی وہاں پہنچ جاتا ہے)

جب تم نے مرض ہی نہ بیان کیا تو کوئی علاج کیا کرے۔ اگر پیر کسی عیب پر متنبہ کرے تو اس کی تقریر کو خوب غور سے سنے اور سوچے سمجھے یہ نہیں کہ توجیہ کرنی شروع کر دے۔ بلکہ اگر وہ عیب اس میں نہ بھی ہو تب بھی اس کا کیا بگڑ گیا۔ چلو ایک کام کی بات ہی معلوم ہو گئی۔ اگر خارش نہیں ہے تب بھی نسخہ تو پوچھ لو کسی وقت کام آئے گا۔ پھر تمہارا یہ سمجھنا بھی قابل اعتبار نہیں کہ ہم میں یہ عیب نہیں بعض اوقات اپنا مرض خود اپنی سمجھ میں نہیں آتا۔ طبیب نے نبض اور قارورہ دیکھ کر اپنی بصیرت فن سے یہ تشخیص کیا کہ خارشت کا مادہ یعنی سودا بدن میں پیدا ہو چکا ہے اس کا جلد انسداد کرنا چاہیے ورنہ عنقریب خارشت ہونے والی ہے۔ یہ سن کر مریض کو چاہیے کہ فوراً علاج کی فکر شروع کر دے۔ یہ نہیں کہ اس کی تردید شروع کر دے کہ نہیں صاحب میں بالکل تندرست ہٹا کٹا ہوں مجھے کیوں خارشت ہوتی۔

خلاصہ یہ کہ پیر کے سامنے اپنا اصلی مرض بھی بیان کر دو اور خود بیان کر دو۔ اس کے منتظر نہ رہو کہ وہ خود پوچھے یا کشف سے معلوم کر لے جب طبیب سے سب حال کہہ دیا جاتا ہے تو وہ مرض تشخیص کر کے نسخہ لکھتا ہے۔ اس کے استعمال کے بعد پھر اطلاع حالات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اب یہ حال ہے پھر اس کے مطابق نسخہ میں مناسب تغیر تبدل کیا جاتا ہے۔ یہی طریقہ شیخ سے رجوع کرنے کا ہے کہ اول مرض بیان کر دو پھر وہ جو کچھ تجویز کر دے ذکر شغل مجاہدہ یا اور کچھ علاج اس پر عمل کر کے اطلاع ان باتوں کی دو کہ یہ مرض تشخیص کیا گیا تھا' یہ علاج تجویز کیا گیا۔ اس کو میں نے اتنے دن استعمال کیا

اب یہ حال ہے اب ہم آگے کونسا نسخہ استعمال کریں اب آپ ایمان سے بتلا دیجئے فیصدی کتنے روحانی مریض جو ایسا معاملہ پیروں کے ساتھ کرتے ہیں۔ پھر الٹی پیروں کی شکایت ہے کہ توجہ نہیں کرتے اب پیر کیا سر دے دیں۔ کبھی تم نے اپنا مرض بیان کر کے علاج تجویز کرا کے اس پر عمل کر کے حالات کی اطلاع دے کر آئندہ کو ہدایت لی یا بس ہاتھ میں ہاتھ دے کر اور مریدی کا نام کر کے پھر غائب غلہ سب کام طریقہ سے ہوا کرتے ہیں۔ غرض فادخلی فی عبادی میں جو خاص بندوں کے ساتھ شامل ہونے کا ذکر ہے اس کا طریقہ برتاؤ کرنے کا یہ ہے جو میں نے بیان کیا۔ دو چیزیں خلاصہ کے طور پر یاد رکھئے اطلاع واتباع۔ یہ دونوں لفظ ہم قافیہ بھی ہیں آسانی کے ساتھ یاد بھی رہ جائیں گے۔ امراض اور حالات کی اطلاع کرتا رہے اور جو کچھ شیخ تجویز کردے اس کا اتباع کرتا رہے بس انہیں دو چیزوں کو عمر بھر لیے رہے اپنا کچا چٹھا کہہ دے لوگ پیروں سے بھی اپنے مرضوں کو چھپاتے ہیں۔ بھلا بے کہے کسی کا مرض کیسے آجائے ذہن میں یہاں تک چاہیے کہ اگر کوئی نیا کام دنیا کا بھی کریں تو اتنا پوچھ لیں کہ باطن میں تو مضر نہ ہوگا۔ ہم یہ تجارت کرنا چاہتے ہیں ہمارے مناسب ہے یا نہیں۔ اس غرض سے نہ پوچھے کہ یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس تجارت میں نفع ہوگا یا نہیں اور پیر صاحب اللہ تعالیٰ سے پوچھ کر کہہ دیں گے کہ ہاں ہوگا۔ اس غرض سے ہرگز نہ پوچھے یہ گندی غرض ہے بلکہ یہ پوچھے کہ ہم فلاں تجارت کرنا چاہتے ہیں وہ ہمارے باطن کو تو مضر نہ ہوگی ہم فلاں عہدہ پر منتقل ہونا چاہتے ہیں ہم انگریزی پڑھنا چاہتے ہیں یا طب پڑھنا چاہتے ہیں یہ ہمارے باطن کو تو مضر نہ ہوگا۔ یہ ہیں پوچھنے کی باتیں اب تو یہ حال ہے کہ جو جی میں آیا کر لیا پیر کو خبر بھی نہیں چاہے باطن کا پڑطا ہی ہو جائے۔ کہتے ہیں یہ ہمارے دنیا کے معاملات ہیں ان کی اطلاع کی کیا ضرورت ہے۔ حالانکہ ان معاملات کا بھی باطن پر بڑا اثر ہوتا ہے اس لیے جب کوئی نیا کام دنیا کا کرے ضرور اس کی اطلاع کر کے پیشتر مشورہ لے لے۔ یہ ہے گویا طریقہ اپنی اصلاح کا۔ یاد رکھو ان سے اپنے امراض کا کہنا ضروری ہے اور اگر ان سے اپنے امراض اس لیے چھپاتے ہیں کہ ہم کو ذلیل سمجھیں گے تو یہ خوب سمجھ لیجئے کہ وہ کسی کو ذلیل نہیں سمجھتے اگر تمہارا یہ خیال ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اس کو پیر ہی نہ سمجھا اول تو ان میں تکبر نہیں ہوتا وہ خود اپنے آپ کو سب سے زیادہ ذلیل سمجھتے ہیں پھر ایسا شخص دوسروں کو کیا ذلیل سمجھے گا۔

مشائخ کی نظر میں ہر وقت دو باتیں رہتی ہیں

میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ جو اہل تحقیق میں سے ہیں وہ اللہ جانے کسی کو حقیر نہیں سمجھتے غصہ کرنا اور بات ہے اس کے راز ہیں۔ دو چیزیں ان کی نگاہ میں ہر وقت رہتی ہیں ایک تو اپنے

عیوب جس کی دونوں آنکھیں پٹ ہوں وہ کانے پر کیا ہنسے۔ دوسرے وہ عالم ہیں حق تعالیٰ کے تصرفات کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ سب کی ڈوریاں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں جن کو ادھر کھینچا وہ ادھر کھنچ گئے۔ جن کو ادھر کھینچ لیا وہ ادھر کھنچ آئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی کو حقیر کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ غرض ان سے بلا خوف اپنے سب امراض ظاہر کردو اور علاج کرو جو کچھ وہ بتلادیں۔ یہ ہے طریق خاص بندوں میں داخل ہونے کا جس کا اشارہ فادخلی فی عبادی میں ہے اور یاد رکھو یہ وہ دولت ہے کہ اس کا آخرت میں تو حظ حاصل ہوگا ہی دنیا میں بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کا وہ حظ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے جب سے یہ سنا ہے کہ جنت میں آپس میں دوستوں میں ملاقاتیں ہوا کریں گی مجھے جنت کی تمنا ہوگئی ہے یعنی ملاقاتیں احباب کی یعنی اللہ کے بندوں کی اور اللہ کے بندوں میں شمار ہونا یہ جنت کی بھی اصل ہے۔ جنت اس کی شاخ اور فرع ہے گویا بالقوۃ دنیا ہی میں جنتی ہے وہ شخص جس نے اللہ والوں کے ذریعے سے اللہ سے تعلق پیدا کیا۔ اب تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ یہ ثمرہ اطمینان کا اور یہ طریقہ ہے اطمینان حاصل کرنے کا۔ دیکھا آپ نے اطمینان کیا چیز ہے۔ گویا دنیا کا بھی نفع اور دین کا بھی نفع۔ اسی کو فرماتے ہیں: "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" (یاد رکھو دلوں کو اطمینان اللہ کے ذکر ہی سے حاصل ہوتا ہے) ہوشیار ہو کر سن لو قلوب کا اطمینان صرف ذکر اللہ سے حاصل ہوتا ہے اور کسی چیز سے نہیں۔ اس کے بعد اب ضرورت نہ ہوگی کسی کو پریشان ہونے کی۔

پریشانی کا اصلی علاج

اگر پریشانیوں سے بچنا چاہتے ہو مثلاً بے اولاد ہو یا کوئی بیماری ہے جس سے تنگ آ گئے ہو تو اصلی علاج یہ ہے کہ خدا سے تعلق پیدا کرو پھر دیکھنا کہاں ہے پریشانی امراء کو ناز ہے اپنے پلاؤ قورمہ پر۔ اہل اللہ کو اپنے روکھے سوکھے ٹکڑوں میں وہ مزا ہے جو ان کو پلاؤ قورموں میں بھی نہیں۔ میں ان چیزوں کے کھانے کو منع نہیں کرتا۔ مطلب میرا اس کہنے سے یہ ہے کہ آپ کو ایک مزہ گھی کا ہے اور ایک مزہ گوشت کا ان کو تیسرا مزہ اس تصور کا ہے کہ یہ خدا کی دی ہوئی چیز ہے۔ محبوب کے ہاتھ کی ملی ہوئی مٹھاس ہے جب یہ تصور جم گیا پھر للہ ان کو اس تصور میں وہ مزہ آتا ہے جو امراء کو پلاؤ قورمہ میں بھی میسر نہیں۔ اصلی بڑیا جو لذت کی ان کے پاس ہے وہ تو یہ ہے چوتھے بھوک کا مزہ ہے۔ ان کا معمول ہے کہ جس روز بھوک نہیں لگتی اس روز کھانا بالکل ناغہ کر دیتے ہیں پھر اگلے وقت کس مزہ سے کھاتے ہیں۔ امراء کے یہاں یہ ہے کہ خادم نے اطلاع

کی حضور کھانا تیار ہے حضور نے سوچا کہ بھوک ہے یا نہیں' بھلا وہ ہی کیا جس کے معلوم کرنے کے لیے مراقبہ کی حاجت پڑے کہا کچھ بھوک تو ہے نہیں خادم نے عرض کیا کچھ تو حضور کھالیں (نہیں تو سوکھ کے کھجور نہ ہو جائیں گے حضور) حضور نے صرف اس ضرورت سے کہ معمول قضا نہ ہو کہا اچھا لے آؤ۔ لاحول ولاقوۃ یہ بھی کوئی وظیفہ ہے کہ قضا نہ ہونے پائے۔ پانچویں یہ لذت ہے کہ مثل امراء کے ان کا یہ معمول نہیں کہ متعدد کھانے کھائے جائیں۔

اصل لطف ایک کھانے میں ہے

جو ایک کھانے میں مزہ ہوتا ہے وہ متعدد کھانوں میں کہاں' متعدد کھانے کھانا اصول طب کے بھی تو خلاف ہے۔ موجز میں ہے: وَكَثْرَةُ الْاَلْوَانِ مُحَيِّرٌ لِلطَّبِيْعَةِ کئی چیزیں اگر کھائی جائیں تو معدہ اچھی طرح ہضم نہیں کرتا کیونکہ طبیعت متحیر ہو جاتی ہے اور طبیعت کھانے سے تو متحیر ہوتی ہی ہوگی کھانے سے پہلے بھی اس طرح متحیر ہوتی ہے کہ اس کو کھاؤں یا اس کو خیر آدھی بھوک کی قدر اس میں سے بھی کھالیا۔ غرض ڈیڑھ بھوک کھا گئے پیٹ ہے یا ربڑ کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ آخر میں ربڑ پڑی کہیں نمک سلیمانی کھا رہے ہیں کہیں چورن پھانک رہے ہیں ارے اتنا کھایا ہی کیوں تھا ایسے بد مذاق لوگ موجود ہیں۔ کان پور میں ایک صاحب نے میری دعوت کی جس میں انہوں نے بجائے روٹیوں کے پراٹھے پکوانے چاہے میں نے کہا میں پراٹھا نہیں کھا سکتا کیونکہ مجھے ہضم نہیں ہوتا تو ایک اور صاحب کیا فرماتے ہیں کہ کیوں ہضم نہیں ہوتا معدہ کا علاج کرنا چاہیے' ہضم کرنا چاہیے۔ میں نے کہا سبحان اللہ میں اپنا علاج کروں گا تمہارے پراٹھے کھانے کے لیے تو وہ حضرات اکثر ایک کھانا کھاتے ہیں اور بڑے لطف سے کھاتے ہیں۔ امراء اس لطف کے لیے ترستے رہ جاتے ہیں۔ ہم نے بھی مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی کے یہاں اکثر ارہر کی دال اور روٹی کھائی تھی جو مزہ ان کے اس کھانے میں آیا وہ بڑی بڑی دعوتوں میں بھی نہیں آیا۔ اس دال پر حضرت مولانا محمد قاسم رحمتہ اللہ علیہ کا لطیفہ یاد آیا۔ ان کے یہاں کوئی رئیس مہمان آئے' گھر والوں نے پوچھا کہ کیا پکانا چاہیے' فرمایا بس دال روٹی بھیج دو۔ عرض کیا گیا کہ حضرت یہ لوگ ایسے ایسے لذیذ کھانوں کے کھانے والے ہیں' بھلا ان کو دال کیا پسند آئے گی۔ فرمایا کہ میاں کل جدید لذیذ ان کے لیے تو نئی چیز یہی ہے۔ انہیں مزیدار کھانا کھلانا چاہیے خیر یہ تو لطیفہ تھا۔ مطلب یہ تھا کہ خوشامد کی کیا ضرورت ہے وہاں کسی کی خوشامد نہ تھی۔ غرض ان کو کھانے میں بھی بڑا لطف آتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ سارے چین حالی قالی مالی ظاہری باطنی

روحانی جسمانی دنیوی آخروی اگر ہیں تو اللہ سے تعلق رکھنے والوں کو۔ وہ افلاس میں بھی راضی مرض میں بھی راضی۔ تکلیف میں بھی راضی مصیبت میں بھی راضی۔ غرض سب پر راضی۔ کسی حالت پر ناراض ہی نہیں۔ اب میں ایک حکایت حضرت بہلول کی نقل کر کے پھر ختم کرتا ہوں۔

حضرت بہلول نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ کیا حال ہے فرمایا میاں اس شخص کا حال کیا پوچھتے ہو کہ دنیا کا کوئی کام ایسا نہیں جو اس کی خواہش کے موافق نہ ہوتا ہو۔ حضرت بہلول نے عرض کیا کہ حضرت ایسا کہاں سے ہو سکا ہے یہ تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بزرگ نے فرمایا جس نے اپنی خواہش کو خدا کی خواہش میں فنا کر دیا ہو اس کی خواہش کے خلاف کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ظاہر میں جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے خدا کی خواہش کے موافق ہو رہا ہے اور اس شخص کی خواہش خدا کی خواہش میں فنا ہو کر عین خواہش حق ہو گئی ہے۔ لہٰذا جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے اس کی خواہش کے موافق ہو رہا ہے اور جب خواہش کے موافق ہے تو خواہ کسی حالت میں بھی ہو چین میں ہے۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ بیان کا یہ ہوا کہ بس ذکر اللہ میں ٹھہری ایک چیز جس میں چین اور اطمینان منحصر ہے اور جس کا طریقہ بھی معلوم ہو گیا۔ اس طریقہ کا معین ہے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا اور ان کی نعمتوں کا مراقبہ۔ اس مجموعی طریق پر عمل کرنے سے انشاء اللہ تعالیٰ وہ حالات پیدا ہوں گے جس کو ذکر حقیقی کہہ سکتے ہیں۔

خلاصہ طریق کا یہ ہے کہ کسی صاحب کو اپنا رہبر تجویز کرو اور اس کی پیروی کرو اور اس کے دامن کے سایہ میں رہ کر زندگی ختم کرو اس کے سوائے نہ کہیں چین ہے نہ آرام۔ میں پھر وہی شعر پڑھتا ہوں:

ہیچ کنجے بے دو دبے دام نیست جزبہ خلوت گاہ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ جال اور درندوں سے خالی نہیں ہے سوائے اللہ تعالیٰ کی خلوت گاہ کے اور کہیں آرام نہیں)

مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں کہہ چکا۔ اس کے بعد آپ کو اختیار ہے۔ اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔

تم بحمدالله الذی بنعمته تتم الصالحات

جلاء القلوب

معروف بہ جام جمشید

یہ وعظ بمقام باغپت ضلع میرٹھ کوٹھی نواب جمشید علی خان صاحب ۲ ربیع الاول ۱۳۳۴ ہجری بروز یک شنبہ ہوا جو حضرت والا نے کھڑے ہو کر تین گھنٹہ سنتالیس منٹ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۲۰۰ تھی اور بالا خانہ پر مستورات تھیں۔ حکیم محمد مصطفیٰ صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُوۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّاٰتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَھُوَ شَھِیۡدٌ ۝ (سورۂ ق آیت نمبر ۳۷)

ترجمہ: ''اس میں اس شخص کے لیے بڑی عبرت ہے جس کے پاس دل ہو یا وہ متوجہ ہوکر کان ہی لگا دیتا ہو۔''

دین سے منتفع ہونے کی شرط

یہ آیت سورہ قاف کی ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید سے یعنی دین سے منتفع ہونے کی ایک شرط ارشاد فرمائی ہے اور یہ بڑی رحمت ہے حق تعالیٰ کی اول تو بندوں کے نفع کے لیے ایک بے مثل کتاب نازل فرمائی جس سے زیادہ کوئی کتاب نافع نہیں ہوسکتی۔ دوسرے صرف کتاب کے اتار دینے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس سے انتفاع کا طریقہ اور شرط بھی بیان فرمادی۔ یہ بے حد شفقت ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی بڑے کو چھوٹے سے جو تعلق ہوتا ہے وہ دو قسم کا ہوتا ہے ایک ضابطہ کا دوسرے شفقت کا اور دونوں کے آثار الگ الگ ہوتے ہیں۔ ضابطہ کا تعلق تو یہ ہے جیسے حاکم کو رعایا کے ساتھ ہوتا ہے کہ ایک حکم دیا اور اس کا اعلان کردیا بے فکر ہوگئے۔ اب اگر وہ اس حکم کو نہ مانے گا تو حاکم کی بلا سے اس کے ساتھ ضابطہ کی کارروائی کی جائے گی اور جیل خانہ بھیج دیا جائے گا اور شفقت کا تعلق یہ ہے جیسے باپ کو بیٹے کے ساتھ ہوتا ہے کہ کوئی بات اس کو بتاتا ہے تو صرف ایک دفعہ بتانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس کو بار بار سمجھاتا ہے۔ ایک دفعہ یہ کہہ کر نہیں چھوڑ دیتا

کہ اس کے خلاف کرو گے تو سزا پاؤ گے جیسے حاکم کرتا تھا بلکہ یہاں دو قسم کے تفاوت ہیں ایک تو وہی کہ ایک دفعہ کہنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے ایک ہی مضمون کو پچاس پچاس دفعہ کہتا ہے ایک ہی لفظ سے یا عنوان بدل بدل کر۔ دوسرے اگر اس پر عمل کرانے کے لیے کسی اہتمام کی یا تدبیر خاص کی ضرورت ہوتی ہے تو اس سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ مثلاً حکومت کی طرف سے اعلان ہوا کہ جو کوئی چوری کرے گا اس کو سزا ہوگی' حاکم تو اس ایک اعلان ہی پر اکتفا کرے گا اور کہہ دے گا کہ ہمارا فرض ادا ہو گیا اور باپ اسی لفظ کو بیٹوں سے دو دفعہ چار دفعہ دس دفعہ کہے گا اور سمجھائے گا اور کسی تعداد پر بھی کفایت نہ کرے گا بلکہ جب تک اس کو کسی قسم کا اندیشہ اور خدشہ بھی رہے گا کہ یہ چوری کریں گے اس وقت تک برابر سمجھاتا رہے گا اور اگر یہ معلوم ہوگا کہ یہ چوری کے عادی ہیں تو اس سے بچانے کے لیے خاص اہتمام اور تدبیر کرے گا۔ مثلاً اول چوری کے اسباب کی تشخیص کرے گا کہ ان کو یہ عادت کیوں پڑی اگر اس عادت کا سبب حب مال ثابت ہوگا تو اس کا علاج کرے گا۔ مثلاً ان کو سمجھائے گا کہ مال اچھی چیز نہیں کیونکہ زیادہ تر مال کھانے پینے کے لیے اور زبان کی لذت کے لیے کمایا جاتا ہے مگر زبان کی لذت کیا چیز ہے ذرا دیر کے لیے مزہ لے لیا اور اس پر جو کلفت مرتب ہوتی ہے وہ ذرا دیر کی نہیں بلکہ ممتد ہے مثلاً چھ مہینے کی سزا ہے تو کیا یہ عقل کی بات ہے کہ ایک لمحہ کے مزے کے لیے چھ مہینے کی کلفت کی پروا نہ کی جائے' اسی طرح قسم قسم کی تدبیروں سے حب مال کو چھوڑائے گا تاکہ بچے چوری نہ کریں۔ دوسری مثال سنئے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض دفعہ کوئی موسم خراب ہوتا ہے اور اس میں بعض چیزوں کا کھانا مضر ہوتا ہے جیسے امرود' کھیرا وغیرہ تو حاکم تو بڑی سے بڑی شفقت یہ کرتا ہے کہ اعلان کرا دیتا ہے کہ آج کل موسم خراب ہے فلاں فلاں چیز کھانا اور ماں باپ بچے کے لیے صرف یہ نہیں کرتے کہ ان چیزوں کا نقصان بتا دیں اور ایک دفعہ کہہ کر چھوڑ دیں بلکہ طرح طرح کی تدبیروں سے ان کو روکتے ہیں ان کو گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتے اور پیسہ ہاتھ میں نہیں دیتے۔ اگر کسی طرح کوئی پھل گھر میں آ بھی گیا تو اس پر کوئی بدمزہ چیز لگا دیتے ہیں جیسے ایلوا یا مرچ وغیرہ تاکہ بچے کو اس سے طبعی نفرت ہو جائے بلکہ اس کی نگرانی رکھتے ہیں کہ وہ چیز گھر میں آنے ہی نہ پائے بچہ ہاتھ میں ہی نہ لے اور اس کی صورت ہی نہ دیکھے یہاں تک کہ خود بھی اس کا کھانا چھوڑ دیتے ہیں چاہے خود کو نقصان نہ کرتی ہو۔ اس طرح کی سینکڑوں مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ضابطہ کے معاملہ میں اور شفقت کے معاملہ میں بڑا فرق ہے۔

اب سمجھو کہ خدا تعالیٰ کو بندوں کے ساتھ شفقت کا تعلق ہے صرف ضابطہ کا تعلق نہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ سے بندوں کو تعلق نہ بھی ہو تب بھی یہ نہیں ہوتا کہ خدا تعالیٰ کو بندوں سے تعلق نہ رہے اس کی موٹی مثال وہ ہی ماں باپ کی شفقت اولاد کے ساتھ ہے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ اولاد کیسی ہی نالائق ہو اور ماں باپ سے قطع تعلق بھی کرے لیکن ماں باپ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ ان سے تعلق نہ رکھیں۔ یہ شفقت ماں باپ میں کہاں سے آئی ہے۔ یہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے کہ ان کی یہ شفقت ایک ذرا سا عکس اور پرتو ہے۔ حق تعالیٰ کی شفقت کا اب ایک اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب عکس کی یہ حالت ہے تو اصل کی شان کیا کچھ ہوگی۔ جب ماں باپ اتنے شفیق ہیں تو حق تعالیٰ کتنے شفیق ہوں گے۔

چہ باشد آں نگار خود کہ بندد ایں نگارہا

حق تعالیٰ شانہ کی شفقت کی عجیب شان

دیکھئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "اَفَنَضۡرِبُ عَنۡکُمُ الذِّکۡرَ صَفۡحًا اَنۡ کُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّسۡرِفِیۡنَ"، یعنی کیا ہم تم کو سمجھانا چھوڑ دیں اس وجہ سے کہ تم راہ پر نہیں آتے کیا انتہا ہے شفقت کی اس شفقت کو پیش نظر رکھ کر قرآن شریف کو دیکھئے تو اسلوب قرآن یہ ملے گا کہ جہاں کوئی امر فرمایا ہے وہاں اس پر عمل کرنے کے طریقے بھی بتائے ہیں۔ یہ اسلوب قرآن کا طالب کو وجد میں لے آتا ہے اسی اسلوب کے اندر یہ بھی داخل ہے کہ بعض اوامر کو بار بار مکرر کیا ہے یہ ایسا ہی ہے۔ جیسا میں نے ابھی مثال دی کہ باپ اولاد کو کسی باپ کی ایک دفعہ تعلیم کر کے نہیں چھوڑ دیتا بلکہ بار بار کہتا ہے اور مختلف عنوانوں سے سمجھاتا ہے کیونکہ اس کو ضابطہ کا معاملہ نہیں کرنا ہے بلکہ شفقت کا معاملہ کرنا ہے ایک دفعہ کہہ کر اس کا دل نہیں مانتا وہ اس بات کو اولاد کے دل کے اندر اتارنا چاہتا ہے۔ یہی حالت ہے اسلوب قرآنی کی کہ بہت سے اوامر کو طرح طرح کے عنوانوں سے اور بار بار ارشاد فرمایا ہے۔ یہ انتہاء درجہ کی شفقت ہے مگر اس کی قدر وہ کر سکتا ہے جو اپنے آپ کو بندہ اور خدا کو خدا جانتا ہو۔ خدا وہ ہے جو کسی کا کسی طرح محتاج نہیں اور بندہ وہ ہے جو ہر وقت ہر حالت میں سراپا احتیاج ہے۔ اگر خدا تعالیٰ بندہ کے ساتھ بالکل استغفار کا برتاؤ بھی کریں تب بھی ان کے شایان شان ہے کیونکہ وہ غنی ہیں مگر ایسا نہیں کیا اول تو تکلیف مالا یطاق نہیں دی دوسرے اوامر کے ساتھ سہولت کے طریقے بھی بتا دیئے اور ایک دفعہ کہہ کر نہیں چھوڑ دیا بلکہ بار بار اوامر کو دہرایا۔ اس سے حیرت ہوتی ہے ایک مصنف کی حالت پر اس نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں قرآن کے مکررات پر اعتراض کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ کسی

مصنف کے لیے کتاب میں ایک بات کو دہرانا عیب میں داخل ہے۔ افسوس ہے کہ گدھے کو دیا سن اس نے کہا میری آنکھیں پھوڑ دیں۔ بیوقوف نے یہ قدر کی شفقت کی یہ شخص شاید باپ نہیں بنا کسی بیٹے کا کہ اس کو معلوم ہوتا کہ بیٹے کے سامنے کسی بات کو دہرانا عیب میں داخل ہے یا شفقت میں۔ اگر یہ باپ نہ بنا تھا تو دوسروں کو دیکھ کر قیاس وہ کر سکتا تھا کہ بیٹے کو ایک ہی دفعہ نصیحت کیا کرتے ہیں یا دو چار دس پانچ سو پچاس دفعہ۔ اگر باپ پر بھی بیٹا یہی اعتراض کرے کہ مجھ سے ایک بات کو بار بار کیوں کہتے ہو تو اس وقت باپ کو کوئی برا کہے گا یا بیٹے کو۔

قرآن میں تکرار عین شفقت ہے

سمجھ لیجئے کہ حق تعالیٰ کے کلام میں تکرار ہونا عیب نہیں بلکہ اس مصنف کی سمجھ میں عیب ہے اور قرآن میں تکرار عین شفقت ہے اسی واسطے خود فرمایا ہے: "وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوْا"، یعنی ہم نے قرآن میں طرح طرح سے بیان کیا ہے تاکہ لوگ نصیحت پکڑیں تاکہ وہ سمجھیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کو ضابطہ کا برتاؤ کرنا نہیں ہے بلکہ دل میں اتار دینا منظور ہے غرض میں نے کہا تھا کہ شفقت کے دو اثر ہوں گے ایک تو یہ اثر ہوگا کہ کہ ایک بات کو بار بار کہا جائے گا دوسرا اثر یہ ہوگا کہ اس پر عمل کرنے کے لیے دستور العمل بھی بتائیں گے۔ دیکھئے ایک تو یہ صورت ہے کہ بچے کے ہاتھ میں قلم دے دیا اور کہہ دیا کہ لکھو اور ایک یہ ہے کہ قلم ہاتھ میں دے کر طریقہ تحریر بھی بتایا جائے اور ایک ایک حرف اپنے سامنے اس کے ہاتھ سے بنوا کر ہاتھ پکا کرایا جائے۔ شفیق استاد کا یہی کام ہے، صرف قلم بچہ کے ہاتھ میں دے دینا دل خوش کرنے کی ترکیب ہے اور بس جیسے بعض وقت اسکولوں میں انعام میں صرف قلم دے دیا جاتا ہے اس سے بھی مقصود یہی ہوتا ہے کہ انعام ایسا دیا جائے جو تعلیم سے اور لکھنے پڑھنے سے تناسب رکھتا ہو۔ قلم ایسی ہی چیز ہے کہ طالب علم کے لکھنے کے کام میں آئے گا اور اس سے اس کو شوق علم کا بڑھے گا تو اس معنی کو یہ بھی شفقت ہے لیکن یہ شفقت ناتمام ہے جس کو دل خوش کرنا ہی کہہ سکتے ہیں۔ شفقت کامل وہ ہی ہے کہ قلم ہاتھ میں دے کر سامنے بٹھا بٹھا کر لکھنا سکھایا جائے۔ یہ شفقت ضابطہ والوں کے یہاں نہیں ہو سکتی۔ دیکھئے اگر ایک افسر کسی محرر کو کچھ لکھنے کا حکم دیتا ہے تو بحیثیت افسر ہونے کے طریقہ تحریر بتلانا اس کے ذمہ نہیں اس کو ضابطہ کا تعلق کہتے ہیں اور شفیق استاد طریقہ تحریر بھی بتلاتا ہے اس کو شفقت کا تعلق کہتے ہیں۔ نفع شفقت ہی کے تعلق سے ہوتا ہے، ضابطہ کے تعلق سے نہیں ہوتا۔ دیکھئے کسی کو سائیکل دے دیجئے اور اس کو طریقہ اس پر سواری کا نہ بتلائے تو اس سے اس کو کچھ

نفع نہیں پہنچ سکتا بلکہ بجائے اس کو نفع پہنچنے کے کہ اس پر وہ سواری کرتا وہ سائیکل اس کے سر پر لد جائے گا اور جو دینے والا شفیق ہوگا مثلاً باپ بیٹے کو سائیکل دے تو سواری کی تعلیم بھی کرے گا۔ یہ شفقت کا برتاؤ عام تعلقات میں نہیں ہوتا بلکہ خاص تعلقات میں ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ خاص تعلق ہے۔ اس وجہ سے ایسا برتاؤ کیا اس خاص تعلق کے ساتھ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک چیز مفید ہم کو دیں اور طریقہ استعمال نہ بتائیں۔ چنانچہ اس آیت میں اس طریقہ ہی کا بیان ہے۔

قرآن پاک میں امم سابقہ کے واقعات بیان کرنے کا مقدمہ

اس سے پہلی آیت میں کچھ اُمتوں کے ہلاک کرنے کی خبر دی پھر اس قصہ سے انتفاع کا طریقہ بھی خود ہی بتلا دیا حالانکہ اہل عقل سمجھ سکتے ہیں کہ قصہ سنانے سے مقصود داستان گوئی نہیں ہوتی۔ خصوصاً قرآن جیسی مذہبی کتاب میں بلکہ مقصود ان واقعات سے عبرت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ بناء بریں کوئی ضرورت طریقہ انتفاع کے تعلیم کی نہ تھی مگر غایت شفقت کی وجہ سے طریقہ کو بھی خود ہی بیان فرما دیا۔ اس واسطے کہ ایسی سلیم طبیعتیں کم ہیں جو قصوں سے پورا نفع اٹھا سکیں۔ عبادت اور کجی طبیعتوں میں غالب ہے اگر صرف قصوں کے بیان پر اکتفا کیا جاتا تو پورا نفع نہ ہوتا بلکہ کج فہم طبیعتیں شاید کہتیں کہ مذہبی کتاب میں قصوں کا کیا کام چنانچہ آج کل جو طبیعتیں ایسی ہیں جن میں یہ کجی موجود ہے اور ایسے لوگ یہی اعتراض کرتے ہیں لیکن سلیم طبیعتیں بھی موجود ہیں جو قصوں سے نفع اٹھاتی ہیں لیکن ایسا نفع وہ بھی نہیں اٹھا سکتی تھیں جیسا کہ اب طریقہ انتفاع کے بیان کے بعد اٹھا سکتی ہیں۔ چنانچہ آگے معلوم ہوگا یہ طریقہ ابلغ ہے نفع میں اس کا فرق دوسرے طریقہ سے یعنی صرف قصہ سنا دینے میں اور طریقہ انتفاع بتلانے میں جو فرق ہے اس کو آج کل کے مذاق کے موافق اس طرح آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ ایک طریقہ قصہ گوئی کا پرانا تھا جس میں بہت دلچسپ حکایتیں بیان کی جاتی تھیں اور ایک طریقہ آج کل ہے جس کو ناول کہتے ہیں۔ اس میں اور اس میں فرق یہی ہے کہ پہلے طریق میں صرف حکایتیں بیان کی جاتی تھیں اور اس نئے طریق میں صرف حکایتیں نہیں ہوتیں بلکہ حکایتوں کو اس پیرایہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ جس سے ان کاموں کا جو حکایتوں میں درج ہیں طریقہ بھی معلوم ہوتا ہے اسی واسطے یہ طریقہ زیادہ مؤثر ہے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں ناولوں کی تعریف کرتا ہوں یا دیکھنے کی اجازت دیتا ہوں بلکہ صرف اثر دکھلانا مقصود ہے ورنہ ناولوں کا دیکھنا نہایت مضر ہے جس کا راز یہ ہے کہ اس کے مصنف اکثر وہ لوگ ہیں جن میں دین نہیں اور جن کے اخلاق خراب ہیں۔ مصنف کے اخلاق

اور اس کی قلبی حالت کا اثر کلام میں ضرور ہوتا ہے اور خصوصاً جبکہ اس میں مضامین بھی زیادہ تر مفسد اخلاق ہی ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ پیرایہ کلام کا بھی ایسا ہوتا ہے جو مؤثر ہے تو ظاہر ہے کہ اس سے فساد اخلاق اور بے دینی ہی کا اثر زیادہ ہوگا۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ پرانی کتابیں قصوں کی جیسے بہار دانش وغیرہ کس قدر فحش ہیں لیکن ان کے پڑھنے سے نہ اس قدر بے دینی پیدا ہوتی ہے نہ فساد اخلاق جتنا کہ ناولوں سے ہوتا ہے۔ غرض ناول بہ نسبت پرانے قصوں کے زیادہ مؤثر ہیں اس وجہ سے کہ ان میں طریقہ عمل بھی بتلایا جاتا ہے۔

مثنوی مولانا روم میں فحش قصے بیان ہونے کی عجیب مثال

یہاں ایک مضمون اور ذہن میں آ گیا وہ یہ ہے کہ مولانا کی مثنوی میں بھی بہت سے فحش قصے ہیں ایسے کہ اگر یہ کتاب مولانا کی نہ ہوتی تو ہم تو اس کو ہاتھ بھی نہ لگاتے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مولانا نے جہاں کہیں ایسے قصے لکھے ہیں وہاں بغیر ان کے کام نکل ہی نہیں سکتا تھا تو اب اس کی مثال ایسی ہوگئی جیسے اناج کی کاشت کہ اناج کیسی پاکیزہ چیز ہے لیکن اس کی کاشت میں پہلے کھاد دینا پڑتا ہے اگر اس پر اناج کی پیداوار موقوف نہ ہوتی تو اس کا ڈالنا لطیف طبیعتیں کبھی گوارا نہ کرتیں۔ یہ لوگ چونکہ اہل تحقیق اور عارف ہیں یہ فحش سے بھی وہ پاکیزہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ دوسرا کوئی نہیں نکال سکتا۔ ان کے فحش کلام سے بھی انوار پیدا ہوتے ہیں اور جن کے دلوں میں گندگی بھری ہوئی ہے اور دین اور عرفان سے ان کو مس نہیں ان کے پاکیزہ کلام سے بھی گندگی اور ظلمات ہی پیدا ہوتے ہیں لہذا ناولوں کو مثنوی پر قیاس نہیں کر سکتے۔

متکلم سے ایک ہی نقطہ کا مختلف اثر

دیکھئے ایک ہی بات ہوتی ہے کہ کسی کے کلام میں کچھ اثر رکھتی ہے اور کسی کے کلام میں کچھ۔ اگر کوئی کسی کافر کا نام لے تو زبان خراب کرنا کہا جائے گا لیکن قرآن میں بعض کفار کا نام آیا ہے جیسے فرعون، قارون، ہامان وغیرہ تلاوت میں ان کا نام آتا ہے تو بجائے زبان خراب ہونے کے فی لفظ دس نیکیاں ملتی ہیں۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے عجیب بات ہے کہ اسی لفظ سے ایک جگہ زبان خراب ہوتی ہے اور ایک جگہ نیکیاں ملتی ہیں۔ قرآن میں فرعون کا لفظ زبان سے کہا اور پچاس نیکیاں مل گئیں۔ یہ بات لفظ فرعون میں اسی وجہ سے تو پیدا ہوگئی کہ حق تعالیٰ کے کلام میں آیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی لفظ ایک متکلم کی وجہ سے ایک اثر رکھتا ہے اور دوسرے متکلم کی وجہ سے دوسرا اثر رکھتا ہے۔ بس میرا مدعا ثابت ہوگیا کہ ناولوں کو مثنوی پر نہیں قیاس کر سکتے۔ اب میں ایک

اور بات کہتا ہوں کہ اس وقت اس فرعون والی مثال کو ذکر نہ کرنا چاہیے تھا کیونکہ سرور بستان یاد دہانیدن سے خواہ مخواہ لوگوں کو وحشت ہوگی اور طرح طرح کے سوالات پیدا کریں گے آج کل طبیعتوں میں کجی زیادہ ہے ذرا سی بات منہ سے نکالتے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

اہل علم کو مشورہ

اسی واسطے میں اہل علم کو مشورہ دیا کرتا ہوں کہ پیچیدہ اور دقیق باتیں نہ بیان کیا کریں اور بے ضرورت ایسے مضامین سے بچا کریں کیونکہ آج کل ذرا سی بات میں فتنہ کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر اس پر مباحثے' مناظرے اور رسالہ بازی شروع ہو جاتی ہے۔ اس وقت فرعون والی مثال زبان پر نہ آتی تو اچھا تھا نہ معلوم کیا کیا سوال اس پر پیدا ہوں لیکن کیا کیا جائے ایسے سوال پیدا ہو چکے ہیں۔ یہ سوال لفظ فرعون کا دہلی سے میرے پاس آ چکا ہے۔ لکھا تھا کہ فرعون جیسا گندہ نام پڑھنے سے بھی کیا نیکیاں ملیں گی۔ دیکھئے کس قدر طبیعت کی کجی ہے' یہ سوال اس وقت سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا حالانکہ کم فہم بلکہ مخالفین و معاندین بھی ہر زمانہ میں رہے ہیں مگر یہ سوال کسی کے ذہن میں نہیں آیا۔ میں نے جواب میں لکھا کہ حیثیات مختلف ہونے سے احکام مختلف ہو جاتے ہیں اور آثار مختلفہ مرتب ہوتے ہیں۔ ویسے یہ ایسا منحوس نام ہے کہ زبان پر لانا بھی باعث نحوست ہے۔ یہ چند باتیں کام کی درمیان میں آ گئیں۔ ذکر یہ تھا کہ طریق عمل کی تعلیم کو بھی کلام کے مؤثر ہونے میں بڑا دخل ہے اگر طبیعت سلیم ہو تو اثر جلدی ہوتا ہے اور قوی ہوتا ہے اور سلیم نہ ہو تو اثر کم ہوتا ہے اور دیر میں ہوتا ہے لیکن ہر صورت میں اگر طریقہ بلیغ ہو تو اثر ضرور ہوتا ہے اور متکلم کی شفقت پر ضرور دلالت کرتا ہے مگر طبائع کی حالت آج کل یہ ہے کہ بلیغ طریقہ پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کے مکررات پر اعتراض کیا ہی گیا ہے۔ پہلے کسی وقت میں تو طبائع کی یہ حالت تھی جس کو شیخ سعدی رحمتہ اللہ نے بیان کیا ہے:

نگویند از سر بازیچہ حرفے ۔۔۔۔ کزاں پندے نگرید صاحب ہوش

(لوگ کھیل کے خیال سے بھی کوئی کر لیتے ہیں صاحب اس سے بھی کچھ نصیحت حاصل کر لیتے ہیں)

سلیم طبائع کی باتوں میں سے اور نکمی باتوں میں سے بھی کام کی باتیں نکال لیتی تھیں اور اب حالت یہ ہے جس کو دوسرے شعر میں بیان کیا ہے:

اگر صد باب حکمت پیش نادان ۔۔۔۔ بخوانی آیدش بازیچہ گردش

(اگر سینکڑوں باتیں دانائی اور حکمت کے سامنے بیان کرو وہ ان کو کھیل ہی سمجھے گا)

کہ کام کی باتوں میں سے بھی نکمی باتیں نکال لی جاتی ہیں اور اچھی سے اچھی بات پر بھی اعتراض کر دیا جاتا ہے۔

آج کل کی طبائع لہو ولعب کی طرف زیادہ راغب ہیں

آج کل زیادہ مذاق غیر سلیم ہی ہیں جن سے یہ امید کم ہے کہ صرف قصہ کو سن کر نتیجہ نکال لیں گے لہٰذا مقتضائے شفقت یہی تھا کہ قصوں کو بیان کر کے نتیجہ کیا جائے اور طریقہ ان سے فائدہ اٹھانے کا بھی بیان کیا جائے۔ دیکھئے طبائع کی یہ حالت ہے کہ علماء وعظوں میں قرآن وحدیث کے مضامین بہت شرح وبسط کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور مالہ وماعلیہ سب سے بحث کرتے ہیں لیکن سننے والے صرف لہجہ اور خوش آوازی سننے کو آتے ہیں اور اسی کو معیار وعظ کے اچھے اور برے ہونے کا بنا رکھا ہے۔ بات یہی ہے کہ طبائع لہو ولعب کی طرف زیادہ راغب ہیں جس چیز میں مزہ آتا ہے اسی کی طرف مائل ہوتی ہیں چاہے اس میں کام کی بات ایک بھی نہ ہو اور جس چیز میں مزہ نہ آئے اس کی طرف مطلق التفات نہیں ہوتا چاہے اس میں ہر ہر لفظ کام کا ہو۔ مجھے الٰہ آباد میں بیان کرنے کا اتفاق ہوا تو بعد وعظ کے بعض لوگوں نے کہا کہ وعظ میں اتنی کسر ہے کہ خوش آوازی نہیں۔ میں نے کہا کہ ہاں بھائی ٹھیک کہتے ہو میں گویا نہیں ہوں نہ میرے خاندان میں کوئی گویا ہوا ہے۔ یہ حالت ہے: "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ" (یہ اللہ ہی کے ہیں اور اسی طرف لوٹنے والے ہیں) جب یہ حالت ہے کہ آواز کو اچھے اور برے بیان کا معیار سمجھا جاتا ہے اور فرعون کے لفظ پر نیکیاں ملنے پر اشکال کیا جاتا ہے اور تکرار کو عیب کہا جاتا ہے۔ غرض طبیعتوں میں کجی ہی کجی ہے تو کیا امید کی جاسکتی ہے کہ کسی بات کو بتانے سے بلا طریقہ انتفاع کی تعلیم کے کارآمد نتائج نکال لیے جائیں گے۔

قرآن میں قصوں سے انتفاع کا طریقہ بھی بتلایا گیا ہے

اس واسطے قرآن میں قصوں کے ذکر کے بعد ان سے انتفاع کا طریقہ بھی تعلیم فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ ○

"اس میں اس شخص کے لیے بڑی عبرت ہے جس کے پاس دل ہو یا متوجہ ہو کر کان ہی لگا لیتا ہے۔"

عربانی زبان جاننے والے سمجھ لیں گے کہ فی ذالک کا اشارہ مذکورہ قصہ کی طرف ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ اشارہ نہ من حیث القصہ ہے بلکہ بحیثیت اس قصہ کے جزو قرآن ہونے کے ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ اس جزو قرآن سے نفع کس کو حاصل ہوگا جس پر مَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ

(جس کے پاس دل ہو) صادق ہوا اور ظاہر ہے کہ قرآن بتامہ بندوں کے نفع ہی کے لیے اتارا گیا ہے تو کسی جزو کی تخصیص کوئی معنی نہیں رکھتی تو یہاں گو ذالک کا مشار الیہ ایک جزو ہے لیکن مراد کل قرآن ہوا تو حاصل یہ ہوا کہ قرآن سے انتفاع کا طریقہ یہ ہے جو بیان ہوگا نہ کہ صرف اس قصہ سے انتفاع کا طریق جو اس سے اوپر مذکور ہے تو سارے ہی قرآن کی یہ حالت ہوئی کہ اس سے انتفاع شرائط مدلولہ آیت پر موقوف ہے۔ یہ مضمون مجھے اس وقت ضروری معلوم ہوا کیونکہ دیکھا جاتا ہے کہ قرآن تو یہ لوگ پڑھتے ہیں بلکہ اگر یہ بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ گزشتہ زمانہ سے زیادہ آج کل تلاوت قرآن کی جاتی ہے بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ مخالفین اسلام بھی قرآن پڑھتے ہیں۔ لیکن یہ دعوے سے کہا جاتا ہے کہ انتفاع بالقرآن (قرآن سے نفع حاصل کرنا) پہلے سے بہت کم بلکہ قریب قریب مفقود ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ شرائط انتفاع مجمع نہیں بس اس آیت میں انہیں شرائط کا بیان ہے:

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَ ھُوَ شَھِیۡدٌ٥

"اس میں اس شخص کے لیے بڑی عبرت ہے جس کے پاس دل ہو یا وہ متوجہ ہو کر کان ہی لگا دیتا ہو"

اور ان شرائط کا بیان قرآن میں اور بھی بہت جگہ ہے اور ان کو جا بجا مختلف عنوانات سے بیان فرمایا ہے کہیں فرمایا ہے: "ذِکۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ" (مومنوں کے لیے عبرت ہے) اور کہیں "عِبۡرَۃٌ لِّاُولِی الۡاَبۡصَارِ" (اہل بصیرت کے لیے عبرت ہے) اور کہیں فرمایا: "لِمَنۡ اَرَادَ اَنۡ یَّذَّکَّرَ" (یعنی اس میں اس شخص کے لیے عبرت ہے جس کا ارادہ عبرت حاصل کرنے کا ہے) اور کہیں "اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَعِبۡرَۃً لِّمَنۡ یَّخۡشٰی" (اس میں بڑی عبرت ہے اس شخص کے لیے جس کو خوف خدا ہو) نزول قرآن تو گو نفع عام کے لیے ہے مگر نفع ہوتا ہے شرائط کے ساتھ اس کو اس مثال سے سمجھ لو ایک طبیب نے دو شخصوں کے لیے مسہل تجویز کیا اور دونوں کو طریقہ مسہل لینے کا اور شرائط مسہل کے مفید ہونے کے بتائے ان میں سے ایک نے تو مسہل کو ان شرائط کے ساتھ استعمال کیا اس کو خاطر خواہ نفع ہوا اور دوسرے نے بغیر شرائط کے استعمال کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کو نفع نہ ہوگا بلکہ عجب نہیں کہ نقصان پہنچ جائے۔ یہاں کیا بات ہے ظاہر ہے کہ طبیب نے تو دونوں کے نفع کے لیے واسطہ مسہل تجویز کیا تھا لیکن ایک کو طبیب کی تجویز نافع ہوئی اور دوسرے کو نافع نہ ہوئی۔ وجہ کیا ہے یہی کہ نفع مشروط بالشرائط تھا "واذا فات الشرط فات المشروط" (جبکہ شرط فوت ہو جاتی ہے مشروط بھی فوت ہو جاتا ہے) شرائط نہیں پائی گئیں نفع بھی نہیں ہوا میں نہیں کہا جا سکتا کہ

طبیب کی تجویز مفید نہیں تھی وہ تو تکلیف تھی چنانچہ دوسرے کو نفع ہوا اور اس کو جو نفع نہیں ہوا تو بوجہ شرائط موجود نہ ہونے کے نہ ہوا۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اثر کے لیے صرف شے نافع کا وجود کافی نہیں بلکہ وجود مع الشرائط ہونا چاہیے۔ ادنیٰ سے اعلیٰ تک ہر کام میں یہی بات ہے کہ اثر کے لیے کچھ شرائط ہوتے ہیں کہ بدوں ان کے اثر مترتب نہیں ہوتا۔ اب لوگ قرآن پڑھتے ہیں مگر اثر نہیں ہوتا یا کم ہوتا ہے۔ پھر یہ خیالات پیدا ہوتے ہیں کہ اثر نہیں ہوا۔

قرآن پاک میں تدبر کی ضرورت

نہ معلوم کیا بات ہے صاحبو! قرآن میں کمی نہیں ہم میں کمی ہے۔ بھلا یہ ممکن ہے کہ قرآن سی چیز سے اثر نہ ہو۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ۝

یعنی اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو وہ پاش پاش اور ریزہ ریزہ ہو جاتا خدا کے خوف سے تعجب ہے کہ پہاڑ جیسی سخت چیز قرآن سے متاثر ہو اور ریزہ ریزہ ہو جائے اور انسان جیسی نرم چیز متاثر نہ ہو گو دونوں جگہ اثر حسب اقتضائے حکمت مختلف ہو مثلاً انسان چونکہ مکلف ہے اس لیے اس میں تصدع غالباً اس لیے خلاف حکمت ہو کہ پھر مکلف بہ یعنی قرآن کا نزول عبث ٹھہراتا ہے کہ عامل ہی مقصود ہو جائے گا اس لیے اس میں اثر صرف خشوع کافی ہوگا اور احیاناً تصدع و زہوق روح ہو جانا اس لیے خلاف حکمت نہیں کہ اس سے مکلّف بہ کی عبث ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ دوسرے مکلفین تو موجود ہیں غرض انسان میں خشوع تو عام ہو مگر یہ بھی نہیں جس کی وجہ دوسری جگہ فرماتے ہیں: "اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا" یعنی قرآن کو غور سے نہیں دیکھتے بلکہ دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں۔ یہی بات ہے کہ قرآن کی آیتوں میں تدبر نہیں کیا جاتا اور دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں جن لوگوں نے تدبر سے قرآن کو دیکھا خواہ موافقین نے یا مخالفین نے تو اثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ کیسے کیسے پتھر موم ہو گئے کیسے کیسے معاندوں نے گردن جھکا دی اس سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ کسی زمانہ میں قرآن میں یہ اثر تھا کہ معاندین اس کے سامنے پانی ہوتے تھے اس واسطے اس کے سننے سے بچتے تھے کہ ہمارے اوپر اثر نہ ہو جائے اور اب لوگوں کو جو اس پر ایمان کے مدعی ہیں اور جو اس کو پڑھتے ہیں شکایت ہے کہ اثر نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ قرآن کو پڑھتے ہیں مگر تدبر کے ساتھ نہیں پڑھتے صرف الفاظ پڑھ لیتے ہیں اور یہ بھی ان کا ذکر ہے جو الفاظ کو بھلتے ہیں ورنہ اب تو دماغوں میں یہ خبط بھی پیدا ہو گیا ہے کہ قرآن کے الفاظ پڑھنے سے کیا فائدہ جتنا وقت اس میں

صرف کیا جائے اتنے وقت میں کوئی ڈگری کیوں نہ حاصل کی جائے اور تدبر و عمل کو جو ہم شرط نفع کی کہہ رہے ہیں یہاں نفع سے خاص نفع یعنی اثر مراد ہے اور مطلق نفع کی نفی نہیں۔ مثلاً یہ حرف پر دس نیکیاں ملنا حدیث میں آیا ہے۔ اس میں یہ شرط نہیں اور یہ لوگ حسنات ہی کو لاشے محض سمجھتے ہیں۔ پس ہمارا مقصود اور ہے ان کا اور۔ خلاصہ یہ کہ بہت سے مسلمان تو قرآن پڑھتے ہی نہیں اور جو پڑھتے بھی ہیں تو تدبر کے ساتھ نہیں پڑھتے جس پر بروئے آیت مذکورہ نفع حاصل ہونا موقوف ہے پھر شکایت عدم نفع کی کیسی۔ مسلمانوں کو تو قرآن سے لگاؤ ہی نہیں رہا اور اس کے ساتھ یہ جہل مرکب ہے کہ قرآن سے نفع نہیں ہوتا' قرآن سے نفع کیسے ہو جب تم اس سے لگاؤ بھی نہیں رکھتے اس سے تعجب ہوگا کہ مسلمانوں کو قرآن سے لگاؤ نہیں رہا کیونکہ قرآن کیسے کیسے عمدہ چھپے ہوئے گھروں میں ہیں۔ تلاوت بھی کی جاتی ہے پھر یہ کیسے کہا جائے کہ قرآن سے لگاؤ نہیں رہا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن سے مراد صرف لکھا ہوا قرآن نہیں ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے بلکہ جس کے بہت سے اجزاء ہیں جیسے عقائد' اعمال' معاشرت' معاملات' اخلاق یہ سب وہ اجزاء ہیں جن کے مجموعہ کو دین کہتے ہیں۔ تصوف بھی انہیں اجزاء میں داخل ہے کیونکہ تصوف کی تعریف گیروا کپڑے پہننا' تعویذ گنڈے کرنا یا کشف وکرامات نہیں ہے بلکہ تصوف کی تعریف ہے: ''تعمیر الظاہر والباطن'' (ظاہر و باطن کی درستی) اس تعریف کی بناء پر اس کا دین ہونا ظاہر ہے۔

دین کا ہر جزو قرآن میں داخل ہے

غرض دین ایک جامع لفظ ہے اس کے جس جزو کو لیجئے وہ قرآن میں داخل ہے۔ حقیقت سب کی واحد ہے اور صورتیں مختلف کسی لباس میں نام اس کا قرآن ہے اور کسی لباس میں نام اس کا حدیث ہے اور کسی لباس میں فقہ ہے:

عبارا تناشتی وحسنک واحد   وکل الی ذاک الجمال یشیر

(عنوانات مختلف ہیں معنون صرف ایک جمال محبوب ہے ہر عنوان اسی جمال کی طرف اشارہ کرتا ہے)

کہیں وہ روشنی چاند کی سی ہے اور کہیں آفتاب کی سی لیکن چاند کی روشنی بھی حقیقت میں آفتاب ہی کی روشنی ہے اس کی ایک موٹی مثال یہ ہے کہ ایک عاشق کسی محبوب کا دلدادہ ہے اس کے سامنے وہ محبوب ایک لباس میں آتا ہے تو اگر اس کو سچی محبت ہے تو اس کو یہ پہچان لیتا ہے اور دوسرے لباس میں آتا ہے تو اس کو سچی محبت ہے تو اس کو پہچان لیتا ہے اور دوسرے لباس میں آتا ہے تب بھی اسکو پہچان لیتا ہے اور تیسرے لباس میں آتا ہے تب بھی پہچان لیتا ہے اور کہتا ہے:

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من از رفتار پایت می شناسم

(جس رنگ کا لباس پہن لے گا میں تیرے پاؤں کی رفتار پہچان لوں گا)

جنہوں نے حقیقت قرآن کی سمجھ لی وہ حدیث میں بھی قرآن ہی پاتے ہیں اور فقہ میں بھی قرآن ہی پاتے ہیں جو کام کرتے ہیں وہ قرآن کے موافق اور جو فتویٰ دیتے ہیں وہ قرآن کے موافق جو فیصلہ کرتے ہیں وہ قرآن کے موافق کہلائے گا۔ مثلاً یہ واقعہ ہوا کہ کسی نے زنا کیا اور وہ محصن ہے اور اس پر باقاعدہ زنا کا ثبوت ہو گیا تو اس میں کسی عالم نے حدیث کے موافق فیصلہ کیا اور رجم کر دیا تو اگرچہ رجم کا حکم قرآن میں نہیں ہے لیکن اس فیصلہ کو بھی قرآن ہی کا فیصلہ کہیں گے اس واسطے کہ نہ قرآن میں حدیث کو واجب الاطاعت قرار دیا ہے تو حدیث کی تعمیل قرآن کی تعمیل ہوئی۔

قرآن میں دین کے کل اجزاء موجود ہونے کی تفصیل

غرض قرآن میں دین کے کل اجزاء موجود ہیں لیکن بعض تصریحاً اور بعض ضمناً اور بعض التزاماً جیسے یہی رجم کا حکم کہ یہ حدیث سے ثابت ہے اور حدیث کی حجیت قرآن سے ثابت ہے تو بواسطہ رجم کا حکم قرآن ہی موجود ہوا۔ زائد سے زائد یہ کہ اس کو بلاواسطہ کہا جائے گا بالواسطہ کہا جائے گا تو اس طرح سے کل دین قرآن ہوگا اس کے اجزاء میں یہ تفاوت ہوگا کہ اس کے بعض اجزاء یہ ظاہر ہیں کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور بعض اجزاء ایسے ہیں کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں بیان فرمایا اور بعض اجزاء ایسے ہیں جن کو حدیث سے بھی ہر شخص نہیں سمجھ سکتا ان کو مجتہدین اور علماء نے سمجھا تو سب اجزاء دین کے بلاواسطہ یا بواسطہ داخل قرآن ہیں اس واسطے میں نے شروع میں تقریباً اس مقام سے چار پانچ صفحے جہاں جہاں یہ عبارت ہے کہ من حیث القصہ بلکہ بحیثیت قصہ کے جزو قرآن ہونے کے یہ کہا جاتا تھا کہ اس آیت میں قرآن سے یعنی دین سے منتفع ہونے کی شرائط حق تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ذلک کا مشار الیہ گو خاص توجیہ کی بناء پر ظاہراً قرآن ہے مگر درحقیقت تمام دین ہے ایک متفق علیہ حدیث میں اس اطلاق کی تائید بھی ہے کہ ایک مقدمہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی گئی "اِقْضِ بَيْنَنَا بِكِتَابِ اللّٰهِ" (ہمارے درمیان کتاب اللہ کی رو سے فیصلہ فرما دیں) اور آپ نے ارشاد فرمایا "لَاَقْضِيَنَّ بَيْنَكُمَا بِكِتَابِ اللّٰهِ"[1] اس کے بعد جو فیصلہ فرمایا گیا ہے:

---

[1] (الصحیح للبخاری ۳: ۲۴۱)

اَمَّا غَنَمُکَ وَجَارِیَتُکَ فَرَدٌّ عَلَیْکَ وَاَمَّا اِبْنُکَ فَعَلَیْهِ جَلْدُ مِائَۃٍ وَتَغْرِیْبُ عَامٍ وَاَمَّا اَنْتَ یَا اُنَیْسُ فَاغْدِاِلٰی اِمْرَاَۃِ ھٰذَا فَاِنِ اعْتَرَفَتْ فَارْجِمْھَا الحدیث o

''لیکن تیری بکریاں اور باندی تجھ پر رد ہے اور تیرے بیٹے پر پورے کوڑے اور ایک سال شہر بدر ہونا اور تو انیس اس کی عورت کے پاس جا سو اگر وہ اعتراف کرے پس اس پر رجم کر تو۔''

اور ظاہر ہے کہ یہ تفصیل قرآن مجید میں کہاں ہے پس لامحالہ یہاں کتاب اللہ سے دین ہی مراد ہے حاصل یہ ہے کہ دین سے منتفع ہونے کے لیے یہ شرائط ہیں جو اس آیت میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ تمہید ہوئی اب میں ان شرائط کو بیان کرتا ہوں۔

عوام الناس کے قرآن پاک کے ادب کی عجیب مثال

حق تعالیٰ نے ہم کو قرآن جیسی نعمت دی لیکن مسلمانوں نے اس سے مختلف قسم کے کام لیے بعض لوگوں نے تو اس کو جلد بندھوا کر عمدہ جزودان میں لپیٹ کر طاق پر رکھ دیا جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ طاق نسیان پر پہنچ جاتا ہے جس کام کے لیے قرآن مجید اترا تھا اس کا تو کیا ذکر کبھی کھول کر بھی دیکھنے کی نوبت نہیں آتی۔ ہاں بس اونچے طاق پر عزت کے ساتھ رکھا ہوا ہے اور اس کو قرآن کا بڑا احترام سمجھتے ہیں۔ صاحبو! یہ احترام ایسا ہے جیسے کسی نے مہمان کا احترام کیا تھا۔ قصہ اس کا یہ ہے کہ ایک رئیس تھے انہوں نے اپنے بیٹے کو جہاں اور وصیتیں کی تھیں وہاں ایک اور بھی وصیت کی تھی بیٹا مہمان کا بڑا احترام کرنا اس کو اونچی جگہ بٹھلانا اور اس کے سامنے بھاری کپڑے پہن کر آنا اور اس سے نرم اور میٹھی باتیں کرنا اور اس کو قیمتی کھانا کھلانا' بیٹے عقل کے پورے تھے باپ کی وصیتوں کو لفظ بلفظ یاد کیا' مطلب خاک بھی نہ سمجھے لیکن الفاظ خوب رٹے۔ اتفاق سے باوا جان کے ایک خاص ملنے والے کم بختی کے مارے آ گئے۔ ان کو دیکھتے ہی آپ گھر میں گھس گئے اور وہاں سے نوکروں کو حکم بھیج دیا کہ لے جا کر مچان پر بٹھا دو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ مہمان صاحب ہر چند بگڑے لیکن نوکروں نے ایک نہ سنی اور زبردستی مچان پر بٹھا دیا کہ ہمارے میاں کا یہی حکم ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد گھر میں سے میاں اس ہیئت سے تشریف لائے کہ لنگی کی جگہ ایک بہت موٹی شطرنجی لپیٹے ہوئے اور کرتے کی جگہ ایک بہت موٹا قالین اوڑھے ہوئے غرض آپ بغلول سے بن کر زمین پر بیٹھ گئے۔ بیچارے مہمان نے وہیں مچان سے تعزیت کرنا شروع کی۔ آپ ہر بات کے جواب میں کبھی گڑ کہہ دیتے کبھی روئی۔ اب مہمان بہت پریشان کہ یا اللہ یہ کیا معاملہ

ہے۔ پھر اس نے میاں صاحبزادے کی خوشامد کی کہ بھائی مجھے تم یہاں سے اتاردو خیر اتارے گئے تھوڑی دیر کے بعد کھانا لایا گیا انہوں نے کچھ کھایا ایک بوٹی کو توڑنے لگے تو وہ بالکل گلی نہیں تھی، کہنے لگے یہ کیسا گوشت ہے تو صاحبزادے فرمانے لگے واہ صاحب کھانے کی اچھی قدر کی میں نے تو آپ کی خاطر پچاس روپے کا اپنا کتا ذبح کر دیا اور آپ کا منہ ہی سیدھا نہیں ہوتا۔ جب بہت پریشانی اور حیرت بڑھی تو مہمان نے پوچھا کہ آخر یہ تمہاری کیا حرکتیں ہیں، کہا میں نے ابا جانے کی وصیت پر عمل کیا ہے ابا جان کہہ مرے تھے کہ مہمان کا بہت احترام کرنا اس کو اونچی جگہ بٹھلانا اور اس کے سامنے بھاری کپڑے پہن کر آنا اور اس سے نرم اور میٹھی باتیں کرنا اور قیمتی کھانا کھلانا میرے یہاں کوئی اونچی جگہ اس مچان سے زیادہ نہ تھی اس واسطے اس پر جناب کو بٹھلایا گیا۔ میں جو آپ کو دیکھ کر جلدی سے گھر میں چلا گیا تھا یہ اس واسطے تھا کہ بھاری کپڑے پہن لوں اس وقت اس شطرنجی اور قالین سے زیادہ بھاری کوئی کپڑا میرے گھر میں نہ تھا اس واسطے ان کو پہن لیا اور ابا جان نے کہا تھا کہ مہمان سے میٹھی اور نرم باتیں کرنا تو روئی سے زیادہ نرم اور گڑ سے زیادہ میٹھی کوئی چیز نہیں اس واسطے میں انہیں دونوں کا نام زبان سے لیتا رہا اور قیمتی کھانا اس کے سوا کوئی میری سمجھ میں نہ آیا کہ اپنا پچاس روپے کا کتا ذبح کر کے آپ کو کھلا دوں کیونکہ اس سے زیادہ قیمتی کھانا میرے پاس نہ تھا۔ مہمان بولا میاں صاحبزادے جیتے رہو باپ کی وصیت کو خوب سمجھا اور اس پر خوب عمل کیا اور لاحول پڑھ کر چلتے ہوئے۔ صاحبو! یہ حکایت تو ایک احمق کی ہے جس پر ہم سب ہنستے ہیں لیکن اپنی حالت بھی اس سے کچھ کم نہیں ہے وہ کتاب جو مسلمان کے لیے دین کا معیار ہے اور جس کا ادب و احترام کرنا ہر مسلمان کے لیے فرض ہے اس کا احترام ہم نے وہی کیا ہے جو اس احمق صاحبزادے نے مہمان کا کیا۔ اس نے مہمان کو اونچائی پر بٹھلا دیا ہم نے اس کتاب کو اونچی جگہ پر رکھ دیا اور سمجھ لیا کہ کتاب کا احترام ہو گیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ احترام نہیں ہے قرآن کو اونچی جگہ ہی پر رکھو لیکن اونچی جگہ پر رکھ کر فارغ نہ ہو جاؤ۔

قرآن پاک کا حق

اس کا حق کچھ اور بھی ہے وہ ادا کرو وہ حق یہ ہے کہ اس کی تلاوت کرو اس کے مطالب کو سمجھو، اس کے احکام پر عمل کرو نہ یہ کہ بس اٹھا کر ادب سے طاق پر رکھ دو اور بعض نے قرآن سے بس محض یہ کام لیا کہ فال نکال لی یا بچہ کا نام لیا اور یہ کام میاں جی اور پیر جی لوگ کیا کرتے ہیں۔ محلہ میں کہیں بچہ پیدا ہوا تو وہاں سے فرمائش آتی ہے کہ قرآن میں اس بچہ کا نام نکال دیجئے۔ انہوں نے

قرآن کھولا اگر پہلا حرف الف نکلا تو کہہ دیا کہ اللہ بخش نام نکلا اسی طرح میم نکلی تو معین الدین اگر خ نکلی تو خدا بخش۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ نام بڑا متبرک ہے کیونکہ قرآن سے نکلا ہے حالانکہ یہ محض پیٹ کا دھندا ہے اور کچھ بھی نہیں۔ صاحبو! یہ کیا جہالت ہے اور لیجئے بعض لوگوں نے قرآن سے یہ کام لیا کہ جب کہیں موت ہوئی تو تیجے میں قرآن خوانی کرادی اور الٹا سیدھا ثواب بخش دیا اس کو تو بہت ہی بڑا کام سمجھا جاتا ہے اس کے متعلق کچھ کہا جاتا ہے تو لڑائیاں ہوتی ہیں' فتوے لگتے ہیں' رسالہ بازیاں ہوتی ہیں اسکے متعلق بھی میں اس وقت صرف یہی کہتا ہوں کہ اس پر حصر کیوں کرتے ہو اس کو کر کے یہ کیوں سمجھ لیتے ہو کہ بس ہم نے قرآن کا حق ادا کر دیا۔ الٹا سیدھا اس واسطے کہا کہ گو ایصال ثواب کرنے سے ثواب پہنچتا ہے۔ اس سے انکار نہیں مگر اس کے واسطے کچھ شرائط بھی تو ہیں وہ شرائط متعارف قرآن خوانی میں نہیں پائے جاتے۔ اس واسطے اس میں کلام ہو سکتا ہے کہ اس طرح قرآن خوانی کرانے سے ثواب پہنچتا بھی ہے یا نہیں۔ خبروں کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہ بحث دوسری جگہ موجود ہے اور سنئے بعض نے قرآن سے یہ کام لیا کہ چادر میں رکھ کر دو آدمیوں نے دونوں طرف سے پکڑ کر بچہ کو اس کے نیچے سے نکال دیا اور کہتے ہیں کہ اس سے حفاظت ہوتی ہے اور بچہ بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے۔ جی ہاں تمہاری اس ہوا ہی کے لیے تو قرآن نازل ہوا تھا۔ اس سے انکار نہیں کہ قرآن کی ہوا میں بھی برکت ہے۔

نزول قرآن کی غرض

مگر سوال یہ ہے کہ کیا قرآن بس اسی واسطے نازل ہوا تھا یہ تو ایسا ہے جیسے دوشالہ سے غرض تو یہ ہے کہ اس کو اوڑھا جائے مگر کسی گنوار نے کیا کیا کہ باوجود اس کے کہ جنگل سے لکڑی ایندھن لا کر جلا سکتا تھا مگر اس نے دوشالہ جلا کر اس کے اوپر کھچڑی پکائی تو اس طرح اس بیوقوف نے دوشالہ کو برباد کیا ہاں یہ منفعت ضرور ہوئی کہ کھچڑی پک گئی مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اس نے اچھا کیا۔ اس پر یہی اعتراض تو ہے کہ اس نے دوشالہ سے یہ کام لے کر اس کے اصلی منافع تلف کر دیئے کیونکہ کھچڑی پکانا تو لکڑی ایندھن سے بھی ہو سکتا تھا اس کو عقلاً حق تلفی کہیں گے کیونکہ جس کام کے لیے دوشالہ موضوع تھا اس سے وہ کام نہیں لیا گیا۔ بس اسی طرح قرآن سے ایسے کام لینا جیسے ابھی بیان کیے گئے قرآن کی حق تلفی ہے وہ کام تو اور چیزوں سے بھی نکل سکتے ہیں۔ قرآن سے ایسے کام لینا ایسا ہے جیسے ایندھن ہوتے ہوئے دوشالہ کو جلا کر کھچڑی پکانا اور بعض قرآن شریف سے یہ کام لیا کہ تعویذ گنڈے شروع کر دیئے اور یہ تو ایسا بڑا کام سمجھا جاتا ہے کہ آج کل بزرگی اور

ولایت کا معیار یہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلانے بڑے بزرگ ہیں ان کے تعویذ حکمی اثر رکھتے ہیں۔ میں اس کے متعلق بھی یہی کہتا ہوں کہ قرآن سے کبھی کبھی یہ کام بھی لیا جائے تو مضائقہ نہیں مگر اس پر حصر کیوں کیا جاتا ہے۔ یہ کیوں سمجھ لیا گیا کہ بس قرآن اترا ہی اسی واسطے ہے خود قرآن سے پوچھو کہ وہ اپنے نزول کی غایت کیا بیان کرتا ہے۔ قرآن میں ہے: "کِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَیْکَ مُبَارَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ" یعنی حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہے کہ قرآن ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اتارا ہے اور وہ برکت والی ہے اور غرض اس کے اتارنے سے یہ ہے کہ لوگ اس کی آیتوں کو تدبر سے پڑھیں اور اہل عقل اس سے نصیحت حاصل کریں۔ لیجئے جو کام ہم لوگ آج کل قرآن سے لیتے ہیں ان کا کہیں بھی ذکر نہیں نہ فال نکالنے کا نہ نام نکالنے کا نہ بچے کو ہوا دینے کا نہ تعویذ گنڈے لکھنے کا۔

مگر افسوس ہم نے یہ حشر کیا ہے قرآن کا کہ اس سے وہ کام تو لیتے ہیں جس کے واسطے وہ نہیں اتارا گیا اور وہ کام نہیں لیتے جس کے لیے وہ اتارا گیا ہے اور یہ میں پہلے ہی کہہ آیا ہوں کہ قرآن سے مراد میری خالص یہی کتاب نہیں ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے بلکہ مجموعہ دین مراد ہے جس میں فقہ اور حدیث سب داخل ہے جس کی مختصر تعبیر دین ہے تو حاصل یہ ہوا کہ دین کی ہر بات کو ہم نے ایسے طریق سے استعمال کیا ہے کہ وہ طریق ہی اس کے استعمال کا نہیں ہے اسی واسطے ہم کو اس سے کچھ نفع نہیں ہوتا۔ بس اس وقت وہی طریق اور نفع کی شرط بیان کرنا مقصود وہی اور اس کا بیان اس آیت میں ہے جو تلاوت کی گئی جو کوئی اس شرط کے ساتھ استعمال کرے گا اس کو تو نفع ہوگا اور جو اس شرط کے ساتھ استعمال نہ کرے گا اس کو نفع نہ ہوگا' میرے بیان سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھ لیں کہ میں تعویذ یا عملیات کو منع کرتا ہوں۔ اگر ان کے واسطے بھی آیات قرآنی کو کبھی کام میں لایا جائے تو مضائقہ نہیں مگر لوگوں کی حالت مختلف ہے ایک تو وہ شخص ہے کہ قرآن پڑھتا ہے اور اس کے موافق عمل بھی کرتا ہے تمام احکام کو بجا لانے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی عندالحاجت رقیہ کے طور پر بھی آیات سے کام لیتا ہے اس میں مضائقہ نہیں اور ایک وہ شخص ہے کہ قرآن سے سوائے تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے کوئی کام نہیں لیتا نہ عقائد ٹھیک ہیں نہ اعمال ٹھیک ہیں نہ صورت شریعت کے موافق ہے نہ سیرت۔ اس کو یہی کہا جائے گا کہ تجھے ہرگز حق نہیں قرآن کو اس کام میں لانے کا تو قرآن کا حق تلف کرتا ہے اس کو اس مثال سے سمجھئے کہ دوشالہ موضوع تو ہے اوڑھنے ہی کے لیے لیکن جو شخص ہمیشہ تو اس کو اوڑھتا ہی ہے لیکن کبھی ضرورت پڑی تو اس نے اس کو پردہ کی جگہ بھی ٹانگ دیا تو اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جائے گا اور ایک شخص ہے

کہ دوشالہ کو ہمیشہ شطرنجی ہی کی جگہ بچھاتا ہے یا ہمیشہ سائبان ہی کا کام اس سے لیتا ہے تو اس کو ضرور بیوقوف کہا جائے گا۔ غرض قرآن کو اگر کبھی کبھی تعویز کے لیے یا برکت کے لیے بھی کام میں لایا جائے تو مضائقہ نہیں مگر صرف اسی کو مقصود قرآن کا نہ سمجھیں مجھ سے اگر کوئی تعویذ مانگتا ہے تو میں دیکھ لیتا ہوں کہ اس شخص کو تعویذ دینے سے اس خیال فاسد کی تائید تو نہ ہوگی کہ قرآن کا مقصود محض یہی ہے اگر قرائن سے معلوم ہوا کہ تائید ہوگی تو اس شخص کو میں تعویذ نہیں دیتا اور اگر معلوم ہو کہ وہ آدمی سمجھدار ہے اور یہ اثر اس پر نہ ہوگا تب دے دیتا ہوں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن کے ساتھ جو برتاؤ ہم کو کرنا چاہیے تھا وہ ہم نہیں کرتے اسی واسطے جو نفع تھا قرآن کا وہ ہم کو حاصل نہیں ہوتا' یہی بیان اس آیت میں ہے کہ قرآن سے انتفاع کے لیے ایک خاص طریق ہے اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ محض حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس طریق کو خود بیان فرمادیا ورنہ یہ بات تو ہمارے پوچھنے کی تھی' قرآن کا اتارنا حق تعالیٰ کا کام تھا اور اس سے انتفاع کا طریقہ ہم کو پوچھنا چاہیے تھا مگر پوچھتے تو کیا بتانے پر بھی سن لیں تو غنیمت ہے چنانچہ یہی واقع ہو رہا ہے۔

وعظ نہ سننے کا حیلہ نفس

دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ وعظ کو صرف اس خوف سے نہیں سنتے کہ اس کے موافق عمل کرنا پڑے گا۔ کیوں خواہ مخواہ اپنے سر بلا لی کوئی پوچھے کہ کیا اس صورت میں یہ عذر آپ کا چل جائے گا کہ ہم نے وعظ نہیں سنا تھا ہمیں گناہوں کا گناہ ہونا معلوم ہی نہیں ہوا تھا اس واسطے گناہ کرتے رہے کیونکہ صاحب آپ ایک قتل کر دیں تو عدالت میں یہ کہہ کر چھوٹ جائیں گے میں نے قتل کی ممانعت کا قانون نہیں سنا تھا یا یہ عذر کریں کہ لوگ مجھ کو ممانعت سناتے رہے مگر میں نے سنی نہیں تھی بلکہ یہ تو دہرا جرم ہوگا کہ سننے سے بھی انکار کیا۔ اسی طرح وعظ سننے کے خوف سے اوامر حق تعالیٰ کے ساقط نہیں ہو جائیں گے۔ یہ محض حیلہ ہے نفس کا اور سستی وغفلت ہے اور دین سے بعد ہے۔ ذمہ تو آپ کے یہ تھا کہ طریقہ انتفاع کا خود پوچھتے مگر اس کی امید کسی طرح نہ تھی اس واسطے حق تعالیٰ نے اس کو خود ہی بیان فرمادیا اگر آپ بیان کرنے پر سن ہی لیں تو غنیمت ہے۔ عجیب بات ہے کہ دین کے بارے میں جو کچھ بتلایا جاتا ہے بجائے اس کے کہ خدا تعالیٰ کے احسان مند ہوں الٹا اس کے سننے کا احسان رکھتے ہیں اس کے یہ تو معنی ہوئے کہ دین خدا تعالیٰ کے فائدہ کا کام ہے اس کو پورا کرنا یا اس کے متعلق کچھ کہنا سننا یہ سب ہماری طرف سے تبرع ہے اور اس غلطی میں صرف عوام ہی مبتلا نہیں بلکہ خواص بھی مبتلا ہیں۔ عوام تو خیر عوام ہی ہیں زیادہ

تعجب خواص سے ہے کہ اگر کوئی کام کرتے ہیں یا کسی بات کا ان کو علم ہوتا ہے تو یہ نہیں سمجھتے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو توفیق اس عمل کی دی یا ہم کو علم دیا۔ ٹٹول کر دیکھ لیں کہ عمل یا عمل کے بعد طبیعتوں میں ایک قسم کا ناز پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے ایک کام کیا اور اپنا کام نہیں بلکہ حق تعالیٰ کا کام کیا یا علم کی وجہ سے حق تعالیٰ کے مقرب ہوگئے۔ خواص میں اس غلطی کا منشاء ایک دھوکہ ہے وہ یہ کہ بعض نصوص میں اس قسم کے الفاظ ہیں: ''جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ'' (یہ ان اعمال کا بدلہ جو وہ کرتے تھے) اور ''اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ'' (وارث بنادیا جائے گا تم کو اس کا ان اعمال کیوجہ سے جن کو تم کرتے تھے) جن میں عمل کو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور اس پر جزاء کو مترتب کیا گیا ہے تو اس سے ان کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ اس حالت میں اگر ہم بھی عمل کو اپنی طرف منسوب سمجھیں اور اپنے کو جزاء کا مستحق سمجھیں تو کیا بے جا ہے۔

توفیق اعمال حسنہ پر ضرورت شکر

میں اہل علم کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ عمل کی نسبت کسی درجہ میں آپ کی طرف ضرور ہوسکتی ہے لیکن اس کے اسباب کا مہیا ہونا یا موانع کا رفع ہونا آپ کے اختیار سے ہوا یا کسی اور کے اختیار سے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ آپ کے اختیار سے ہوا۔ مثلاً نماز پڑھی یہ عمل آپ نے کیا آپ کو مصلی کہہ سکتے ہیں لیکن نماز ہاتھ پیر سے پڑھی جاتی ہے۔ ہاتھ پیر میں قوت کہاں سے آئی کیا وہ بھی آپ ہی نے پیدا کی یا کوئی مانع پیش نہ آیا کیا کسی مانع کا پیش نہ آنا آپ ہی کی قوت سے ہوا' ہرگز نہیں یہ سب دوسرے کے عطایا ہیں۔ پھر جب نماز ہاتھ پیر پر موقوف ہے اور ان کا کام دینا مانع نہ ہونے پر موقوف ہے اور یہ سب دوسرے کے کام ہیں آپ کے اختیار میں نہیں تو نتیجہ تو وہی نکلا کہ عمل آپ کے اختیار میں نہیں۔ اب جو نسبت عمل کی آپ کی طرف کی جائے تو وہ محض آپ کے دل خوش کرنے اور ہمت بندھانے کے لیے ہے اور غایت درجہ کی شفقت اور کرم ہے اس کی قدر اور اس پر شکر کرنا چاہیے نہ کہ دعویٰ فخر کیا جائے۔ دیکھئے بعض وقت طبیب کسی جاہل آدمی سے جس سے خاص تعلق ہو یا کسی ایسے بچے سے جس سے تعلق ہو از روئے ترحم کہہ دیتا ہے کہ یہ دوا پی لو اور اس میں وہ حیلہ وحجت کرتا ہے تو طبیب کہتا ہے کہ میرا کام سمجھ کر کرلو اور اپنے اوپر رحم نہ کرو بلکہ میرے اوپر رحم کرو تو کیا اس سے دوا کا پینا سچ مچ طبیب کا کام ہو گیا جو کوئی ایسا سمجھے وہ دیوانہ ہے یا نہیں اسی طرح اگر عمل کی نسبت آپ کی نسبت آپ کی طرف کی گئی تو وہ کیا سچ مچ آپ ہی کا عمل ہو گیا۔ یہ صرف حق تعالیٰ کا کرم ہے کہ اپنا احسان نہیں جتلانا چاہتے اس

واسطے عمل کو آپ کی طرف منسوب کر دیا۔ قیامت میں یہی ہوگا کہ اعمال کی جزا کہہ کر درجات دیئے جائیں گے۔ ''وَنُوْدُوْا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ٥'' یعنی ندا دی جائے گی کہ یہ جنت تم کو تمہارے اعمال کے بدلے دی جاتی ہے اور حقیقت وہی ہے جو میں نے بیان کی کہ یہ سب کرم و فضل ہے کیونکہ ہمارے اعمال موقوف ہیں آلات پر اور آلات ہمارے اختیار میں نہیں تو قاعدہ سے ہمارے اعمال بھی من کل الوجوہ ہماری قدرت میں نہ ہوں گے۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے اپنے کسی غلام کو ایک چیز دینی ہے مگر اپنا نام کرنا نہیں ہے اس واسطے پہلے اس کو ایک اشرفی دے دی پھر کہہ دیا کہ یہ چیز ہم سے ایک اشرفی کے بدلے خرید لو اس نے خرید لی۔ تو سچ بتایئے کہ ضابطہ شرعیہ واقعیہ سے یہ چیز اس کی ہوئی یا دینے والے کی ہوئی۔ خریدا تو اس نے بیشک ہے لیکن وہ اشرفی جس سے اس نے خریدا ہے وہ کہاں سے آئی تھی وہ تو اسی نے دی تھی تو درحقیقت یہ سب کچھ اسی کی عطا ہوئی اور وہ بھی تمہارے ہی نفع کے لیے چنانچہ ذرا اوپر کی تقریر سے ظاہر ہے جہاں اس غلطی کا بیان کیا گیا ہے کہ بجائے اس کے خدا تعالیٰ کے احسان مند ہوں الٹا اپنا احسان رکھتے ہیں مگر سوچو سیدھی بات ہے کہ عبادت اور عمل بالقرآن کس کے نفع کا کام ہے خدا کا یا تمہارا بتایا ہوا بحیثیت بندہ ہونے کے اس کا امتثال بہرحال واجب ہے خواہ ہمارا کچھ نفع ہو یا نہ ہو بلکہ نقصان ہو تب بھی واجب ہے چہ جائیکہ اس پر اجر کا بھی وعدہ ہے جب یہ ہے تو اس کے طریقہ کا پوچھنا بھی ضابطہ سے ہمارے ہی ذمہ واجب ہونا چاہیے تھا لیکن ہماری لاپروائی سے یہ امید کہاں کی جاسکتی تھی کہ طریقے پوچھیں گے لہٰذا از راہ کرم بلا ہمارے پوچھنے کے خود ہی طریقے بھی بتا دیئے اس کرم کی بہت قدر کرنا چاہیے۔

حقوق اللہ کہنے کی عجیب مثال

میری اس تقریر سے اس کی حقیقت بھی سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ بعض اعمال کو جو حقوق اللہ کہا گیا ہے اس کے یہ معنی نہیں ہے کہ وہ خدا کے ذاتی نفع کے کام ہیں جن کو وہ اپنی کسی ضرورت سے تم سے لینا چاہتے ہیں بلکہ اس کی حقیقت وہی ہے جو طبیب اور مریض کی مثال میں بیان کر چکا ہوں کہ بعض وقت طبیب کسی مریض سے خاص تعلق کی وجہ سے کہتا ہے کہ میرا کام سمجھ کر دوا پی لو اسی طرح بعض اعمال کو حقوق اللہ کہہ دیا گیا ہے تاکہ ہم خدا ہی کا کام سمجھ کر ان کو کرلیں اور اس کی جزا کے مستحق ہو جائیں۔ اب لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کا کام کر رہے ہیں۔ بعضے رات کو اٹھتے ہیں بارہ تسبیح کا ذکر کرتے ہیں پھر دل میں ناز کرتے ہیں کہ ہم ذاکر ہیں اور اپنی بزرگی کے خود ہی معتقد ہو جاتے ہیں۔

گویا خدا تعالیٰ پر احسان رکھتے ہیں۔ ارے بیوقوفو تم خدا کا کام کرتے ہو یا اپنا اور اس میں بزرگی کی کیا بات ہے اول تو یہ خدا کا کام نہیں تمہارا ہے اگر ہو بھی تو تم نے کیا کیا خدا ہی نے تو توفیق دی اور اسباب مہیا کیے تب تم کام کر سکے تو اس کی حقیقت وہ ہی ہوئی یا نہیں جو میں نے ابھی کہا کہ ایک شخص کسی کو کچھ دیتا ہے مگر دینے والا ایسا کریم ہے کہ اپنا نام کرنا اور احسان جتلانا نہیں چاہتا اس واسطے پہلے اس کو ایک اشرفی دے دیتا ہے پھر کہتا ہے کہ اس اشرفی کی یہ چیز ہم سے خرید لو۔ کون عقلمند خریدار ہے جو اس خریداری کا احسان الٹا اس دینے والے پر رکھے۔ درحقیقت تو سب اسی کا احسان و کرم ہے ایسے دینے والے پر تو قربان ہو جانا چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے دماغ بگڑ گئے ہیں دین تو خود ہمارا کام تھا نماز پڑھتے روزہ رکھتے تمام ارکان دین بجالاتے اور احسان مانتے کیونکہ ہم کو ان کا فائدہ ملنے والا ہے لیکن خیالات اُلٹے ہو گئے ہیں نماز پڑھتے ہیں اور اس پر ناز کرتے ہیں اس کے معنی یہ ہوئے کہ دوسرے کا کام ہے جب ایسا مذاق خراب ہو گیا ہے تو عجب نہیں کہ عین کو بیکار اور اپنے ذمہ بار سمجھنے لگیں۔ پھر نتیجہ یہ ہو کہ ان تمام ثمرات سے جو اس پر موعود ہیں محروم رہیں۔ اسی محرومی سے بچانے کے لیے بعض اعمال کو حق اللہ کہہ دیا گیا ہے کہ اپنا کام سمجھ کر نہیں کرتے تو خدا ہی کا کام سمجھ کر کرلو۔ یہ خلاف حقیقت ہے اس عنوان میں بھی ایک کام کی بات ہے وہ یہ کہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی کام کرتا ہے اور اس میں لگا رہتا ہے تو کام خود فہم درست کر لیتا ہے۔ دیکھئے بچہ کو پڑھنے بٹھاتے ہیں تو اس پر اس قدر گرانی ہوتی ہے اور وہ کسی طرح پڑھنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ اگر مربی یہ کہہ کر اس کو چھوڑ دے کہ یہ کام تیرا ہی تو تھا تیرا دل نہیں لگتا تو جا بھاڑ میں تو اس کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ ہمیشہ جاہل ہی رہے اس کو کوئی سمجھدار اور اس کا بہی خواہ پسند نہیں کرتا بلکہ بچہ کو خوشامد وغیرہ سے زجر و تنبیہ سے لالچ سے پیسے دے کر راہ پر لگاتے ہیں۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ جب وہ الٹا سیدھا جس طرح بھی ہو پڑھنے میں لگ جاتا ہے تو اس کی سمجھ خود درست ہو جاتی ہے اسی معنی کو کہا جاتا ہے کہ کام خود بخود فہم کو درست کر لیتا ہے۔ بس اسی فائدہ کے لیے یہ کہا گیا کہ اگر تم دین کو کام نہیں سمجھتے اور اس سے تمہیں وحشت ہے تو اس کو خدا ہی کا کام سمجھ کر کرلو۔ جب کام میں لگ جاؤ گے تو کام تمہارے فہم کو درست کر لے گا۔ یہ وجہ ہے بعض اعمال کو حق اللہ کہنے کی۔ بہر حال کام میں لگانا چاہتے ہیں اور اس کے ثمرات دینا چاہتے ہیں اس کی قدر کرنا چاہیے کہ باوجود بے نیازی کے کام بتانے کے ساتھ اس کا طریقہ بھی بتاتے ہیں اگر کام ان ہی کے بتائے ہوئے طریقہ سے کیا جائے گا تو نفع یقینی اور بہت ہوگا اگر قرآن سے تعلیم ان طریقوں کے مطابق لی جائے جو قرآن نے بتائے ہیں تو ناممکن ہے کہ نفع نہ ہو۔

قرآن سے نفع حاصل کرنے کی شرائط

وہ طریقے کیا ہیں اسی کو فرماتے ہیں: "اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی" یعنی اس بیان میں (اس سے اور پر امم سابقہ کے کفار کے ہلاک کا ذکر ہے) نصیحت ہے مگر کس کو جس میں دو باتیں ہوں اور دو کا ذکر علی سبیل منع خلو ہے یعنی دونوں سے خالی نہ ہو خواہ دونوں جمع ہو جائیں۔ چنانچہ یہاں ہر واحد بھی کافی ہے اور دونوں کا اجتماع بھی ممکن ہے اس پر دلائل مستقلہ قائم ہیں (اس کا بیان بقدر ضرورت ختم وعظ کے قریب جہاں سے "اَلْقَی السَّمْعَ" کا بیان شروع ہوا مذکور ہے ۱۲) وہ دو باتیں کیا ہیں: "لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ" جس کے پاس قلب ہو "اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ" یعنی کان کو متوجہ ہو کر لگا دے ان دونوں لفظوں کا ترجمہ ذرا سا ہے اور لفظ بھی چھوٹے چھوٹے ہیں اس اختصار سے تعجب ہوگا کہ ذرا ذرا سی چیزیں ہیں اور ذرا سی بات ہے جس پر تمام دین کا نفع مبنی ہے۔ اس تعجب کا رفع میں کیے دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ سمجھ لیجئے کہ قرآن منطق کی اصطلاح میں نہیں نازل ہوا بلکہ سامعین کے محاورات میں نازل ہوا ہے یہ ایسا ہے جیسے ہمارے محاورے میں ہے کہ یہ دل گردہ والے کا کام ہے اس کے اگر لغوی معنیٰ لیے جائیں تو کلام بلاغت سے بہت ہی گرا ہوا ہو جاتا ہے بلکہ مفہوم ہی غلط ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں تو یہ معنی ہو جائیں گے کہ جس کے جسم میں دل اور گردہ ہو وہ یہ کام کر سکتا ہے سو دل اگر گردہ تو ہر انسان کے جسم میں موجود ہیں تو اس کے تو یہ معنی ہو گئے کہ ہر انسان یہ کام کر سکتا ہے حالانکہ یہ جملہ بولا جاتا ہے ایسے موقع پر کہ اس کام کو ہر انسان نہ کر سکے۔

لغت اور محاورہ میں فرق

بات یہ ہے کہ لغت اور محاورہ میں فرق ہوتا ہے وہ یہ کہ محاورہ میں لغوی معنی پر ایک زیادتی ہوتی ہے کہ وہ ہی مراد ہوتی ہے۔ مثلاً یہاں دل سے مراد لغوی دل نہیں بلکہ وہ دل مراد ہے جس میں صفات دل ہوں اور گردہ سے مراد لغوی گردہ نہیں بلکہ وہ گردہ مراد ہے جس میں صفات گردہ ہوں اور دل کی صفت ہے ہمت اور گردہ کی صفت ہے قوت۔ تو اس لفظ کے یہ معنی ہوئے کہ یہ کام وہ کر سکتا ہے جس میں ہمت وقوت ہو۔ دیکھئے اب یہ لفظ کیسا بلیغ ہو گیا اور اس موقع پر کیسا چسپاں ہو گیا جس میں یہ بولا جاتا ہے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ ایک حاکم کہتا ہے کہ ہمیں ایک آدمی کی ضرورت ہے اس کے لغوی معنی تو یہ ہیں کہ ایک ایسا شخص تلاش کیا جائے جس پر آدمی کا اطلاق ہو یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اب کسی نے اس پر یہ عمل کیا کہ ایک ایسے انسان کو جو نہایت درجہ بیمار اور اپاہج ہے ڈولی میں ڈال کر لے آیا اور حاکم کے سامنے پیش کر دیا کہ لیجئے

حضور آدمی حاضر ہے حالانکہ اس میں کسی کام کے کرنے کی قوت تو درکنار حواس بھی پورے موجود نہیں بس ایک مضغہ گوشت ہے۔ ہاں سانس چل رہا ہے اب آپ ہی فرمایئے کہ کیا اس کے حکم پر عمل ہو گیا لغتہً تو ہو گیا کیونکہ آدمی کا اطلاق اس پر صادق آتا ہے آخر وہ بھی اولاد آدم تو ہے ہی اور از روئے منطق بھی وہ آدمی ہے کیونکہ حیوان ناطق ہے اور ناطق کے معنی بولنے والا نہیں جیسا کہ عرف عام میں سمجھا جاتا ہے بلکہ اس کے معنی ہیں مدرک کلیات و جزئیات جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں یہ سب کچھ ہے لیکن اس حاکم کے سامنے ایسے مریض انسان کا پیش کرنا امتثال امر نہیں سمجھا جاتا۔ وجہ کیا ہے جو اغراض آدمی کے متعلق ہے جن کے واسطے حاکم آدمی مانگتا ہے وہ اس سے حاصل نہیں ہیں حتیٰ کہ اگر کمزور آدمی کو بھی پیش کیا جائے تو اس کو بھی وہ منظور نہیں کرے گا کیونکہ وہ تو ایسے آدمی کو چاہتا ہے جو خدمت گزاری اچھی طرح کر سکے اور یہ کام بہت ہٹے کٹے اور توانا و تندرست آدمی کا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جس کام کے لیے آدمی چاہیے اگر اس سے وہ کام نہیں ہو سکتا تو اس سے آدمیت ہی کی نفی کی جاتی ہے۔ اسی معنی کو یہ کہا گیا ہے:

آنرا کہ عقل و ہمت تدبیر روئے انیست   خوش گفت پردہ دار کہ کس درسرائے نیست

(جو شخص عقل و ہمت و تدبیر ورائے نہیں رکھتا پردہ دار نے خوب کہا کہ سرائے گھر میں کوئی آدمی نہیں ہے)

دیکھئے کس کی نفی کی ہے حالانکہ وہاں آدمی موجود ہیں وجہ یہی ہے کہ وہ محض لغوی آدمی ہیں ایسے آدمی نہیں جن سے وہ غرض پوری ہو جو آدمی سے پوری ہوتی ہے۔ یعنی لغوی آدمی ہیں اصطلاحی نہیں۔ امراء کے ہاں تو یہ محاورہ بہت مستعمل ہے' کہا جاتا ہے کہ آپ فلاں تجارت شروع کیجئے یا فلاں محکمہ کھولئے تو کہتے ہیں میں مجبور ہوں میرے پاس کوئی آدمی نہیں ہے یعنی اس کام کا آدمی نہیں ہے یوں لغوی آدمی تو بہت سے موجود ہیں۔ خلاصہ یہ کہ محاورات میں محض لغت پر نظر نہیں ہوتی بلکہ حصول اغراض پر نظر ہوتی ہے۔

لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ کا مفہوم

اب سمجھ میں آ جائے گا کہ "لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ" کے کیا معنی ہیں۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ جس کے جسم میں دل بمعنی مضغہ گوشت ہو بلکہ وہ دل ہو جس سے وہ اغراض حاصل ہو سکیں جس کے لیے دل ہوتا ہے وہ اغراض کیا ہیں' ادراک یعنی بھلے برے کو سمجھنا اور ارادہ جس سے نافع کو اختیار اور مضر کو ترک کر سکے۔ ان ہی کو شرعی اصطلاح میں علم و عزم کہتے ہیں تو دو صفت ہوئیں قلب کی علم اور

عزم۔ میں نے دونوں لفظ (یعنی علم اورعزم) پہلے نہیں استعمال کیے بلکہ بجائے ان کے دوسرے الفاظ یعنی ادراک وارادہ۔ اس واسطے کہ آج کل ایسی بدمذاقی پھیل رہی ہے کہ اپنے علوم یعنی علوم دینیہ کے اصطلاحوں سے بھی اجنبیت ہوگئی اسی واسطے میں نے اول عام محاورات سے تفہیم کر کے اس کے بعد ان لفظوں کا استعمال کیا۔ غرض دوصفت ہیں قلب کی' علم اورعزم۔ جب یہ دونوں صفتیں موجود ہوں گی تب کہا جائے گا کہ اس پر ''لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ'' صادق ہے۔

ہر فن کی اصطلاحات جدا ہیں

اب ایک دوسری بات سنئے وہ یہ کہ یہ عام قاعدہ ہے کہ جس فن میں گفتگو ہوتی ہے تمام گفتگو میں اسی فن کی اصطلاحیں بولی جایا کرتی ہے جیسے اقلیدس میں اصول موضوعہ ہیں کہ اول ان کو بیان کر دیا جاتا ہے اس کے بعد تمام اقلیدس میں جہاں اصول موضوعہ کا لفظ آتا ہے انہیں اصول میں سے کوئی مراد ہوتا ہے کسی دوسرے فن کے اصول مراد نہیں ہوتے یا علم حساب کی اصطلاح میں بعض الفاظ مقرر ہیں جیسے جمع' تفریق' ضرب ان کے خاص خاص معنی ہیں۔ علم حساب میں جہاں جہاں وہ لفظ بولے جائیں گے وہی معنی مقررہ مراد ہوں گے کہیں جمع سے مراد مجمع کرنا یا تفریق سے مراد جمع کو منتشر کرنا یا ضرب سے مراد مارنا نہیں ہوگا۔ غرض ہر فن کی اصطلاحات جدا ہیں دین بھی ایک فن ہے اس کے متعلق بھی کچھ اصطلاحات ہیں اُن ہی میں سے ایک لفظ علم بھی ہے دین میں اس سے مراد مطلق جاننا نہیں ہوتا بلکہ مراد علم دین ہوتا ہے کسی اور چیز کا جاننا مراد نہیں ہوتا اس غلطی میں بہت سے ہمارے بھائی پڑے ہوئے ہیں کہ قرآن یا حدیث یا اور دین کی کتابوں میں علم کی فضیلت دیکھتے ہیں تو اس سے مراد کیا لیتے ہیں کوئی زراعت وفلاحت لیتا ہے کوئی تجارت لیتا ہے کوئی صنعت وحرفت لیتا ہے۔ یوں تو بڑی گنجائش نکلے گی وہ کام بھی اس میں داخل ہو جائیں گے جن کو تمام دنیا برا کہتی ہے جیسے چوری' حرام کاری' ڈاکہ' زنا وغیرہ کہ ان کا جاننا بھی تو علم ہی کی فرد ہے تو دین کیا ہوا' مجموعہ ہوا حسن اور قبیح کا اور مجموعہ حسن اور قبیح کا قبیح ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پلاؤ قورمہ میں نجاست ملادی جائے تو اس مجموعہ کو کوئی اچھا نہ کہے گا' یہ کوئی مذہب والا بھی نہیں کہہ سکتا کہ بری باتوں کا جاننا بھی مذہبی علم ہے۔ لامحالہ یہ کہنا پڑے گا کہ جس فن میں گفتگو ہو اس میں اسی فن کا جاننا علم کہلائے گا۔ یہاں دین کا بیان ہو رہا ہے تو یہاں علم سے مراد علم دین ہی ہوگا۔

قلب کی دو صفات

میں نے جو کہا تھا کہ دو صفت ہیں قلب کی جن پر دین سے منتفع ہونا موقوف ہے اور وہ دو صفت علم اور عزم ہیں تو اس سے مراد یقیناً علم دین ہی ہے اور اگر میں ترقی کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ علم کا مصداق صرف ایک علم دین ہی ہے دوسرے علوم اس کے سامنے علوم ہی نہیں ہیں اس سے تعجب نہ کیجئے دیکھئے کفش دوزی بھی ایک کام ہے اور زراعت و فلاحت بھی ایک کام ہے کہ ایک کفش دوزی کے علم کو زراعت و فلاحت کے علم کے سامنے آپ علم کہیں گے اگر ایسا ہے تو چمار اور کاشتکار برابر ہوں گے۔ آفتاب کے سامنے تاروں کو کوئی منور نہیں کہتا حالانکہ تاروں میں بھی روشنی یقیناً ہے پھر ان کو آفتاب کے سامنے منور کیوں نہیں کہا جاتا۔ حتیٰ کہ وہ آفتاب کے سامنے نظر بھی نہیں آتے' دن کو تارے کہیں چلے تھوڑا ہی جاتے ہیں بلکہ آفتاب کے سامنے ان کی روشنی ماند ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جس سے پوچھئے دن کے وقت یہی کہے گا کہ تارے اس وقت نہیں ہیں۔ وجہ کیا ہے کہ ان کی روشنی اس وقت آفتاب کے مقابلہ میں ماند ہوگئی ہے تو تاروں کی صفت خاص یعنی روشنی ماند ہو جانے کی وجہ سے ان کی ذات پر بھی معدوم ہونے کا اطلاق کیا گیا۔

اعلیٰ کی موجودگی میں ادنیٰ معدوم ہوتا ہے

اس کی بناء اسی قاعدہ پر تو ہے کہ اعلیٰ کے سامنے ادنیٰ کو اور شریف کے سامنے خسیس کو موجود ہی نہیں کہا جاتا۔ اب بہت آسانی سے سمجھ میں آ جائے گا کہ علم اعلیٰ واشرف کے سامنے علم ادنیٰ واخس کو اگر معدوم بھی کہہ دیا جائے تو کچھ بے جا نہیں اب ہم کہتے ہیں کہ تمام علوم میں اشرف علم دین ہی ہے اور دیگر تمام علوم اخس اور ارذل ہیں۔ رہی یہ بات کہ یہ فیصلہ کیونکر ہو کہ یہ دعویٰ ہمارا صحیح ہے یا غلط اور علوم میں شریف اور خسیس کون ہے اس کے لیے کوئی معیار ہونا چاہیے سو اس معیار کی تعلیق بہت سہل ہے وہ معیار یہ ہے کہ علم کا شرف معلوم کے شرف پر موقوف ہے اور معلوم اس کو کہتے ہیں جس کے حالات اس علم میں بیان کیے جاتے ہیں اور ہر علم کا معلوم جدا ہوتا ہے۔ جس علم کا معلوم جس درجہ میں ہے اسی درجہ میں علم بھی ہوتا ہے۔ مثلاً علم کا معلوم جدا ہوتا ہے۔ جس علم کا معلوم جس درجہ میں ہے اسی درجہ میں علم بھی ہوتا ہے۔ مثلاً علم فلاحت کا معلوم زراعت یعنی کھیتی کرنا ہے اور کناسی (خاکروبی) کا معلوم پاخانہ ہے جو نسبت دونوں معلوموں میں ہے یعنی کھیتی اور پاخانہ میں وہی نسبت ان کے علموں میں بھی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ پاخانہ نجس چیز اور ارذل چیز ہے اور زراعت صاف ستھری اور ذی شرف چیز ہے لہٰذا علم کناسی ارذل ہوگا اور علم خلافت اشرف اور علم کناسی علم فلاحت کے سامنے علم کہلانے کا بھی مستحق نہ ہوگا۔ یہ قاعدہ تمام علوم کے لیے عام ہے' تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اب دیکھئے علم دین کا معلوم کیا ہے سب

جانتے ہیں کہ وہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات اوراحکام ہیں۔تمام علم دین کا خلاصہ یہی ہے اور دیگر تمام علوم کا معلوم دنیا کو گویا سوی اللہ کو کہو تو جو نسبت دنیا یا ماسوا کو خدا تعالیٰ کے ساتھ ہے وہی نسبت علوم دنیویہ کو ہوگی علم دین کے ساتھ اور اس نسبت کے متعلق بجز اس کے کیا کہا جاسکتا ہے کہ ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔(عالم پاک کو خاک سے کیا نسبت ہے) حق تعالیٰ کی ذات صفات کو تو کسی چیز کے ساتھ کچھ بھی نسبت نہیں دی جاسکتی وہ باقی اور سب فانی' وہ زندہ اور سب مردہ' وہ غنی اور سب محتاج وہ موجود اور سب چیزیں معدوم "کُلُّ شَیْءٍ هَالِکٌ اِلَّا وَجْهَهٗ" (ذات حق کے علاوہ سب چیزیں فانی ہیں) غرض دونوں چیزوں میں کوئی نسبت قائم ہوہی نہیں سکتی تو دونوں کے علوم میں بھی کوئی نسبت نہیں قرار دی جاسکتی سوائے اس کے علم دین پر موجود کا اطلاق کیا جائے اور دیگر علوم پر معدوم کا اب میرا دعویٰ بہت قریب الی الفہم ہوگیا ہوگا کہ علم دین کے سامنے دیگر علوم علم کہلانے ہی کے مستحق نہیں مقابلہ تو کیا کیا جائے جولوگ علم کی فضیلتوں کے ضمن میں علوم دنیا کو ٹھونستے ہیں مجھے اس پر سخت حیرت ہوتی ہے۔

علوم دنیا دراصل پیشہ ہیں

خدارا مسلمانو! اس اصطلاح کو بدلو علوم دنیا کو علم فن کہو دین نہ کہو' پیشہ کہو حرفت کہو' مگر علم مت کہو بلکہ جہاں کہیں قرآن وحدیث میں علم کا لفظ آئے اس سے مراد یہ علوم دنیا ہرگز نہ لو۔اس میں ایک باریک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ جب ان دنیوی چیزوں کے علم کو بھی علم کہا جاتا ہے تو جولوگ ان علوم کے جاننے والے ہیں ان کو علماء اور فضلاء اور حکماء اور عقلاء اور اہل تحقیق اور جانے کیا کیا بھی کہا جاتا ہے اور جب علماء کے فضائل بیان ہوتے ہیں تو ان لوگوں کو بھی ان کا مستحق سمجھا جاتا ہے بلکہ بعضے لوگ صرف انہیں علوم کو علوم فاضلہ مطلوبہ سمجھنے لگتے ہیں کیونکہ علم کے مصداق ان کے ذہن میں یہی ہیں پھر شرعی نصوص سے ان کی فضیلت ثابت کی جاتی ہے اور ان علوم کے نہ جاننے والوں کو جاہل' پست ہمت تاریک دماغ وغیرہ کہا جاتا ہے حالانکہ جہاں شریعت میں علم کی فضیلت آئی ہے وہاں ان علوم کی فضیلت مراد نہیں۔جیسا ابھی بیان ہوا ہے یہ خرابی اس اصطلاح ہی کی ہے ان کو بدلو۔

علم سے متعلق ایک مشہور حدیث کا مفہوم

چنانچہ ایک لیکچر میں دنیوی علوم کی فضیلت کو بیان کیا گیا اور عجیب طرح استدلال کیا گیا وہ جو عوام کی زبان پر ایک مشہور حدیث ہے:"اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ کَانَ بِالصِّیْنِ"[1] یعنی علم کو طلب کرو اگرچہ چین میں ملے۔اس میں آج کل کے عام تعلیم یافتہ لوگ علوم مروجہ کو صرف داخل ہی کیا کرتے ہیں لیکن اس پر لیکچرار نے تو اور بھی کمال کیا کہ اس نے اس حدیث میں

---

[1] (کنزالعمال:۲۸۶۹۷)

صرف ان ہی علوم کو مراد لیا اور دلیل یہ بیان کی کہ یہ حدیث جس وقت ارشاد ہوئی اس وقت چین میں ظاہر ہے کہ علوم دین تو پہنچے ہی نہیں تھے صرف علوم نبویہ ہی تھے تو لامحالہ اس جلسہ میں علم سے مراد صرف یہی دنیویہ علوم ہوں گے۔ بظاہر یہ استدلال ہے کہ آج کل کے تعلیم یافتہ تو اس پر عش عش کرنے لگیں گے اور اپنے نزدیک سمجھ لیں گے کہ بس اس کا کوئی جواب ہو ہی نہیں سکتا لیکن سنئے عربی زبان کے محاورات میں لو کا لفظ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جہاں ہمارے محاورہ میں بالفرض کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً آیت میں ہے:

فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ۝

یہ آیت کفار کے بارے میں ہے مطلب یہ ہے کہ کافر سے اس کے جرم کے فدیہ میں تمام زمین بھر کر بھی سونا نہیں قبول کیا جائے گا اگرچہ وہ دینا چاہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قیامت میں ایسا ہوگا کہ کافر زمین بھر کر سونا دے گا مگر قبول نہ کیا جائے گا بلکہ یہی مطلب ہے کہ ایسا نہ ہوگا اور اگر بالفرض ایسا ہوتا بھی تب بھی قبول نہ کیا جاتا اور کافر کو دوزخ ہی میں ڈالا جاتا۔ بنابریں ولو کان بالصین والی حدیث میں جو لفظ علم واقع ہے اس سے یقیناً علوم دنیویہ مراد نہیں ہو سکتے وہ تو اس وقت وہاں موجود تھے بلکہ ایسا علم مراد ہوگا جو اس وقت وہاں نہ تھا اور اس کا ہونا بعید بھی تھا۔ سو حاصل حدیث کا یہ ہوا کہ علم دین جس کی توقع چین میں ہونا بہت بعید ہے اگر بالفرض کسی وقت وہاں مل سکے تو وہاں جا کر حاصل کرنا۔ اب بتلائیے اس حدیث میں علم سے مراد علم دنیوی ہوا یا علم دین۔ غرض یہ غلط اصطلاح ہے کہ علم سے مراد ہم جو چاہیں لے لیں اور نصوص شرعیہ میں جو فضیلت علم کی آئی ہے وہ اپنے اصطلاحی معنوں کے لیے ثابت کریں۔

اصطلاح شریعت میں علم صرف علم دین ہی ہے

شاید کوئی ذہین آدمی یہ کہہ دے کہ مشہور جملہ ہے ''لامشاحة فی الاصطلاح'' کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ ایک اصطلاح مقرر کرلے ہم اپنی اصطلاح میں ان علوم کو بھی علم ہی کہتے ہیں تو اس پر کیوں نکیر کی جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اختیار آپ کو بے شک حاصل ہے اور کوئی آپ کو منع نہیں کر سکتا کہ آدمی کا نام بندر رکھ دیجئے یا خنزیر رکھ دیجئے لیکن آپ کو اپنی اصطلاح کا دوسرے علوم یا فنون میں جاری کرنے کا تو اختیار نہیں ہے وہاں تو اسی علم یا فن کی اصطلاح لی جائے گی اور یہ اوپر ثابت ہو چکا ہے کہ شریعت کی اصطلاح میں علم صرف علم دین ہی ہے تو آپ کو اپنی اصطلاح اختراع کر کے شریعت میں تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں۔ لہٰذا آپ کو وہ فضائل جو شریعت نے علم

کے واسطے بیان فرمائے ہیں علوم دینیہ ہی کے واسطے ماننے پڑیں گے دوسرے علوم کے لیے نہیں۔ البتہ ان علوم دنیویہ کے متعلق شریعت کا حکم یہ ہے کہ نہ یہ منع ہیں اور نہ کچھ فضیلت کی چیز ہیں۔ ہاں ان کے لیے بھی شریعت کے احکام ہیں اور قیود ہیں جو اپنے اپنے موقع پر مذکور ہیں نہ انگریزی پڑھنے کو منع کیا جاتا ہے نہ زراعت کو نہ تجارت کو۔ ہاں ان کو منتہائے مقصود اور جزو شریعت بنانے سے منع کیا جاتا ہے۔ دیکھئے پڑوسی کے بھی حقوق ہوتے ہیں جن کو سب دنیا مانتی ہے۔ شریعت نے بھی پڑوسی کے بہت حقوق مقرر کیے ہیں لیکن اس بات کو کوئی عقلمند جائز نہیں کہتا اور نہ شریعت تعلیم دیتی ہے کہ اس کو باپ بنالو یا اس کو میراث دو۔ ہاں یہ حکم ضرور ہے کہ اس کا ہر بات میں جائز لحاظ کرو اور ضرور کرو اس کو احتیاج ہو تو اس کی امداد کرو لیکن اسی حد میں رکھو جو پڑوس کے لیے مناسب ہے ذوی القربیٰ پر مقدم نہ کرو۔ اسی طرح تمام ان چیزوں کو جو مفید ہوں سیکھنے کی اجازت ہے۔ بشرطیکہ حدود کے اندر ہوں لیکن ان کو کوئی امر شرعی یا باعث فضیلت اور جزو دین مت کہو ورنہ یہ ایسا ہی ہوگا جیسے پڑوسی کو باپ بنانا۔ اب میں اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ قلب کے لیے دو صفت ہیں اگر ان دونوں کے ساتھ متصف ہو کر قلب موجود ہوں تو ''لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ'' (اس شخص کے لیے جس کے پاس دل ہو) کا مصداق ہوگا ان میں سے ایک صفت تو علم ہے جس کا علم دین کے ساتھ خاص ہونا اوپر ثابت ہو چکا ہے۔

آیت میں عزم کا مفہوم

اور دوسری صفت عزم ہے اور جیسے کہ علم کے معنی میں لوگ غلطی کرتے ہیں جس کو رفع کر دیا گیا ہے ویسے ہی عزم کے معنی میں بھی لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ارادہ ضعیفہ کو بھی عزم سمجھتے ہیں خواہ وہ ادنیٰ مانع سے بھی زائل ہو جائے اس غلطی کو بھی میں رفع کرتا ہوں۔ بیان اس کا یہ ہے کہ عزم کہتے ہیں ارادہ قویہ کو یعنی ایسا پختہ ارادہ کہ چاہے کیسا ہی عارض پیش آئے بشرطیکہ اختیار باقی رہے اس ارادہ میں زوال ہو تو انتفاع بالقرآن کے لیے دو شرطیں ہوئیں ایک یہ کہ دین کا علم ہو اور دوسری یہ اس پر عمل کرنے کا پختہ قصد ہو اور یہی حاصل ہے ''لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ'' کا۔ غرض اس آیت کا یہ مطلب ہوا کہ نفع اس شخص کو ہوگا جس کو علم دین حاصل ہو اور اس پر عمل کے لیے عزم ہو۔ مجھے اس وقت اسی کا بیان کرنا ہے کہ ہر مسلمان کو ان دونوں صفتوں کے حاصل کرنے کی ضرورت ہے علم دین کی' عزم کی۔ علم سے سیدھا راستہ معلوم ہوگا اور عزم سے اس راستہ پر چلنا نصیب ہو سکے گا۔

مختصر دستور العمل حکمت میں

سبحان اللہ یہ کس قدر مختصر تعلیم ہے اس کی قدر اہل فہم جان سکتے ہیں کہ کس قدر مختصر عنوان ہے اور جامع ہے یہ بھی حکمت کا اصول ہے کہ دستور العمل مختصر ہو کیونکہ دستور العمل جس قدر مختصر ہو اس پر عمل کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت حدیثوں سے بھی ملتا ہے۔ ایک اعرابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اور کہ مجھے کچھ تعلیم کیجئے گا مگر وہ تعلیم مختصر جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے کیسی جامع اور مختصر تعلیم فرمائی۔ فرمایا: "قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ" یعنی اللہ پر ایمان لا پھر اس پر جارہ کیسا چھوٹا سا جملہ ہے مگر اس میں سب ہی کچھ آ گیا یہ ایسا ہے جیسے نکاح کے وقت ایجاب اور قبول کیا جاتا ہے اور لڑکے سے کہا جاتا ہے کہ تم نے فلاں لڑکی سے نکاح کو قبول کیا وہ کہتا ہے قبول کیا۔ یہ ذرا سا لفظ ہے مگر تمام ذمہ داریاں اور حقوق معاشرت سب کو حاوی۔ ہے ایسے ہی جب کہا کہ اللہ پر ایمان لا اس کے معنی یہ ہوئے کہ حق تعالیٰ کو خدا اور اپنے آپ کو بندہ مان لے اس میں سارے حقوق الوہیت حقوق عبودیت آ گئے اور دوسرے جملہ میں ثم استقم یعنی اس پر جمے رہو۔

حاصل یہ ہوا کہ ایمان لاؤ اور مرتے دم تم مومن رہو۔ بس دیکھو جیسا اس کا سوال تھا ویسا ہی جواب ہو گیا یہ اعلیٰ درجہ کی حکمت ہے کہ دستور العمل مختصر ہو اس سے احکام مختصر نہیں ہو جاتے ہاں یادداشت مختصر ہو جاتی ہے اس سے دماغ پریشان نہیں ہوتا اور ہر وقت تمام اجزاء اس دستور العمل کے اس عنوان کی وجہ سے مستحضر رہتے ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ ایک استاد نے بچہ کو آمد نامہ پڑھایا اور ایک ہزار مصدر یاد کروائے اب ان ہزاروں مصدروں کو یاد رکھنے میں اس کو بہت دقت ہوگی اس کے لیے اس نے مصدر کی ایک علامت کلی بتلادی کہ جس لفظ کے آخر میں دن یا تن ہو وہ مصدر ہوتا ہے اس سے اس کو کس قدر سہولت ہوگی اور کتنا بار ہلکا ہو گیا اگر یہ علامت نہ بتلائی ہوتی تو ان مصدروں کے یاد رکھنے کے لیے اس کو کس قدر تعب اٹھانا پڑتا کہ ہمیشہ ان مصدروں کو بطور آموختہ کے پھیرا کرتا اور اس علامت کے بتلا دینے کے بعد اسے آموختہ کی ضرورت ہی نہیں۔ ہر مصدر کو غیر مصدر سے تمیز کر سکتا ہے (کوئی طالب علم یہ سوال نہ کر بیٹھیں کہ اس علامت سے گردن بھی مصدر ہوا کیونکہ اس میں یہ بھی شرط ہے کہ آخر میں دن یا تن ہونے کے ساتھ اس سے صیغے مشتق ہوتے ہوں یہ بحثیں اپنے موقعوں پر کتابوں میں مذکور ہیں۔ یہاں ایک مثال کے طور پر ذکر آ گیا تھا) اس علامت سے مصادر مختصر نہیں ہو گئے مصادر تو ہزار ہا تھے اور وہ ہی رہے ہاں یادداشت مختصر ہو گئی۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے ثم استقم یعنی ایمان پر مع اس کے کل لوازم کے جمے رہو

اس میں کل احکام شریعت کے آ گئے اور ذہن میں جمعیت پیدا ہوگئی اس کی قدر اس اعرابی ہی سے پوچھنا چاہیے ایک بڑی چیز ہاتھ آ گئی اور جس چیز کی اس کو تلاش تھی وہ ہی مل گئی۔

ہم اپنے محاورات میں دیکھتے ہیں کہ جب ہم کوئی نوکر رکھتے ہیں تو اس سے بہت سے کام لیتے ہیں سب کاموں کو ایک دم بتا دینا ناممکن ہے اس واسطے خلاصہ بتا دیا جاتا ہے کہ حاضر رہو اور جس وقت ہم گھنٹی بجائیں فوراً بولو اس کہہ دینے کے بعد کاموں کی تفصیل کی ضرورت نہیں رہتی' اس کو ضابطہ کہتے ہیں۔ اسی کا ترجمہ قاعدہ کلیہ ہے ہر کام میں ضابطہ سے آسانی ہوجاتی ہے۔ اسی طرح قرآن سے نفع ہونے کے لیے ضابطہ بتلا دیا گیا جس کے بعد تفصیل یاد رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی وہ ضابطہ یہی ہے۔ ''لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ'' (اس شخص کے لیے جس کے پاس دل ہو) اور اس کے دو جزو ہوئے علم اور عزم یعنی ہمت۔ دین مکمل موجود ہے اس کے علم کی ضرورت ہے اور نرا علم کارآمد نہیں ہوتا بلکہ اصل غرض عمل ہے اس کے لیے عزم و ہمت کی ضرورت ہے دین کے بہت سے اجزاء ہیں عنوان مختصر ہونے سے ان اجزاء کی کمی مقصود نہیں بلکہ ان کے یاد رکھنے میں سہولت مقصود ہے۔

دین خود جوہر ہے

آج کل یہ بھی ایک ہوا چلی ہے کہ دین کا اختصار کیا جاتا ہے جیسے محسوسات میں علم کیمیا نکل آیا ہے کہ اس سے ہر چیز کا جوہر نکال لیا جاتا ہے' دواؤں کے جوہر موجود ہیں جو دوا سیر بھر وزن سے کام دیتی ہے وہ اب ماشہ بھر سے کام دیتی ہے۔ غرض صنائع کی ترقی ہے اس سے ہر چیز کا اختصار کر لیا گیا ہے جو کام دس آدمی کرتے تھے وہ ایک آدمی مشین سے کر سکتا ہے جو مسافت دس دن میں طے ہوتی تھی وہ ریل سے یا موٹر سے دس گھنٹہ میں طے ہوتی ہے۔ بعض غذاؤں کے جوہر بھی نکالے گئے ہیں جن سے جو کام سیر بھر غذا سے نکلتا تھا وہ چھٹا نک بھر جوہر سے نکل آتا ہے۔ بعض ذہین لوگوں نے علم کیمیا کو دین میں بھی استعمال کیا ہے جس سے دین کا بھی اختصار کرنا چاہا ہے۔ گویا تھوڑے کام سے سارے دین کا کام لے سکتے ہیں جیسے تھوڑی دوا سے بہت سی دوا کا کام لیا جاتا ہے اب دین کا جوہر کیا رہ گیا ہے فقط الٹی سیدھی نماز پڑھ لینا اور کسی رفاہ عام کے کام میں چندہ دے دینا اس کو بجائے زکوۃ کے سمجھتے ہیں۔ یورپ کا سفر کر آنا یہ حج کا خلاصہ ہے بعض نے تو یہاں تک اختصار کیا ہے کہ نماز کے لیے وضو کی بھی ضرورت نہیں رکھی اور رکعتوں کی تعداد بھی اڑا دی اور اس سے بھی زیادہ اختصار یہ ہے کہ تمام دین سے مقصود نیکی کرنا ہے بس نیکی کرتے رہو کسی کو ستاؤ مت' بس یہی دین ہے' یہ سب دین کے جوہر ہیں۔ صاحبو! دین خود جوہر ہے جوہر کے جوہر نکالنے کے لیے کوئی بھی نہیں۔

جوہر کا جوہر نہ نکلنے کی عجیب مثال

اگر کسی دوا کا جوہر نکالا تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کا بھی جوہر نکالو پھر اس جوہر کا بھی جوہر نکالو اس کا انجام تو اس چیز کو فنا کر دینا ہے' علم کیمیا کا انکار نہیں مگر تحلیل زوائد کی ہوا کرتی ہے ایک دوا کا جوہر نکالتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ جو چیزیں اس میں زائد تھیں ان کو تدبیر سے تحلیل کر دیا اور اصل چیز رہ گئی اسی کا نام جوہر ہے اور اسی کو ست بھی کہتے ہیں۔ اب ست چونکہ اصل چیز ہے اور زوائد سے پاک ہو چکا ہے اب اس میں تحلیل نہیں ہو سکتی۔ دین سارے کا سارا جوہر اور ست ہی ہے جن اجزاء کو زوائد سمجھا جاتا ہے وہ زوائد نہیں اگر وہ زوائد ہوتے تو ان کے ترک پر وعید کیوں ہوتی۔ رہے مکررات مثلاً نماز میں چار رکعت ہیں' سو یہ سمجھنا کہ ایک رکعت کافی تھی بار بار چار دفعہ ایک ہی سے افعال کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دیکھئے آپ کا جسم کتنے اعضاء سے مرکب ہے جن میں مکررات بھی ہیں دو ہاتھ ہیں دو پیر ہیں دو آنکھیں ہیں وغیرہ وغیرہ مگر ان میں چونکہ زوائد نہیں بلکہ یہ سارے کے سارے اصلی اور ضروری اجزاء ہیں۔ گویا ست ہی ہیں اس واسطے انہیں تحلیل و تخفیف نہیں کی جاتی ورنہ انہیں بھی اختصار کیجئے۔ دو ہاتھ کی جگہ ایک ہاتھ رکھئے دو پیر کی جگہ ایک پیر رکھئے۔ دو آنکھوں کی جگہ ایک آنکھ رکھئے' منہ میں دانت تو ۳۲ ہیں ان میں اختصار کر کے صرف ایک دانت رکھئے باقی زوائد کو حذف کیجئے اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ جو اعضاء دو ہیں ان کے دونوں کی ضرورت ہے دانت ۳۲ ہیں تو ۳۲ ہی کی ضرورت ہے اگر اتنے نہ ہوں تو کام نہیں چلے گا۔ دو ہاتھ نہ ہوں تو کھانا پینا' آبدست لینا دشوار ہوگا۔ دانت ۳۲ نہ ہوں تو کھانا مشکل ہوگا' پیر دو نہ ہوں تو چلنا پھرنا ناممکن ہے۔

اب سمجھئے کہ جو اعضاء کے اختصار پر مضار مرتب ہیں یہ وعیدیں ہی تو ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ اگر اختصار ہوگا تو فلاں نقصان ہوگا۔ دین آخرت کا کام ہے اس کے اجزاء کی کمی پر وعیدیں موجود ہیں کہ اگر فلاں کام نہ ہوگا تو اس پر یہ عذاب ہوگا پھر اس میں اختصار کے کیا معنی؟ اس میں اختصار کے یہی معنی تو ہوئے کہ گو یہ عذاب ہو مگر ہم اس کو برداشت کریں گے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم جسم کے اجزاء کے بارے میں کہیں کہ اگر ایک پیر ہوگا تو بلا سے ہم چلنا پھرنا نہیں کریں گے ایک ہاتھ ہوگا تو ہم آبدست نہیں لیں گے پھر کسی کو یہ کرتے دیکھا ہے یا کوئی اس کو پسند کرتا ہے۔ اگر دین کا ست نکالنا اور اختصار کرنا ہے تو اپنے جسم کا بھی ست نکالئے اور اعضاء میں اختصار کیجئے مگر اعضاء کی نسبت تو کہا جاتا ہے کہ ایک بھی زائد نہیں بلکہ بعضے اعضاء ایسے ہیں جن کی ضرورت

اور حکمت اب تک سمجھ میں نہیں آئی لیکن کہا جاتا ہے کہ صانع جل شانہ علیم و حکیم نے ان میں بھی کوئی حکمت رکھی ہوگی۔ "فعل الحکیم لایخلو عن الحکمۃ" (حکیم کا فعل حکمت سے خالی نہیں ہوا کرتا) حیرت ہے کہ جسم کے اجزاء میں تو حکمت ہو اور دین کے اجزاء میں حکمت نہ ہو حالانکہ دین بھی تو انہیں کا بنایا ہوا ہے جن کا جسم بنایا ہوا ہے جو علیم و حکیم ہیں اور جسم دنیاوی چیز ہے جس کو انہوں نے خود ناقص اور ناقابل اعتبار کہا ہے اور جو فانی بھی ہے اور دین اخروی چیز ہے جس پر آخرت مترتب ہے اور آخرت کو کامل اور قابل اعتبار کہا ہے اور وہ باقی ہے۔

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى. مَاعِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۝

"دنیا کا مال و متاع قلیل ہے اور آخرت اس شخص کے لیے بہتر ہے جو اللہ سے ڈرتا ہوں۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ فنا ہو جائے گا جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔"

پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو چیز فانی اور ناقابل اعتبار ہو اس کے اجزاء میں تو حکمت ہو اور جس پر ایک خیر باقی مرتب ہو اس کے اجزاء میں حکمت نہ ہو۔ یہ بہت موٹی بات ہے۔

دین کا کوئی جزو بھی زائد نہیں

میں تو کہتا ہوں کہ دین کا کوئی جزو بھی زائد نہیں حتیٰ کہ مستحبات بھی اپنے درجہ میں غیر زائد ہیں گو اتنا تفاوت ہے کہ واجبات کی کمی میں خسران ہے اور مستحبات کی کمی میں حرمان مگر ضرر تو ان کی کمی میں بھی ہوا۔ اب لوگ مستحبات کو یہ کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ کوئی ضروری کام نہیں' کریں گے تو ثواب ملے گا' نہ کریں گے تو گناہ نہ ہوگا۔ صاحبو! گناہ نہ ہونا اور بات ہے اور منفعت ہونا اور بات ہے اگر آپ کو مستحبات کے ثمرات معلوم ہو جائیں تو ان کا بھی کافی اہتمام کرنے لگیں۔ اگر مستحبات کے ثمرات کے سامنے آ جائیں تو کوئی ایک ادنیٰ سے مستحب کو بھی نہ چھوڑیں گے۔ گو یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ مستحبات سے ضرورت کو اٹھا لیا اس وجہ سے کہ ہم لوگوں میں ہمت کم ہے اگر سب کو فرض کر دیا جاتا تو غالباً ہم مستحبات ہی کو نہیں بلکہ فرائض کو بھی چھوڑ دیتے اور یہ فرق علوم دینیہ کی تکمیل کے لیے ظاہر کیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ علماء کو جزائے خیر دے جنہوں نے احکام دین کے مراتب کو خود شریعت کے اشارات سے سمجھ کر قائم کیا اور یہ منجانب اللہ دین کی حفاظت ہے کہ ایسے وقت میں یہ ترتیب ہوگئی جبکہ دین میں کچھ گڑبڑ بھی نہیں ہونے پائی تھی اگر اس وقت علماء دین کو بلا ترتیب چھوڑ دیتے تو اس وقت میں جبکہ ہوا اور رائے کا دور دورہ ہے دین میں خلط مبحث ہو جاتا اور اس کے کسی جزو کا بھی پتہ نہ چلتا۔ الحمد للہ کہ اب دین کی

ایسی ترتیب ہوگئی کہ تمام احکام کے مراتب محفوظ ہیں' فرائض الگ ہیں' سنن الگ ہیں' مستحبات الگ ہیں جس کی علت وحکمت وہ ہے جو ابھی مذکور ہوئی مگر ہم لوگوں نے اس کا نتیجہ اُلٹا نکالا کہ مستحبات کو زوائد سمجھ لیا اور ان کا اہتمام بالکل چھوڑ دیا۔ یہ مانا کہ ضرورت کو ان سے اٹھالیا گیا ہے مگر جو ثمرات اور درجات ان پر موعود ہیں وہ بھی تو بلا ان کے نہیں ملیں گے اور وہ ثمرات معمولی چیز نہیں ہیں۔ دیکھئے کوئی اعلان کرتا ہے کہ جو کوئی صبح کو میرے مکان پر پہنچ جائے گا اس کو ایک لاکھ روپیہ ملے گا' یہ اعلان امر اور وجوب کے درجہ میں نہیں ہے۔ انعام اور بخشش کے درجہ میں ہے جس کو زائد ہی کہہ سکتے ہیں لیکن ہے کوئی ایسا جو اس اعلان کو سن کر وہاں پہنچ نہ جائے۔ ایک لاکھ روپیہ تو بڑی چیز ہے ایک روپیہ کا بھی اعلان ہو بلکہ دولڈوؤں کا بھی اعلان ہو تب بھی وقت مقررہ سے پہلے ہی پہنچ جائیں گے۔ خیر اس اعلان میں تو یقین یا کم از کم ظن غالب ہوتا ہے شے موعود کے مل جانے کا اور جوئے میں تو یقین بلکہ ظن بھی نہیں ہوتا۔ صرف امید موہوم پر ہزاروں روپیہ کی بازی لگادیتے ہیں۔ اس احتمال پر کہ شاید ہم ہی جیت جائیں پھر جس پر یقین ہو ایسے ثمرات کے ملنے کا جو دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں اس پر کیا ہونا چاہیے۔

مستحبات کی عجیب مثال

مستحبات کی مثال احکام کے اندر ایسی ہے جیسے دعوت کے کھانوں میں چٹنی کہ چٹنی کسی معنی کو زائد ہی ہے نہ اس پر بقائے حیات موقوف ہے نہ پیٹ بھرنا موقوف ہے۔ پھر دیکھئے چٹنی کا بھی کتنا اہتمام ہوتا ہے کہ فرمائش کر کے چٹنی منگائی جاتی ہے اور صرف ایک ہی قسم کی چٹنی سے سیری نہیں ہوتی بلکہ طرح طرح کی چٹنیوں اور اچاروں کا مطالبہ ہوتا ہے اور بلا چٹنی کے دعوت پھیکی کہی جاتی ہے۔ اسی طرح صرف فرائض وموکدات ادا کر لینے سے ضرورت کا مرتبہ تو پورا ہو جائے گا اور آخرت میں عذاب بھی نہ ہوگا لیکن بلا مستحبات کے جنت سونی سونی رہے گی اس کے جنت کا حصہ دوسروں کے حصہ کے نسبت ایسا رہے گا جیسا کم درختوں کا باغ زیادہ درختوں والے باغ کے سامنے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیغام ہے جو شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت پہنچایا گیا ہے: "اَلْجَنَّةُ قَيْعَانٌ وَغِرَاسُهَا سُبْحَانَ اللّٰهِ"[1] یعنی فرما دیجئے گا اپنی اُمت سے کہ جنت چٹیل میدان ہے اور اس میں درخت لگانے کی ترکیب یہ ہے کہ سبحان اللہ پڑھا جائے یہ باعث حدیث سے ثابت ہے کہ اگر ایک دفعہ بھی کوئی سبحان اللہ کہتا ہے تو اس کے لیے فوراً ایک درخت جنت میں لگ جاتا ہے۔ دیکھئے ظاہر میں یہ کوئی ایسی ضروری بات نہ تھی جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہم لوگوں تک پہنچایا۔ بات یہ ہے کہ وہ حضرات رحیم وکریم ہیں خصوصاً

---

[1] (المعجم الکبیر للطبرانی ۱۰: ۲۱۴)

حضرت ابراہیم علیہ السلام انہوں نے ہم کوایسی تدبیر بتادی جس سے جنت کے زیادہ درخت مل جائیں اس میں یہ تعلیم بھی ہوگئی کہ فرائض پر بس مت کرلینا آگے بھی ہمت کرنا۔غرض مستحبات بھی اہتمام کی قابل چیزیں ہیں زوائدنہیں ہیں جبکہ مستحبات بھی زوائدنہیں ہیں تو فرائض وواجبات کا تو کیا پوچھنا ہے پھر دین میں اختصار کیسے ہوسکتا ہے۔ بیان یہ تھا کہ ''لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ'' (اس کے لیے جس کے پاس دل ہے) عنوان مختصر ہے اس سے دین کے اجزاء میں اختصار لازم نہیں آتا۔تفصیلات تو سب کی سب بدستور رہتی ہیں۔عنوان مختصر سے صرف یادداشت میں سہولت ہوجاتی ہے اور یہ عین حکمت ورحمت ہے۔یہاں سے اس حدیث کا حل بھی ہوجاتا ہے۔

کلمہ توحید کے تمام دین کو مشتمل کی عجیب مثال

''مَنْ قَالَ لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ''[۱] (جس شخص نے لاالہ الا اللہ کہا جنت میں داخل ہوگیا) اس سے بعض فاسد دماغ لوگوں نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ بس توحید کا قائل ہونا نجات کے لیے کافی ہے۔رسالت کے قائل ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ حدیث میں تو صرف اتنا ہی آیا ہے ''مَنْ قَالَ لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' (جس شخص نے لاالہ الا اللہ کہا) یہ حل اس طرح ہوا کہ لا الہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے) عنوان ہے دین کا جو حاوی ہے تمام اجزائے دین کو۔گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو کوئی دین اسلام قبول کرے وہ جنت میں جائے گا اور دین میں تمام اجزاء دین آگئے۔ان کی تفصیل دوسری نصوص میں صراحۃً موجود ہے۔مثلاً ''كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ'' (ہرایک ایمان لایا اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر) اس میں اللہ پر ایمان لانے کے ساتھ ملائکہ پر اور کتب سماویہ پر اور تمام انبیاء پر ایمان لانا مذکور ہے۔اس طرح کہ صدہا آیتیں نہیں جن میں اجزاء دین کا بیان ہے تو کیا یہ حدیث ان آیات کی معارض ہے حاشا وکلا حقیقت یہی ہے کہ یہ محض عنوان ہے مراد تمام اجزاء دین ہیں اور میں تو کہتا ہوں کہ توحید کو ماننا مستلزم ہے۔رسالت کے ماننے کو بھی کیونکہ توحید کو ماننا مستلزم ہے اس بات کو حق تعالیٰ کو سچا مانا جائے اور حق تعالیٰ کے کلام میں موجود ہے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں) تو جو شخص رسالت کو نہیں مانتا وہ حق تعالیٰ کی تکذیب کرتا ہے۔جب تکذیب کی تو اس پر ''مَنْ قَالَ لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ''[۲] (جس نے کہا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں) کہاں صادق ہوا۔غرض یہ محض جہالت اور کوتاہ نظری ہے کہ لا الہ الا اللہ کو صرف اس کے لفظی معنی پر محمول کیا جائے بلکہ یہ تو ایک جامع مانع عنوان ہے جو تمام دین کو شامل ہے اس کی ایک بہت موٹی مثال وہی

---

[۱] (کنز العمال: ۲۰۸) [۲] (کنز العمال: ۲۰۸)

ہے جو قریب ہی بیان ہوئی ہے۔ یعنی نکاح جو کیا جاتا ہے وہ ظاہر میں تو نام ہے صرف ایجاب و قبول کا لیکن یہ ایجاب و قبول نکاح کا محض عنوان ہے اور درحقیقت ان کے اندر تمام دنیا کے بکھیڑے اور مصائب اور مصارف سب داخل ہیں جو نکاح کے بعد پیش آتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ کسی نے نکاح کیا پھر چند روز کے بعد بی بی صاحبہ نے نان و نفقہ کا مطالبہ کیا اور آٹے دال کا تقاضا کیا اور رہنے کو گھر مانگا تو کیا دولہے میاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ واہ میں نے تو تمہیں قبول کیا تھا اس آٹے دال اور گھر گھرستی کا دینا کب قبول کیا تھا۔ اگر کوئی ایسا کہے تو اس پر سب ہنسیں گے اور اس کو بے وقوف بنائیں گے اور اس کو یہی جواب دیں گے کہ میاں تم نے جو نکاح میں یہ کہا تھا کہ میں نے تجھ کو قبول کیا اس میں سب کچھ آ گیا۔ نان نفقہ بھی گھر گھرستی بھی، نمک تیل، لکڑی بھی اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ نکاح ایک عنوان ہے جو خود تو مختصر ہے لیکن بہت سے بکھیڑوں کو شامل ہے۔ بس اسی طرح "مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ"[1] ہے کہ وہ ایک مختصر عنوان ہے جو تمام اجزاء دین کو شامل ہے، نماز کو بھی روزہ کو بھی زکوٰۃ کو بھی، معاملات کو بھی، معاشرات کو بھی، اخلاق کو بھی، فرائض کو بھی مستحبات کو بھی، ہاں ان مختلف اجزائے دین میں فرق مراتب ہونا اور بات ہے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا خلاصہ

پس لا الٰہ الا اللہ کا خلاصہ حق تعالیٰ سے تعلق ہو جانا ہے جب یہ ہو گیا تو پھر جو کچھ بھی حق تعالیٰ فرمائیں گے وہ سب کرنا پڑے گا جیسے نکاح کا خلاصہ ہے۔ بی بی سے تعلق ہو جانا، جب نکاح ہو گیا تو پھر جو کچھ وہ اپنے حقوق واجبہ طلب کرے گی وہ دینا پڑیں گے بلکہ نکاح کا تعلق تو محدود ہے اور وہ قطع بھی ہو سکتا ہے لیکن حق تعالیٰ کا تعلق غیر محدود ہے اور وہ قطع بھی نہیں ہو سکتا۔ بس لا الٰہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) کہا اور ہمیشہ کے لیے پھنس گئے اور سارے حقوق الوہیت سر پڑ گئے کہیں اس فقرہ کو سن کر پھنس گئے وحشت نہ کرنے لگنا کیونکہ حق تعالیٰ سے تعلق تو ایسا لذیذ ہے کہ اس میں پھنس جانے کے بعد پھر رہائی کی تمنا ہی نہیں رہتی۔ اسی کو کہا گیا ہے کہ

اسیرش نخواہد رہائی زبند   شکارش نجوید خلاص از کمند

(اس کا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا اور اس کا شکار کمند سے چھٹکارا نہیں ڈھونڈتا)

وحشت بس جب ہی تک ہے جب تک اس میں پھنسے نہیں ہو اور جب پھنس گئے تو بس ساری دنیا اس قید کے مقابل بری معلوم ہونے لگے گی۔ سوائے اس قید کے کوئی چیز اچھی ہی نہ

---

[1] (کنز العمال: ۲۰۸)

معلوم ہوگی۔ دیکھئے وہ لوگ جو اسلام لانے سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن اور خون کے پیاسے تھے جن کی سرشت میں گویا جہالت اور عداوت داخل تھی۔ بس ایک دفعہ کلمہ پڑھنے کے بعد ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر دل و جان سے فدا ہونے لگے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینہ کی جگہ اپنا خون گرانے کو بخوشی تیار ہوگئے۔ چنانچہ نہایت شوق کے ساتھ جہاد کیے' سر کٹوائے' شہید ہوئے۔ آخر یہ بھی کہیں سنا کہ ان میں سے کوئی ان تکلیفوں کے وقت اسلام سے پھر گیا ہو یا دل پر کبھی میل بھی لایا ہو۔ آخر اس میں کوئی لذت ایسی ہی تو تھی جس کے سامنے ان کی نظر میں دنیا کے سارے عیش اور آرام گرد ہوئے تھے اور ساری مصیبتیں آسان ہوگئی تھیں۔ سارے مصائب برداشت کیے لیکن اس جال سے نکلنا گوارا نہ کیا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

گرد و صد زنجیر آری بکسلم غیر زلف آں نگارے دلبرم

(اگر دو سو زنجیریں بھی لاؤ تو توڑ ڈالوں' سوائے اپنے محبوب کی زلف کی زنجیر کے)

اور بالکل سچ ہے:

اسیرش نخواہد رہائی زبند شکارش نجوید خلاص از کمند

(اس کا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا اور اس کا شکار کمند سے چھٹکارا نہیں ڈھونڈتا)

عاشق کو تو جو تکلیف محبوب کی طرف سے پہنچے وہ تکلیف ہی نہیں بلکہ سراسر راحت ہے میں اس کی ایک مثال دیا کرتا ہوں وہ یہ کہ فرض کیجئے کسی کا کوئی محبوب ہے وہ ایسا ہے کہ عاشق اس کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے مگر وہ کبھی اس کو منہ بھی نہیں لگاتا' اتفاق سے مدتوں حیران و پریشان ہونے کے بعد ایک دفعہ ایسا ہوا کہ اس محبوب نے پیچھے سے آ کر اس عاشق کی کولی بھر لی اور اتنی زور سے دبایا کہ میاں کی پسلیاں ٹوٹنے لگیں۔ اب ظاہر ہے کہ اسے اس سے تکلیف تو ضرور ہوگی لیکن جب پیچھے پھر کر دیکھے گا کہ ارے یہ تو میرا محبوب ہے اس وقت اس کی کیا حالت ہوگی کیا وہ تکلیف پھر تکلیف رہے گی یا مبدل براحت ہو جائے گی۔ اب فرض کرو کہ وہ محبوب یہ کہے کہ اگر تجھ کو تکلیف ہو رہی ہو اور میرے دبانے سے ناگواری ہو تو میں تجھ کو چھوڑ کر تیرے رقیب کو دبالوں کیا اس کو وہ منظور کر لے گا' ہرگز نہیں وہ تو یہ کہے گا:

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا یہ نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو' دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر کو آزمائے)

یہ تو وہ تکلیف ہے جس پر ہزار راحتیں قربان۔ اسی طرح اگر تعلق مع اللہ صحیح معنوں میں پیدا

ہوگیا ہے تو تمام احکام خداوندی بجالانے میں لذت ہی لذت آئے گی اور کوئی بھی تکلیف محسوس نہ ہوگی۔ اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ پھنس جانے سے وحشت نہ ہونی چاہیے وہ صورۃً پھنس جاتا ہے اور حقیقتاً دولت ہی دولت مل جاتا ہے۔ مثال مذکور سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اپنے کو شریعت کے آغوش میں دینا محبوب کی گود میں دینا ہے۔ اگر آغوش محبوب سے نکلنا پسند ہے تو مبارک ہو شریعت کو بھی چھوڑ دو مگر کیا ایسا ہوسکتا ہے۔ اسی واسطے میں نے کہا تھا کہ لا الہ الا اللہ کہہ کر پھنس گئے تو پھنس گئے جیسے نکاح میں قبلت کا لفظ کہہ کر پھنس گئے تو پھنس گئے۔ سارے حقوق نکاح کے اسی قبلت میں آ گئے وہاں ایک محبوب مجازی کے پھندے میں پھنس گئے یہاں محبوب حقیقی کے پھندے میں پھنس گئے۔ بس لا الہ الا اللہ کا کہنا ہوا کہ چاروں طرف سے جکڑ جانا ہوا اب اس خیال کی غلطی سمجھ میں آ گئی ہوگی جس میں ''مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ''[1] (جس نے لا الہ الا اللہ کہا) سے یہ استنباط کیا تھا کہ صرف توحید کا قائل ہونا نجات کے لیے کافی ہے۔ اجی حضرت تو توحید کے اس جال میں پھنس جانے کے بعد تو مستحبات کو بھی نہ چھوڑ سکیں گے اور اس مباح کے پاس بھی نہ جاسکیں گے جس میں ذرا کھٹکا ہوگا کہ شاید محبوب کو ناپسند ہو۔

تمام دین کی جان

غرض یہ سب عنوانات ہیں اور ضابطے ہیں جن سے احکام نہیں ہوتے بلکہ ان کے سمجھنے میں اور یاد رکھنے میں سہولت ہوجاتی ہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اعرابی کو تمام دین کی جان بتادی کہ بس لا الہ الا اللہ پر جمے رہو یہ تمام دین کی جان اس لیے ہے کہ توحید پر جمے رہنا اور توحید کی حفاظت تمام حقوق محبوب حقیقی کی حفاظت ہے اس میں تمام دین آ گیا خواہ اصول ہوں یا فروع ہوں یا واجبات ہوں یا مستحبات اور اس کلمہ توحید کے بعد جو بات بھی دین کی بتلائی جائے گی وہ سب اسی کے اجزاء ہوں گے جیسے ازدواج کے تمام حقوق نکاح ہی کے اجزاء ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس سائل کو تعلیم فرمائی: ''قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ'' (کہہ دیجئے کہ میں اللہ پر ایمان لایا) اس میں مختصر عنوان سے تمام دین کی تعلیم کردی پھر فرمایا ثم استقم یعنی دین کے تمام اجزاء پر جمے رہنا یہ نبی ہی کی تعلیم ہوسکتی ہے کہ ایسے مختصر جملہ میں سب کچھ تعلیم کردیا۔ یہ اعرابی کی حکایت میں نے اس واسطے پیش کی کہ کسی کام کا ضابطہ بنادینے سے اس کے اجزاء کے استحضار میں سہولت ہوجاتی ہے یہ نہیں کہ ان کے اجزاء میں اختصار ہوجاتا ہے۔ جیسا اس شخص نے سمجھا جس نے ''مَنْ

---

[1] (کنز العمال: ۲۰۸)

قَالَ لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ‘‘ سے استدلال کیا کہ صرف توحید کا اعتقاد کافی ہے نہ رسالت کے اعتقاد کی ضرورت ہے نہ اعمال کی۔اس کو میں نے بسط کے ساتھ عرض کر دیا۔

قرآن پاک سے منتفع ہونے کا ایک گُر

اسی قبیل سے یہ لفظ ہے:’’اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ‘‘(اس میں بڑی عبرت ہے اس شخص کے لیے جس کے پاس دل ہے)اس میں بھی ایک ضابطہ بتلایا گیا ہے قرآن سے نفع ہونے کا۔اس میں سب باتیں دین کی داخل ہوگئیں اور یہ ضابطہ ایسا جامع ہوگیا جیسے حساب دانوں کے یہاں گر ہوتے ہیں جن کو گر یاد ہوتے ہیں وہ کیسی جلدی حساب کر لیتے ہیں۔اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ گر جانتے ہیں۔باقاعدہ ضرب تقسیم کرنے والا جس حساب کو منٹوں میں نکالے گا اس کو گر جاننے والے سیکنڈوں میں نکال دیتے ہیں اور باقاعدہ حساب لگانے والے کو قلم‘ دوات‘ پنسل‘ کاغذ‘ تختی سلیٹ کی ضرورت ہوتی ہے اور گر جاننے والوں کی زبان پر حساب کے گر رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔بات یہی ہے کہ ان کو حساب کے گر یاد ہوتے ہیں مثلاً جتنے روپے کی سیر بھر چیز اتنے آنے کی چھٹانک بھر یا جتنے روپیہ کا ایک گز کپڑا اتنے آنے کا ایک گرہ۔اس سے ہزاروں روپیہ کا حساب ذراسی دیر میں زبانی ہی لگا لیا جاتا ہے۔غرض گر بھی تو ایک ضابطہ ہی کا نام ہے جو استقرار کے بعد وضع کر لیا جاتا ہے۔گر کا فائدہ یہ ہے کہ حساب کرنے میں بہت سہولت اور جلدی ہوتی ہے۔اسی طرح حق تعالیٰ نے بھی اس آیت میں گر بتادیا ہے قرآن سے نفع ہونے کا۔تو دیکھئے ایک گر کتنے استقرار کے بعد وضع ہوتا ہے اگر ہم قرآن سے نفع اٹھانے کا گر وضع کرتے تو کتنے استقرار کی ضرورت ہوتی اور کتنے زمانہ میں اس میں کامیابی ہوسکتی تھی پھر بھی ہمارا ذہن کہاں تک پہنچ سکتا تھا۔لہٰذا یہ بالکل سچی بات ہے کہ برسوں کی محنت بھی اس کے لیے کافی نہ ہوتی پس قدر کیجئے حق تعالیٰ کی رحمت کی کہ ہم کو اس محنت سے بچا دیا اور اپنی طرف سے خود ہی اس گر کی تعلیم کر دی جس کا مختصر عنوان علم و ہمت ہے۔

صرف علم کے ناکافی ہونے کی عجیب مثال

اب جس عمل میں کوتاہی ہوگی انہیں کی کمی سے ہوگی مثلاً کسی کی نماز قضا ہوگی تو اس کی وجہ یہی ہوگی کہ یا تو اس کی فرضیت ہی اس کو معلوم نہیں۔ظاہر ہے کہ جب ایک چیز کو آدمی ضروری ہی نہیں سمجھتا تو اس کو وہ کرے گا کیوں۔یا اگر فرضیت تو معلوم ہے لیکن ہمت نہ ہوئی کسی کام میں مشغول تھے یا سورہے تھے

نماز قضا ہوگئی۔ غرض کوئی کام ایسا نہیں نکلے گا جس میں کوتاہی انہیں دونوں کی کوتاہی سے نہ ہو اور یوں تو عام طور سے دونوں ہی میں کوتاہی ہو رہی ہے لیکن ان میں سے بھی ہمت میں زیادہ کوتاہی ہے یعنی علم کی تو ذہنوں میں کچھ وقت بھی ہے اور اس کو صحیح سمجھتے ہیں کہ علم نہ ہوگا تو عمل بھی نہ ہوگا لیکن ہمت اور قصد کی تو قریب قریب بالکل ہی وقعت نہیں۔ بہت سے لوگ مسائل کو جانتے ہیں لیکن ان پر عمل نہیں کرتے اس کی وجہ یہی ہے کہ قصد نہیں کرتے بہت سے لوگ مشائخ کے مرید ہوتے ہیں صرف اس قصد سے کہ سارا بار انہیں کے ذمہ ڈال دیں اور خود کچھ نہ کرنا پڑے یہ وہی بات تو ہے کہ خود قصد کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی اور اس غلطی میں صرف عام لوگ ہی مبتلا نہیں بلکہ پڑھے لکھے بھی مبتلا ہیں۔ ہم طلبہ سے بھی واجب اعمال میں کمی ہوتی ہے تو صرف قصد کی کمی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ بات دراصل یہی ہے کہ ہم نے علم کی طرف تو توجہ کی اور جیسی توجہ تحصیل علم کی طرف کی ویسی قصد کی تحصیل کی طرف نہیں کی۔ علم کی تحصیل کے لیے تو بہت وقت صرف کیا مگر قصد کی تحصیل کے لیے کچھ بھی وقت صرف نہیں کیا۔ بری بھلی کتابیں ختم کرنے کے بعد بے فکر ہوگئے اور یہ سمجھ لیا کہ بس علم ہی کافی ہے حالانکہ یہ فاش غلطی ہے۔ دیکھئے کسی نے ہر قسم کی مٹھائی بنانے کا علم تو حاصل کرلیا اور اس کی تحصیل میں بڑی بڑی محنتیں کیں اس فن کی تمام کتابیں جمع کرلیں اور ساری عمر اس میں صرف کردی لیکن کبھی مٹھائی کھانے کا قصد نہیں کیا تو آپ بتا سکتے ہیں کہ کبھی اس کا منہ میٹھا ہوگا ہرگز نہیں جس کی وجہ بجز اس کے کیا ہے کہ اس نے قصد نہیں کیا۔

ہمت میں انتہائی کوتاہی

دیکھئے قصد وہ چیز ہے کہ فرض کیجئے آپ کو سوتے میں پیاس لگی اور آنکھ کھل گئی مگر چونکہ کسل غالب ہے اس پیاس کو گوارا کیا اور پڑے رہے تو یہاں مقصود حاصل ہونے میں کس چیز کی کسر ہے۔ علم تو ہے یعنی حس ہے کہ پیاس لگی ہوئی ہے لیکن اٹھ کر پانی پینے کا قصد نہیں ہوا اس لیے پیاسے رہے۔ اس کے بعد فرض کیجئے کہ اسی شخص کے پاس اسی وقت حاکم کا حکم پہنچا کہ اسی وقت حاضر ہو تو آپ فوراً کھڑے ہوجاتے ہیں اور دو میل کا سفر طے کرکے حاکم کے ڈیرے پر پہنچتے ہیں۔ حتیٰ کہ سردی بھی لگی زکام بھی ہوگیا لیکن کام ہوگیا اور کسل مانع نہ ہوسکا۔ بتایئے اس وقت ایک ہی شخص سے دو مختلف فعل کس چیز کے فرق سے صادر ہوگئے اس سے تو اٹھا بھی نہیں جاتا تھا۔ حتیٰ کہ پیاس کی تکلیف گوارا کی اور ابھی ایسا چاق و چوبند ہوگیا کہ سردی اور زکام سب کو برداشت کرلیا اسی کو قصد کہتے ہیں۔ جب آدمی نے سمجھ لیا کہ جانا تو ہے ہی کیونکہ حاکم کا حکم آچکا ہے تو اسی شخص سے جس سے پانی لانے کے لیے چار قدم نہ چلا گیا تھا اب چار میل چلا گیا۔ غرض قصد اتنی بڑی چیز ہے۔

اسی کا ترجمہ ہمت ہے بس اسی کی ضرورت ذہنوں میں بہت کم ہوگئی ہے اور اس کے حاصل کرنے کی طرف توجہ بھی نہیں جیسے علم حاصل کرنے کی طرف بعض کو کسی درجہ میں ہے۔ غرض قرآن سے نفع حاصل کرنے کی دو شرطیں تھیں جن میں ایک تو کسی درجہ میں ہے بھی لیکن دوسری قریب قریب بالکل ہی نہیں اس واسطے نفع نہیں ہوتا۔ یعنی علم تو کسی درجہ میں ہے بھی لیکن اس پر عمل کرنے کا ارادہ قریب قریب بالکل ہی نہیں کرتے اس میں شکایت صرف مولویوں کی نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو کسی مسئلہ کو جانتا ہے اور وہ اس کا عالم ہے وہ سب اسی شکایت میں داخل ہیں۔ سب نے ہمت ہار دی ہے اسی وجہ سے طرح طرح کی مشکلیں پیش آتی ہیں۔ مثلاً ہمت ہی کی کمی ہے جو کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں بلا سود کے گزر نہیں یا کہا جاتا ہے کہ بلا رشوت کے گزر نہیں یا کہا جاتا ہے کہ باغوں کی بہار پھل آنے سے پہلے بیچنے کے بغیر گزر نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر حاکم وقت سود اور رشوت کو جرم قرار دے دے اور ایسے ہی بہار قبل از وقت بیچنے کی بھی قانوناً منع کر دے تو کیا پھر بھی کسی کو ہمت ہوگی اس کے کرنے کی۔ اس وقت یہ سب عذر رخصت ہو جائیں گے۔ دیکھئے رشوت کے لینے میں حق تعالیٰ کے سامنے یہ عذر کیا جاتا ہے کہ اس کے بغیر گزر کیسے ہوگی۔ اگر یہ عذر چلنے والا ہے تو اس کو حاکم کے سامنے بھی پیش کیجئے اور کھلم کھلا رشوت لیا کیجئے اور یہ ہی کہیے کہ ہم مجبور ہیں' دیکھیں وہ اس عذر کو سن لے گا یا نہیں اور اعلانیہ رشوت لینے کی اجازت دے گا یا نہیں۔ حاکم کے قانون میں رشوت منع ہے اس واسطے کوئی عذر آپ کا نہیں چلتا اور اعلانیہ رشوت نہیں لے سکتے اور کبھی حاکم کو علم ہو جاتا ہے اور ثبوت ہو جاتا ہے تو اس پر سزا بھی ہو جاتی ہے اور حق تعالیٰ کو ہر وقت علم ہے ان کی سزا کا خوف کیوں نہیں ہوتا۔ غرض سزا کے خوف سے حاکم کے سامنے رشوت نہیں لے سکتے اس کا حاصل تو یہی ہے کہ خوف کی وجہ سے عزم ہو جاتا ہے رشوت سے بچنے کا اور جب عزم ہو جاتا ہے تو پھر کام تو بلا رشوت لیے بھی چلتا ہی ہے۔ غرض کمی ہے تو عزم کی ہے۔ سود اور رشوت کے چھوڑنے کا چونکہ عزم نہیں ہے اس واسطے بہانے ڈھونڈے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی بکثرت ہیں جنہوں نے باوجود قلت آمدنی کے پکا ارادہ کر لیا کہ سود اور رشوت نہ لیں گے۔ چنانچہ عمر بھر نہیں لیا اور اسی برس کی عمر میں انتقال کیا ان کی ضرورت کونسی اٹکی رہی۔ اب بعض لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ اگر سود اور رشوت نہ لیں تو خرچ کہاں سے چلے میں کہتا ہوں کہ خرچ کیا ہے اسی کا نام خرچ ہے کہ پاؤ بھر گھی ایک وقت میں کھایا جائے اور تن زیب ہی پہنی جائے' خرچ کو کم کرو آخر خرچ کو کسی حد پر جا کر ختم کرتے ہی ہو کیا کوئی مرتبہ ایسا نہیں نکلتا کہ اس سے زیادہ خرچ نہ کیا جائے۔ اگر سو روپیہ

مہینہ خرچ کرو گے تو ایسے بھی لوگ موجود ہیں جو ایک ہزار روپیہ مہینہ خرچ کرتے ہیں تو ان کی برابری کی ریس کیوں نہیں کرتے اور ایسے بھی لوگ موجود ہیں جو پانچ روپیہ خرچ کرتے ہیں ان کی ریس کیوں نہیں کرتے۔ غرض ضرورتوں کو بڑھالیا پھر کہتے ہیں کہ بلا رشوت کے گزارہ کیسے ہو۔

غالب ایک مسخرہ شاعر

کسی نے غالب کو ایک خط نظم میں لکھا تھا اس میں یہ مشدد تھا جس کے حاشیہ پر یہ لکھ دیا: تشدید بضرورت شعر' غالب چونکہ بہت مسخرہ تھا اس نے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا:

چہ خوش گفت فائق شاعر غرا — کہ کسی ہمچومن ذہن رسا نباشد
چو مقام ضرورت شعر افتد — تشدید جائز چرا نباشد

(کیا اچھا کہا فائق شاعر غرا نے کہ کوئی شخص میری مانند ذہن رسا نہ ہوگا جب شعر کے مقام میں ضرورت پیش آئے کس واسطے تشدید جائز نہ ہو)

اس طرح اس کے فعل کا قبح اس جوابی شعر میں دکھا دیا جس کا حاصل یہ تھا کہ شعر گفتن چہ ضرور (شعر کہنا کیا ضرور ہے) اسی طرح خرچ بڑھانے کو میں کہتا ہوں کہ خرچ افزودن چہ ضرور (خرچ بڑھانا کیا ضرور ہے) ایسے خرچ ہی کرنے کی کیا ضرورت ہے جس کے لیے سود اور رشوت لینے کی ضرورت پڑے۔ اسی کی تعلیم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا میں ہے وہ دعا مقفی ہے نظم نہیں ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نظم میں نہیں ہوتے تھے۔ "وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِىْ لَهٗ" (ہم نے آپ کو شعر کا علم نہیں دیا اور آپ کو زیبا بھی نہ تھا)

نبی کا کوئی فعل تعلیم سے خالی نہیں

وہ دعا یہ ہے کہ: "وَمِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ وَقَلْبٍ لَا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ"[1] (یعنی اے اللہ میں پناہ مانگتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دے اور ایسے دل سے جس میں خشیت نہ ہو اور ایسے نفس سے جو شکر سیر نہ ہو) یہاں تک دعا مقفہ چلی آتی ہے۔ اگلا جملہ ہے: "وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا يُسْتَجَابُ لَهَا" (اور ایسی دعا سے جو قبول نہ ہووے) یہاں قافیہ چھوڑ دیا میں جب حدیث پڑھاتا تھا تو یہ وسوسہ ضرور ذہن میں آتا تھا کہ یہ جملہ بھی مقفی کیوں نہ ہوا اس کا مقفی ہونا کچھ مشکل نہ تھا ہم جیسے بدلیاقت آدمی بھی چاہیں تو قافیہ ملالیں۔ مثلاً یہ کہہ دیتے ہیں: "وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا تُسْمَعُ" (ایسی دعا سے جو سنی نہ جائے) لیکن وجہ یہ ہے کہ نبی کا کوئی فعل تعلیم سے

---

[1] (سنن النسائی ۸: ۲۶۳)

خالی نہیں اس میں تعلیم ہے کہ تصنع سے بچنا چاہیے خصوصاً دعا میں کیونکہ دعا حق تعالیٰ سے عرض حال اور سوال کا نام ہے۔ حق تعالیٰ احکم الحاکمین ہیں۔ حاکم ہونے کا مقتضا ہیبت ہے۔ ہیبت کے مقام پر کسی کو آپ نے قصداً اور تکلفاً مقفٰی عبارت بولتے ہوئے سنا ہوگا اس میں تعلیم ہوگی کہ ضرورت کو خواہ مخواہ تصنیف نہ کرو۔ اختراعی ضرورت کو آگ لگاؤ وہ کام کرو جس کا حکم ہے' خرچ اتنا مت بڑھاؤ جس کے لیے گناہ کرنا پڑے۔

لوگ ناموری کی خاطر شادی میں زیادہ خرچ کرتے ہیں

مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شادی کے متعلق جس میں بہت زیادہ خرچ کیا گیا تھا جس میں نیت محض ناموری کی تھی یہ فرمایا کہ خرچ تو خوب کیا لیکن اتنے خرچ سے ایسی چیز خریدی کہ جس کو اگر بیچنے لگیں تو پھوٹی کوڑی کو بھی کوئی نہ لے وہ کیا چیز ہے۔ نام بس ایسے ہی لوگوں نے اخراجات غیر ضروریہ اختراع کر رکھے ہیں۔ مرتے ہیں' کھپتے ہیں' برباد ہوتے ہیں مگر ان کو پورا کرتے ہیں' ارے آگ لگاؤ ایسی ضرورتوں کو۔ یہ دیکھو کہ شریعت کا حکم کیا ہے۔

شریعت پر چلنے سے دنیا کی بربادی سے حفاظت

شریعت پر چلنے سے دین تو سدھرتا ہی ہے دنیا کی بربادی سے بھی حفاظت رہتی ہے۔ ایک شخص نے ایسے غیر ضروری اخراجات کی حقیقت بڑی طاقت سے ظاہر کی۔ بلند شہر میں ایک رئیس زادے تھے ان کے باپ کا انتقال ہو گیا' لوگوں نے چالیسواں کرنے کے لیے مجبور کیا اس وقت تو وہ مجبوراً راضی ہو گئے اور جبراً قہراً اپنے باپ کا چالیسواں کیا جس میں انہوں نے بہت تکلف کیا۔ ایک کیمپ کا کیمپ گویا تیار کیا گیا آٹھ دس طرح کے بہت پر تکلف کھانے پکوائے لیکن مہمان جب دسترخوان پر بیٹھ گئے اور کھانا چن دیا گیا تو قبل کھانا شروع ہونے کے صاحبزادہ صاحب تشریف لائے اور کھڑے ہو کر کہا کہ مجھ کو عرض کرنا ہے۔ جب سب متوجہ ہو گئے تو یہ کہا کہ آپ سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ آپ اس وقت کس تقریب میں تشریف لائے ہیں وہ تقریب یہ ہے کہ میرے باپ کا انتقال ہو گیا ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ باپ سرپرست ہوتا ہے اس کا سر پر سے اٹھ جانا ظاہر ہے کہ کس قدر صدمہ کی بات ہے۔ اس کا مقتضاء تو یہ تھا کہ میرے ساتھ ہمدردی کی جاتی کیا یہی ہمدردی ہے کہ مجھ پر تو اتنا بڑا پہاڑ غم کا ٹوٹ پڑے اور آپ آستینیں چڑھا چڑھا کر پلاؤ قورمہ کھانے بیٹھ جائیں۔ اس کے بعد کہا کہ بسم اللہ شروع کیجئے۔ اس تقریر سے سب پر ایسی غیرت سوار ہوئی کہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اسی وقت ایک محضر نامہ لکھا جس پر سب نے دستخط

کیے کہ آج سے اس قسم کی سب رسوم موقوف' کسی نے پوچھا کہ صاحبزادے جب کھلانا ہی نہ تھا تو یہ خرچ ہی کیوں کیا' کہا کہ اگر میں یہ سامان نہ کرتا تو اس کو بخل پر محمول کرتے اور کہتے کہ شریعت کو تو محض آڑ بنایا ہے دراصل اپنا خرچ بچایا ہے اب یہ کہنے کا کسی کو منہ نہیں رہا اور میری اس وقت کی تقریر کا پورا اثر ہو ورنہ یہ بات نہ ہوتی اور رسم نہ ٹتی۔ پھر وہ کھانا مساکین کو کھلا دیا اور دعا کی اور باپ کو ثواب بخش دیا۔ تو واقع میں تخفیف اخراجات کی سخت ضرورت ہے مگر ہم لوگوں نے ایسی آنکھیں بند کی ہیں کہ دین کی تو کیا سوجھتی دنیا کی بھی نہیں سوجھتی۔

کیرانہ میں کچھ گوجر رہتے ہیں ایک گوجر کا باپ بیمار ہوا تو اس نے ایک حکیم کو بلا کر اس کے بہت ہاتھ جوڑے اور کہا کہ اجی حکیم جی اب کے تو میرے باپ کو اچھا ہی کردو کیونکہ اس سال چاول بہت مہنگے ہیں اگر اس وقت مر گیا تو تیجے دسویں چالیسویں میں تو میرا دیوالیہ ہی نکل جائے گا۔ دیکھئے باپ کے مرنے کا تو غم نہیں اپنا دیوالیہ نکل جانے کا اندیشہ ہے۔ صاحبو! یہ کیا حال ہے کچھ تو عقل سے کام لینا چاہیے اگر دین کا بھی خیال نہیں تو دنیا ہی کا خیال کیجئے۔ ذرا دیکھئے تو کہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ اجی دین کی تعلیم تو وہ چیز ہے کہ اس سے دنیا بھی سدھرتی ہے۔ چنانچہ یہ فضول خرچیاں وہ ہیں جن کو نئے تعلیم یافتہ بھی منع کرتے ہیں اس باب میں وہ بھی علماء کے ساتھ متفق ہیں مگر ان پر ہمارا یہ اعتراض ہے کہ یہ آپ کا منع کرنا مسلمانوں کی اصلاح کے لیے نہیں بلکہ اپنے مطلب کے لیے ہے کیونکہ وہ ان رسوم سے اس واسطے منع کرتے ہیں کہ اپنی پسند کی فضول خرچیوں کی گنجائش ملے اور وہ فضول خرچیاں کیا ہیں۔ کوٹ' پتلون اور دوسری فیشن کی چیزیں۔ چنانچہ دیکھ لیجئے جو نئے تعلیم یافتہ پرانی رسوم کو بند کرتے ہیں وہ اس سے زیادہ اپنی فضولیات میں خرچ کرتے ہیں تو یہ کہنا صحیح ہے کہ دنیا کو منع کیا گیا دنیا کے لیے۔ ایک خرابی سے بچے اس سے بدتر خرابی میں پڑے جو غرض منع کرنے سے تھی وہ خاک بھی حاصل نہ ہوئی اور یوں کھڑے ہو کر بڑی تیز زبانی سے کہتے ہیں کہ مولویوں کو یہ نظر نہیں آتا کہ مسلمان کس حال کو پہنچ گئے ہیں اس وقت ان کی دنیا کی درستی کی بھی ضرورت ہے لیکن علماء جب وعظ کہیں گے تو بس نماز کا' روزہ کا' دنیا کو چھوڑنے کا۔ حالانکہ اب وہ وقت ہے:

ترقی دنیا کا وعظ کہنا علماء کے ذمہ نہیں

علماء کو چاہیے دنیا کا وعظ کہا کریں اس کے متعلق قابل غور یہ بات ہے کہ علماء کے ذمہ دنیا کی تعلیم ہے یا نہیں۔ تقسیم کام کا مسئلہ تو آج کل دنیا بھر کے نزدیک مسلم ہے علماء بحیثیت رہبر دین ہونے کے دین کے ذمہ دار ہیں یا دنیا کے' سارے کام انہیں کے سر کیوں ڈالتے ہو۔ اگر یہی بات

ہے تو ہم کہتے ہیں کہ آپ دنیا کی تعلیم کرتے ہیں، دین کی کیوں نہیں کرتے۔ مولویوں کے کسی وعظ میں تو دنیا کے متعلق بھی بیان سنا ہوگا لیکن آپ کے لیکچروں میں تو کبھی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا بیان سنا ہی نہیں جاتا اور یہ جو آپ رسوم کے متعلق غل شور مچاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو اسراف سے بچاتے ہیں اور اسراف شریعت میں ممنوع ہے تو گویا دین کی تعلیم بھی کرتے ہیں کیونکہ گناہ سے بچاتے ہیں تو اس کی حقیقت وہی ہے جو میں نے ابھی بیان کی کہ دین کی تعلیم ہی نہیں نہ یہ گناہ سے بچانا ہے بلکہ یہ تو ایک نوع کے اسراف کو بند کر کے دوسری نوع کے اسراف کے لیے گنجائش نکالنا ہے۔ بس یہ تو دنیا کی تعلیم دنیا ہی کے لیے ہوئی اور مولوی جو اسراف کو منع کرتے ہیں تو دین کے لیے کرتے ہیں کسی دنیوی غرض کے لیے نہیں کرتے تو ان کی دنیا کی تعلیم بھی دین کے لیے ہے تو اگر تقسیم کام کا مسئلہ آپ کے نزدیک مسلم نہیں ہے تو آپ بھی دین و دنیا دونوں کے کام کیجئے اور مولوی بھی دونوں کے کام کریں اور اگر تقسیم کا مسئلہ مسلم ہے جیسا کہ آج دنیا بھر کا اس پر اتفاق ہے تو آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ مولویوں پر اعتراض کریں کہ وہ بس دین ہی دین کا کام کرتے ہیں دنیا کا کام کیوں نہیں کرتے۔ اب اس کا راز سنئے کہ مولویوں نے اپنے ذمہ صرف دین ہی کا کام کیوں لیا ہے۔ بات یہ ہے کہ گو دنیا بھی بقدر ضرورت ضروری ہے لیکن پھر بھی دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے کیونکہ دین کے سامنے دنیا کی کچھ بھی تو حقیقت نہیں، وہ باقی ہے یہ فانی ہے وہ کامل ہے یہ ناقص لیکن باوجود اس تفاوت کے معاملہ پر برعکس ہے کہ دنیا کی ضرورت اور اہمیت تو سب کے ذہنوں میں ہے اور دین کی ضرورت سے غفلت ہے ان کے لیے علماء نے دین کی ترغیب و تعلیم کو اپنے ذمہ لے رکھا ہے وہی دنیا سو اول تو خود ہی اس کی ضرورت کو لوگ سمجھے ہوئے ہیں دوسرے اس کی تعلیم آپ لوگوں نے اپنے ذمہ لے ہی رکھی ہے۔

گو اس کا طریق جو آپ نے اختیار کیا ہے وہ غلط ہے اور علماء غلطی کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ پس اس حالت میں آپ کا علماء کی شکایت کرنا ایسا ہے جیسا فرض کیجئے حکیم عبدالمجید خان کے پاس ایک مریض پہنچا اس کو دیکھ کر حکیم صاحب نے تشخیص کیا کہ مرض سخت ہے اور اندیشہ ہے کہ اگر علاج فوراً نہ کیا گیا تو دق ہو جائے پھر بہت غور کے ساتھ نسخہ لکھ کر دیا کہ اس کا باقاعدہ استعمال کرو جب وہ نسخہ لکھوا کر لوٹا تو دروازہ پر ایک چمار بھی بیٹھا ہوا تھا اس نے پوچھا کہ حکیم جی نے کیا بتلایا۔ اس نے سب حال سنایا اس پر چمار نے کہا کہ تمہاری جوتیاں بھی تو پھٹی ہوئی ہیں ان کے سلوانے کے لیے حکیم جی نے کوئی بھی مشورہ نہیں دیا، بس صرف نسخہ ہی لکھ دیا۔ اس سے یہی کہا جائے گا کہ یہ تو تیرا کام

ہے حکیم جی کا کام نہیں۔ البتہ حکیم صاحب جوتی سلوانے سے منع نہیں کریں گے لیکن اگر وہ چمار اس طور پر جوتی سینے لگے کہ جوتی کے ساتھ پاؤں میں سے بھی سوا نکالنے لگے تو اس وقت حکیم صاحب ضرور اپنا فرض منصبی سمجھ کر کہ بدن کو ضرر سے بچانا ضروری ہے اس فعل کو منع کریں گے۔ اسی طرح علماء دنیا سے منع نہیں کرتے لیکن جب وہ یہ دیکھیں گے کہ دنیا سے دین کا نقصان ہو رہا ہے اور دنیا کی تحصیل کے لیے خلاف دین طریقے استعمال کیے جا رہے ہیں تو اس وقت ان کا فرض منصبی ہوگا کہ وہ مسلمانوں کو دین کے ضرر سے بچائیں گے اگرچہ دنیا کے حصول میں کچھ کمی واقع ہوتی ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب علماء اپنا فرض منصبی ادا کر رہے ہیں پھر ان پر اعتراض کیسا۔ البتہ اگر علماء دین کی تعلیم کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا کے کاموں سے بالکل روکتے۔ مثلاً یہ کہتے کہ کھانا مت کھاؤ' کپڑا مت پہنو' مکان مت بناؤ' تجارت مت کرو' تب تو یہ اعتراض کسی درجہ میں صحیح بھی ہوتا لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ علماء دین کی تعلیم تو خود کرتے ہیں اور دنیا کو حدود دین کے اندر کہتے ہوئے آپ کی رائے پر چھوڑتے ہیں پھر ان پر کیا اعتراض یہاں تک تو تعلیم یافتہ لوگوں سے خطاب تھا ان سے بڑھ کر بعض بے باک جاہل یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ گناہ کریں گے تو ہم خود بھگتیں گے آپ کو کیا پڑی۔ میں کہتا ہوں کہ واقعی بھگتیں گے تو آپ ہی لیکن علماء کے ذمہ بھی تو فرض ہو گیا کہ آپ کو متنبہ کریں وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں پھر آپ جانیں اور آپ کا کام۔

ضرر دینی کی بناء پر علماء دنیا سے منع کرتے ہیں

انہیں جاہلوں میں سے بعضے لوگ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ مولوی لوگ کہتے ہیں کہ گناہ کا وبال آئے گا ہم تو دیکھتے ہیں کہ گناہ کرنے والے چین کرتے ہیں کسی کا کان بھی گرم نہیں ہوتا۔ علماء کی کچھ عادت ہو گئی ہے کہ بات بے بات گناہ گناہ ہی پکارتے رہتے ہیں اور دنیا کی ان کو خبر نہیں کہ غیر قومیں تو دھڑا دھڑ سود لے رہی ہیں اور بڑھتی چلی جاتی ہیں نہ کسی پر کوئی وبال آتا ہے نہ کچھ ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کسی چیز سے فوراً نقصان نہ ہونے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ آئندہ بھی اس کا نقصان ظاہر نہ ہوگا۔ دیکھئے کوکین کھانے سے فوری کونسی تکلیف ہوتی ہے کوئی بھی نہیں لیکن بعض فائدے حاصل ہوتے ہیں جن کے واسطے وہ کھائی جاتی ہے لیکن اگر طبیب کسی کو کوکین کھاتے دیکھ لے تو ضرور منع کرے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ گو اس وقت تو اس کا کوئی نقصان ظاہر نہیں ہوا لیکن انجام اس کا خون کا خشک ہو جانا اور مہلک امراض کا پیدا ہونا ہے اس واسطے وہ منع کرتا ہے وہاں کوئی یہ نہیں کہتا کہ لوگ کوکین سے کیا فائدہ حاصل کر رہے ہیں نہ کسی کا خون خشک ہوتے دیکھا نہ کسی کو مرتے دیکھا

اور حکیم صاحب ہیں کہ منع ہی کرتے رہتے ہیں اگر کوئی ایسا کہے تو اسی کو بیوقوف بنایا جائے گا نہ کہ حکیم صاحب کو۔ اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ یہ ظاہری کوکین دنیا میں مضر ہے اور غفلت اور معصیت کی کوکین آخرت میں مضر ہوگی۔ پس علماء کا احسان ماننا چاہیے کہ وہ اس سے منع کرتے ہیں۔ گناہ سے صرف چندروز کی آسائش ہے لیکن جب آدمی مرے گا تو کہے گا کہ مولوی سچ کہتے تھے لیکن اسوقت اس کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ مولوی دنیا کو منع نہیں کرتے اور دنیا کی باتوں میں دخل نہیں دیتے۔ ہاں جب ضرر دینی کی نوبت آجاتی ہے تب وہ دخل دیتے ہیں اور منع کرتے ہیں تو اب وہ شبہ نہ رہا کہ مولوی دنیا کو منع کرتے ہیں اور وہ جو آپ نے کہا تھا کہ مولوی دنیا کی تعلیم نہ کریں تو دنیا سے منع بھی تو نہ کریں اس کا حل ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان اعتراضات کی بناء ہی غلط فہمی پر ہے۔ آپ علماء سے ملتے نہیں آپ کو ان کے حالات معلوم نہیں دور بیٹھے جو چاہتے ہیں ان پر تہمت لگا دیتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ کے قلب میں ان کی عظمت نہیں۔

بڑے مفسدہ کے خوف سے چھوٹے مفسدہ کو گوارہ کرنا

اور میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ وہ حضرات دنیائے مباح کو تو کیوں منع کرتے بعض اوقات دنیائے غیر مباح کو بھی کسی بڑے دینی ضرر سے بچانے کے لیے گوارا کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص ہے کہ وہ کسی ناجائز نوکری میں مبتلا ہے اور اس کے پاس اور کوئی جائز ذریعہ معاش نہیں ہے اس کو احساس ہوا کہ میں ناجائز کام کرتا ہوں اب وہ کسی محقق عالم سے پوچھتا ہے کہ میں یہ نوکری چھوڑ دوں تو وہ بحالت موجودہ اس کو یہ جواب دیتے ہیں کہ نہیں جلدی نہ کرو کسی جائز ذریعہ معاش کا انتظام کرلو پھر چھوڑنا اور ایسی حالت میں وہ حضرات اس واسطے منع نہیں کرتے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت تو وہ ایک ہی گناہ میں مبتلا ہے اس کو چھوڑ کر بہت ممکن ہے کہ ناداری کا تحمل نہ ہونے سے بہت سے گناہوں میں مبتلا ہو جائے کیونکہ احتیاج وہ چیز ہے کہ اسکی بدولت بہتوں نے خودکشی کرلی ہے بہت سے (نعوذ باللہ) مرتد ہو گئے ہیں تو وہ محقق اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کے قلب میں تحمل نہیں۔ اگر میں اس نوکری کو چھوڑنے کی اجازت دے دوں گا تو پھر ایمان تک کی خیر نہیں۔ البتہ اگر وہ یہ دیکھتے ہیں کہ کسی میں صفت تحمل موجود ہے تو پھر اس کو بلا ضرورت ناجائز میں مبتلا رہنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتے کیونکہ ایسی صورت میں ایسا کرنا جائز ہی کہاں ہوسکتا ہے اور جب تحمل اتنی بڑی چیز ہے تو میں اس تحمل کے پیدا ہونے کا طریق بتلاتا ہوں وہ طریق غلبہ محبت الٰہی کا حاصل کرنا ہے۔ یہ غلبہ محبت وہ چیز ہے کہ جو مشکل سے مشکل چیز کو آسان کر دیتی ہے۔ دیکھو دنیا میں

سب سے مشکل چیز موت ہے جس کے نام سے بھی ہم لوگوں کو موت آتی ہے مگر اہل محبت کے قصے پڑھے وہ تو موت کی تمنائیں کرتے ہیں۔ ایک بزرگ کہتے ہیں:

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم — راحت جاں طلبم در پے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر آیں غم روزے — تا در میکدہ شادان و غزل خوان بروم

(جس دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے، راحت جاں طلب کروں اور محبوب حقیقی کے پاس جاؤں، میں نے نذر کی ہے اگر یہ دن نصیب ہو جائے تو خوش و خرم اور غزل پڑھتا ہوا جاؤں)

ایک بزرگ انتقال فرماتے وقت یہ اشعار پڑھتے ہیں:

چیست توحید آنکہ از غیر خدا — فرد آئی ورخلاؤ درملا
وقت آں آمد کہ من عریاں شوم — جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(توحید یہ ہے کہ خلوت اور جلوت میں غیر اللہ سے تعلقات قطع کردے اور اب وہ وقت آ گیا کہ میں عریاں ہوں اور جسم کو چھوڑ کر سراسر جان بنوں)

موت کا آسان ہو جانا تو کیا معنی ان کے تو حوصلے ہی کچھ اور ہو جاتے ہیں۔

حکایت حضرت ابن الفارضؒ

ایک بزرگ جن کا نام ابن الفارض ہے ان کے روبرو مرتے وقت آٹھوں جنتیں پیش کی گئیں۔ ہمارے نزدیک تو اس سے بڑھ کر کیا چیز ہو سکتی تھی مگر انہوں نے فوراً منہ پھیر لیا اور یہ شعر پڑھا:

ان كان منزلتى فى الحب عندكم — ماقد رايت فقد ضيعت ايامى

(اگر یہی میری محبت کی قدر ہوئی تو میری ساری محنت برباد ہوگئی)

یہ ایک خاص حالت تھی اس وقت ان کی نظر جنت سے بھی بڑی نعمت پر تھی یعنی بقائے حق جو مقصود بالذات ہے اور جنت بھی اسی لیے مطلوب ہے کہ وہاں یہ نعمت نصیب ہوگی اسی کو کہا گیا ہے:

چوں بجنت وعدہ دیدار آمد لاجرم — عاشقاں جنت برائے دوست میدارند دوست

غرض حضرت ابن الفارض پر مرتے وقت ایک خاص کیفیت طاری تھی جس کے اثر سے انہوں نے جنتوں کے بھی پیش کیے جانے پر اپنا منہ پھیر لیا اور مذکورہ بالا شعر پڑھا۔ بس پھر اس وقت ان سے وہ جنتیں محجوب کر دی گئیں اور ایک تجلی خاص ہوئی اور دم نکل گیا۔ غرض یہ وہ حضرات تھے جن میں محبت حق ساری چیزوں پر غالب تھی حتیٰ کہ محبت جنت پر بھی۔ یہاں سے حضرت قلندر رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی شرح ہوتی ہے:

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد　　　تانہ بینم رخ تو روح رمیدن ندہم

(اگر ملک الموت میری جان لینے کو آئے جب تک آپ کی تجلی نہ دیکھ لوں جان نہ دوں گا)

واقعی ان کے نزدیک موت مکروہ تو کیا ہوتی بلکہ محبوب ہے کیونکہ وہ وسیلہ ہے ان کے مقصود کے حاصل ہونے کا۔

غلبہ محبت الٰہی کا نتیجہ

غرض غلبہ محبت الٰہی ایسی چیز ہے کہ جو ہر چیز کا تحمل پیدا کر دیتی ہے اسی لیے محققین طالب کے قلب میں پہلے اس کو پیدا کرتے ہیں اس کے بعد ناجائز نوکری وغیرہ چھڑاتے ہیں بلکہ پھر تو ان کو خود اس باب میں کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی وہ آپ ہی چھوڑ دیتا ہے بلکہ اگر کوئی منع بھی کرتا ہے تو رسیاں تڑوا کر اس سے کوسوں بھاگتا ہے ایسے ناجائز کام پھر اس سے ہو ہی نہیں سکتے اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ ان حضرات کا کسی ناجائز کام سے فی الحال منع نہ کرنا اس کے جواز کی بناء پر نہیں بلکہ دو ناجائز چیزوں میں سے جس کا مفسدہ شدید تھا اس سے بچانے کے لیے خفیف مفسدہ کو عارضی طور پر گوارا کر لیتے ہیں اس لیے ان پر یہ اعتراض بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ حضرات بعض کو ناجائز نوکری سے کیوں منع نہیں کرتے وہ منع ضرور کرتے ہیں مگر تدبیر اور سلیقہ سے اور اس طرح سے کہ پھر جڑ ہی کٹ جائے اگر اس وقت منع کریں تو دو چار دن کو وہ نوکری ہی چھوڑ دے گا لیکن پھر گھبرا کر کرے گا یا اس سے بھی بدتر مفاسد میں مبتلا ہو گا اور اس تدبیر سے چھڑانے کے بعد اس کو پھر کبھی وسوسہ بھی نہیں آئے گا۔ اس بات کو محققین ہی سمجھ سکتے ہیں کہ کس کا تحمل کتنا ہے جس کو وہ دیکھتے ہیں کہ ابتداء ہی سے متحمل ہے اس کو وہ ابتداء ہی سے روکتے ہیں۔ اس تشخیص میں وہ مجتہد ہیں ان سے منازعت کا کسی کو حق نہیں اگر بالفرض وہ غلطی بھی کریں گے تو مجتہد کی غلطی قابل گرفت نہیں اس صورت میں بھی ان کو اجر ملتا ہے۔ "واذا اخطا فله اجر" (اور جبکہ خطا کرے تو بھی ایک اجر ہے) اب دونوں شبہے رفع ہو گئے۔ یہ شبہ کہ مولوی دنیا کو منع کرتے ہیں چنانچہ معلوم ہو گیا کہ مولوی دنیا کو منع نہیں کرتے حتیٰ کہ بعض اوقات دنیائے ناجائز کو بھی منع نہیں کرتے اور یہ وہ شبہ بھی کہ ناجائز کام کو کیوں منع کرتے وہ بھی حل کر دیا گیا کہ منع کرتے ہیں لیکن تمام پہلوؤں پر نظر کر کے اب آپ کا یہ الزام بالکل غلط ہو گیا کہ مولوی دنیا کو منع کرتے ہیں البتہ یہ پہلے بھی کہہ دیا گیا ہے کہ وہ خود تعلیم دنیا کی نہیں کرتے کیونکہ یہ ان کا کام نہیں اور جس دنیا کو وہ منع کرتے ہیں وہ دنیا وہی ہے جو دین میں مضر ہے یعنی جو دنیا دین کو خراب کرتی ہے اس سے منع کرنا

ان کے فرائض میں داخل ہے۔ رہا یہ کہ جائز دنیا کی تعلیم کیوں نہیں کرتے اس کی وجہ یہ ہے کہ اتنی دنیا جو دین کو خراب نہ کرے وہ مسلمانوں کو حاصل بھی ہے اور جن کو حاصل نہیں وہ اس کی کوشش میں خود ہی مشغول ہیں۔ پھر تحصیل حاصل سے کیا فائدہ۔

مسلمانوں کے پاس بقدر ضرورت دین موجود نہیں

دین البتہ آج کل مسلمانوں کے پاس بقدر ضرورت بھی موجود نہیں یعنی فرائض تک بھی ادا نہیں کرتے۔ بتلایئے کتنے مسلمان ہیں جو پابندی سے نماز پڑھتے ہیں اور کتنے مسلمان ہیں جو باقاعدہ زکوٰۃ دیتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ جس فرض اور رکن دین کو آپ دیکھیں گے مسلمانوں کو اس میں قاصر پائیں گے پھر کیا بیجا ہے اگر علماء انہیں کے متعلق وعظ کہیں کیونکہ دنیا بقدر ضرورت موجود ہے اور دین بقدر ضرورت بھی موجود نہیں تو کس کی تعلیم کی ضرورت ہوئی۔ انصاف کیجئے اور یہ سب کلام اس صورت میں ہے کہ یہ تسلیم کرلیا جائے کہ علماء دین کی تحصیل کی تعلیم نہیں کرتے حالانکہ یہ امر خود محل کلام ہے بلکہ اس میں ایک خاص تفصیل ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے دو درجے ہیں ضروری اور غیر ضروری۔ سو وہ حضرات غیر ضروری کی بیشک تعلیم نہیں کرتے لیکن ضروری کی خود شریعت میں بھی تعلیم ہے اور ان حضرات کے ارشادات میں بھی مصرح ہے۔ چنانچہ حدیث ہے: ''کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَةِ''[1] (حلال کمانا فرض ہے بعد فرائض کے) اور حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا باوجود سید التارکین ہونے کے یہ ارشاد ہے کہ جس کے پاس کچھ نقدی ہو اس کو محفوظ رکھنا چاہیے اگر ہم محتاج ہوتے تو امراء ہم کو ہاتھ کا رومال بنالیتے یعنی ذلیل کرتے جیسے رومال کہ اس سے میل کچیل پونچھا جاتا ہے۔ شریعت میں کہیں بھی یہ تعلیم آپ دکھا سکتے ہیں کہ روپے پیسے کو ضائع کردو اور بے موقع اڑا دو بلکہ اس کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ اگر مسلمان شریعت پر عامل ہوتے تو نہ دوسروں کے دست نگر ہوتے نہ دوسروں سے مغلوب ہوتے اس لیے سخت ضرورت ہے کہ جس کے پاس مال ہو وہ تھوڑا بہت جمع کر کے بھی رکھے نفس کی تسلی کے لیے۔ غرض خرچ کو کم کیا جائے اور اسراف سے بچا جائے۔

مباح دنیا کی حفاظت کا مشورہ

مجھ سے ایک عورت نے مشورہ کیا کہ کیا اپنے مکان سب وقف کردوں، میں نے اس کو منع کیا بعض لوگوں نے کہا کہ تو مناع للخیر بنتا ہے۔ میں نے کہا نہیں بلکہ یہ مناع للشر بننا ہے کیونکہ وہ

---

[1] (کنز العمال: ۹۲۰۳)

جانتا تھا کہ عورت ناقص العقل ہے اس وقت تو جوش میں آ کر کار خیر سمجھ کر وقف کر رہی ہے اور کل کو اگر احتیاج پیش آئی تو پھر پچھتائے گی اور اس خیر کو برا کہے گی اور خدا جانے کہاں تک نوبت پہنچے تنگ دستی میں مستقل رہنا بڑے بڑوں کو بھی مشکل ہے تو اس وقت کی خیر موجب ہو جائے گی آئندہ کے شر کی۔ اس لیے بس عافیت اسی میں ہے کہ ایسی خیر ہی نہ کرو۔ معترضین کی نظر اس بات تک پہنچی جو چیز دوسروں کو آئینہ میں نظر نہیں آتی کسی کو اینٹ میں نظر آ جاتی ہے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے کہ ایک شخص نے جس کو کسی ظالم نے جائیداد کے مقدمہ میں پریشان کر رکھا تھا حضرت حاجی صاحب سے کہا کہ میں اپنا حق ہی چھوڑ دوں؛ حضرت نے فرمایا بہتر؛ صبر کرو۔ حافظ صاحب نے کہیں سن لیا اور بڑے زور کے ساتھ اس سے منع کیا کہ ہرگز صبر نہ کرنا مقدمہ کرو ہم دعا کریں گے اور حضرت حاجی صاحب کی طرف خطاب کیا کہ یہ آپ نے اس کو بتلا دیا۔ آپ کے تو بیوی نہ بچے آپ نے دنیا کو چھوڑ دیا؛ وہ دنیا کو چھوڑے گا تو بیوی بچوں کا کیا حشر ہوگا یہ بھی تو سوچ لیا ہوتا۔ یہ سن کر حضرت حاجی صاحب خاموش ہو گئے اور اپنے حجرہ میں چلے گئے۔

اسی واقعہ میں غور کر لیجئے معلوم ہو جائے گا کہ وہ خود دنیا کو چھوڑنا چاہتا تھا مگر اس کو اس سے منع کیا گیا اور مباح دنیا کی حفاظت کا مشورہ دیا گیا۔ اس سلسلہ میں ایک بات اور قابل تنبیہ ہے اور وہ یہ کہ اس مشورہ کو سن کر حرام نوکری کو فوراً نہ چھوڑنا چاہیے کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہو کہ پھر اسی طرح سود اور رشوت کو بھی حلال کر دینا چاہیے کیونکہ اس کی بھی آج کل سخت ضرورت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کس نے کہا ہے کہ محققین حرام نوکری کو حلال کر دیتے ہیں۔ ان کی تعلیم کا خلاصہ تو یہ ہے کہ وہ چھوٹے مفسدہ کو بڑے مفسدہ کے خوف سے کچھ دن کے لیے گوارا کر لیتے ہیں اور رفتہ رفتہ تدبیر سے چھوڑ دیتے ہیں اس میں اور حلال کرنے میں بڑا فرق ہے۔ حرام چیز تو کبھی حلال نہیں ہو سکتی پاخانہ کبھی پاک نہیں ہو سکتا۔ دیکھئے کسی کے ہاتھ پاخانہ میں سن گئے تو اب دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ اس نے فوراً ہاتھ کو زمین پر ایسا رگڑا کہ پاخانہ کی نجاست تو زائل ہو گئی لیکن ہاتھ بھی زخمی ہو گیا۔ اب تکلیف ہے اور چلا رہا ہے اور ایک یہ صورت ہے کہ اس نے تھوڑی دیر کے لیے صبر کیا اور پانی لا کر دھو ڈالا۔ اس صورت میں نجاست بھی زائل ہو گئی اور کوئی تکلیف بھی نہ ہوئی اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جتنی دیر تک اس نے صبر کیا وہ نجاست نہ رہی یا اس کو پاخانہ برا نہ معلوم ہوتا تھا یا اس کو پاک سمجھتا تھا۔

کیا ترقی دنیا کیلئے سود کو حلال سمجھنا ضروری ہے؟

اس پر یاد آیا۔ میں انجمن نعمانیہ لاہور میں بلایا گیا اور علماء بھی بلائے گئے تھے۔ اہل شہر کی اہل جلسہ سے یہ درخواست تھی کہ علماء مسئلہ سود پر غور کر کے کوئی صورت جواز کی نکالیں کیونکہ آج کل مسلمانوں کی ترقی کے لیے اس کی سخت ضرورت ہے اس کے بغیر ترقی ہو ہی نہیں سکتی۔ مولوی سلیمان صاحب پھلواروی نے جب میری آمد کی خبر سنی تو فرمایا کہ بس اب اس مسئلہ کا صحیح فیصلہ ہو جائے گا اور جو امر حق ہوگا وہ ظاہر ہو جائے گا۔ مختلف علماء نے مختلف تقریریں کیں' پھر آخر میں میری نوبت آئی۔ میں نے عدم جواز پر تقریر کی لیکن ایک خاص عنوان سے میں نے کہا کہ صاحبو! سود لینا ترقی کا موجب ہے یا سود کو حلال سمجھنا بھی ترقی کے لیے شرط ہے۔ مثلاً ایک شخص سود تو لیتا ہے مگر اس کو حرام سمجھتا ہے اور دوسرا سود بھی لیتا ہے اور اس کو حلال بھی سمجھتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ ان دونوں کی ترقی میں کیا فرق ہوگا کچھ بھی نہیں کیونکہ روپیہ جس کو مقصود اور ترقی کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے وہ تو دونوں ہی کے پاس آ جائے گا پھر حلال ثابت کرنے کو ترقی میں کیا دخل ہوا۔ اگر ایسی ہی حرص ہے ترقی کی تو اس کے پیچھے اپنے عقیدہ کو خراب کرو' سود لینا ہی ہے تو سود لو لیکن خدا کے لیے اس کو خواہ مخواہ حلال تو نہ سمجھو۔ حرام سمجھ کر بھی اگر سود لو گے تو کیا تمہاری مطلوب ترقی حاصل نہ ہوگی۔ لیجئے میں نے ایسی ترکیب بتلا دی ہے کہ عقیدہ کا عقیدہ درست رہے اور ترقی کی ترقی ہو جائے۔ پھر میں نے ترقی کر کے کہا کہ اگر ہمارے مولوی بھی فتویٰ جواز سود کا دے دیں تو تب بھی خدا تعالیٰ کے فضل سے عام مسلمان سود کو جائز نہ سمجھیں گے کیونکہ اس کی صریح حرمت قرآن مجید میں موجود ہے اور اس حرمت کا سب کو علم ہے۔ خدانخواستہ علماء کا سود کے جواز پر اتفاق بھی ہو گیا پھر بھی عام مسلمان یہی کہیں گے کہ ہمارے علماء ہی خود بگڑ گئے ہیں' سود بھی کسی کے حلال کیے حلال ہو سکتا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ افسوس آج کل لوگ یوں چاہتے ہیں کہ علماء شریعت کو اگر بتا دیں کہ جس طرف کو وہ کہیں اسے کھینچ تان کر اسی طرف مل جائیں اور جس چیز سے چاہیں اس کا سرا ملا دیں جس چیز کو حلال کرانا چاہیں اس کو حلال کر دیں۔ ان سے یہ توقع نہ رکھئے سو اول تو سود اور رشوت کی ضرورت ہی تسلیم نہیں یہ کیا ضرور ہے کہ پلاؤ قورمہ ہی کھاؤ' تن زیب ہی پہنو جس کے لیے ان چیزوں کے حلال کرانے کی فکر ہو' موٹا چال چلن رکھو' سادہ زندگی بھی تو ایک چیز ہے۔ شریعت کی تعلیم سادہ زندگی ہے اس کو اختیار کرو کسی گناہ میں پڑنے کی ضرورت نہیں اور اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے کہ آپ کو کچھ ایسی ضرورتیں لاحق ہیں جن سے آپ بزعم خود مجبور ہیں تو حرام کماؤ مگر یہ کیا ضرور ہے کہ حرام کو حلال کرنے کی کوشش کرو۔

حرام کو حلال سمجھنا کفر ہے

کیونکہ حرام کا کسب تو گناہ ہی کا مرتبہ ہے اور تحلیل حرام کفر ہے گناہ اور کفر میں کچھ فرق ہے یا نہیں پھر خواہ کوئی مرتبہ ہو مگر ہم کو گناہ اور کفر میں کیوں شریک کرتے ہو ہم سے ایسے فتوؤں کی کیوں توقع رکھتے ہو۔ ایسی درخواستیں کر کے لوگوں نے مولویوں کو ہاں میں ہاں ملانے کے لیے نوکر رکھنا شروع کیا ہے جیسے ایک حکایت ہے کہ ایک رئیس کے یہاں لازمی طور پر ایک نوکر ہاں میں ہاں ملانے کے لیے رہا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک نوکر انہوں نے رکھا اور یہی خدمت سپرد کی کہ جو بات ہم کہیں اس کی تم تصدیق کر دیا کرو۔ ایک دن کہنے لگے ہم شکار کے لیے گئے تھے ایک ہرن مارا گولی اس کا سم توڑ کر پیشانی پھوڑ کر نکل گئی۔ لوگ ہنسنے لگے کہ کہاں سم کہاں پیشانی۔ نوکر صاحب بولے حضور بجا فرماتے ہیں وہ ہرن اس وقت پیشانی کھجلا رہا تھا۔ جانور کی عادت ہوتی ہے کہ سم سے کھجلاتا ہے۔ گویا انہوں نے تصدیق کر دی کہ سم کو توڑنے اور پیشانی کو پھوڑنے کی یہ صورت ہوئی کہ سم اور کھوپڑی ایک ہی جگہ تھے کیونکہ کھوپڑی کو سم سے کھجلا رہا تھا اسی حالت میں ایسا نشانہ مارا کہ گولی سم کو توڑ کر اور کھوپڑی کو پھوڑ کر پار نکل گئی۔ اب آپ لوگ بھی بس یہ چاہتے ہیں کہ مولویوں سے یہ کام لیں سو حضور مولویوں سے ایسی نوکری نہیں ہوتی۔ اول تو زیادہ مولوی ایسے ہیں کہ فتوئی لکھنے کی تنخواہ نہیں لیتے اور جو بیچارے پیٹ کی خاطر تنخواہ بھی لیتے ہیں تو یہ کام ان سے بھی نہیں ہو سکتا' دنیا کی خاطر دین نہیں بیچا جاتا' کوئی اجتہادی امر ہوتا تو شاید فتوئی بھی دیا جا سکتا۔

ربوا سے متعلق محرفین کی اختراع

لیکن قرآن کی آیت سود کے بارے میں صریح موجود ہے: ''وَحَرَّمَ الرِّبٰوا'' (حرام کیا سود کو) پھر بھلا کسی کی مجال ہے کہ اس کی حلت کا فتوئی دے دے جیسا بددینوں نے یہ شیوہ اختیار کیا ہے۔ چنانچہ بعضے ذہین مگر جاہل لوگوں نے اس میں بھی ایک ایجاد کی ہے اور یہ کہہ دیا ہے کہ قرآن میں ربوا بکسر راء ہے ہی نہیں جس کے معنی سود کے ہیں بلکہ ربوا بضم راء ہے اور مشتق ہے ربودن سے۔ جیسے دلبربا ہوشربا۔ ربودن کے معنی اچک لے جانا تو اس سے ممانعت ہوئی ڈکیتی اور غصب کی اور کہتے ہیں یہ مولویوں کی اختراع ہے کہ ربوا پر زیر لگا دیا۔ یہ تحریف نئے لوگوں کی ایجاد ہے اللہ بچائے۔ غرض اول تو بہت سے ذرائع حرام ہیں ضرورت ہی کا درجہ مسلم نہیں اور اگر تمہاری خاطر سے مان بھی لیا جائے تب بھی غایت سے غایت یہ ہے

کہ حرام کماؤ مگر دین میں تو ترمیم مت کرو‘ گناہ کو گناہ ہی کے مرتبہ میں رہنے دو اور میں اس وقت تمہاری خاطر سے کہتا ہوں کہ خیر گناہ کرلو لیکن جب تمہاری ایک درخواست میں نے منظور کی تو تم بھی میری دو درخواستیں منظور کرلو۔

سوتے وقت کا محاسبہ

ایک تو یہ کہ گناہ کرو مگر اس کو سمجھنا گناہ اور حرام ہے جیسا ابھی بیان کرچکا ہوں اور ایک یہ کہ سوتے وقت دن بھر کے گناہوں کا حساب کرلیا کرو یعنی تھوڑی دیر اس طرح محاسبہ کیا کرو کہ صبح سے ہم نے اس وقت تک کیا کیا گناہ کیے۔ خصوصاً وہ گناہ جو معاش کے متعلق ہیں کیونکہ مال حرام سب سے بری چیز ہے یہ تخم ہے تمام گناہوں کا۔ سو اس طرح گناہوں کو یاد کیا کرو اور زبان سے کہا کرو کہ اے اللہ میں بڑا نالائق ہوں اس قابل ہوں کہ غرق کردیا جاؤں‘ کوئی عذر میرے پاس نہیں‘ میں نے بہت ہمت کی مگر مجھے کامیابی نہیں ہوتی۔ آپ مدد کیجئے اور اس خباثت سے نکال دیجئے۔ میں ایسے کام کی بات بتاتا ہوں کہ اول تو اس سے وہ گناہ ہی چھوٹ جائے گا اور اگر بالفرض نہ چھوٹا اور ساری عمر بھی اسی میں مبتلا رہے تب بھی اتنا فائدہ پہنچے گا کہ مرتے وقت ایک ہی گناہ سر رہے گا کیونکہ جب روز توبہ کی جاتی ہے تو اس سے ماضی کا تو کفارہ ہوجاتا ہے تو بجائے اس کے سو دن کے گناہ سر ہوتے ایک ہی دن کے رہ جائیں گے۔ یہ بھی کچھ تھوڑی بات نہیں۔ دیکھئے ایک مجرم پر دس دفعہ لگا کر سزا کی جاتی ہے تو وہ اپیل کرتا ہے لیکن وکلاء کہتے ہیں کہ سزا ضرور رہے گی۔ ایک بیرسٹر کہتا ہے کہ کوشش کریں گے اور امید ہے کہ تخفیف ہوجائے گی اور بجائے دس دفعات کے ایک دو دفعہ رہ جائیں گی تو وہ کس قدر خوش ہوتا ہے اور بیرسٹر صاحب کی خوشامد کرتا ہے اور کافی معاوضہ دینے کو تیار ہوجاتا ہے اور کہتا ہے یہی غنیمت ہے۔ اسی طرح اگر آخرت کی بہت سی دفعات لگی ہوں اور ان میں معتدبہ کمی ہوجائے تو غنیمت سمجھنا چاہیے جو تدبیر میں نے بتلائی ہے اس سے آپ کے ذمہ صرف ایک دفعہ رہ جاتی ہے اور بدون اس کے بہت سی دفعات لگی ہوئی ہیں یعنی بے فکری کا گناہ آپ کے ذمہ ہے‘ غفلت کا گناہ آپ کے ذمہ ہے‘ روزانہ عمل کا گناہ آپ کے ذمہ ہے اگر یہ تدبیر کرو گے تو صرف ایک ہی عمل کا گناہ رہ جائے گا۔ یہ کیا تھوڑی بات ہے۔

گناہ بے لذت فوراً چھوڑنے کی ضرورت

ان گناہوں کے متعلق میں ایک اور کام کی بات عرض کرتا ہوں۔ نئی بات آپ کو سناتا ہوں آپ نے اب تک دو ہی باتیں سنی ہوں گی ایک تو وہ بات جو مولوی صاحبوں کے وعظوں میں کہی

جاتی ہے کہ ایک گناہ بھی چھوٹا ہو یا بڑا مت کرو اور ایک وہ بات جو آزاد لوگوں سے سنی ہوگی کہ سب گناہ کرو ایک چھوڑنے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ جب جہان میں جانا ہی ٹھہرا تو پھر کیوں کسر رکھیں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ یہ دو باتیں ہوئیں ان دونوں کے بین بین تیسری بات آپ نے نہ سنی ہوگی وہ میں سناتا ہوں کہ گناہ دو طرح کے ہیں ایک وہ گناہ جن کے چھوڑنے میں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی اور ایک وہ گناہ جن کے چھوڑنے میں کسی قدر تکلیف ہوتی ہے۔ اول کی مثال مردوں کو ریشم پہننا یا داڑھی منڈانا ہے۔ بتلایئے اس کے چھوڑنے میں کیا تکلیف ہوتی ہے اور کس کام میں حرج ہوتا ہے دنیا کا کونسا کام اس پر موقوف ہے نہ معاش اس پر موقوف ہے نہ صحت اس پر موقوف ہے پھر اس کے چھوڑنے میں آپ کو کیا عذر ہے۔ اگر حق تعالیٰ سے ذرا بھی تعلق ہے تو ایسے گناہ کا تو خیال بھی نہ آنا چاہئے کیونکہ حق تعالیٰ تو اس سے ناراض ہوتے ہیں اور دنیا میں اس کی کوئی ضرورت نہیں تو کیا عقل کی بات ہے کہ ایسا کام کیا جائے کسی کام کے کرنے سے ایک معمولی حاکم کی ذرا ترچھی نظر دیکھی جاتی ہے تو سب کے خون خشک ہو جاتے ہیں اور کیسی ہی ضرورت ہو مگر اس کام کو نہیں کیا جاتا۔ حق تعالیٰ تو احکم الحاکمین ہیں ان کی نظر ترچھی اور کام بھی ایسا نہ ہو کہ ضروری کام ہو تو اس کے کرنے کے لیے مسلمان کی ہمت کیسے ہو سکتی ہے۔ غرض یہ قسم گناہ کی تو اس قابل ہے کہ فوراً ہی چھوڑ دی جائے کیونکہ اس کے لیے کوئی معتد بہ داعی بھی نہیں سوائے لاپروائی کے ایسے گناہوں کو تو آج ہی چھوڑ دو۔

اصلاح کا آسان نسخہ

اور گناہ کی دوسری قسم کی مثال مثلاً ناجائز نوکری کرنا ہے میں گناہوں کو ایک دم نہیں چھڑاتا اس کے لیے وہ ہی طرز عمل رکھو جو میں نے ابھی بیان کیا ہے کہ رات کو ان کو یاد کرو اور اپنی خطا کا اعتراف کرو اور زبان سے کہو کہ اے اللہ میں نالائق ہوں میں خبیث ہوں میرے پاس کوئی عذر نہیں میں گناہ گار ہوں اپنی غلطی سے شرمندہ ہوں روز اسی طرح کیا کرو۔ اس کا نتیجہ وہ ہی ہوگا جو میں نے ابھی کہا تھا کہ اول تو وہ گناہ چھوٹ جائے گا اور اگر ساری عمر بھی نہ چھوٹا تو صرف ایک دفعہ کے آپ مجرم رہیں گے۔ لیجئے میں نے ایسی آسان تدبیر بتلا دی ہے جس کی نسبت میرا دعویٰ ہے کہ اس سے زیادہ تخفیف دس برس تک بھی کسی مصلح سے نہ سنئے گا۔ اب آپ کے پاس کیا عذر ہے۔ صاحبو! قیامت میں حق تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کرنا اور عذر پیش کرنا بہت مشکل ہے درحقیقت تو مشکل سے مشکل کام کے لیے بھی کوئی عذر نہیں ہو سکتا کیونکہ حق تعالیٰ کو بحق الوہیت حق حاصل ہے کہ جو چاہیں امر کریں خواہ

وہ کام مشکل ہو یا آسان لیکن حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا' تکلیف مالا یطاق کو بالکل برطرف رکھا ہے کوئی حکم ایسا نہیں دیا جس میں طاقت سے زیادہ تکلیف ہو بلکہ اتنی تکلیف بھی تو نہیں ہے جتنی معمولی حکام دنیا کے احکام میں ہوتی ہے اور معمولی تکلیف تکلیف نہیں اور میں نے جو ایک شق نکالی ہے اس میں تو معمولی تکلیف بھی نہیں رہی اور بہت ہی آسانی ہو گئی اور اس پر جو میں نے آپ سے اس وقت سوال کیا ہے کہ باوجود اتنی سہولتوں کے آپ کے پاس کیا عذر ہے۔ اگر حق تعالیٰ اسی کا اعادہ فرمائیں تو آپ کے پاس کیا جواب ہو سکتا ہے سمجھ لیجئے اور غور سے کام لیجئے اور اس بیان پر شاید بعض طبیعتوں میں یہ شبہ پیدا ہوا ہوگا کہ یہ تو گناہ کی تعلیم کی جا رہی ہے۔ سو سمجھ لو کہ یہ گناہ کی تعلیم نہیں بلکہ ترک گناہ کی تعلیم ہے ہاں اس کے لیے سہولت کی سبیل نکالی گئی ہے جیسا مفصل مذکور ہوا۔ اب اس شق کے متعلق ایک بات باقی رہی ہے وہ یہ کہ جس گناہ کے ترک سے کوئی تکلیف نہ ہو ظاہر ہے کہ ایسے گناہ کسی لذت دنیاوی کی وجہ سے ہی کیے جاتے ہیں بلکہ ہر گناہ میں کچھ نہ کچھ تو حظ نفس ہے ہی' سو اس طرح کے کرنے سے جب گناہ چھوٹیں گے یا محاسبہ سے سب گناہ چھوٹ جائیں گے تو لذات بھی چھوٹ جائیں گے تو یوں کہئے کہ دنیا ہاتھ سے گئی بس ملا بن کر رہیں گے تو دنیا کی زندگی کا تلف تو گیا۔ میں کہتا ہوں کہ واقعی اس کا اثر اخیر میں ہوگا تو یہی مگر آپ اس سے گھبراتے کیوں ہیں۔

دنیا کی لذت کی مثال

یہ دنیا کی لذتیں اسی وقت تک لذتیں ہیں جب تک کہ دوسری لذتیں سامنے نہیں آتی ہیں ان سے بڑھ کر لذتیں کچھ اور بھی ہیں جن کا ابھی آپ کو پتہ نہیں ہے نہ وہ بیان میں آ سکتی ہیں۔ بس ایک مثال سے میں آپ کو بتائے دیتا ہوں وہ مثال یہ ہے کہ بچے مٹی سے کھیلتے ہیں اور بہت سے کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔ پتنگ اڑاتے ہیں' اچھلتے ہیں کودتے ہیں ان کاموں میں ان کو کیسا مزا آتا ہے۔ حتیٰ کہ انہیں باتوں میں آپس میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں روتے ہیں پیٹتے ہیں' بڑوں تک فریاد لے جاتے ہیں وہ کہتا ہے میرا کھلونا چھین لیا وہ کہتا ہے میرا ٹھیکرا چھین لیا۔ غرض ان کے نزدیک سب سے بڑی لذتیں یہی کھیل کھلونے ہیں لیکن آپ ان کو منع کرتے ہیں ہر وقت روک ٹوک کرتے ہیں ان کو میاں جی کے سپرد کر دیتے ہیں جس سے ان کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے اور جس سے یہ سب کھیل کھلونے چھن جاتے ہیں اور کھیل کود چھوٹ جاتے ہیں اس سے ان کو کیسی حسرت ہوتی ہے مگر آپ کی شفقت اس حسرت کا خیال نہیں کرتی اور ان لذات کے چھوٹ جانے کی کچھ پروا نہیں کرتی اور ان کو باندھ باندھ کر مدرسہ بھیجتی ہے آپ ان سے یہی تو کہتے ہیں کہ یہ کھیل کود کی لذتیں کیا ہیں تو

پڑھ لکھ جائے گا تو ڈپٹی ہوگا' تحصیلدار ہوگا' کرسی پر بیٹھ کر حکومت کرے گا' یہ اچھا یا ان پڑھ رہنا اور کھیل کود میں رہنا اور سمجھ آنے کے وقت تکلیف کا محسوس کرنا اچھا' بچہ کی سمجھ میں اس وقت آپ کی ایک بات بھی نہیں آتی اور وہ آپ کی روک ٹوک اور تعلیم کو ظلم کہتا ہے بتایئے آپ اس کو اس وقت کس طرح سمجھا سکتے ہیں اور آپ کو اس وقت کیا کرنا چاہیے آیا بچہ کو اس کے خیال پر چھوڑ دینا چاہیے یا بہلا پھسلا کر نرمی سے سختی سے جبراً قہراً تعلیم دلانی چاہیے جو اس بات کا جواب ہوگا۔

بہلا پھسلا کر دین کی طرف مائل کرنا

لذات دنیا چھڑانے کے متعلق وہی میرا جواب ہے کہ آپ کو اس وقت تو بہلا پھسلا کر راہ پر لگایا ہے اور سہولت کی تدبیر بتلائی ہے جس کا اثر وہی ہوگا کہ دنیا چھوٹ جائے گی اور دین سر پڑ جائے گا مگر جب حقیقت واضح ہوگی اس وقت اس کی قدر ہوگی اس سر پڑ جانے پر ایک قصہ یاد آیا۔ ایک ڈوم تھا وہ روزہ رکھنے سے بہت گھبراتا تھا اور یہ مسئلہ کہیں سن لیا تھا کہ چاند دیکھنے سے روزہ واجب ہوتا ہے۔ بس آپ نے کیا کیا کہ چاندرات کے وقت گھر میں بیٹھ رہا کہ کہیں چاند نظر نہ پڑ جائے اور روزہ واجب نہ ہو جائے۔ جب کئی روز ہو گئے بیوی نے گھر سے نکال دیا' جنگل جو گیا دن چھپے کے وقت پاخانہ کی ضرورت ہوئی۔ نظر نیچی کیے ہوئے پاخانہ گیا اور بہت احتیاط کی کہ چاند نظر نہ پڑ جائے لیکن ایک تالاب پر جو آب دست کرنے بیٹھے تو تالاب کے کنارے پانی میں چاند کا عکس نظر آ گیا' بہت خفا ہوئے اور چاند کو مخاطب کر کے کہنے لگے جا کمبخت سر ہی ہوتا پھرتا ہے تو حضرت دین اس طرح سر پڑے گا جیسے چاند اس ڈوم کے سر پڑ گیا۔ اور ظاہر ہے کہ جب دین آ گیا تو دنیا بھاگے گی تو یہ خیال بالکل سچا ہے کہ دنیا کی لذتیں چھوٹ جائیں گی مگر اس میں برائی کیا ہے کیونکہ ان سے بہتر لذتیں حاصل ہو جائیں گی تو ان کے چھوٹنے سے گرانی بھی نہ ہوگی جیسے کسی سے ایک کوڑی چھن جائے اور اس کے بدلے ایک اشرفی مل جائے تو اس کو کیا گرانی ہو سکتی ہے۔

دین کی لذت کی حقیقت

دین کی لذت وہ چیز ہے کہ ذرا محسوس ہو جائے تو پھر کوئی لذت بھی اس کے سامنے حقیقت نہیں رکھتی۔ یہی راز ہے اس بات کا کہ قبیلہ بنی ثقیف نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اول عرض کیا کہ ہم اسلام لاتے ہیں مگر اس میں دو شرطیں ہیں ایک یہ کہ جہاد میں نہیں جائیں گے دوسرے زکوٰۃ و خیرات کچھ نہیں کریں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منظور فرما لیا' اس وقت کوئی ناسمجھ آدمی

کہہ سکتا ہے کہ ایسے اسلام لانے سے فائدہ کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کیسے منظور کر لیا۔ اس کا حل یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ دین ایسی چیز ہے جو پاس آنے کے بعد خود نہ لپٹ جائے بس ان کے صرف اسلام کو منظور فرما لیا پھر دیکھ لیجئے اسلام ان کو ایسا لپٹا کہ اپنی سب شرطیں بھول گئے، مال بھی خرچ کیا اور جان بھی خرچ کی، جہاد کیا اسی طرح ہماری اس تعلیم کی حقیقت یہی ہے کہ ہم دین کا چسکا لگانا چاہتے ہیں اور دین کی سڑک پر ڈالتے ہیں، سڑک پر پہنچ کر ایک ایسا باغ ملے گا جس کی بہار آپ کو خود ہی کھینچ لے گی تو اب میری تعلیم پر اعتراض نہ رہا۔ دیکھئے کس قدر آسانی ہو گئی جس کا خلاصہ میں مکرر اعادہ کرتا ہوں کہ میں تکلیف کے گناہ کو فی الحال نہیں چھوڑاتا یعنی وہ گناہ جن کے چھوڑنے میں آپ کو تکلیف ہو صرف تکلف کے گناہ کو چھڑاتا ہوں یعنی وہ گناہ جن کو آپ نے تکلف بلاضرورت طبعیہ اپنے ذمہ لے رکھا ہے جن کے چھوڑنے میں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو گی سو ایسے گناہوں کو چھوڑنا کیا مشکل ہے۔ اتنی ہمت کرو تراشے ہوئے گناہ چھوڑ دو۔ مگر کم سمجھوں کی یہ حالت ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ شریعت پر عمل کرو اور گناہوں کو چھوڑ دو تو کہہ دیتے ہیں کہ کیا کھانا پینا چھوڑ دیں، مر جائیں۔ میں کہتا ہوں کہ مروت مگر تھوڑی تکلیف تو گوارا کرو میں تو فی الحال ان گناہوں کو چھڑاتا ہوں جن کے چھوڑنے سے موت نہیں آتی پھر وہ اعتراض کہاں رہا کہ شریعت پر عمل کریں تو کیا مر جائیں۔ ہاں یہ ضرور ہو گا کہ ہوا پرست لوگ برا کہیں گے سو اس سے مت ڈرو اور میں کہتا ہوں کہ برا کہنے کی کہاں تک پروا کی جائے گی اگر کوئی چاہے کہ سب کو راضی کر لے تو یہ ناممکن ہے دیکھنا یہ چاہیے کہ کسی کا برا کہنا اور ملامت کرنا بجا ہے یا بے جا ہے تو عقل مند کا کام یہی ہے کہ اس کی پروا نہ کرے۔

ہمارے گناہوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت

اور میں کہتا ہوں کہ اگر ملامت سے آپ ڈرتے ہیں تو گناہ میں بھی تو ملامت ہوتی ہے تو ملامت ہی کے خوف سے گناہ کو چھوڑنا چاہیے وہ ملامت معلوم بھی ہے کس کی ہوتی ہے وہ اللہ کی ہوتی ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوتی ہے کیونکہ گناہ کرنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ملامت کرتے ہیں اور رنجیدہ ہوتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دل دکھتا ہے۔ آپ نے سنا ہو گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہفتہ میں دو بار عرض اعمال اُمت ہوتا ہے۔ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جب مسلمانوں کے گناہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتے ہوں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قدر رنج ہوتا ہو گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو یہ ہے کہ کفار پر بھی اس قدر رنج فرماتے تھے گویا

جان دینے کوتیار ہیں۔ قرآن میں ہے: "لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَنْ لَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ" یعنی شاید آپ اپنی جان کو تلف کردیں گے اس رنج میں کفار ایمان نہیں لاتے۔ جب کفار پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر شفقت تھی تو مسلمانوں پر کیا کچھ ہوگی جس وقت مسلمانوں کی بداعمالیاں پیش ہوتی ہوں گی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا گزرتی ہوگی۔ کیا یہ مسلمان گوارا کرسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دے۔

حکایت مرزا قتیل مرحوم

اس تکلیف پر ایک حکایت یاد آئی۔ غالباً مرزا قتیل کا قصہ ہے کہ وہ ڈاڑھی منڈایا کرتے تھے ایک شخص ان سے ملنے آئے اور از روئے نصیحت ان سے کہا کہ آغا ریش می تراشی (بھائی صاحب کیا ڈاڑھی کترواتے ہو) مرزا قتیل نے جواب میں کہا ارے ریش می تراشم لیکن دل کسے نمی تراشم (ہاں ڈاڑھی کترواتا ہوں لیکن کسی کا دل نہیں ستاتا) اس شخص نے فوراً کہا ارے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم می تراشی۔ اس جملہ کا مرزا قتیل پر یہ اثر ہوا کہ بیتاب ہوگئے اور وجد کی سی کیفیت ہوگئی اور توبہ کی اور بزبان حال بار بار یہ کہتے تھے:

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی مرابا جان جاں ہمراز کردی

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی مرابا جان جاں ہمراز کردی

(اللہ تعالیٰ تجھ کو جزا دیں کہ تو نے میری آنکھیں کھول دیں مجھ کو میرے محبوب کے ساتھ ہمراز کردیا)

سو سب سے بڑی ملامت تو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اور درحقیقت بچنے کی چیز یہی ہے اگر لوگ ملامت کریں تو ایک طرف ان کی ملامت اور ایک طرف اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملامت اور اپنے دل سے پوچھو کہ کونسی ملامت قابل لحاظ ہے۔ مسلمان تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملامت لوگوں کی ملامت سے کمتر ہے۔ اس کے متعلق اور سنئے حضرت آپ ہیں عاشق آپ کو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق عشق کا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" (مومنین ہی اللہ کی محبت میں زیادہ شدید ہیں) یہاں مطلق مومن کے لیے شدت حب کو ثابت کیا گیا۔ شدت حب عشق ہوئی جب آپ عاشق ہیں تو عاشق کی تو شان یہی ہے کہ ملامت سے ڈرے۔ عاشق کو تو ملامت میں لطف آیا کرتا ہے پھر آپ کو لوگوں کی ملامت سے آیا یہ اثر ہونا چاہیے کہ عشق کو چھوڑ دیں یا یہ کہ اور چھیڑ چھیڑ کر ملامت کا لطف اٹھائیں اور جب آیت قرآنی سے ہر مومن کا عاشق حق ہونا ثابت ہوگیا۔

مسلمان کو دنیادار کہلانا مناسب نہیں

تو اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایک شعر جو مشہور ہے:

اہل دنیا کافران مطلق اند　　روز و شب در زق زق و در بق بق اند

(فقط کافران مطلق ہی دنیادار ہیں، رات دن زق زق بق بق میں گرفتار ہیں)

اور اکثر واعظ لوگ اس شعر کو وعظ میں پڑھا کرتے ہیں اس کو اگر ظاہری معنی پر محمول کیا جائے تو محض غلط ہے کیونکہ عاشق ہونے کے بعد اس کو کافر کیسے کہا جا سکتا ہے۔ البتہ ایک توجیہ سے صحیح ہو سکتا ہے وہ توجیہ یہ ہے کہ اس شعر کے پہلے مصرعہ کی ترکیب میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی اہل دنیا مبتداء ہے اور کافران مطلق خبر ہے۔ مگر مقصود اس کا عکس ہے یعنی کافران مطلق مبتداء ہے اور اہل دنیا خبر تو مطلب یہ ہوا کہ فقط کافران مطلق ہی دنیادار ہیں۔ ان کے سوا مسلمانوں کو خواہ وہ کیسے ہی گناہ گار ہوں دنیادار مت کہو۔ مسلمان تو کسی حال میں بھی ہو تارک نماز ہو بدکاری میں مبتلا ہو زکوۃ نہ دیتا ہو غرض سارے گناہ کرتا ہو تب بھی اس کو کافر نہیں کہہ سکتے اور واعظ صاحبان یہ غضب کرتے ہیں کہ جو لوگ ایسے گناہوں میں مبتلا ہیں صرف مال و دولت اور عیش و آرام میں مشغول ہیں ان کو بھی دنیادار کہہ کر اس شعر کا مصداق قرار دیتے ہیں اور لفظ کافر کا ان پر اطلاق کرنے سے باک نہیں کرتے یہ کس قدر زیادتی ہے۔ مسلمان تو کیسا ہی دنیا میں مبتلا ہو پھر بھی اس کے قلب کو ایک خاص تعلق حق تعالیٰ سے ہوتا ہے اور اس تعلق کے اثر سے وہ اپنا گھر دنیا کو نہیں سمجھتا بلکہ اپنا اصلی گھر آخرت ہی کو سمجھتا ہے یعنی وہ یہ سمجھتا ہے کہ وطن تو اس کا آخرت ہے لیکن وہ چندروز کے لیے مسافرانہ دنیا میں آ گیا ہے تو اب اس کی مثال ایسی ہو گئی جیسے کوئی باغپت کا رہنے والا مہینے دو مہینے کے لیے لکھنؤ چلا جائے تو اس کو لکھنؤ والا نہیں کہا جاتا نہ خود وہ اپنے آپ کو لکھنؤ کا رہنے والا سمجھتا ہے نہ کوئی دوسرا۔ دیکھئے سالہا سال بلکہ بعض صورتوں میں تمام عمر لوگ ملازمت کے سلسلہ میں وطن سے باہر رہتے ہیں مگر پھر بھی اپنے آپ کو رہنے والا اور کہیں کا سوائے اپنے وطن کے نہیں کہتے۔ حتیٰ کہ کاغذات میں بھی اپنے نام کے آگے باغپتی، بجنوری، دہلوی لکھواتے ہیں یعنی اپنی نسبت وطن ہی کی طرف کرتے ہیں پھر جبکہ مسلمان اپنا اصلی گھر آخرت ہی کو سمجھتا ہے تو دنیا میں آ کر اس کو دنیا والا یا دنیادار کیسے کہا جائے، ہاں اپنی غفلت اور جہالت سے دنیا کے خارستان میں آ کر چندروز کے لیے اس سے دل لگا لیا ہے اور بوجہ غفلت کے بعض مسلمان بھی اس کے کانٹوں میں اپنے کپڑے پھڑواتے پھرتے ہیں مگر جب وطن کا نام آئے تو آخرت ہی کا نام لیں گے دنیا کی دل فریبیاں دیکھ کر آخرت سے ذہول ضرور ہو جاتا ہے لیکن یہ نہیں ہوتا کہ دنیا کو اپنے وطن سمجھنے لگیں۔

آخرت سے ذہول پر مولانا جامی کی تنبیہ

اسی کے خلاف کی شکایت مولانا جامی رحمتہ اللہ علیہ نے کی ہے:

دلا تاکے دریں کاخ مجازی　　کنی مانند طفلاں خاکبازی

توئی آں دست پرور مرغ گستاخ　　کہ بودت آشیاں بیروں ازیں کاخ

چرازاں آشیاں بیگانہ گشتی　　چو دوناں چغداں ویرانہ گشتی

(اے دل اس مجازی مکان (دنیا) میں کب تک لڑکوں کی طرح خاک سے کھیلتا رہے گا تو ہی وہ ہاتھ کا پلا ہوا مرغ گستاخ ہے کہ تیرا آشیانہ اس مکان سے باہر تھا اس آشیانہ سے کیوں بیگانہ ہو گیا' کمینوں کی طرح سے اس ویرانہ کا الو بنا ہوا ہے)

آگے مولانا نے وطن اصلی کو یاد دلایا ہے:

بیفشاں بال و پرزیں عالم خاک　　پر تا کنگرہ ایوان افلاک

(اس عالم خاک (دنیا) سے باز اور پر جھاڑ ایوان افلاک کے کنگرہ تک اڑ)

خیر یہ تو بڑوں کی باتیں ہیں جن کو دنیا اور آخرت آنکھوں سے نظر آتی ہیں وہ تو دنیا کو کیوں پسند کرنے لگے ان کو تو دنیا سے نفرت ہوتی ہی ہے مگر جو مسلمان بظاہر اور واعظوں کے قول کے موافق دنیا دار ہیں وہ بھی گو دنیا کے لذائذ اور تنعمات میں مبتلا ہیں مگر پوچھا جائے تو کہیں گے یہی کہ وطن آخرت ہے۔ خلاصہ یہ کہ ع کہ ایں دنیا کافران مطلق اند (کافران مطلق ہی دنیا دار ہیں) میں خبر مقدم اور مبتداء مؤخر۔ تو اس میں مسلمانوں پر اطلاق اہل دنیا کا نہ ہوا بلکہ مطلب یہ ہوا کہ اہل دنیا ہونا منحصر ہے کفار میں مسلمان کیوں ہوتا دنیا دار' ہم نے تو کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی ادنیٰ مسلمان بھی فنافی الدنیا ہو کہ ہر وقت دنیا ہی کا ذکر کرتا رہتا ہو اور کبھی اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اس کی زبان پر نہ آئے۔ اس کا پتہ اس کے مقابل سے چلتا ہے۔ کفار کو دیکھئے کہ ہر وقت دنیا ہی کی دھن میں رہتے ہیں۔ ریل میں ایک ہندو آ کر بیٹھا اور اس نے سب سے پہلے مجھ سے یہ سوال کیا کہ آپ کے یہاں غلہ کا کیا بھاؤ ہے۔ بس ان کا سفر ہے تو دنیا ہے حضر ہے تو دنیا۔ یہ ہی زق زق اور بق بق جس کو اس شعر میں کہا ہے ع روز و شب درزق زق در بق بق اند (رات دن زق زق یعنی بق بق میں گرفتار ہیں) یہ حالت مسلمانوں کی بھی نہیں ہو سکتی یہ کفار ہی کے ساتھ خاص ہے جن کی یہ حالت ہے کہ "ع چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد" (جب مرتا ہے مبتلا مرتا ہے جب اٹھے گا مبتلا اٹھے گا)۔ بس جن کی یہ حالت ہے انہیں کو اس شعر میں اہل دنیا کہا گیا ہے۔ لیجئے اب اس شعر کے مصرعہ ثانی ہی سے جس میں روز و شب زق زق بق بق کا مضمون ہے پتہ چل گیا ہے کہ مصرعہ اول میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی خبر مقدم اور

مبتداء مؤخر ہے۔ غرض مسلمان دنیادار نہیں بلکہ عاشق ہے اور عاشق بھی صادق۔ مگر اس نے جہالت اور غفلت سے اپنی مٹی پلید کر رکھی ہے اور اپنا عشق اس قدر خفی کر دیا ہے کہ کسی کو اس کا احساس ہونا بھی مشکل ہو گیا ہے مگر حق تعالیٰ کو تو علم ہے اس واسطے حق تعالیٰ کے نزدیک ان کا لقب عاشق ہی ہے جیسا میں نے اوپر اس آیت سے ثابت کر دیا ہے "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" (اور ایمان والے اللہ تعالیٰ سے محبت بہت قوی ہے) جس میں کسی کی تخصیص نہیں کی نہ جنید کی نہ شبلی کی نہ اگلوں کی نہ پچھلوں کی بلکہ جو ایمان رکھتا ہے ہر اس شخص کے واسطے یہی حکم ثابت کیا۔ اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ یعنی وہ خدا تعالیٰ کے برابر کسی سے محبت نہیں رکھتا اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ وہ حق تعالیٰ سے محبت رکھتا ہے بلکہ اشد کا لفظ فرمایا جس کا حاصل یہ ہوا کہ مسلمان کو شدید محبت حق تعالیٰ ہی سے ہوتی ہے۔ لیجئے ہر مسلمان کو حق تعالیٰ زمرہ عشاق ہی میں شمار کرتے ہیں آپ اپنی طرف سے کتنے ہی اس لقب سے الگ ہوں مگر وہ آپ کو الگ نہیں کرتے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی کو عہدہ دیا گیا تحصیلداری کا اور وہ اس سے الگ ہونا چاہتا ہے اور استعفیٰ دیتا ہے لیکن حاکم بالا اس کا استعفیٰ منظور نہیں کرتا تو وہ اس عہدہ سے علیحدہ ہونا چاہتا ہے لیکن اس کو علیحدہ نہیں ہونے دیا جاتا۔ غرض آپ کے واسطے عاشق کا خطاب ثابت ہو چکا جب یہ ہے تو پھر عاشق کو ملامت سے ڈرنا نہیں چاہیے' دیکھئے ایک مردار عورت پر کوئی عاشق ہو جاتا ہے تو نہ گھر کی خبر رہتی ہے نہ بار کی نہ مال کی پرواہ رہتی ہے نہ جان کی نہ آبرو کی سب کو اس پر نثار کر دیتا ہے اور ملامت سے ڈرتا تو کیا ملامت میں اس کو لطف آتا ہے۔ پھر جبکہ آپ کا تعلق حق تعالیٰ جیسے احکم الحاکمین کے ساتھ عشق کا ہے تو ان کی رضا کے لیے جان یا مال یا آبرو کی کیا پرواہ ہونی چاہیے اور اہل دنیا کی ملامت سے ڈرنا کیا معنی۔ اب بتلائیے کیا عذر ہے آپ کو گناہ کے چھوڑنے میں۔

عشق میں ملامت سے لطف آتا ہے

اب تو معلوم ہو گیا کہ عاشق کے سامنے ملامت کوئی چیز ہی نہیں بلکہ عشق میں ملامت سے الٹا لطف آتا ہے عاشق کی تو ہر حالت میں یہ شان ہوتی ہے:

اے دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی — بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطر ہاست بجاں — شرط اول قدم آنست مجنوں باشی

(اے دل یہی بہتر ہے محبوب حقیقی کی محبت کی شراب سے سرشار رہے بے زر و مال کے دنیا داروں سے حشمت و دبدبہ میں سینکڑوں درجہ زیادہ رہے' منزل محبوب میں جان کے لیے سینکڑوں خطرے ہیں' قدم رکھنے کی اول شرط یہ ہے کہ تو مجنوں بن جا)

دیکھئے مجنوں کو کہ ہر مصیبت کے لیے تیار رہتا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ آپ اونٹنی پر سوار ہو کر لیلیٰ کی طرف چلے۔ اس اونٹنی کے راستہ اس کا ایک چھوٹا بچہ تھا وہ پیچھے رہ رہ جاتا تھا اور وہ اونٹنی بار بار اس کی طرف مڑتی تھی جس سے سفر میں دیر ہوتی تھی یہ رنگ دیکھ کر آپ نے یہ شعر کہا

هوىٰ ناقتي خلفي وقد امي لهوىٰ ۔۔۔ واني واياها لمختلفان

(یعنی میری ناقہ کا محبوب تو پیچھے ہے اور میرا محبوب آگے ہے تو میں اور وہ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں یعنی وہ پیچھے کو جانا چاہتی ہے اور میں آگے کو جانا چاہتا ہوں۔ پس اسی اونٹنی ہی کو چھوڑنا چاہیے اور پیدل چلنا چاہیے۔ اس کے بعد اتنا صبر بھی نہ ہوا کہ اس اونٹنی سے باطمینان اتر لیتے نہیں بلکہ اپنے آپ کو اس کے اوپر سے گرا دیا' بہت چوٹ لگی اور بدن پاش پاش ہو گیا' اب پیدل چلنے کے قابل بھی نہ رہے اور سکون کس کو تھا جب کچھ بن نہ پڑا تو لڑھکنا شروع کیا کہ مقصود سے کچھ تو قریب ہو۔ یہاں کوئی خشک کہہ سکتا ہے کہ بڑی غلطی کی اگر باقاعدہ اترتے تو چوٹ نہ لگتی اور پیدل ہی چل کر لیلیٰ کے پاس جلدی پہنچ جاتے۔ اس طرح گرنے میں چوٹ بھی لگی اور مقصود بھی فوت ہوا' اب زخمی پڑے ہیں کہ معمولی طور پر بھی چل نہیں سکتے۔ اس کا جواب آپ کو کیونکر سمجھایا جائے جو عشق کا مذاق رکھتا ہو وہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ عاشق کو بھلا اتنا ہوش کہاں کہ اونٹ کے اوپر سے یوں اترا کرتے ہیں اور یہ قاعدہ ہے راستہ قطع کرنے کا۔ اس کا کام تو بس طلب ہے اور تڑپ طالب صادق کا قول تو یہ ہوتا ہے:

دست از طلب ندارم کام من برآید ۔۔۔ یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

(جب تک میرا مقصد پورا نہ ہو جائے طلب سے ہاتھ کوتاہ نہ کروں گا یا تو محبوب سے وصال ہو جائے یا جان تن سے نکل جائے)

اسی قصہ پر مولانا فرماتے ہیں کہ

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود ۔۔۔ گوئے گشتن بہراو اولیٰ بود

(خدا تعالیٰ کا عشق کیا لیلیٰ سے بھی کم ہو؟ اس کے لیے تو کوچہ گردی کرنا زیادہ بہتر ہے)

یعنی غیرت دلاتے ہیں مسلمانوں کو کہ جب مجنوں کا ایک عورت کے پیچھے یہ حال تھا تو مسلمان کا اللہ کی راہ میں کیا حال ہونا چاہیے۔ غرض عاشق کی تو یہ شان ہوا کرتی ہے جب آپ اللہ کے عاشق ہیں تو پھر کسی بات کا کیا ڈر اور ملامت کی کیا پروا۔ ان کی رضا کے لیے سب کچھ گوارا ہونا چاہیے اس لیے آپ پہلے ہی سوچ لیجئے کہ اس طلب میں آپ کو کوئی ملا کہے گا' کوئی مسجد کا مینڈھا

کہے گا' کوئی کہے گا کہ گلگلوں کی تسبیح گلے میں ڈال لو۔ میں کہتا ہوں کہ سب کی سن لو اور جواب کسی کو مت دو۔ جواب دینا تو طالب علموں کا کام ہے تمہارا کام نہیں' چون و چرا کرنا طالب علموں کا کام ہے۔ چنانچہ کیرانہ میں ایسا ہی ہوا۔ ایک طالب علم نے ایسی باتوں کا جواب خوب ترکی بترکی دیا۔ وہ بیچارے مسجد کے حجرے میں رہتے تھے ان سے کسی دنیادار نے کہا کہ مولوی لوگ تو مسجد کے مینڈھے ہوتے ہیں انہیں کیا خبر کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اس نے کہا جی ہاں مگر مسجد کے مینڈھے دنیا کے کتوں سے ہزاروں درجہ بہتر ہیں۔ خیر اس جواب کا بھی ایک موقع ہے مگر ہم تو اس کو بھی اچھا نہیں سمجھتے ہم تو کہتے ہیں کہ بجائے ترکی بترکی جواب دینے کے یوں کہنا چاہیے تھا کہ اچھا بھائی تم ہم سے اچھے سہی کیونکہ جب عشق کا دم بھرا تو پھر ملامت کی کیا پروا۔ مشہور مثل ہے کہ جب اوکھلی میں دیا سر تو موسلوں سے کیا ڈر۔ تم کو تو اس پر قناعت کرنا چاہیے کہ ہم کو تو بفضلہٖ وہ دولت حاصل ہے کہ ملامت کرنے والے کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی وہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ تمہارا عاشقان الٰہی میں نام لکھا گیا ہے۔ دیکھئے ایک کیمیا گر کیمیا کے اوپر اتنا نازاں ہوتا ہے کہ اسے کوئی غریب کہے امیر کہے بھلا کہے برا کہے وہ ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا کہ میں کیمیا گر ہوں وہ اپنی کیمیا پر مست ہے۔ دیکھنے والے اس کو لنگوٹ بند دیکھ کر غریب سمجھتے ہیں' بیوقوت سمجھتے ہیں مگر اس کے دل سے پوچھو کہ وہ کتنا خوش ہے۔ اسی طرح جبکہ آپ کو عشق کا کیمیا حاصل ہے تو آپ کو دنیا سے استغنا ہونا چاہیے اور کوئی کچھ بھی کہے اپنی اسی کیمیا پر مست رہنا چاہیے۔

ملامت سے ہمت قوی ہو جاتی ہے

اس ملامت کی ایک نئی حکمت قلب میں اسی وقت وارد ہوئی وہ یہ کہ جس کام پر ملامت ہوتی ہے اس پر آدمی زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے کیونکہ طبعاً اپنی بات کی پچ ہو جاتی ہے اور ضد میں آ کر اس کام کو جس پر ملامت کی گئی ہے اور بھی زیادہ کرنے لگتا ہے اور ایک چڑ سی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص کوٹھے پر چڑھتا ہو اور کمزوری کے باعث اس کو چڑھنا مشکل ہو تو اگر کوئی اس کو چڑھا دے کہ جی ہاں آپ چڑھ ہی جائیں گے تو اس کو اس طعن سے ایک جوش سا پیدا ہو جائے گا اور جس طرح بھی بن پڑے گا چڑھ ہی کر دم لے گا۔ غرض ملامت سے ہمت قوی ہو جاتی ہے اور یہ ہمت وہ چیز ہے جس کو طالب میں پیدا کرنے کے لیے شیخ وقت بہت تدابیر کرتا ہے اور یہاں اس کی وہ بات بلا ان تدابیر کے ملامت ہی سے حاصل ہو گئی تو بجائے برا ماننے کے اور خوش ہونا چاہیے اور ملامت کرنے والے کا احسان ماننا چاہیے کہ جو کام شیخ بھی مشکل سے

کر سکتا وہ اس نے ذرا سی بات کہہ کر کر دیا تو وہ ہمارا محسن ہوا یا دشمن ۔غرض آپ کسی کی عیب چینی
سے نہ گھبرایئے اس سے گھی چینی ملے گی اور عمل کی ہمت پیدا ہو جائے گی اور ہمت وہ چیز ہے کہ
حکماء دین کہتے ہیں کہ علم سے زیادہ ہمت کی ضرورت ہے مگر آج کل تو ہمت کی بہت ہی کمی ہو گئی
ہے۔گو علم کی چنداں کمی نہیں پہلے لوگوں میں اتنا علم نہ تھا جتنا اب ہے مگر ہمت آج کل سے زیادہ
تھی اسی سے سارے کام درست ہو جاتے تھے۔

علم سے متعلق کوتاہیاں

اور اس تفاوت سے کوئی یوں نہ سمجھے کہ علم کے متعلق کوئی شکایت نہیں اس میں بھی بہت
کوتاہیاں ہو رہی ہیں چنانچہ اکثر لوگ علم حاصل تو کرتے ہیں مگر بے ڈھنگے طور پر چنانچہ بعضوں
نے تو یہ سمجھ لیا کہ علم نام صرف عربی پڑھنے کا نہیں ہے ہر زبان میں آ سکتا ہے کیونکہ علم کے معنی ہیں
جاننا۔جاننا عربی زبان سے بھی ہو سکتا ہے اور اردو سے بھی ہو سکتا ہے اور صرف زبانی تعلیم سے
بھی ہو سکتا ہے۔ان لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ آج کل کتابیں اردو کی بکثرت موجود ہیں عربی کا
مشغلہ ہی چھوڑ دیا جائے جو بجائے خود ایک کمی ہے۔کون نہیں جانتا کہ اردو کی کتابیں ہر فن کی
موجود ہیں۔مثلاً ڈاکٹری کا فن بقدر کفایت اردو میں موجود ہے پھر آپ خود اس کو دیکھ کر ماہر
کیوں نہیں بن جاتے اور ماہرین نے اس کی تحصیل کے لیے انگریزی وغیرہ کی قید کیوں لگائی
ہے۔ڈاکٹری کے کالجوں میں اردو کی کتابیں کیوں نہیں پڑھا دیتے۔معلوم ہوا کہ عقلاء کے
نزدیک یہ مسئلہ مسلم ہے کہ کسی فن کی اعلیٰ درجہ کی تکمیل اسی زبان میں ہو سکتی ہے جس زبان میں وہ
فن مدون ہے' ترجموں سے تکمیل نہیں ہوتی۔پھر حیرت ہے کہ دنیا کے فنون میں تو یہ مسئلہ مسلم ہو
اور دین کے فنون میں مسلم نہ ہو۔دین کے لیے صرف اردو دانی کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے حتیٰ کہ دین
میں دخل دینے کے لیے وہ لوگ بھی تیار ہو جاتے ہیں جن کو صرف اردو دانی آتی ہے بلکہ اردو بھی
صحیح طور سے نہیں آتی اور تلفظ اور املاء بھی ان کا صحیح نہیں۔ایسے لوگ اہل فن یعنی علماء سے بحث
مباحثہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔خیر اس جھگڑے کو چھوڑو' لو میں تنزل کرتا ہوں
اور مطالعہ کو منع نہیں کرتا' اردو ہی میں دین کی کتابوں کا مطالعہ کرو مگر اس کا طریقہ تو سیکھ لو محض اردو
دانی کو کتاب کے سمجھنے کے لیے کافی مت سمجھو بلکہ ان ہی اردو کی کتابوں کو کسی معتبر معالج سے سبقاً
سبقاً پڑھ لو جہاں سینکڑوں کاموں کے لیے وقت صرف کرتے ہو ایک آدھا گھنٹہ اس کے لیے بھی
صرف کیا کرو۔دیکھئے کوئی شخص اردو کی قانون کی کتاب دیکھ کر ایک عرضی دعویٰ بھی نہیں لکھ سکتا۔

یہ کام بھی وکیل ہی سے پوچھ کر کیا جاتا ہے اور اگر قانون کا علم پورا بھی حاصل کرنا نہ ہو بلکہ بقدر ضرورت ہی حاصل کرنا ہو وہ بھی اسی طرح آ سکتا ہے کہ قانون کی کتاب وکیل سے سبقاً سبقاً پڑھو۔ گو قانون کی کتابیں اردو میں موجود ہیں لیکن زبان کے آسان ہونے سے یہ کہاں لازم آیا کہ وہ فن بھی آسان ہے۔ فن تو ایسا مشکل ہے کہ انگریزی داں اور پاس شدہ وکیل بھی ایک دم کام نہیں کر سکتے۔ پاس ہونے کے بعد کسی وکیل کے پاس کام سیکھتے ہیں تب وہ کام کے قابل ہوتے ہیں۔ اسی طرح دین کی کتابوں کی اردو تو آسان ہے مگر فن تو آسان نہیں۔

بس اردو سے آپ کو اتنی سہولت ہوگئی کہ آپ عبارت پڑھ سکتے ہیں زبان کے سیکھنے کے لیے جتنا وقت عربی پڑھنے میں لگتا وہ نہیں لگے گا لیکن اس سے فن کہاں آسان ہوگیا اور علماء سے استغناء کیسے ہوگیا۔ بس طریقہ صحیح یہی ہے کہ اردو کی کتاب بھی اگر دیکھنا ہو تو اس کو کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھ لو مگر میں دیکھتا ہوں کہ دین کی طرف سے اتنی لاپروائی ہے کہ اس کے لیے بھی کوئی تیار نہیں ہوگا کہ کتاب سبقاً سبقاً روزمرہ جا کر پڑھا کرے۔ اس لیے میں ایک اور اس سے زیادہ سہل تدبیر بتاتا ہوں وہ یہ ہے کہ کتاب کا مطالعہ بطور خود ہی سہی لیکن جہاں سمجھ میں نہ آئے اس پر پنسل سے نشان لگا دو اور ہفتہ میں ایک دفعہ یا پندرہ دن میں ایک دفعہ کسی عالم کے پاس جا کر ان مقامات کو حل کر لو۔ ان مقامات کے سمجھنے میں خود اجتہاد نہ کرو۔ اب بتایئے کہ اس سے کونسا معاش میں حرج ہوا۔ اب کوئی عذر آپ کے پاس علم کے حاصل نہ کرنے کے لیے نہیں ہے۔ یہ ڈھنگ ہے علم کے حاصل کرنے اور بے ڈھنگا کام تو بے ڈھنگا ہی ہوتا ہے۔ آج کل تعلیم یافتہ اصحاب علم کا شوق رکھتے ہیں اور بعض وقت دین کی کتابیں بھی دیکھتے ہیں لیکن صحیح طریق سے نہیں دیکھتے۔ لہٰذا کوئی نتیجہ کارآمد اس سے نہیں نکلتا۔ صحیح طریق وہی ہے جو میں نے عرض کیا۔

ہر کس و ناکس کی تصنیف دیکھنا مضر ہے

تحصیل علم کے متعلق ایک بات بتلاتا ہوں جو نہایت ضروری ہے گو اس کو تعصب کہا جائے گا مگر درحقیقت خیرخواہی ہے وہ یہ ہے کہ مختلف مضامین اور مختلف مصنفین کی کتابیں نہ دیکھئے۔ آج کل یہ بھی ایک شوق ہے کہ جو کتاب ملی اسی کو دیکھنے لگے خواہ وہ ہندو کی ہو یا عیسائی کی ہو یا دہری کی ہو۔ نہ معلوم اس میں کیا مصلحت ہے سوائے وقت ضائع کرنے کے بعض علم متضاد ہوتے ہیں تو اس تضاد سے مفید علم بھی فاسد ہو جاتا ہے جیسے کھانا کھا کر سنکھیا کھا لیا کہ وہ خود ہضم ہوتا ہے نہ دوسرے کھانے کو ہضم ہونے دیتا ہے بلکہ سب کو بگاڑ دیتا ہے اور سب زہر ہی زہر ہو جاتا ہے۔ اسی

طرح مختلف کتابیں دیکھنے سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا بلکہ شبہات پیدا ہوجاتے ہیں اور تمام علم زہر بن جاتا ہے اور قلب کو ہلاک کردیتا ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ ہم مختلف کتابیں اس واسطے دیکھتے ہیں کہ محقق ہوجائیں کیونکہ تحقیق جب ہی ہوتی ہے کہ انسان متضاد چیزوں سے واقف ہو مثلاً کسی نے ہمیشہ میٹھا حلوا ہی کھایا ہے وہ حلوے کی قدر کیا جانے۔ جب اس کو ایک دفعہ کڑوا ایلوا بھی کھلا دیا جائے تب اس کو قدر ہوگی کہ حلوا ایسی چیز ہے۔ اسی واسطے کہا ہے "تعرف الاشیاء باضدادھا" (چیزیں اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں) میں کہتا بسم اللہ آپ ضرور محقق بنئے۔

محقق بننے کا طریقہ

مگر اس کا طریقہ یہ نہیں ہے اس کا طریقہ بھی یہ ہے کہ پہلے علم یعنی علم دین کو مکمل کر لیجئے اور اہل فن کی صحبت میں رہئے اس کے بعد جس کی کتاب چاہے دیکھئے۔ سلف نے بھی یہ کام کیے ہیں جن کی کتابیں اس وقت تک موجود ہیں جن کی بدولت علم کلام ایسا مکمل موجود ہے کہ قیامت تک کوئی مخالف دم نہیں مار سکتا اور یہ تکمیل اس طرح ہوگی کہ معاش کو آگ لگائیے طالب علم بنئے۔ میزان سے پڑھئے اور پوری تحصیل کیجئے پھر کسی محقق کی صحبت میں بھی کچھ روز رہئے اس طرح آپ محقق بن جائیں گے۔ یہ طریقہ کچھ دین ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر کام کی اور ہر فن کی حالت یہی ہے کہ سیکھنے اور محنت کرنے ہی سے آتا ہے صرف بطور خود ایک دو کتاب دیکھ لینے سے نہیں آتا۔ غرض محقق بننا کچھ برا نہیں مگر ہر کام کا طریقہ ہے۔ محقق بننے کا طریقہ وہ ہے جو میں نے بتایا۔ آج کل لوگوں کو شوق ہے کہ کام طریقہ سے تو کرتے نہیں اور قدم رکھتے ہیں سب سے آگے۔

بے علم مسلمانوں کو مناظرہ میں حصہ لینا مناسب نہیں

ایک کوتاہی علم کے متعلق یہ ہے کہ بعض بے علم مسلمان مناظروں میں گھس جاتے ہیں اور بعض وقت جہالت سے کامیاب بھی ہوجاتے ہیں پھر تو ان کا دماغ بہت ہی بڑھ جاتا ہے۔ ایک جگہ ایک عیسائی تقریر کررہا تھا اس نے اثناء تقریر میں اعتراض کیا کہ دیکھو حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردہ کو زندہ کردیتے تھے اندھوں کو اچھا کردیتے تھے اس کے مسلمان بھی قائل ہیں خود قرآن میں موجود ہے اور مسلمانوں کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسا نہیں کرتے تھے تو اس سے فضیلت ثابت ہوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہمارے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ ایک آج کل کے سے محقق کھڑے تھے وہ اس عیسائی سے الجھ گئے اور کہنے لگے ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بڑی شان ہے ایسے کام تو میں کرسکتا ہوں وہ عیسائی اتفاق سے کانا تھا کہنے لگا مردہ کو زندہ کرنا تو بڑی

بات ہے میری ایک آنکھ پھوٹی ہوئی ہے اسی کو درست کردو تو میں جانوں۔ اب ان کو کوئی علمی جواب تو آیا نہیں مگر تھے ذہین کہنے لگے عیسیٰ علیہ السلام تو نبی تھے اور میں ہوں اُمتی ان کی برابری کا دعویٰ گستاخی میں شمار ہوگا ہاں اتنا کرسکتا ہوں کہ تیری دونوں آنکھیں یکساں کردوں اس طرح کہ دوسری کو بھی پھوڑ دوں۔ بس اس پر مجمع میں ایک قہقہہ لگا اور عیسائی خاموش ہوگیا۔ غرض بعض اس طرح جاہلوں کی نظر میں کامیابی بھی ہوجاتی ہے مگر یہ کوئی کامیابی نہیں۔

ہر عامی شخص دقیق مسئلہ سمجھنے کا اہل نہیں

ایک کوتاہی تحصیل علم کے متعلق یہ ہے کہ دین کے متعلق کوئی عام آدمی بھی سوال کرتا ہے تو دقیق سے دقیق مسئلہ کا جس کے سمجھنے کی لیاقت نہیں اور فرمائش یہ کی جاتی ہے کہ ہم کو تو سمجھا ہی دو۔ ایک انجینئر صاحب نے مجھ سے ایک مسئلہ علم بلاغت کے متعلق پوچھا' میں نے کہا اس کا جواب سمجھنے کے لیے چند علوم کی ضرورت ہے' کہنے لگے پھر مجیب کا کمال ہی کیا ہوا۔ علوم پڑھنے کے بعد تو ہم خود ہی سمجھ لیں گے۔ سلیس عبارت میں آپ تقریر کردیجئے میں سمجھ لوں گا میں نے کہا جناب اقلیدس اردو میں ہے اور عبارت اس کی کیسی سلیس ہے مگر اس کی ایک سہل سے سہل شکل کسی ایسے شخص کو سمجھا تو دیجئے جو اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ کو نہ جانتا ہو مگر آپ ایسا ہرگز نہیں کرسکتے پھر آپ سے بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ کمال ہی کیا ہوا جو آپ نے ایسے شخص کو نہ سمجھایا جو علوم متعارفہ اور اصول موضوعہ کو نہ جانتا ہو اور آپ انجینئر ہیں تعمیر کا کام بھی جانتے ہیں اگر ایک معمار آپ سے یہ کہنے لگے کہ جو کام آپ آلات سے کرتے ہیں وہ مجھے بلا آلات کے سکھادیجئے تو کیا آپ ایسا کرسکتے ہیں یا آپ کو یہی کہنا پڑے گا کہ بھائی وہ کام آلات ہی پر موقوف ہے' آلات منگالو اور ان کا استعمال سیکھ لو تب میرا سا کام کرسکو گے۔ اب انجینئر صاحب چپ تھے بعضے حضرات اس موقع پر بھی کہنے لگتے ہیں کہ اچھا صاحب ہمارا سوال حل کرنے سے پہلے ان علوم کو بھی سمجھا دیجئے جن پر جواب کا سمجھنا موقوف ہے مگر اس کے ساتھ فرمائش یہ بھی ہوتی ہے کہ اسی وقت اور ایک ہی مجلس میں سب کام ہوجائیں گے اور ہم یہاں سے محقق بن کر اٹھیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اتنی جلدی کونسا کام ہوجاتا ہے ایک ذرا سا امتحان آپ دینا چاہتے ہیں تو اس کی تیاری میں کتنے دن لگتے ہیں حالانکہ وہ علم ہی کیا ہے جس کا امتحان آپ دینا چاہتے ہیں تو اس کی تیاری میں کتنے دن لگتے ہیں حالانکہ وہ علم ہی کیا ہے جس کا امتحان آپ دینا چاہتے ہیں اور علم شرائع تو وہ علم ہے جو بڑے بڑے عقلاء کی سمجھ سے بالا ہے جس کے لیے حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا اور عقل اس کے واسطے کافی نہ ہوئی بلکہ وحی کی ضرورت ہوئی

اب ایک اس علم کو لے لیجئے جو آپ کے ہم جنس انسانوں کا بنایا ہوا ہو۔ مثلاً پارلیمنٹ کی ممبری کے لیے جن علوم کی ضرورت ہے ان کو آپ کسی یونیورسٹی میں حاصل کرنے کے لیے جائیے اور یہی فرمائش کیجئے کہ وہ علوم کو سیکھادو اور یہی شرط کیجئے کہ اسی ایک جلسہ میں سیکھادو۔ دیکھیں کونسا پروفیسر ہے جو ایسا کر سکتا ہے' اگر کوئی ایسا کر سکتا ہے تو ہم بھی آپ کو ایک ہی جلسہ میں محقق بنادیں گے۔

غرض یہ ناممکن ہے کہ ایک جلسہ میں بلکہ ایک دن میں بلکہ دو چار دن اور دو چار مہینہ میں بھی محقق بنادیا جائے ہاں باقاعدہ طالب علمی کیجئے اور سب کام چھوڑ کر علم کے پیچھے پڑیئے۔ ایک معتد بہ وقت میں آپ ضرور محقق بن جائیں گے پھر آپ نہ صرف خود ان کے مسائل کو سمجھ لیں گے بلکہ اوروں کو بھی سمجھا سکیں گے۔

غیر محقق کو محقق کے اتباع کے بغیر چارہ نہیں

اور اگر اس طرح طالب علمی کرنے اور باقاعدہ علم پڑھنے سے کم فرصتی کا عذر ہے تو اس ہوس کو چھوڑیئے اور کسی محقق کا دامن پکڑیئے اور جو وہ کہے اس کو تسلیم کیجئے تمام فنون میں یہی طریقہ ہے آپ کیسے ہی بڑے آدمی ہوں اور کیسے ہی تعلیم یافتہ ہوں لیکن ڈاکٹر نہ ہوں اور آپ کا بچہ بیمار ہو تو آپ کو ڈاکٹر ہی کے پاس جانا پڑے گا اور جو وہ کہے گا وہی کرنا ہوگا۔ اس کے نسخہ کو آپ پڑھ بھی نہ سکیں گے مگر یہ نہ کہہ سکیں گے کہ ذرا سمجھا دیجئے کہ نسخہ کیا لکھا ہے اور کس مرض کا لکھا ہے' اسی کا نام تو اتباع ہے۔ وہ ڈاکٹر اس وقت بمقابلہ آپ کے محقق ہے آپ غیر محقق ہیں۔ اس واسطے اس کی ہر بات کو تسلیم ہی کرنا پڑے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ غیر محقق کو محقق کے اتباع سے چارہ نہیں' دنیا کے کاموں میں یہ سب کے نزدیک مسلم ہے پھر دین کے کاموں میں کیوں مسلم نہیں۔ غرض یا تو محقق بنئے یا محقق کا اتباع کیجئے اور اس کے سامنے قیل وقال نہ کیجئے میں یہ بتادوں گا کہ محقق کس کو کہتے ہیں اور وہ کیسے مل سکتا ہے کوئی پہلو نہ چھوڑوں گا۔ انشاءاللہ مگر سب سے پہلے اس پندار کو دماغ سے نکال دیجئے کہ ہم محقق ہیں پھر محقق کی تلاش شروع کیجئے اور عزم کر لیجئے کہ اگر کوئی محقق مل گیا تو ہم اس کی جوتیوں میں پامال ہو جائیں گے جس کو مولانا فرماتے ہیں:

پیش یوسف نازش وخوبی مکن | جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

(یوسف یعنی کامل کے روبرو ناز وخوبی یعنی دعویٰ کا اظہار کمال مت کرو بجز آہ و نیاز یعقوبی کے اور کچھ مت کرو)

اس کے سامنے ناز سے کام نہیں چلتا' نیاز ہی سے کچھ کام چل سکتا ہے۔ اب میں ان سے ملنے کا طریقہ بتلاتا ہوں سو اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو غیر مکتسب یعنی منجانب اللہ ایسا محقق مل گیا۔

طلب صادق کا اثر

اور عادۃ اللہ یہ ہے کہ طلب صادق پر اس کا ترتب ہو جاتا ہے۔ طلب صادق میں یہ اثر ہے کہ مطلوب مل ہی جاتا ہے مثل مشہور ہے جو یندہ یابندہ۔ یہ مثل چاہے اور کسی کام میں صحیح ہو یا نہ ہو مگر اس طریق میں تو بالکل صحیح ہے۔ خدا کا طالب خدا تک پہنچ کر رہتا ہے بشرطیکہ طالب صادق ہو طلب صادق خود پہنچا دیتی ہے مطلوب تک۔ عادت الٰہی یہی ہے اسی کے متعلق مولانا کہتے ہیں:

ہر کجا پستی است آب آنجا رود　　ہر کجا مشکل جواب آنجا رود
ہر کجا دردے دوا آنجا رود　　ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

(جہاں نیچاؤ ہوتا ہے اسی جگہ کو پانی جاری ہوتا ہے جہاں اشکال ہوتا ہے وہاں جواب دیا جاتا ہے جہاں بیماری ہوتی ہے وہاں دوا استعمال کی جاتی ہے جہاں مرض ہوتا ہے وہاں ہی شفا پہنچتی ہے)

ایک جگہ اس مضمون کو زیادہ کھول کر فرمایا ہے:

آب کم جو تشنگی آور بدست　　تا بجوشد آبت از بالاؤ پست

(پانی کی جستجو کرو پیاس پیدا کرو تا کہ پانی تمہارے لیے بالا و پست سے جوش مارے)

تشنگاں گر آب جویند از جہاں　　آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(تشنہ لوگ اگر دنیا میں پانی کے طالب ہیں تو پانی بھی تشنہ لوگوں کا طالب ہے)

دوسرے شعر میں وصول کا راز بتلایا ہے وہ یہ کہ طلب صرف ادھر سے نہیں ہوتی بلکہ ادھر سے بھی ہوتی ہے بلکہ اول ادھر سے ہوتی ہے اگر ادھر سے نہ ہوتی تو ادھر تو توفیق طلب کی کیسے ہوتی۔ توفیق بھی تو ان ہی کے دینے سے ہوتی ہے۔ غرض طلب صادق مطلوب تک پہنچا دیتی ہے۔ گویا طالب صادق کو الہام ہوتا ہے کہ یہ کام فلاں جگہ ہوگا' فلاح محقق ہے اور اکثر یہی ہوتا ہے کہ طالب ایسی جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا کام ہونے والا ہے۔

مشائخ زمانہ کی خدمت میں چند دن گزارنے کی ضرورت

اور دوسری صورت مکتسب ہے وہ یہ کہ جتنے مشائخ و حکماء اس وقت مشہور ہیں ان سب کے پاس خالی الذہن ہو کر چند روز رہ کر دیکھو اس سے ضرور حق واضح ہو جائے گا۔ اب میں کہتا ہوں کہ اگر اس طرح محقق مل گیا اور تردد باقی نہ رہا تو بس محقق متعین ہو گیا۔ اب اس کے پاس رہو یا نہ رہو مگر اس کا اتباع کرو اس محقق کے سامنے چون و چرا نہ کرو۔ حتیٰ کہ بدون اس کے اذن کے کتاب بھی مت دیکھو صرف اس کو دیکھو اس کے اقوال کا اور اس کے افعال کا اتباع کرو۔ خوب کہا ہے:

در مصحف روئے او نظر کن   خسر و غزل و کتاب تا کے

(محبوب حقیقی پر متوجہ ہو کتاب اور غزل میں کب تک مشغول رہو گے)

دیکھئے آپ مقدمہ لڑنے عدالت میں جاتے ہیں تو جو وکیل بلکہ وکیل کا محرر کہتا ہے وہ کرنا پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ کاغذ پر دستخط بھی اگر بے موقع کر دیئے ہیں تو وہ دوسری جگہ دستخط کراتا ہے آپ کی اتنی بھی مجال نہیں ہوتی کہ اس سے پوچھیں کہ اس جگہ دستخط کرنے میں کیا خرابی تھی جو دوسری جگہ دستخط کراتے ہو۔ اس معنیٰ کو کہا ہے:

جملہ اوراق و کتب در نار کن   سینہ را از نور حق گلزار کن

(تمام کتابوں اور اوراق کو آگ میں جھونکو' سینہ کو حق تعالیٰ شانہ کے نور سے گلزار کر)

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کتاب غلط ہے۔ پڑھنا لکھنا نہیں چاہیے' جیسے بعض جاہل اس کا مطلب یہی لے لیتے ہیں کہ پڑھنے لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں بس کودا اچھلا کرو اور جو چاہے کرتے رہو اور کیسے ہی بڑے سے بڑے افعال اور گناہ کرو کچھ حرج نہیں اور جب کوئی اعتراض کرے تو یہی پڑھ دو۔ ع جملہ اوراق و کتب در نار کن۔ بہت سے جاہل پیر ایسے ہی پھرتے ہیں جو الف کا نام بھی نہیں جانتے اور خود بھی گمراہ ہیں اور اوروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں جو چاہیں کرتے پھرتے ہیں اور یہی جملہ ان کا متمسک ہے۔ ع جملہ اوراق و کتب در نار کن (تمام کتابوں اور اوراق کو آگ میں جھونکو) میں کہتا ہوں کہ اگر اس پر عمل ہے تو آپ کے یہاں دنیا کے بھی تو کچھ کاغذات ہوں گے۔ مثلاً بیع نامے۔ تمسک رہن نامے وغیرہ۔ سب کو ایک دم آگ میں جھونک دو' غرض اس جملہ کا یہ مطلب نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی محقق تم کو مل جائے تو اس سے کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ عرصہ کے واسطے اس طرح اس پر عمل کرو کہ جو وہ کہے اس کے مقابلہ میں کتاب پیش مت کرو۔ اس سے کسی بات میں معارضہ مت کرو جو وہ کہے آمنا و صدقنا کہہ کر تسلیم کرو۔ اس کا راز یہ ہے کہ کتاب تو غلط نہیں ہے لیکن تمہاری سمجھ غلط ہے اگر تمہیں کتاب سمجھنے کی لیاقت ہوتی تو تم کو محقق کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جب تمہیں اتنی لیاقت نہیں جب ہی تو اس کے پاس گئے ہو پھر اس کے سامنے لیاقت بگھارنا اپنے افعال میں تعارض ہے۔ چندروز اسی طرح اس کے اقوال تسلیم کرو پھر تم کو معلوم ہو جائے گا کہ جو وہ کہتا ہے وہ ہی کتاب کہتی ہے اور جو تم سمجھتے تھے وہ غلط تھا مگر ابتداء میں کتاب پر اعتماد کرنا اور اس کے قول پر اعتماد نہ کرنا یہ زہر قاتل ہے اور اس کا نتیجہ سوائے گمراہی اور محرومی کے کچھ نہیں۔ نیز اس کی صحبت میں بہت سی باتیں وہ بھی دیکھو گے جو تصریحاً کتاب میں

نہیں ملیں گی۔ اس کو اس طرح سمجھ لینا ایک شخص گانا سیکھنا چاہتا ہے تو علم موسیقی کا استاد جس طرح کہے اور جس طرح خود آواز نکال کر بتلائے اسی کی تقلید کرنا پڑے گی۔ تب تو گانا آئے گا اور اگر کوئی موسیقی کی کتاب ہاتھ میں لے کر استاد پر اعتراض کرنا شروع کر دے کہ استاد یہ تال آپ کی کتاب کے خلاف ہے اور یہ سُر آپ کا کتاب کے خلاف ہے تو اس کو گانا کبھی نہیں آئے گا۔ ہاں اگر استاد کا پورا اتباع کیا اور اس کے کہنے سے اس کے گانے کی نقل بے سوچے سمجھے اتاری تو چند ہی روز میں گانا آجائے گا اور یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ استاد جو بتاتا تھا وہ سب کتاب کے موافق ہی تھا باقی محقق کے لیے صاحب کشف اور صاحب تصرف ہونا لازم نہیں جیسا آج کل یہ بھی ایک خبط ہے اور اسی کو معیار کمال اور محقق اور کامل کی پہچان قرار دے رکھا ہے کہ جس کے پاس بیٹھو اور کشف ہونے لگے اور کلکتہ اور بمبئی اور سمندر نظر آنے لگے وہ کامل ہے اور جس کی صحبت میں یہ بات حاصل نہ ہو اس کو کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ یہ ایسی غلطی ہے کہ بہت سے لکھے پڑھے اس میں مبتلا ہیں اور بہت سے آدمی اس کشف و کرامت کی بدولت گمراہ ہو چکے ہیں کسی نے تصرف سے خواب میں اپنی حقانیت دکھادی کسی نے تصرف سے کلکتہ کی سیر کرادی' بس اسی کے پیچھے ہولیے' ایمان تک کی بھی پروانہ رہی' کلکتہ چیز ہی کیا ہے بلکہ ساری دنیا کیا چیز ہے۔

محقق سے حاصل کرنے کی اصل چیز

جو چیز محقق سے حاصل کرنے کی ہے وہ تو چیز ہی اور ہے۔ وہ چیز کیا ہے وصول الی اللہ۔ یعنی حق تعالیٰ تک پہنچنا۔ حق تعالیٰ کو پہچاننا' حق تعالیٰ کو پہچانو گے تو دنیا تو کیا اپنے آپ کو بھی بھول جاؤ گے۔ یہ چیز کسی گمراہ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ باقی کشف و کرامت اور تصرفات اور شعبدے ہر قسم کے آدمی سے ہو سکتے ہیں۔ بہت سے جوگی بہت سے مسمریزم والے بہت سے شعبدے باز ایسی چیزیں دکھلا سکتے ہیں جو سمجھ میں نہیں آسکتے۔ ان چیزوں کے لیے حق پر ہونا شرط نہیں اور وصول الی اللہ (اللہ تعالیٰ تک پہنچنے) کے لیے حق پر ہونا شرط ہے اور اسی لیے محقق کی تلاش کی ضرورت ہے۔ غرض جب ایسا محقق مل جائے تو پھر وہ جس راہ پر چلائے اسی راہ چلو' اس کے سامنے لم اور کیف اور چون و چرا نہ کرو کیونکہ وہ تم کو ایسے راہ پر لے جا رہا ہے جس کو تم نہیں جانتے پھر ایسی بات میں دخل دینا جس کو تم نہیں جانتے کیسے درست ہو سکتا ہے بلکہ اس کے ہاتھ میں ''کَالْمَیِّتِ فِیْ یَدِالْغَسَّالِ'' (مثل مردہ نہلانے والے کے ہاتھ میں ۱۲) ہو جاؤ اور جو تصرف تمہارے اندر کرے کرنے دو۔ چند روز میں ثابت ہوگا کہ اس کے تصرف سے تم کو کیا نفع پہنچا اور اس صورت کے

متعلق ایک ضروری بات یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ جس کو ایسا محقق مل گیا ہو اور تردد نہ رہا ہو اس کو ایک ہی کو اختیار کر لینا چاہیے۔ اس کو دوسری طرف نظر اٹھانا جائز نہیں۔

محقق کی اجازت سے کوئی کتاب نہ دیکھو

اسی میں متفرق کتابوں کا دیکھنا بھی داخل ہے۔ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ مختلف کتابوں کو دیکھنے میں کیا حرج ہے اگر کہیں کوئی مضمون غلط اور مضر ہوگا تو اس کی اصلاح ہم اپنے محقق سے کر لیں گے۔ میں کہتا ہوں یہ ایسا ہے جیسے انگلی آگ میں جلا لینا اس اعتماد پر کہ ہمارے پاس ایک مجرب مرہم ہے وہ لگا لیں گے اس کو کون عقلمند پسند کرے گا کہ پہلے انگلی کو جلا لو پھر مرہم لگاؤ۔ بیوقوف سے بیوقوف بھی یہی کہتا ہے کہ آگ سے بچتے رہو۔ اسی طرح یہ کون سی عقلمندی ہے کہ ایک مضر کتاب دیکھو پھر اس سے جو نقصان پہنچے اس کی اصلاح کے لیے دوسری کتاب تلاش کرو یا شیخ اور محقق کو دق کرو۔ یہی کیوں نہ کرو کہ ایسی کتاب ہی نہ دیکھو شیخ کے پاس رہ کر اور ہی بہتیرے کام ہیں وہ کرو۔ مرہم پٹی پر ایک قصہ یاد آیا کوئی سرحدی پٹھان ہندوستان آئے تھے ان کے بدن پر زخم ہو گئے، کسی نے ان کا علاج کیا اور مرہم پٹی کی وہ اچھے ہو گئے، بہت خوش ہوئے اور کہا کہ بھائی تم ہمارے یہاں آئے گا تو ہم تم کو اس کا بدلہ دے گا ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ یہ ہندوستانی اتفاقاً ان کے ملک میں پہنچے اور تلاش کرتے کرتے مکان پر بھی پہنچ گئے۔ خان ملے بہت خوش ہوئے اور کھانا کھلایا، ٹھہرایا، پھر کہا بھائی تم بیٹھے گا ہم تمہارے احسان کا بدلہ دے گا، ہم ابھی آتا ہے یہ کہہ کر خان کہیں کو گئے یہ مہمان سمجھے کوئی توڑا روپیوں کا لا کر دے گا۔ خوشی خوشی بیٹھے رہے، خان کی بیوی نے کہا ارے کمبخت کیوں تیری موت لائی ہے، چھرا لینے گیا ہے وہ تجھے زخمی کرے گا پھر ان زخموں کا علاج کرے گا جیسے تو نے زخموں کا علاج کیا تھا کیونکہ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر وہ یہاں آیا تو میں یہی کروں گا۔ یہ حضرت وہاں سے بدحواس ہو کر بھاگے اور چھپ چھپا کر اپنی جان بچا کر نکل آئے۔ یہ بری کتابوں کا دیکھنا پھر اس کی اصلاح کرنا ایسی ہی حماقت ہے جیسے اس سرحدی نے تجویز کی تھی۔ بالفرض اگر کچھ ضرر بھی نہیں ہے تو کم از کم تضیع وقت تو ہے ہی۔ محقق کے پاس رہ کر وہ کام کیجئے جو اس کے پاس رہ کر کرنے کے ہیں۔ یہ وقت پھر نہیں ملے گا دوسرے مضر یا فضول اشغال میں اپنا وقت پھر ان کی اصلاح میں اس کا وقت ضائع نہ کیجئے۔ اگر ایسا ہی کتب بینی کا شوق ہے تو اسی محقق سے پوچھ لیجئے کہ میں فلاں کتاب دیکھنا چاہتا ہوں اگر وہ اجازت دے تو دیکھئے ورنہ نہیں۔ غرض اس سے ایسا تعلق رکھئے کہ نرم گیر د سخت گیر د خوش بگیر۔ اسی طرح اس سے اپنا کوئی عیب مت چھپاؤ اور ان عیبوں کی اصلاح کے لیے جو وہ کہے وہ کرو وہ تمہارے عیبوں کی ایسی

اصلاح کردے گا جیسے صابن میلے کپڑے کی اصلاح کردیتا ہے۔ بعض لوگوں کو اپنا عیب ظاہر کرتے عار آتی ہے میں کہتا ہوں پھر اصلاح کیسے ہوگی۔ شیخ پر ظاہر کرہی دینا چاہیے۔ یہ بھی اطمینان رکھئے کہ وہ بدتہذیب نہیں ہے کہ وہ آپ کے عیبوں کو گاتا نہیں پھرے گا بلکہ دل سے اور للّٰہیت کے ساتھ ان کی اصلاح کرے گا اور بدون اس کے یعنی بلا عیبوں کو ظاہر کیے ہوئے ہرگز امید نہ رکھئے کہ اصلاح ہوسکے گی بلکہ اگر وہ تمہارے عیبوں کو دوسروں کے سامنے ظاہر بھی کردے تو سمجھ لو کہ اسی میں تمہاری مصلحت ہوگی یہ ایسا ہے جیسے ڈاکٹر کہے کہ اس مرض کا آپریشن دھوپ میں اور ہوا میں کھلی جگہ میں ہوگا تو اگر اس سے علاج کو کرنا اور صحت کا حاصل کرنا منظور ہے تو یہی کرنا پڑے گا اور حیا اور شرم کو بالائے طاق رکھنا ہوگا۔ اسی طرح شیخ کے سامنے عار کو چھوڑ دو اور اس کی ہر تجویز کو اپنے واسطے مفید سمجھو اور مکدر مت ہو جو کچھ تکلیف پہنچے وہ برداشت کرو اور اس میں اپنی رائے کو دخل دو گے اور مکدر ہو گے کہ تو نفع نہ ہوگا اور شیخ کے پاس جانا بیکار ہوگا۔

حکایت قزوینی

مثنوی میں ایک قصہ قزوینی کا لکھا ہے کسی زمانہ میں ان میں گدوانے کا رواج تھا اور لوگ جو اپنے جسم پر تصویریں بنوایا کرتے تھے۔ ایک قزوینی ایک گودنے والے کے پاس پہنچا اور فرمائش کی کہ میری کمر پر شیر کی تصویر بنادے اس نے کہا اچھا اور کمر کھول کر کام کرنا شروع کیا۔ پہلے دم کی طرف سے تصویر بنانی چاہی ایک سوئی کچ سے چبھوئی اس نے کہا یہ کیا کرتے ہو کہا شیر کی دم بناتا ہوں اس نے کہا میاں دم کو جانے دو لنڈورے شیر بھی ہوتے ہیں اس نے کہا اچھا' اب اس نے سر بنانا چاہا پھر سوئی کچ سے چبھوئی اس نے کہا اب کیا کررہے ہو کہا شیر کا سر بنارہا ہوں' کہا میاں یہ شیر سچ مچ کا تھوڑا ہی ہے یہ کیا کچھ کھائے پئے گا جو منہ اور سر بناتے ہو' منہ اور سر کو رہنے دو۔ گودنے والے نے پیٹ بنانا چاہا تو پھر سوئی چبھوئی' پھر یہ چیخ اٹھے اور کہا کیا کررہے ہو' کہا پیٹ بناتا ہوں' کہا جب اس کو کھانے پینے کی ضرورت نہیں تو پیٹ کی بھی کیا ضرورت ہے۔ غرض جب وہ گودنے والا شیر کا کوئی عضو بنانا چاہتے تو یہ چیخنے لگتے تو اس نے جھلا کر کہا کہ شیر بنوانے کو آئے ہو اور کوئی عضو بنانے نہیں دیتے تو میں کیا چیز بناؤں' شیر تو آخر چند اعضاء ہی کے مجموعے کا نام ہے جب تم کوئی عضو ہی نہیں بنانے دیتے تو پھر شیر بنوانے ہی کے کیا معنی ایسا شیر تو بھائی مجھے بنانا نہیں آتا جس کی نہ دم ہو نہ منہ ہو نہ پیٹ' ہاتھ پاؤں ہوں نہ ناک کان۔

شیر بے گوش و سر و اشکم کہ دید   ایں چنیں شیرے خدا ہم نافرید

(شیر بے دم وسر اور پیٹ کا کس نے دیکھا' ایسا شیر تو خدا نے بھی پیدا نہیں کیا)

اس پر مولانا فرماتے ہیں:

چوں نداری طاقت سوزن زدن　　پس تو از شیریاں کم دم بزن

(یعنی جب سوئی چبھنے کی تم میں طاقت نہیں ہے تو تم شیر ہونے کا دعویٰ نہ کرو)

یہی حالت ان لوگوں کی ہے جو اصلاح کرانے کا تو دم بھرتے ہیں اور جب ان کو روک ٹوک کی جاتی ہے تو مکدر ہوتے ہیں اور بات بات پر حجت کرتے ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے اس میں کیا حرج ہے حرج کو تم جانتے ہو یا تمہارا مصلح۔ اگر تم خود ہی حرج کو جانتے ہو تو پھر مصلح کے پاس کیوں آئے جب مصلح کے پاس آئے ہو تو اپنی رائے کو چھوڑ دو۔

چوں گزیدی پیرہن تسلیم شو　　ہمچو موسیٰ زیر حکم خضر رو

(جب کسی کو پیر بنالیا تو اس کی اطاعت ہر بات میں کرو' موسیٰ علیہ السلام کی طرح خضر کے زیر حکم ہو کر چلو)

ور بہر زخمے تو پر کینہ شوی　　پس کجا بے صیقل آئینہ شوی

(اگر ہر زخم پر تم پر کینہ ہو یعنی مرشد کی ہر تنبیہ پر ناک بھوں چڑھاؤ تو کس طرح قلب مثل آئینہ کے صاف ہو سکتا ہے)

خوب سمجھ لو کہ اگر قیل وقال رہے گی تو بس تم جیسے تھے ویسے ہی رہو گے اپنا وقت بھی خراب کرو گے اور مصلح کا بھی۔ دیکھو آئینہ کو کتنا رگڑا جاتا ہے تب اس میں جلا پیدا ہوتی ہے۔ چاہئے تو یہ کہ اگر وہ تمہاری رعایت کرے اور نرمی کرے تو فرمائش کرو کہ رعایت نہ کیجئے کام پورا کیجئے۔ ڈاکٹر جب آپریشن کرتا ہے تو اسی کو اچھا سمجھا جاتا ہے اور اسی کی فرمائش کی جاتی ہے کہ پورا کام ہو جائے کچھ کسر باقی نہ رہ جائے۔ اسی طرح روحانی آپریشن کو سمجھ لو اس میں بھی یہی فرمائش ہونا چاہیے کہ پورا کام ہو رعایت اور نرمی نہ کی جائے۔ خیر اگر یہ فرمائش بھی نہ ہو تو کم سے کم یہ تو ہونا چاہیے کہ اس کے مجوزہ تصرفات پر راضی رہیں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ محقق مصلح بالکل باپ ہے اور بالکل ماں ہے۔ یعنی ماں ہے شفقت میں اور باپ ہے عقل میں۔ ماں ہر وقت ایسی فکر میں رہتی ہے کہ میرا بچہ تندرست رہے' موٹا تازہ رہے اور جلدی جلدی بڑا ہو جائے اور باپ یہ چاہتا ہے کہ بچہ علم و ہنر سیکھے' ترقی کرے۔ اسی طرح مصلح ماں کی طرح ہر وقت یہ چاہتا ہے کہ طالب کو فائدہ پہنچے اور باپ کی طرح ہر وقت یہ چاہتا ہے کہ طالب کی اصلاح ہو جائے نفس و شیطان سے بچا رہے اور آخرت کی ترقی حاصل کرے' پھر ایسے ہمدرد کا کہنا ماننا چاہیے یا

مخالفت کرنا چاہیے۔ اس سے تو کسی قسم کا خطرہ نہیں رکھنا چاہیے وہ جو کچھ کہے گا ہمدردی سے کہے گا۔ غرض محقق پیر مل جائے تو غنیمت سمجھو اور اس کی صحبت کو اکسیر اعظم سمجھو اور اپنے آپ کو عمر بھر کے لیے اس کے سپرد کردو اور اس سے کسی امر میں قیل وقال مت کرو اور اس کے کسی فعل میں بدگمانی بھی نہ کرو۔ بہت سے افعال اس کے ایسے ہوں گے جو تمہاری سمجھ میں نہ آئیں گے اس وقت جلدی مت کرو بلکہ دیکھتے رہو بعد میں اس کا راز کھل جائے گا۔ ہاں اگر کوئی امر خلاف شریعت کرے تو اور بات ہے لیکن اس میں بھی جلدی نہ کرو حتی الامکان محل صحیح پر اس کو محمول کرو۔ اگر سمجھ میں نہ آئے تو چندے انتظار کرو ہاں اگر بار بار خلاف شریعت اس سے صادر ہو اور کوئی تاویل بھی نہ ہو سکے تو اس سے علیحدہ ہو جاؤ یعنی اس پیر کو چھوڑ دو مگر اس صورت میں بھی اسکے ساتھ گستاخی نہ کرو۔ یہ ہیں آداب شیخ اور اس طریق میں ادب بھی ایک چیز ہے بلا اسکے ایک قدم چلنا ناممکن ہے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ کسی کو محقق پیر مل جائے اور تردد نہ رہے مگر ایک آزاد جماعت وہ بھی ہے جو سمجھتے ہیں کہ کس کا اتباع کریں' محقق ملتا ہی نہیں۔

علماء میں اختلاف کی مثال طبیبوں کی سی ہے

یہ شکایت آج کل اکثر زبانوں پر ہے کہ ہم کس کی پیروی کریں' علماء اور مشائخ میں خود اختلاف ہے کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ اور بعض لوگ تو اس کے متعلق بہت ہی دریدہ دہن ہیں اور جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہیں کہ سب کو چھوڑ و' اس غم ہی کو مت پالو۔ ان حضرات سے میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اختلاف کس چیز میں نہیں ہے دنیا کی کوئی چیز بھی اختلاف سے خالی نہیں' معاملہ علاج ہی کو لے لیجئے کہ جس ڈاکٹر کے پاس جاؤ جس حکیم کے پاس جاؤ اس کی تشخیص الگ' تجویز الگ' دوائیں الگ بلکہ خود طبیعتیں بھی الگ الگ ہیں۔ فروع تو فروع اصول بھی الگ الگ ہیں۔ کسی طب میں علاج بالضد ہے۔ کسی میں علاج بالمثل ہے۔ غرض اتنا اختلاف ہے کہ خدا کی پناہ' مگر ہم کسی کو نہیں دیکھتے کہ اس اختلاف سے یہ نتیجہ نکالے کہ ڈاکٹروں اور طبیبوں کو مطلقاً چھوڑ دے اور بیماری میں علاج نہ کرے بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ ذرا سی پھانس بھی لگ جائے یا خفیف سا زکام بھی ہو جائے تو ڈاکٹر اور حکیم کی تلاش ہوتی ہے اور اختلاف اطباء سے متاثر نہیں ہوتے اور یہ نہیں کرتے کہ کسی کا علاج بھی نہ کریں خود کو اپنے ہی حال پر چھوڑے رکھیں بلکہ ڈاکٹر اور طبیب کو ڈھونڈتے ہیں اور یہ کام بھی کسی اناڑی اور عطائی سے نہیں لیتے بلکہ اس کے لیے بھی ہوشیار اور کار کردہ معالج کو تلاش کرتے ہیں اور کوئی نہ کوئی مل جاتا ہے۔ ایک پھانس کے لگ جانے میں تو یہ

حالت ہوتی ہے اور دین کے بارے میں یہ حکم لگا دیا کہ چونکہ علماء میں اختلاف ہے لہٰذا سب کو چھوڑ دو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک دین اتنا بھی مہتم بالشان نہیں جتنی ایک پھانس کا لگنا مگر ان لوگوں کو چھوڑیئے اس وقت ان سے خطاب نہیں ان کی نسبت تو بس یہ کہنا کافی ہے؎

فسوف تریٰ اذا انکشف الغبار افرس تحت رجلک ام حمار

(جب غبار ہٹ جائے گا عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے پر)

آنکھ بند ہوتے ہی معلوم ہو جائے گا کہ تمام عمر کس خبط میں گزر گئی جس کا اب کچھ تدارک نہیں ہو سکتا۔ اس وقت خطاب ان لوگوں سے ہے جو دین کی پروا رکھتے ہیں اور محقق مصلح کی تلاش بھی کرتے ہیں مگر طریقہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے ان کا تردد رفع نہیں ہوتا ایسے لوگوں کو میں مقصد کے پانے کا طریقہ مکرر بتاتا ہوں اور وہ وہی ہے جو اوپر قریب ہی بیان کر چکا ہوں کہ چند جگہ کا انتخاب کرو کیونکہ دنیا خالی نہیں نہ کبھی خالی ہوگی۔ پھر تھوڑا وقت اور تھوڑا پیسہ خرچ کرو اور ہر ہر جگہ ایک ایک ہفتہ رہو مگر یہ شرط ہے کہ خالی الذہن ہو کر رہو نہ کسی کے معتقد ہو نہ مخالف اور وہاں کی ہر ہر حالت میں غور کرتے رہو۔ دن بھر وہاں کے حالات دیکھو اور باتیں سنو اور رات کو غور کرو اور سوچو۔ اگر طلب صادق ہے تو حق واضح ہو جائے گا اور صاف معلوم ہو جائے گا کہ کہاں مصری ہے کہاں تنکے۔ کہیں تصنع اور بناوٹ ملے گی کہیں جعلسازی اور فریب ہوگا۔ کہیں پیران نمی پرند و مریدان می پرانند (پیر نہیں اڑتے مرید اڑا رہے ہیں) کا ظہور ہوگا مگر کہیں سچی اور کھری بات بھی ہوگی۔ اگر طلب میں خلوص ہے تو کھرے کھوٹے میں تمیز کر لینا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ اس طریق سے کوشش کرو اور حق تعالیٰ سے دعا بھی کرتے رہو صرف اپنی کوشش پر بھروسہ نہ کرو۔ ہدایت حق تعالیٰ کے کرم پر موقوف ہے اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ عجز و نیاز ہی ہے۔ دعاء کا مغز یہی عجز و نیاز ہے کوئی اپنے علم و فہم و ذہانت سے ہدایت نہیں پاتا ہے بڑے بڑے عقلاء گمراہ ہو چکے ہیں اور اب بھی موجود ہیں۔ ہدایت جس کو ہوئی ہے حق تعالیٰ کے فضل ہی سے ہوئی ہے۔ اس واسطے کوشش کے ساتھ عجز و نیاز و دعاء کی بھی سخت ضرورت ہے۔ یہ طریقہ ہے حق کے حاصل کرنے کا اس سے ضرور حق مل جاتا ہے۔ یہاں تک کہ الحمدللہ اکثر طبقات کی اصلاح کے طریقے بیان میں آ گئے۔

ناخواندہ لوگوں کی اصلاح کا آسان نصاب

اب صرف ایک فرقہ رہ گیا جن کو نہ علم ہے نہ فرصت ہے نہ ہمت اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا سے زیادہ ضروری دین ہے جس کو ہر مسلمان مانتا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ دنیا کے لیے علم بھی حاصل کر لیا جائے اور فرصت بھی نکال لی جائے اور ہمت بھی پیدا ہو جائے اور دین کے لیے کچھ

بھی نہ ہو سکے مگر خیر میں کسی درجہ میں ان کے ان عذروں کو قبول ہی کیے لیتا ہوں اور ان کے لیے بھی طریقہ اصلاح قلب کا بتاتا ہوں وہ یہ ہے کہ کسی اہل علم سے ایک نصاب تجویز کرالیا جائے جس میں ضروریات دین ہوں اور تمام اجزاء دین کا بیان ہو عقائد کا بھی اور عبادات کا بھی اور معاملات کا بھی اور معاشرات کا بھی اور اخلاق کا بھی مگر عام فہم اور سلیس ہو علمی نکات اور دقیق باتیں اس میں نہ ہوں۔ پھر یہ ناخواندہ لوگ اس کو سنا کریں اور سننا بھی روزمرہ نہیں صرف ہفتہ میں ایک بار اس طرح کہ سب لوگ جمع ہو جایا کریں اور گھنٹہ آدھا گھنٹہ کوئی پڑھ کر سنا دیا کرے اور سنانے کے لیے یا تو ایک آدمی مستقل رکھ لیا جائے جس کے لیے بڑی تنخواہ کی ضرورت نہیں۔ پانچ، سات روپیہ میں ایسا آدمی مل سکتا ہے جو معمولی اردو پڑھ سکے وہ کافی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کھاتے پیتے لوگ اپنے گھر طبیب کو نوکر رکھتے ہیں تاکہ کنبہ کے بچوں کی اور محلّہ کی بلکہ قصبہ کی صحت کی نگرانی رکھے، یہ جسمانی طبیب ہے۔ اسی طرح محلّہ میں یا قصبہ میں ایک روحانی طبیب بھی رہے جو اصلاح دین کرتا رہے تو کیا حرج بلکہ روحانی طبیب کی ضرورت تو جسمانی طبیب سے بھی زیادہ ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ اگر پانچ سات روپیہ بھی نہیں جمع ہو سکتے اور مستقل آدمی اس کام کے لیے نہیں رکھ سکتے تو مسجد کے امام ہی کے ذمہ یہ خدمت کردو کہ ہفتہ میں ایک دن وہ تجویز کرو کہ تمہیں سنایا کریں اور تم سب لوگ بیٹھ کر سنا کرو اور وقت بھی اگر دن کا نہ ملے تو رات کو سہی بعد نماز عشاء فرصت کا وقت ہوتا ہے۔ ہفتہ میں ایک دن یہ وقت بجائے حقے بجانے کے دین کے کام میں صرف کرو۔ ہاں اتنا اور کہتا ہوں کہ جو کتاب سنائی جائے اس میں ترغیب و ترہیب بھی ہو یعنی نیک اعمال پر ثواب کا بیان اور گناہوں پر عذاب کا بیان ہو اس کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ یہ وہ تدبیر ہے جس سے کوئی امی آدمی بھی ناواقف نہیں رہ سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دین کا خیال ہو دنیا کے لیے کیا کیا محنتیں اٹھائی جاتی ہیں دین کے لیے کچھ تو کرنا چاہیے اس سے زیادہ کیا سہولت ہو سکتی ہے کہ ہفتہ میں ایک دن تھوڑا سا وقت نکال لیا جائے۔ رہیں عورتیں تو ان کے لیے اور بھی سہولت ہے وہ یہ کہ جو باتیں مرد باہر سنیں وہ گھر میں جا کر عورتوں کو سنا دیا کریں نہ اس میں ڈولی کا خرچ ہے نہ کسی گھر بار کے کام کا حرج ہے۔ گھر میں وہ باتیں سناتے وقت بچوں کو بھی بٹھا لینا چاہیے، بچوں کے کان میں جو بات پڑتی ہے وہ پتھر کی لکیر ہو جاتی ہے البتہ اس کے ساتھ ذرا سی نگرانی کی بھی ضرورت ہے وہ یہ کہ اس کا خیال رکھا جائے کہ گھر والے جو کچھ سنتے ہیں اس پر عمل بھی کرتے ہیں یا نہیں تو خود بھی عمل کرو اور گھر والوں سے بھی عمل کراؤ۔

یہ طریقے ہیں اصلاح کے واللہ اگر مسلمان چاہیں اور ان کو دین کا خیال ہو تو دین اس سہولت سے حاصل ہو سکتا ہے کہ دنیا کا کوئی کام بھی اس سہولت سے پورا نہیں ہو سکتا۔ اس سہولت کا خلاصہ یہ ہے کہ مرد ہفتہ میں ایک دن جمع ہو کر دین کی کتابیں سنیں اور گھر جا کر عورتوں کو سنائیں کوئی مسئلہ پیش آئے تو علماء سے پوچھ لیں۔ اگر یہاں حل نہ ہو تو ڈاک کا راستہ کھلا ہوا ہے جہاں سے چاہیں ایک ہفتہ کے اندر جواب منگوا سکتے ہیں گھر بیٹھے مولوی بن سکتے ہیں اور جبکہ کچھ کرنا ہی نہ چاہیں اور دین کی ضرورت ہی ذہن میں نہ ہو تو پھر دنیا میں اس کا کچھ علاج نہیں۔ اس کا علاج تو بس آنکھ بند ہونے کے بعد ہوگا۔

ہمت فعل اختیاری ہے

یہاں تک تو علم کے حصول کی تدبیریں بیان کی گئیں دوسری چیز تھی ہمت سو وہ فعل اختیاری ہے اس میں اختیار کے صرف کرنے کی ضرورت ہے کسی خاص تدبیر کی ضرورت نہیں جیسے کھانا کھانا کہ سامنے کھانا رکھوا رادہ کرو ہاتھ سے لقمہ اٹھاؤ منہ میں رکھو دانتوں سے چباؤ اور نگل جاؤ' پیٹ بھر جائے گا۔ اس میں کسی مستقل تدبیر کی کیا ضرورت۔ البتہ اگر قوت اختیار یہ ہی کو صرف نہ کرو' کھانا اگرچہ سامنے رکھا رہے مگر پیٹ میں ہرگز نہ جائے گا اور نہ پیٹ بھرے گا۔ غرض ہمت کی روح صرف قصد ہی جو تدبیر سے مستغنی ہے مگر میں تبرعاً اس میں بھی سہولت کے طریقہ بتائے دیتا ہوں جس سے وہ سہولت اور مزید سہولت ہو جائے۔

حصول ہمت کی آسان تدبیر نیک صحبت ہے

سوایک طریقہ تو ہمت کے حاصل ہونے کا صحبت ہے یعنی کسی کے پاس رہنا یہ عجیب چیز ہے کیسا ہی کم ہمت آدمی ہو لیکن جس فن کے آدمی کے پاس بیٹھے اس سے اس فن کی رغبت اور اس سے مناسبت اور ہمت عادۃً پیدا ہو ہی جاتی ہے اچھے آدمی کے پاس بیٹھے تو اچھی باتوں کی رغبت اور ہمت پیدا ہو جاتی ہے اور برے آدمی کے پاس بیٹھے تو برائیوں کی رغبت اور ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر آدمی عقل مندوں میں رہے تو عقلمندی آ جاتی ہے' بیوقوفوں میں رہے تو بیوقوف ہو جاتا ہے' عورتوں میں رہے تو زنانہ پن آ جاتا ہے' سپاہیوں میں رہے تو مردانگی اور جرأت پیدا ہوتی ہے۔ اپاہجوں میں رہے تو احدی پن پیدا ہوتا ہے۔ غرض صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے بس جس میں ہمت نہ ہو دین کے حاصل کرنے کی اس کو چاہیے کہ دینداروں کی صحبت اختیار کرے اور کچھ دیر کو ان کے پاس جا بیٹھا کرے' ہمت پیدا ہو جائے گی۔ یہ تدبیر ہے ہمت پیدا ہونے کی۔

وظیفہ ہمت کی تدبیر نہیں

اب لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ پوچھتے ہیں کہ کوئی ایسا وظیفہ بتادو جس سے نماز کی اور دین کی ہمت پیدا ہو جائے۔ صاحبو! ہر کام کا ایک طریقہ ہوتا ہے ہمت پیدا کرنے کا طریقہ وظیفے پڑھنا نہیں ہے بلکہ اس کا طریقہ صحبت اختیار کرنا ہے۔ اس پر بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اللہ کے نام میں بڑا اثر ہے کیا تم اللہ کے نام میں اثر ہونے کے قائل نہیں۔ پس وظیفوں سے کیوں ہمت پیدا نہ ہوگی۔ میں کہتا ہوں تم اللہ کے نام میں بے سمجھے بڑا اثر ہونے کے قائل ہو تو کھانا مت کھاؤ، کوئی وظیفہ پڑھ لیا کرو، پیٹ بھر جایا کرے گا۔ بات یہ ہے کہ افعال اختیاریہ میں بلاقوت اختیاریہ صرف کیے کام نہیں ہوتا اور قوت اختیاریہ صرف کرنے کا ارادہ پیدا ہونے میں آسانی ہونے کا مؤثر ذریعہ صحبت ہے۔ باقی ذکر اور وظیفے بھی اس میں معین ہو جاتے ہیں لیکن ہر چیز کا ایک درجہ ہوتا ہے ذکر کا صحبت کے ساتھ وہی درجہ ہے جو مادہ کا مسہل کے ساتھ، بعضے مرض کا علاج یا وہ کہ تنقیہ سے ہوتا ہے اس لیے مسہل دیا جاتا ہے۔ مثلاً سنا یا املتاس وغیرہ پلایا جاتا ہے لیکن اگر کبھی مسہل کا پوری طرح عمل نہیں ہوتا تو تکمیل عمل کے لیے مدد دی جاتی ہے مثلاً عرق بادیان پلایا جاتا ہے تو مسہل کو اور مدد کو دونوں کو تنقیہ مادہ میں من وجہ دخل ہے لیکن ان دونوں میں اصل مسہل ہے اور مدد معین کے درجہ میں ہے تو اگر کوئی مسہل تو پئے لیکن اس کی مدد کے لیے عرق بادیان وغیرہ نہ پئے تو اس کا کام تو جیسے تیسے چل ہی جائے گا اور مادہ کا تنقیہ ہو جائے گا گو دیر میں ہو لیکن اگر کوئی صرف مادہ کی چیز یعنی عرق بادیان وغیرہ تو پی لے اور املتاس یا سنا وغیرہ جو اصل مسہل ہے وہ نہ پئے تو پھر کچھ بھی کام نہ چلے گا۔

ذکر اللہ ہمت کا معین ہے

اسی طرح اصلاح کے لیے اصل چیز ہمت اور قصد ہے اور ہمت پیدا ہونے کے لیے ذریعہ سہولت کا صحبت ہے اور اس کے ساتھ تھوڑا ذکر بھی بطور مدد ہو تو مفید ہے لیکن محض ذکر کافی نہیں اس وقت ذکر کے متعلق عام غلطی شائع ہو رہی ہے اور بعض مشائخ بھی اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ اس میں افراط و تفریط ہو رہی ہے۔ بعض تو ذکر کو بالکل بے سود سمجھتے ہیں اور طالبین کو صرف مجاہدوں میں ڈال دیتے ہیں اور ایسی ایسی محنتیں لیتے ہیں کہ صحت خراب ہو جاتی ہے اور دماغ بیکار ہو جاتا ہے، حقوق ضائع ہوتے ہیں پھر طالب پریشان ہو کر سب کام چھوڑ کر بیٹھ رہتا ہے اور بعض لوگ ذکر ہی کو کافی سمجھتے ہیں اور وظیفہ ہی وظیفہ بتائے جاتے ہیں، مدتیں گزر جاتی ہیں اور ان کو کچھ بھی نفع نہیں

ہوتا۔ بات وہی ہے کہ اصل چیز قصد و ہمت ہے اور اس کا موثر ذریعہ صحبت ہے اور ذکر معین ہے اور لوگوں نے وظیفوں کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ جو آتا ہے وظیفے ہی پوچھنے آتا ہے نہ نماز کی تصحیح کی ضرورت سمجھتے ہیں نہ زکوٰۃ کے مسائل معلوم کرنے کی نہ اصلاح معاملات کی اور معاشرت کو تو آجکل دین سے خارج ہی مان لیا گیا ہے۔ غرض شریعت کے علم و عمل کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی' بس بڑی دوڑ یہ ہے کہ وظیفے پڑھا کرو۔ ایک مہمان میرے یہاں تشریف لائے ہاتھ میں ہر وقت تسبیح چلتی رہتی تھی۔ آپ نے جماعت کی نماز پڑھی قعدہ اولیٰ کے بعد امام کھڑا ہوا تو وہ نہ اٹھے سب کو تعجب ہوا' بعد سلام کے پوچھا یہ آپ نے کیا کیا' کہنے لگے میں مسافر ہوں قصر نماز پڑھی ہے۔ بہت افسوس ہوا ان کی جہالت پر۔ میں نے کہا ارے ظالم اس تسبیح کو تو طاق میں رکھ اور میرا بہشتی زیور ہاتھ میں لے اور اپنے ارکان اسلام کو درست کر اس کے بعد تسبیح اٹھانا' یہ حالت ہو رہی ہے۔ اگر مشائخ کی تعریف کی جاتی ہے تو یہی کہ فلاں صاحب کسی سے بات تک بھی نہیں کرتے ہر وقت تسبیح ہی گھماتے رہتے ہیں اور جہاں یہ نہیں ہے بلکہ مہمانوں سے بات چیت کرنا ہی طالب علموں کو پڑھانا ہی گھر والوں سے ملنا جلنا ہے اور ان کے دین کی نگرانی کرنا ہے تو ان کو کہا جاتا ہے تو دنیادار ہیں اللہ والے نہیں ہیں' اللہ والے کو غیر اللہ سے کیا علاقہ۔

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

صاحبو! سب سے بڑے اللہ والے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح اٹھا کر دیکھو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاغل کیا تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی بیبیاں تھیں' کتنے مکان تھے' کتنے خادم تھے' کتنے سواری کے جانور تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بس تسبیح کے لیے مسجد ہی میں بیٹھے رہتے تھے یا لوگوں سے ملتے جلتے بات چیت بھی کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو مسلمانوں سے کیا کفار سے بھی بات چیت کرتے تھے۔ گھر میں بھی رہتے تھے وعظ و تلقین بھی فرماتے تھے' لوگوں کے مکانوں پر بھی جاتے تھے' مریضوں کی عیادت کرتے' جنازوں کی نماز پڑھتے' دفن میں شرکت فرماتے تھے' کیا یہ سب کام دنیا داری کے ہیں۔ خیر یہ تو جہالت کی باتیں ہیں کہ ہر وقت تسبیح گھماتے رہنا ہی کمال ہے اور بلا اس کے کمال ہوتا ہی نہیں۔ صاحبو! کمال ہوتا ہے اتباع شریعت سے ہر حالت میں بولنے میں چالنے میں' کھانے میں' پینے میں' لینے میں' دینے میں' ملنے میں' چلنے میں اور یہ سب باتیں جبھی حاصل ہو سکتی ہیں جب شریعت کا علم ہو تو علم مقدم ہوا تسبیح گھمانے اور وظیفہ گھونٹنے پر۔ اسی بناء پر میں نے ان مہمان صاحب سے کہا

کہ جو تسبیح ہر وقت تمہارے ہاتھ میں رہتی ہے اس کی ضرورت نہیں' نماز درست کرو' اس کے مسئلے پڑھو یا پوچھو۔ غرض آج کل بعض لوگ اس مذاق کے ہیں کہ ذکر اور وظیفوں ہی کو کافی سمجھتے ہیں اور بعضے اس مذاق کے ہیں کہ ذکر اور وظیفوں کو بیکار سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ اصل چیز علم اور ہمت ہے اور ذکر اس کا معین ہے اس نفع کے لیے ضرور کرنا چاہیے ذکر سے قلب میں نورانیت پیدا ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے: "اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ"[1] یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس شخص کا ہم نشین ہوں جو میرا ذکر کرتا ہے اس سے زیادہ کیا فضیلت ہوسکتی ہے کہ ذکر سے حق تعالیٰ کے ساتھ ہم نشینی حاصل ہوتی ہے۔ اب شاید کوئی کہہ دے کہ جب ذکر سے صحبت مع اللہ حاصل ہوتی ہے تو اور کس چیز کی ضرورت رہی پھر وہی بات لوٹ آئی کہ اصل چیز ذکر ہے اور اللہ کی مصاحبت حاصل ہونے کے بعد اور کسی کی صحبت کی ضرورت کیا رہی۔ بات یہ ہے کہ ایک چیز بے قاعدہ ہوتی ہے اور ایک باقاعدہ صرف ذکر سے صحبت مع اللہ ضرور حاصل ہوگی مگر بے قاعدہ اور کسی محقق کی صحبت میں رہنے سے بھی مصاحبت مع اللہ حاصل ہوگی اور باقاعدہ اور یہ وہ ذکر ہوگا جس سے مصاحبت مع اللہ صحیح معنوں میں حاصل ہوگی۔

قرب کی دو قسمیں

اس کی مثال سمجھو کہ ایک بادشاہ ہے اس سے قرب کا ہر شخص متمنی ہے اور اس کا قرب بہت سے منافع کو مشتمل ہوتا ہے لیکن قرب دو طرح کا ہوتا ہے ایک باقاعدہ اور ایک بے قاعدہ۔ باقاعدہ تو وہ ہے جو ان لوگوں کو حاصل ہے جن سے بادشاہ راضی ہے یہ تو مفید ہے یہ قرب وہ ہے جس کے لیے قرب صوری کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ اس شخص کو بھی حاصل ہے جو بادشاہ سے منزلوں دور رہتا ہے۔ مثلاً ایک عامل ہے جو بادشاہ کی طرف سے کسی علاقہ پر مامور ہے اور خیر خواہ اور کارگزار ہے اور بادشاہ اس سے راضی ہے ان کو گو قرب صوری حاصل نہیں مگر قرب معنوی حاصل ہے' دور بیٹھے ہی بادشاہ اس کو انعامات اور تمغے اور خطابات عطا کرتا ہے اگر اس شخص کو قرب معنوی کے ساتھ قرب صوری بھی حاصل ہوجائے تو کیا کہنے ہیں مثلاً بادشاہ ان کو دربار میں حاضری کی اجازت دے کسی تقریب میں بلائے تو کیا لطف ہوگا سلامی دی جائے گی اور فوج سے استقبال کرایا جائے گا اور کیا کیا ہوگا۔ یہ قرب تو باقاعدہ ہوا اور دور بیٹھے بھی حاصل ہے اور اس کے ساتھ قرب صوری بھی حاصل ہوجائے تو سونے پر سہاگہ کہنا چاہیے اور ایک قرب بے قاعدہ ہے وہ وہ ہے جس میں رضا بادشاہ کی حاصل نہیں اور اس میں پھر دو

---

[1] (اتحاف السادۃ المتقین ۶: ۲۸۷)

صورتیں ہیں ایک یہ کہ رضا تو حاصل نہیں مگر سخط یعنی غصہ بھی نہیں اور ایک یہ کہ رضا نہ ہونے کے ساتھ غصہ اور عتاب بھی ہے اول کی مثال وہ تماشائی ہیں جو مثلاً بادشاہ کی سواری نکلنے کے وقت راستوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ وہ بھی بادشاہ سے قریب ہیں مگر نہ ان پر بادشاہ کی کوئی عنایت ہے نہ ناراضی ہے۔ قرب ان کو بھی حاصل ہے مگر یہ ایسا قرب ہے کہ وہ مفید ہے نہ مضر اور دوسری قرب کی مثال وہ قرب ہے جو ایک مجرم کو حاصل ہے جو مشکیں بندھا ہوا بادشاہ کے سامنے کھڑا ہے وہ بہت ہی قریب ہے اور عجب نہیں کہ سب سے زیادہ قرب اسی کو حاصل ہو مگر قرب کس کام کا جس کے ساتھ موت کو بھی قرب ہے خدا بچائے ایسے قرب سے۔ یہ تینوں قسم کے قرب قرب ہی کے تو افراد ہیں مگر مطلوب قرب وہی ہے جو اس عامل کو حاصل ہے اور درمیانی قرب بھی غنیمت ہے مگر اخیر کا قرب تو پناہ مانگنے کی چیز ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرب جو رضا کے ساتھ ہو وہی حقیقی قرب ہے اور وہ مفید ہے اور جو قرب ناراضی کے ساتھ ہو وہ حقیقت میں قرب ہی نہیں ہے بلکہ بعد ہے اور ڈرنے کی چیز ہے۔ اب سمجھ لیجئے کہ رضا الٰہی کا ہے سے حاصل ہوتی ہے صرف اعمال سے جب اعمال برے ہیں تو رضا حاصل نہیں پھر اگر قرب ہوا بھی تو وہ قرب باقاعدہ نہ ہوگا بلکہ بے قاعدہ ہوگا۔ پس میں مانتا ہوں کہ ذکر سے مصاحبت مع اللہ حاصل ہوتی ہے لیکن جب اعمال درست نہیں تو یہ مصاحبت چنداں مفید نہیں کیونکہ اعمال درست نہ ہونے کی وجہ سے رضا جو حاصل نہیں اور بلا رضا کے قرب کا حاصل میں بتا چکا ہوں کہ وہ ہے جو مجرم کو بھی حاصل ہے ہاں اعمال درست ہوں اور اس کے ساتھ ذکر بھی ہو تو قلب میں نورانیت پیدا ہوتی ہے اور اس سے جو قرب ہوتا ہے وہ قرب حقیقی ہے اسی کو میں نے قرب باقاعدہ کہا ہے اور اعمال کی درستی میں بڑا دخل ہے نیک صحبت کو اسی واسطے کہا ہے:

ہر کہ خواہد ہم نشینی باخدا ۔ گو نشیند در حضور اولیاء

(جو شخص خدا کی ہم نشینی کا طالب ہو اس سے کہو کہ اولیاء اللہ کے پاس بیٹھا کرے)

اور کہا ہے

صحبت نیکاں اگر یک ساعت است ۔ بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است

(نیکوں کی صحبت اگر ایک گھڑی بھی میسر ہو جائے تو سو سالہ زہد و طاعت سے بہتر ہے)

اور کہا ہے

صحبت صالح ترا صالح کند ۔ صحبت طالح ترا طالح کند

(نیک لوگوں کی صحبت تم کو نیک بنا دے گی اور بدوں کی صحبت تم کو بد کر دے گی)

اس شعر میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی نیک صحبت کے اثر کا بیان بھی ہے اور بدصحبت کے اثر کا بھی اس کا بہت اہتمام رکھنا چاہیے کہ صحبت اچھی ہے یا بری کیونکہ آج کل اچھوں کی صورت میں راہزن بہت ہے جو خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں اور یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اگر کہیں بری صحبت میں غلطی سے جا پھنسے تو اس کو چھوڑ دینا چاہیے مگر چھوڑنا چاہیے لطافت کے ساتھ دل شکنی نہیں کرنی چاہیے۔ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ہے کفار کے چھوڑنے کا مگر کس طرح "وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا" یعنی ان کو چھوڑ دیجئے خوبی کے ساتھ یہ معاملہ کفار کے ساتھ ہے اس سے سبق لینا چاہیے کہ مسلمان کو اگر چھوڑنا ہو تو کس طرح چھوڑنا چاہیے۔ بس نہایت نرم الفاظ میں عذر کردے کہ میں اب آپ سے تعلق نہیں رکھنا چاہتا اور اس کے ساتھ کسی قسم کی بے ادبی نہ کرے اور ایذا نہ دے یہ حق ہے صحبت کا اور صحبت نیک کی تاثیر اور ضرورت کے متعلق ایک نکتہ سمجھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ ہمیشہ سے قانون قدرت اور عادت الٰہی یہی رہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھیجا اور صحیفے اور کتابیں نازل فرمائیں جن سے گمراہوں کو ہدایت ہوئی اور حق و باطل میں امتیاز ہو گیا۔ حالانکہ ایک صورت یہ بھی تو ہو سکتی تھی کہ صرف صحیفے اور کتابیں اتار دی جاتیں ان میں احکام ہوتے ان پر لوگ عمل کرتے اور ارشادات خداوندی کا امتثال ہو جاتا مگر ایسا کبھی نہیں ہوا بلکہ صحیفے اور کتابیں اتارنے کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کو بھی مبعوث فرمایا اس میں کونسی بات بڑھ گئی وہی ایک چیز بڑھ گئی جس کا نام صحبت ہے۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ صحبت موقوف علیہ ہے اصلاح کے لیے اسی معنی کو مولانا کہتے ہیں:

بے عنایات حق و خاصان حق — اندریں رہ کے تواں بردن سبق

(خدا تعالیٰ اور خاصان خدا کے بغیر عنایت کے اس راہ سلوک میں نہیں سبقت لے جا سکتے)

توجہ کی حقیقت

بمعنی توجہ و تعلیم ہے جو حاصل ہے صحبت کا۔ اس توجہ کے لفظ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ توجہ کے متعلق کچھ ضروری بیان کیا جائے اور یہ لفظ توجہ اہل طریق میں بہت مستعمل ہے اور اس کو آج کل بڑا کمال سمجھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں فلاں ایسے بزرگ ہیں کہ ایک نظر جس پر ڈال دی وہ مسخر ہو گیا بلکہ ولی کامل ہو گیا اور اکثر طالبین اسی توجہ کی درخواست کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے مجھ سے نماز نہیں پڑھی جاتی ایسی توجہ ڈالئے کہ میں پکا نمازی ہو جاؤں۔ کوئی کہتا ہے مجھ سے بدنظری کا مرض نہیں چھوٹتا۔ ایسی توجہ کیجئے کہ میری نظر بے موقع اٹھ ہی نہ سکے اور معلوم نہیں کیا کیا اسی قسم

کی درخواستیں ہوتی ہیں۔ حاصل ان سب کا یہ ہے کہ خود کچھ کرنا نہ پڑے سب کرنا کرانا پیر صاحب ہی کے ذمہ ہے۔ صاحبو! کوئی یہ درخواست نہیں کرتا کہ ایسی توجہ کیجئے کہ بلا کھائے پیٹ بھر جایا کرے یا بلا نکاح اولاد ہوجایا کرے۔ جب پیر صاحب کی توجہ سے سب کچھ ہوسکتا ہے تو بلا کھائے پیٹ بھی بھر سکتا ہے اور بلا نکاح اولاد بھی ہوسکتی ہے پھر یہ درخواست کیوں نہیں کی جاتی۔ بات یہ ہے کہ پیٹ بھرنے کی اور اولاد کے ہونے کی ضرورت اور وقعت تو قلب میں ہے لہٰذا ان کے لیے ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے اور کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا اور اصلاح قلب اور نماز روزہ وغیرہ اور اجتناب عن المعاصی کی ضرورت اور وقعت ہی قلب میں نہیں ہے لہٰذا یہ حیلے بہانے تراشے جاتے ہیں اور اگر کسی نے ذرا سا سہارا دے دیا کہ ہاں دعا کریں گے یا توجہ کریں گے تو بس خوئے بدرا بہانہ بسیار اس امید دلانے پر اطمینان ہوگیا اور فراغت ہوگئی کہ بس سب کچھ آپ سے آپ ہو رہے گا۔ صاحبو! اگر توجہ متعارف سے اصلاح ہوجایا کرتی تو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کون اس کام کو کرسکتا تھا اور ان سے زیادہ کون شفیق ہوسکتا تھا مگر ان حضرات نے کبھی اس سے کام نہیں لیا' مصیبتیں اٹھائیں جہاد کیے' برے برے الفاظ سنے مگر یہ نہیں کیا کہ توجہ ڈال کر سب کے قلوب مسخر کرلیتے اور سب کا تزکیہ ہوجاتا۔

حالانکہ اس سے یہ فائدہ ہوتا کہ ان حضرات کو بھی سہولت ہوتی مصیبتیں نہ اٹھانا پڑتیں اور طالبین کو تو بہت ہی آسانی ہوتی کہ کچھ کرنا ہی نہ پڑتا۔ آپ غور کرسکتے ہیں کہ کوئی بات تو ہے جو ایسا نہیں کیا اور وہ حضرات کیا کرتے حق تعالیٰ ہی نے ان کے واسطے اس کو تجویز نہیں کیا کیونکہ وہ اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کرتے تھے بس وہی کرتے تھے جو وحی کے ذریعے سے ان کو امر کیا جاتا تھا۔ اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ توجہ بالمعنی المتعارف غیر سنت ہے اس لیے میں نے شعر مذکور (یعنی بے عنایات حق و خاصان حق) میں عنایت کی جو تفسیر توجہ و تعلیم کے ساتھ کی ہے اس توجہ کو معنی متعارف پر محمول نہ کیجئے گا بلکہ التفات اور دلسوزی کے معنی لیجئے اور یہ التفات اور دلسوزی عادتاً بھی جبھی ہوتی جب کہ ان کے پاس رہا جائے اسی لیے میں نے اس کا حاصل صحبت کو بتلایا۔ یہاں کوئی توجہ کے متعلق یہ شبہ نہ کرے کہ توجہ بالمعنی المتعارف کامل تو بہت سے بزرگوں سے منقول ہے اور میں نے اس کو غیر سنت کہہ دیا۔ بات یہ ہے کہ توجہ بالمعنی متعارف (یعنی مشہور کے ساتھ) بزرگوں سے بیشک منقول ہے اور معمول رہا ہے مگر سنت تو نہیں تو غیر سنت کا اتنا درجہ بڑھانا یعنی اس کو کافی سمجھ لینا اور اسی کو معیار کمال سمجھ لینا جس کو یہ حاصل نہ ہو اس کو ناقص سمجھنا یہ عظیم غلطی ہے وہ کافی ہے ورنہ انبیاء علیہم السلام اس سے کام لیتے یہ وہ کمال ہے کیونکہ بے دینوں کو بھی حاصل ہے بہت

سے جوگی بھی اس کا ملکہ رکھتے ہیں۔ پس وہ چیز مسلمان کے لیے کمال ہوسکتی ہے جس کے لیے اسلام کا ہونا بھی شرط نہیں اور بزرگوں نے جو اس سے کام لیا ہے تو بطور تقویت کے لیا ہے اصل چیز تعلیم ہے۔ بعض دفعہ کسی کو کچھ تعلیم کیا جاتا ہے اور وہ محبت کرتا ہے مگر ضعف استعداد سے اس کو خاص نفع جو کسی مصلحت سے مطلوب ہی نہیں ہوتا تو اس وقت اس توجہ سے اس پر خاص اثر ڈالا جاتا ہے جس سے کامیابی ہونے لگتی ہے مگر وہ نفع خاص خود ہی مطلوب نہیں وہ بھی درجہ معین میں ہے۔ اس توجہ کی مثال روٹی کا چولہے میں سینکنا ہے کہ روٹی کی تیاری کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ یہ کافی نہیں کہ کوئی کچے آٹے کو صرف سینک کر روٹی تیار کر لے بلکہ آٹے کو گوندھنا پڑھے گا اور روٹی بڑھا کر گرم توے پر اس کو پکانا ہوگا پھر چولہے میں سینکنا ہوگا اس سے روٹی تیار ہوگی اور اگر وہ توے ہی پر سینک دی گئی تو پھر چولہے میں سینکنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اسی طرح اصطلاح تو ہوتی ہے علم وعمل سے مگر کبھی اس اصلاح میں قوت پیدا کرنے کے لیے ضرورت ہوتی ہے توجہ متعارف کی اور اس وقت اس سے بھی کام لیا جاتا ہے ہر چیز کو اپنے مرتبہ پر رکھنا چاہیے۔ یہ حل ہے اس شبہ کا کہ بزرگوں سے توجہ متعارف منقول ہے۔ اب میں سابق کی طرف عود کرتا ہوں' میں صحبت کی برکات کا بیان کر رہا تھا' دلائل سے ثابت ہوگیا کہ صحبت اہل اللہ کی عجیب چیز ہے' اس سے ہمت پیدا ہوتی ہے جو اصلاح میں خاص مؤثر ہے۔ یہاں ایک تفصیل تھی آیت کے ایک جزو "اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ" (اس میں اس شخص کے لیے بڑی عبرت ہے جس کے پاس دل ہے) اس میں بڑی عبرت ہے اس شخص کے لیے جس کے پاس دل ہے کہ اب آیت کا دوسرا جزو رہ گیا یعنی "اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ" جس کا ترجمہ یہ ہے کہ یا اس شخص کو نفع ہوگا قرآن سے جس نے قرآن کو سنا توجہ کے ساتھ کان لگا کر اس تقابل پر نظر ظاہر میں شبہ ہوسکتا ہے کہ کان لگا کر سننا یہ بھی ایک ذریعہ علم ہی ہے تو معنی یہ ہوئے کہ جس کو علم ہو اس کو نفع ہوگا قرآن سے اور لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ میں بھی یہی مضمون تھا۔ جیسا آپ نے اس کا حاصل سنا کہ جس قلب میں علم و عزم ہو تو اس دوسرے جملہ میں باعتبار علم کے بلکہ ظاہر تکرار ہوگیا۔

معلومات کی دو قسمیں

اس شبہ کا حل یہ ہے کہ معلومات دو قسم کی ہوتی ہیں ایک وہ جو بدوں سے سمجھ میں آسکتی ہیں اور ایک وہ جو بدون سے سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ اول کی مثال مسئلہ وجود صانع ہے کہ سننے پر موقوف نہیں دنیا میں کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی ایسا نہیں جو فعل کے لیے فاعل کی ضرورت نہ سمجھتا ہو اور دوسری کی مثال مسئلہ معاد ہے اور کیفیت حشر و نشر و جنت و نار ہے کہ اس کا علم بلا سماع کے نہیں

ہوسکتا تو لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ (اس شخص کے لیے جس کے پاس دل ہے) متعلق ہے قسم اول کے معنی یہ ہوئے کہ جس کا قلب سلیم ہو یعنی اس میں عقل سلیم سے استعداد ہو صحیح بات کے سمجھنے کی چنانچہ صاحب جلالین نے قلب کی تفسیر عقل سے کی ہے اور القی السمع متعلق ہے قسم دوم کے معنی یہ ہوئے کہ جو باتیں مدرک بالعقل نہیں جن کو سمعیات کہتے ہیں ان کے متعلق یہ عادت ہو اس شخص کی کہ غور سے سنے، خواہ مخواہ عناد نہ کرے جیسے بعض کفار نے کہہ دیا تھا کہ

قُلُوْبُنَا فِيْ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَا اِلَيْهِ وَفِيْ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ

یعنی جس بات کی طرف آپ ہم کو بلاتے ہیں اس کی طرف سے ہمارے دل غلافوں کے اندر ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے اور ہمارے اور آپ کے درمیان ایک پردہ پڑا ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ تمہاری دعوت کو قبول کرنا تو کہاں ہم تمہاری بات سننا بھی نہیں چاہتے۔ یہ عناد ہے تو جس شخص میں یہ عناد نہ ہوگا بلکہ غور سے سنے گا قرآن کو تو اس کو بھی نفع ہوگا اور قرآن جو باتیں سمعیات کی قسم سے بتائے گا وہ اس کی سمجھ میں آجائیں گی کیونکہ وہ باتیں سب حق ہیں عناد سے ان پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ جب عناد نہ ہوگا تو ان کی واقعیت قلب میں بیٹھتی چلی جائے گی۔

قلب سلیم

تو حاصل یہ ہوا کہ جس میں ایسا قلب ہو کہ عقلیات میں صفت سلامت رکھتا ہو اور بات کو صحیح سمجھتا ہو (اور یہ حاصل ہے جزو اول کا) اور سمعیات میں قرآن کو کان لگا کر توجہ سے سنے، عناد نہ کرے تو اس کو نفع ہوگا قرآن سے۔ اب جملہ "اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ" (یا متوجہ ہو کر کان لگائے) میں تکرار نہ رہا، تقابل ہو گیا، اب ایک شبہ رہا کہ اوپر جو قلب کی صفت بیان کی گئی اس میں کسی علم کی تخصیص نہیں تھی اور اور تقابل کا مدار تخصیص ہے تو تعمیم میں پھر تقابل نہ رہا۔ جواب یہ ہے کہ یہ تقابل منطقی نہیں کہ ایک دوسرے کا جزو نہ ہو تقابل عرفی ہے جس کے لیے بعض اجزاء کا تقابل بھی کافی ہے۔ پھر یہ تقابل تضاد کا نہیں ہے بلکہ "مانعة الخلو" ہے کیونکہ دونوں صفتیں ایک شخص میں جمع ہو سکتی ہیں اور صحت حکم کیسے ہر واحد کافی ہے (کماسیاتی) (جیسا کہ عنقریب آتا ہے) جو شان ہوتی ہے (مانعة الخلو) کی چنانچہ شروع وعظ کے ذرا بعد ول گردہ کی مثال سے ذرا پہلے مانعة الخلو ہونے کی تصریح ہے۔

(ثم رایت بعد سنین فی روح المعانی ما یقارب هذا باختلاف العنوان مع الحکم بکونه مانعة الخلو ولله الحمد ولهذا التقابل وجوه اخری متحملة

''چند سال کے بعد میں نے روح المعانی میں اختلاف عنوان سے اس کے قریب قریب دیکھا مع حکم مانعۃ الخلو کے الحمدللہ اس تقابل کے لیے اور بھی وجود متحمل ہیں۔''

اب ان متقابلین میں جو امر مشترک ہے اور وہ امر مشترک روح ہے شرائط کی وہ قلب سلیم ہے کیونکہ عناد نہ ہونا بھی صفت قلب ہی کی ہے تو مدار آخر قلب ہی پر ٹھہرا تو یہ معنی ہوئے کہ جس شخص میں ایسا قلب ہو جس کو قلب کہا جاسکتا ہے کہ عقلیات کے متعلق بھی سلیم ہو اور سمعیات کے متعلق بھی سلیم ہو اس کو نفع ہوگا قرآن سے اور چونکہ یہ سب آثار قلب سلیم کے لوازم سے ہیں تو بواسطہ ملزوم کے ان سب لوازم میں بھی تلازم ہوگا۔ تحقق ملزوم کے وقت تو تلازم عقلی اور صرف ایک لازم کے تحقق کے وقت لازم عرفی۔ اس لیے ہر واحد کے تحقق کو صحت حکم کے لیے کافی کہیں گے (یہ بیان ہے سیاق کا جو ابھی گذرا' خلاصہ یہ کہ قرآن نصیحت ہے قلب سلیم کے لیے' تو قلب کو سلیم بنایئے پھر دیکھئے قرآن سے کیا کیا چیزیں حاصل ہوں گی۔ جب قلب سلیم ہوگا تو قرآن سے اس میں صفت علم بڑھے گی اور اس میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوگی۔ اسی کے بارے میں کہا ہے:

بینی اندر خود علوم انبیاء　　　بے کتاب و بے معید و اوستا

(اپنے اندر انبیاء جیسے علوم بغیر کتاب و اوستا اور معین کے دیکھو گے)

یعنی وہ علوم پیدا ہوں گے کہ تمام علوم ان کے سامنے گرد نظر آئیں گے اور ہر چیز کی حقیقت منکشف ہوگی وہ علوم ہوں گے جن کو علوم کہنا صحیح ہے۔ سفلی اور اوہام نہ ہوں گے دنیا کے عقلاء ان کے سامنے سر جھکائیں گے اور اس علم کی برکت سے ہمت کی تزاید کی بھی یہ کیفیت ہوگی کہ کسی کا خوف اس کے دل میں نہ رہے گا دنیا بھر ایک طرف اور وہ ایک طرف

موحد چہ در پائے ریزی زرش　　　چہ شمشیر ہندی نہی برسرش

امید و ہراسش نباشد زکس　　　ہمیں است بنیاد توحید وبس

(موحد کے قدموں پر سونا نچھاور کرو خواہ اس کے سر پر تلوار ہندی رکھو امید و خوف اس کو کسی سے نہ ہوگا۔ بس توحید کی بنیاد یہی ہے)

نہ کسی کے خوف سے حق سے وہ منحرف ہوگا نہ کسی لالچ سے وہ حق کو چھوڑے گا اور ہمت کی قوت کی وہ حالت ہوگی۔

اہل اللہ کا غم والم میں حال

جو بہلول دانا ایک بزرگ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے ان بزرگ کو دیکھا کہ بہت خوش خوش بیٹھے ہیں۔ پوچھا کہئے کیا حال ہے' کہا اس شخص سے زیادہ خوش کون ہوسکتا ہے کہ سارے

جہان میں کوئی کام اس کے ارادہ کے خلاف نہ ہوتا ہو۔ پوچھا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہا یہ تو مسلم ہے کہ ہر کام حق تعالیٰ کے ارادہ سے ہوتا ہے سو جس شخص نے اپنے ارادہ کو حق تعالیٰ کے ارادہ میں فنا کر دیا ہو تو ہر کام اس کے ارادہ کے موافق ہوگا تو یہ کہنا صحیح ہوا کہ کوئی کام اس شخص کے ارادہ کے خلاف نہیں ہوتا پھر ایسے شخص کے پاس غم کا کیا کام۔ اس کی حالت تو حق تعالیٰ کے ساتھ یہ ہوتی ہے:

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں یہ آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر فدا ہوں' دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں آپ سے راضی ہوں)

اور اس کی حالت یہ ہوتی ہے:

ناخوش تو خوش بود برجان من دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ اپنی طبعیت کے خلاف اور طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہوا گر وہ میری جان خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان پر رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں)

پھر اس کے پاس غم اور پریشانی تو ہمیشہ مقصود کے فوت ہو جانے سے ہوتی ہے اور جس کا مقصود ہی وہ ہے جو حق تعالیٰ کا مقصود ہے تو اس کے مقصود فوت ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں۔

پریشانی اپنا مقصود فوت ہونے سے ہوتی ہے

مثلاً ایک شخص نوکری چاہتا ہے' تعلیم حاصل کی روپیہ خرچ کیا' سفارشیں بہم پہنچائیں مگر نوکری نہیں ملی تو اس کو رنج ہوا' یہ رنج کیوں ہے اس واسطے کہ مقصود فوت ہو گیا اگر مقصود فوت نہ ہوتا اور نوکری مل جاتی تو رنج نہ ہوتا بلکہ خوشی ہوتی۔ اسی طرح کسی نے کیمیا بنانا چاہی' استادوں کے نخرے اٹھائے' گھر بار چھوڑا' امیر سے فقیر ہو گئے تب ایک نسخہ ملا اور بہ ہزار وقت اس کو مہیا کیا اور چڑھایا جب آنچ ختم ہوئی اور اس کو اتارا تو وہاں کچھ بھی نہیں ایک تاؤ کی کسر ہی رہی۔ ایسی صورت میں اس شخص کو کیا کچھ رنج ہوگا۔ یہ رنج کیوں ہے اس واسطے کے مقصود حاصل نہ ہوا۔ غرض رنج جبھی ہوتا ہے جب مقصود حاصل نہ ہو اور جس کا مقصود ہر وقت حاصل ہی ہو اس کے پاس رنج کا کیا کام جس کا مقصد وہی ہے جو اللہ کا مقصود ہے وہاں فوت مقصود کا احتمال ہی نہیں بلکہ اس سے آگے جس کو خود اللہ ہی مقصود ہو تو اللہ کو تو نہ فنا ہے نہ تغیر ہے اس کو پریشانی اور رنج سے کیا واسطہ تندرست

ہے تب بھی اس کا مقصود حاصل ہے بیمار ہے تب اس کا مقصود حاصل ہے غنی ہے تب اس کا مقصود حاصل ہے فقیر ہے تب اس کا مقصود حاصل ہے۔ غرض اس کا مقصد ہاتھ سے جا ہی نہیں سکتا' پھر رنج وغم کیسا۔ سوا ایسے قلب میں جو حالت ہمت کی ہوگی ظاہر ہے یہ ہے قلب جس کو قلب کہنا چاہیے یہ قلب محل ہوتا ہے تجلیات لامتناہیہ کا اور مہبط ہوتا ہے انوار الٰہیہ کا اسی کی نسبت کہا ہے:

آئینہ سکندر جام جم است بنگر تا بر تو عرضہ دارد احوال ملک دارا

(یعنی تمہارے اندر ایک آئینہ سکندر یا جام جم موجود ہے اس میں دیکھو اور غور کرو اس ملک دارا یعنی شیطان کے حالات نظر آئیں گے اس کے مکر وفریب کا انکشاف ہوگا تو ان سے بچ سکو گے)

یہ قلب اس آئینہ کی طرح ہوتا ہے جو بہت صاف ہے اور تمہارے سامنے رکھا ہوا ہے اس میں وہ چیزیں صاف نظر آتی ہیں جو تمہاری نظر کے سامنے نہیں ہیں بلکہ پس پشت ہیں۔ اس شعر میں سکندر اور دارا سے مراد وہ دو بادشاہ نہیں ہیں جنہیں کسی وقت بھی لڑائی ہوئی تھی جس کا ذکر سکندر نامہ میں ہے بلکہ مخالف مراد ہیں جن کو تشبیہاً سکندر اور دارا کہہ دیا ہے اس وجہ سے کہ ان دونوں میں سخت مخالفت ہوئی تھی سکندر تم ہو اور دارا وہ ہے جو سب کو دار پر لے جا رہا ہے اور یہ وہ ذات شریف ہیں جن کو سب جانتے ہیں ان کا نام ہی ابلیس آپ میں اور ابلیس میں بھی غایت درجہ کی مخالفت ہے جیسے سکندر اور دارا میں تھی تو شعر مذکور کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے اندر ایک آئینہ یا جام جم موجود ہے اس میں دیکھو اور غور کرو اس میں ملک دارا یعنی ابلیس کے حالات نظر آئیں گے یعنی ابلیس کے تلبیسات اور مکر وفریب کا انکشاف ہو جائے گا تو ان سے بچ سکو گے یہ اسی قلب کی نسبت کہا ہے جس میں صفات قلب موجود ہوں اور جو قلب کہے جانے کے قابل ہو جیسا کہ آپ نے طویل تقریر میں سنا۔ واقعی اگر قلب میں صفت سلامت پیدا ہو جائے تو ایسا دقیقہ رس ہو جاتا ہے کہ بے تکلف خیر وشر کا ادراک کر لیتا ہے جیسا حس ذائقہ جو زبان میں ہے کہ منہ میں چیز رکھتے ہی فوراً بتاتا ہے کہ یہ نمکین ہے یا میٹھی' نہ سوچنے کی ضرورت ہے نہ مقدمات کی ترتیب اور استدلال کی دنیا ایک طرف ہے اور حس ذائقہ ایک طرف تو بات وہی صحیح ہوگی جو حس ذائقہ نے بتائی ہے اس طرح اہل دل کا دل حق و باطل کو اول ہی وہلے میں پہچان لیتا ہے کہ یہ حق ہے اور یہ باطل اور اتنا حق ہے اور اتنا اس میں باطل ملا ہوا ہے۔ ابھی استدلال کی بھی نوبت نہیں آئی کہ ان کے دل نے حکم لگا دیا' بعض اوقات اہل استدلال ان سے معارضہ کرتے ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اس وقت اس کا جواب بھی نہ دے سکیں گے۔ غور کرنے کے بعد خود معارض ہی کو دلیل بھی مل جائے گی اور ان اہل استدلال کو ساکت ہونا پڑے گا اور ثابت ہو جائے گا کہ ان کے دل کا حکم لگا دینا صحیح تھا۔

نفس کا عجیب مکر وفریب

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ خلوت میں تھے اتفاقاً کفار اور مسلمانوں میں مقابلہ ہوا ان کو جوش اٹھا کہ چلو جہاد کے لیے۔ اس موقع پر کوئی غیر محقق ہوتا تو فوراً کھڑا ہو جاتا اور سمجھتا کہ بڑا کام کیا اور بڑی ہمت کی کیونکہ جہاد جانبازی کا کام ہے اس سے زیادہ ہمت کا کام کونسا ہوگا مگر محقق کا کام یہ ہے کہ ہر کام کو سوچ کر کرے اور خود کرے کہ یہ کام حق تعالیٰ کے حکم کے موافق ہے یا نہیں۔ چنانچہ جہاد جیسے کام میں بھی انہوں نے جلدی نہیں کی کہ ایسا نہ ہو اس میں کوئی مخفی غامض کید ہو، بہت سوچا لیکن اطمینان نہ ہوا بس حق تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ مجھے اس کے بارے میں شرح صدر عطا فرما دیجئے۔ فوراً سمجھ میں آیا کہ یہ خیال نفس کا ہے۔ رہا یہ کہ نفس نے اس عمل کی ہمت کیسے کی جس میں سراسر تکلیف ہے حتیٰ کہ جان کا اندیشہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نفس کو ہر وقت ذکر شغل میں مراقبہ میں قسم قسم کی ریاضت میں رکھتے تھے یہ ہر وقت کی مصیبت تھی نفس نے کہا کہ جہاد میں جائیں گے ایک دفعہ قتل ہو جائیں گے، تھوڑی دیر کی تکلیف ہو کر ختم ہو جائے گی ہر وقت کی مصیبت سے اس واسطے جہاد کی تلقین کی وجہ یہ سمجھ گئے کہ جہاد فرض کفایہ ہے اور یہ فرض عین ہے۔ ظاہر ہے کہ فرض عین زیادہ موکد ہے فرض کفایہ سے لہٰذا انہیں اسی کو اختیار کرتا ہوں اور تجھے اسی میں رکھوں گا اور زیادہ رگڑوں گا۔ یہ فریب اول دے کر شیطان کے احکام سمجھنا شروع کا کام نہیں ان کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کے قلب میں پوری پوری صفت سلامت ہو اور حق کے پہچاننے کا کیا احساس پیدا ہو گیا ہو جیسے زبان میں قوت ذائقہ ہے کہ منہ میں رکھتے ہی حکم لگا دیتی ہے کہ یہ چیز کڑوی سی ہے ورنہ میٹھی۔ اگرچہ دلائل اور شواہد اس کے خلاف ہوں۔ مثلاً ایک شخص نے ہمارے سامنے قند پانی میں گھول کر شربت بنایا۔ ظاہر ہے کہ یہ شربت میٹھا ہی ہوگا لیکن جب زبان تک پہنچا تو تلخی پائی گئی اب اس وقت دلائل و شواہد کا حکم تو یہ ہے کہ میٹھا ہونا چاہیے کیونکہ اس میں قند ہے اور پانی ہے کڑوی کوئی چیز نہیں اور وہ شخص بھی معتبر ہے اس نے کوئی اور چیز ملائی بھی نہیں ہے لیکن زبان جو کہ ماؤف نہیں اس کے خلاف حکم کرتی ہے تو اب فرمائیے کس کا حکم معتبر ہوگا۔

ظاہر ہے کہ زبان ہی کا حکم معتبر ہوگا اور دلائل و شواہد میں غور کیا جائے گا کہ اس میں کہاں غلطی ہوئی اس شربت بنانے والے کے ہاتھ کڑوے تھے یا پانی میں کوئی چیز کڑوی پڑ گئی تھی یا جس دکان سے وہ قند لایا گیا تھا وہاں کوئی غلطی ہو گئی تھی۔ غرض دلائل و شواہد میں تاویل کی جائے

گی یا ان کو غلط کہا جائے گا لیکن زبان کے حکم کو غلط نہ کہا جائے گا۔ یہی حالت اصحاب قلب کے حکم کی ہوتی ہے کہ اول وہلے ہی میں جو حکم انہوں نے لگا دیا گو اس وقت دلیل نہ بیان کر سکیں بلکہ بادی النظر میں دلیل اس کے خلاف بھی موجود ہو لیکن حکم صحیح وہی ہوگا جو انہوں نے لگایا اور تامل سے بعد میں دلیل بھی مل جائے گی۔ چنانچہ ان بزرگ کے دل میں کھٹکا پیدا ہوا اور جہاد جیسی چیز کو دل نے قبول نہیں کیا اور آخر میں اس میں نفس کا مکر ہی ثابت ہوا۔ شیطان کے اور نفس کے عجیب عجیب مکر وفریب ہیں اور ان دونوں میں سے نفس کا مکر زیادہ بڑھا ہوا ہے کیونکہ شیطان اول تو چلتا پھرتا رہتا ہے ممکن ہے کہ کسی وقت انسان کے پاس موجود نہ ہو اور اس وقت انسان اس سے بچا رہے لیکن نفس تو ہر وقت انسان کے اندر ہی موجود ہے یہ ہر وقت کا مار آستین ہے شیطان سے تو کسی وقت آدمی بچ بھی جائے لیکن اس سے بچنا بہت مشکل ہے اس لئے ہر وقت تیقظ کی اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے اس نے بڑے بڑوں کو دھوکے دیئے ہیں۔ پھر خود شیطان ہی کو کس نے غارت کیا اسی نفس نے جو کہ اس کا قرین ہے شیطان کو جو سجدہ کا حکم ہوا لیکن اس کے نفس نے سمجھایا کہ بڑی ذلت ہوگی تو آتشی ہے اور آدم خاکی آگ کو خاک پر شرف حاصل ہے آگ لطیف ہے اور خاک کثیف آگ نورانی ہے اور خاک ظلماتی لہٰذا یہ قلب موضوع ہے کہ تو آدم کو سجدہ کرے۔ چنانچہ اس نے سجدہ نہیں کیا اور غارت ہوا۔

نفس شیطان سے زیادہ چالاک ہے

نفس وہ چیز ہے جس نے شیطان کو بھی غارت کیا۔ نفس شیطان سے بھی زیادہ چالاک ہے، شیطان کو بھی دھوکہ دیتا ہے نفس کو وہ چالاکیاں آتی ہیں جن کا پتہ بھی نہیں چلتا، بڑے بڑوں کو اس نے ہلاک کیا ہے پھر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسا دشمن جو چالاک بھی ہو کیسا خطرناک ہوگا اسی لیے محققین نے نفس کو زیادہ دشمن سمجھا ہے اور اسی سے ہوشیار رہنے کی زیادہ تاکید کی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

اے شہاں کشتیم ما خصم بروں ماند خصمے زوبتر در اندروں
کشتن ایں کار عقل وہوش نیست شیر باطن سخرہ خرگوش نیست

(یعنی اے بزرگو! تم نے ظاہر دشمن کو تو ہلاک کر دیا مگر ایک دشمن جو اس سے بدتر اور ضرر رساں ہے باطن میں رہ گیا یعنی نفس اس دشمن باطنی کا ہلاک کرنا محض عقل وہوشیاری کا کام نہیں ہے کیونکہ شیر باطن خرگوش کے قابو کا نہیں ہے جب وہ شیر خرگوش کے داؤ میں آ گیا تھا یہ شیر باطن ایسا نہیں ہے)

نفس کے بڑے بڑے گھات ہیں جن سے وہ انسان کو ہلاک کرتا ہے بسا اوقات یہ معصیت پر ایسا رنگ چڑھاتا ہے کہ وہ طاعت معلوم ہونے لگتی ہے پھر کیسے کوئی اس کی مکر سے بچے نفس کے مکروں پر تنبہ جبھی ہوسکتا ہے کہ قلب میں نورانیت ہو اور ایسا صحیح حس حق و باطل کے پہچاننے کا پیدا ہوگیا ہو جیسے زبان میں ہے کڑوا اور میٹھا پہچاننے کا۔ جب قلب ایسا ہوجائے گا تو اس کو قرآن میں وہ چیزیں ملیں گی جو بیان میں نہیں آسکتیں۔

وعظ کے نام ولقب کی وجہ تسمیہ

اب بیان ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ نورانیت قلب اور توفیق خیر عطا فرمائیں۔ میں اس بیان کا نام جلاء القلوب تجویز کرتا ہوں کیونکہ اس میں دل کی صفائی ہی کا بیان ہوا ہے اور ایک قلب بھی تجویز کرتا ہوں۔ جام جمشید' کیونکہ جام جمشید کے متعلق مشہور ہے کہ اس میں دنیا کی خبروں کا انعکاس ہوا کرتا تھا اس میں دل کی صفائی کا بیان ہوا ہے اس سے دل ایسا ہوجائے گا کہ اس میں حق کا انعکاس ہونے لگے گا اور اتفاقی بات ہے کہ ابھی ایک شعر زبان پر آیا تھا جس میں جام جم کا لفظ تھا اس سے یہ لقب پیدا ہوا نیز اس لقب میں حافظ صاحب (نواب جمشید علی خان صاحب میزبان و مالک مکان کا نام بھی آگیا) کاتب وعظ احقر محمد مصطفیٰ بجنوری مقیم میرٹھ محلہ کرم علی عرض کرتا ہے کہ اس سفر میں تین وعظ ہوئے سب سے پہلا یہ وعظ مسمّی بہ جلاء القلوب ملقب بجام جمشید اور اس سے اگلے دن بمقام کاٹھ متصل باغپت وعظ رجاء الغیوب ملقب بصبح امید اور اس سے اگلے دن بمقام میرٹھ وعظ دواء العیوب ملقب بہ شام خورشید تینوں کے نام مقفہ ہیں۔ نیز القاب بھی اور تینوں کی وجہ تسمیہ نہایت معقول ہے جلاء القلوب کی وجہ تسمیہ اور لقب کی مناسبت تو ابھی بیان ہوئی اور کاٹھ میں وعظ۔ مستورات کے مجمع میں تحت آیت "ان الذین یتلون کتاب الله واقاموا الصلوة وانفقوا مما رزقناهم سرا و علانیة یرجون تجارة لن تبور" ہوا تھا جس میں رجاء کا مضمون غالب تھا اور خود آیت ہی میں یرجون کا لفظ موجود ہے۔ نیز آیت میں جو وعدے ہیں وہ آخرت کے ہیں جو عالم غیب ہے اس واسطے رجاء الغیوب کیا ہے برمحل نام ہوا نیز وعظ کا وقت صبح کا تھا اس وجہ سے صبح امید کیا ہے چسپاں لقب رہا اور میرٹھ میں وعظ تحت آیت وجاء کم النذیر ہوا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ نذیر کی تفسیر بعض علماء نے بڑھاپے سے کی ہے لہٰذا بوڑھوں کو زیادہ ضرورت اپنی اصلاح کی ہے اور اس میں امراض اور ان کے علاج مذکور ہوئے لہٰذا دواء العیوب اسم بامسمّی ہوا اور اتفاق سے یہ وعظ شام کے وقت ہوا تھا جس وقت آفتاب کا غروب قریب تھا اور بڑھاپا عمر کی شام ہے لہٰذا شام خورشید لقب نہایت مناسب رہا اور اس میں ایک لطیفہ یہ بھی ہوا جس کی طرف حضرت والا کو بھی خیال نہیں تھا کہ جب لقب شام خورشید تجویز ہوا تو احقر نے عرض کیا کہ خورشید علی خان' نواب جمشید خان صاحب کے والد

ماجد مرحوم کا نام تھا تو اس سلسلہ میں دونوں آ گئے تو حضرت والا نے مسرت ظاہر فرمائی چونکہ یہ سفر فرمائش نواب صاحب موصوف ہوا تھا اس واسطے قاعدہ للا کثر حکم میں وعظوں میں سے دو میں اس خاندان کے نام آ جانا گویا کل میں آ جانا ہے یہ بھی لطف سے خالی نہیں۔ معذرت بعد ختم وعظ شام خورشید حضرت والا نے یہ بھی فرمایا تھا کہ کاش یہ تینوں وعظ ایک ساتھ ہی چھپیں لیکن بعض موانع تو یہ کی وجہ سے یہ نہ ہو سکا وہ دونوں وعظ یعنی صبح امید اور شام خورشید تیار ہو کر عرصہ ہوا کہ شائع ہو چکے اور یہ وعظ مسمی جام جمشید سب سے آخر میں تیار ہوا۔ افسوس ہے کہ حضرت والا کی خواہش پوری نہ ہو سکی تاہم یہ ہو سکتا ہے کہ اہل مطابع تینوں وعظوں کو اب یکجا کر دیں۔ "فالحمد لله الذی بعزته و جلالته تتم الصالحات" ناظرین سب سے پہلے حضرت واعظ صاحب مدظلہ کے لیے دعا مغفرت کریں اس کے بعد کاتبین وعظ کے لیے اور آخر میں احقر کے لیے اور احقر کے والدین کے لیے دعا کریں۔

رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّکَ رَءُوْفٌ الرَّحِيْمٌ○ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ○

(اے رب قبول کریں آپ ہماری جانب سے یقیناً آپ سمیع وعلیم ہیں) تتمہ وعظ ہذا از صاحب وعظ۔ وعظ ہذا کے ختم کے قریب جہاں سے " او القى السمع وهو شهيد" کا بیان شروع ہوا ہے اس سے تقریباً صفحہ ڈیڑھ صفحہ بعد لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ کے تقابل کے بحث ہے وہاں خطوط وحدانیہ کے درمیان ایک چھوٹی سی عربی عبارت ہے اس میں یہ جملہ ہے ولهذا التقابل وجوه الاخرى محتملة۔ ان وجوہ میں سے میں نے جس وجہ کو بیان القرآن سے اختیار کیا ہے اتمام فائدہ کے لیے اس کو نقل کر دینا مفید سمجھتا ہوں۔ اس میں اس شخص کے لیے بڑی عبرت ہے جس کے پاس (فہیم) دل ہو یا اگر فہیم زیادہ نہ ہو تو کم از کم یہی ہو کہ) وہ (دل سے) متوجہ ہو کر (بات کی طرف) کان ہی لگا دیتا ہو (اور سن کر اجمالاً حقانیت کا معتقد ہو کر اتباعاً لاہل الفہم اس بات کو قبول کر لیتا ہو) آہ توضیح مزید جدید و مفید پہلی شان محقق کی ہے اور دوسری مقلد کی یعنی تذکر کے لیے یہ شرط ہے کہ مخاطب محقق ہو یا مقلد۔ فقط

(اشرف علی ۴/۴/۶۱/۱۳ھ)

ذم النسیان

یہ وعظ ۱۷ ربیع الاول ۱۳۳۱ ہجری بعد نماز عشاء بمقام جامع مسجد تھانہ بھون جوکہ حضرت والا نے بیٹھ کر ۲ گھنٹہ ۱۸ منٹ ارشاد فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلَّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

وَلَاتَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ○ (الحشر:۱۹)

ترجمہ: ’’اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنہوں نے اللہ سے بے پروائی کی تو اللہ تعالیٰ نے خود ان کی جان سے ان کو بے پروا بنا دیا' یہی لوگ نافرمان ہیں۔‘‘

قرآن پاک کا ہر جز وضروری ہے

یہ ایک مختصر سی آیت ہے۔ سورہ حشر کے آخر کی جس میں مثل دوسری آیتوں کے ایک نہایت ضروری مضمون مذکور ہے اور میں نے تشبیہ کا صیغہ اس لیے استعمال کر دیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ یہ کچھ اس آیت کی تخصیص نہیں بلکہ قرآن کی تمام آیات کی یہی شان ہے کہ ہر آیت میں ضروری ہی مضمون ہے اگر میں تشبیہ کا ذکر نہ کرتا تو ممکن تھا کسی کو یہ شبہ ہوتا کہ شاید دوسری آیتوں میں ضروری مضمون نہیں۔ بس خاص اسی آیت میں یہ بات ہے۔ گو اس شبہ کی کوئی معقول وجہ نہ تھی کیونکہ تخصیص ذکری سے تخصیص حکمی لازم نہیں آتی مگر شاید کسی کو بلا وجہ ہی شبہ پڑتا اس لیے میں نے تشبیہ کے صیغہ سے پہلے ہی دفع دخل مقدر کر دیا کہ اس آیت میں بھی ایک نہایت ضروری مضمون ہے جیسا کہ دوسری آیتوں کی بھی یہی شان ہے۔ قرآن کا تو ہر ہر جز وضروری ہے اس میں غیر ضروری کوئی بات بھی نہیں ہے۔

مستحبات کی تعلیم بھی ضروری ہے

حتیٰ کہ جن آیات میں واجبات وفرائض کا بھی ذکر نہیں محض مستحبات ہی کا ذکر ہے۔ مضمون ان کا بھی ضروری ہے۔ گو آج کل مستحبات کو ضروری نہیں سمجھا جاتا اور عمل کے درجے میں وہ واجبات

وفرائض کے برابر ضروری نہیں سمجھا جاتا اور عمل کے درجے میں وہ واجبات وفرائض کے برابر ضروری ہیں بھی نہیں مگر تعلیم ان کی بھی ضروری ہے (دو وجہ سے ایک اس لیے کہ لوگوں کو ان کا مستحب ہونا معلوم ہو جائے گا تو کوئی ان کو ناجائز نہ سمجھے گا یا فرض وواجب نہ خیال کرے گا یہ تو اصلاح اعتقاد کے لحاظ سے ضرورت ہے اور اس درجے میں مباحات کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ دوسرے اس لیے کہ ان کی برکات اور ثمرات بے شمار ہیں جن پر مطلع نہ ہونا ہی ان سے بے رغبتی کا باعث ہے اگر ان برکات وثمرات کی اطلاع ہو جائے جو ادنیٰ ادنیٰ مستحبات سے حاصل ہوتے ہیں تو آپ خود کہیں گے کہ افسوس ہم اب تک بڑے خسارہ میں تھے جو ایسے قیمتی جواہرات سے بے خبر رہے (یہ ضرورت تکمیل عمل کے درجے میں ہے) غرض مستحبات کا ذکر بھی قرآن میں بے ضرورت نہیں بلکہ تعلیم کے درجے میں ان کا ذکر بھی ضروری اور بہت ضروری ہے اگر محبت ہو تو اس کی قدر ہو۔

عاشق کا مذاق

عاشق کا مذاق یہ ہوتا ہے کہ وہ محبوب کی خوشی کی ذرا ذرا سی بات کی تلاش میں رہتا ہے اور جب اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ محبوب فلاں فلاں بات سے خوش ہوتا ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ یہ بھی کرلوں وہ بھی کرلوں اور کوئی بات اس کے خوش کرنے کی مجھ سے رہ نہ جائے۔ اگر ہم لوگوں کو یہ مذاق عاشقانہ نصیب ہو جائے تو اس وقت ان مستحبات کی قدر معلوم ہو اور ان کے بیان کو خداوند تعالیٰ کی رحمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت سمجھیں گے کہ اللہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس تفصیل سے ان باتوں کو بتلا دیا جو اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے والی ہیں اور اگر شریعت میں صرف ضروریات ہی کا بیان ہوتا مستحبات کا ذکر نہ ہوتا تو عشاق کو سخت بے چینی ہوتی کیونکہ قاعدہ ہے کہ عاشق محض ضروریات پر اکتفاء نہیں کیا کرتا ان کو تو وہ اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ فرض منصبی کے علاوہ بھی میں کچھ ایسا کام کروں جس سے محبوب کو مجھ پر زیادہ توجہ ہو۔ (دیکھئے ایک نوکر تو وہ ہے جو محض تنخواہ کے لیے کسی خاص کام پر آپ کا ملازم ہے۔ وہ تو یہ چاہے گا کہ فرض منصبی کو ادا کرتا رہوں۔ اس سے زیادہ کی اس کو خواہش نہ ہوگی اور ایک وہ نوکر ہے جس کو بچپن سے آپ نے پالا' پرورش کیا ہے اور اس کو آپ کے ساتھ جان نثاری کا تعلق ہے وہ ہرگز فرض منصبی پر اکتفاء نہ کرے گا بلکہ وہ اس کی کوشش کرے گا کہ آقا کے خوش کرنے کا جو کام بھی ہو وہ میرے ہاتھ سے ہو جائے۔ وہ اپنے خاص کام کے علاوہ رات کو آپ کے پیر بھی دبائے گا' پنکھا بھی جھلے گا اور آپ کے جاگنے سے پہلے تمام ضروریات کے مہیا کرنے کا سامان کرے گا اور یہ کبھی خیال نہ کرے

گا کہ یہ کام تو میرے فرض منصبی سے زیادہ ہیں انہیں کیوں کروں بلکہ اس کی محبت اور جان نثاری مجبور کرے گی کہ جس کام سے بھی آقا خوش ہو وہ ضرور کرنا چاہیے۔

ہمارا تعلق حق تعالیٰ شانہ سے محبت اور جانثاری کا ہونا چاہیے

صاحبو! ہمارا علاقہ حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ ہمارے خیال فاسد میں محض قانونی رہ گیا ہے اسی لیے ہم واجبات وفرائض کے علاوہ مستحبات کو غیر ضروری سمجھتے ہیں اگر ہم کو حق تعالیٰ کے ساتھ محبت اور جانثاری کا علاقہ ہوتا تو فرائض وواجبات پر ہم کبھی اکتفا نہ کر سکتے بلکہ مستحبات کی تلاش میں خود بخود رہتے اور جس بات کے متعلق بھی یہ معلوم ہو جاتا کہ حق تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں اس کی طرف شوق سے سبقت کرتے اور جس بات کے متعلق یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ حق تعالیٰ کو ناپسند ہے اس سے کوسوں دور بھاگتے اور اس کی تحقیق نہ کرتے کہ یہ زیادہ ناپسند ہے یا کم۔ عاشق کو اتنا جان لینا کسی کام سے روکنے کے لیے کافی ہے کہ یہ محبوب کو ناپسند ہے وہ کبھی تفتیش نہیں کرتا کہ یہ ایسا ناپسند ہے کہ اس کی سزا میں ضرب وحبس کی جاتی ہے یا ایسا ناپسند ہے کہ محبوب کسی قدر کبیدہ خاطر ہو جاتا ہے اور رخ پھیر لیتا ہے اس کے نزدیک دونوں کام برابر ہیں وہ اس کو بھی ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ محبوب اس سے کچھ بھی کبیدہ خاطر یا بے رخ ہو جائے اور جس کام میں کبیدگی کے علاوہ سزائے ضرب وحبس بھی ہو وہ تو بھلا کیوں ہی کرنے لگا۔

حق تعالیٰ شانہ سے ہمارا تعلق انتہائی ضعیف ہے

مگر آج کل ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کسی کام کی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ یہ گناہ ہے تو سوال ہوتا ہے کہ کیا بڑا گناہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر چھوٹا گناہ ہو تو کر لیں گے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ بہت ضعیف ہو گیا ہے۔ گو پوری بے تعلقی بھی نہیں ہے کیونکہ یہ سوال ہی تعلق کی دلیل ہے میں ان لوگوں کی طرف داری کرتا ہوں کہ ان کو خدا تعالیٰ سے بالکل بے تعلق نہ سمجھا جائے کیونکہ ان کو اتنا تعلق تو ہے کہ وہ حق تعالیٰ کو زیادہ ناراض کرنا پسند نہیں کرتے اگر اتنا بھی تعلق نہ ہوتا تو اس سوال ہی کی کیا ضرورت تھی کہ یہ کیا بڑا گناہ ہے۔ معلوم ہوا کہ بڑے گناہ سے ڈرتے ہیں کیونکہ اس سے خدا تعالیٰ بہت ناراض ہوتے ہیں لیکن زیادہ تعلق نہیں ہے اس لیے تھوڑا سا ناراض کر دینا گوارا ہے۔ غرض یہی سوال تعلق کی بھی دلیل ہے اور ضعف تعلق کی بھی اس تقریر سے وہ لوگ خوش ہوئے ہوں گے جو گناہ کے متعلق بڑا چھوٹا ہونے کا سوال کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق بھی ثابت ہو گیا اور یہ بات ایک درجہ میں ہے بھی خوش ہونے کی کیونکہ

بلا بود ے اگر ایں ہم نبود ے (مصیبت ہوتی اگر یہ بھی نہ ہوتا) مگر وہ یاد رکھیں کہ نفس تعلق پر قناعت نہیں ہوسکتی آخر آپس میں جو ایک دوسرے سے ہم تعلقات رکھتے ہیں کیا ان میں نفس تعلق پر کوئی شخص قناعت کرسکتا ہے ہرگز نہیں بلکہ ہر تعلق کا درجہ کمال ہر شخص کو مطلوب ہے۔

ضابطہ کے تعلق سے لطف حاصل نہیں ہوتا

دیکھئے بیوی کے ساتھ جو ارتباط ہے حالانکہ وہ ایک نہایت ہی ضعیف تعلق ہے جو صرف دو لفظوں سے جڑ جاتا ہے اور ایک لفظ سے ٹوٹ جاتا ہے مگر اس میں ہم نے کسی کو نہیں دیکھا جو نفس تعلق پر قناعت کرتا ہو بلکہ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ بیوی کو میرے ساتھ کامل تعلق ہو اسی لیے محض حقوق ضروریہ پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے خوش کرنے کے لیے وہ کام کیے جاتے ہیں اور وہ زیور اور لباس تیار کیے جاتے ہیں جو اس کا حق نہیں مگر محض اپنے مصالح کی وجہ سے ان کاموں کو کیا جاتا ہے تاکہ یہ تعلق بڑھے اور مستحکم ہو۔ اگر مرد بیوی کے ساتھ یا بیوی مرد کے ساتھ قانونی علاقہ رکھے اور حقوق ضروریہ سے زیادہ کچھ نہ کرے تو گو نفس تعلق باقی رہ سکتا ہے مگر تعلق کا لطف حاصل نہیں ہوتا اور اس صورت میں ہر وقت قطع تعلق کا اندیشہ رہتا ہے۔ تعلق کو بقاء جب ہی ہوتی ہے کہ اس کے استحکام کی تدبیر کی جائے۔ چنانچہ مرد کے ذمے بیوی کا محض کھانا کپڑا ضروری ہے۔ زیور اور ریشمی لباس لازم نہیں نہ اس کی دوادار ولازم ہے نہ اس کے کنبے والوں کی دعوت ضیافت ضروری ہے مگر محض تعلق بڑھانے کے لیے یہ سب کچھ کیا جاتا ہے اور اس کے جی خوش کرنے کو ہر کام میں ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ حالانکہ اوپر معلوم ہو چکا کہ یہ تعلق نہایت ہی ضعیف ہے مگر باوجود اس ضعف کے اس کا منقطع ہو جانا ہر شخص کو ناگوار ہے اور اگر کبھی منقطع ہو جاتا ہے تو کتنا رنج ہوتا ہے اور انقطاع سے بچنے ہی کے لیے اس کے استحکام کے اسباب اختیار کیے جاتے ہیں پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہم کو ایک ضعیف تعلق میں تو نفس تعلق پر قناعت نہ ہو بلکہ خوف انقطاع سے اس کے استحکام کی فکر ہو اور حق تعالیٰ کے ساتھ نفس تعلق پر اکتفا گوارا ہو حالانکہ خدا تعالیٰ سے ہمارا ایسا قوی علاقہ ہے کہ اس کے برابر کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ استحکام کی ہم کو فکر نہیں اور محض نفس تعلق کو کافی سمجھ رکھا ہے اور یہاں وہ خیال کیوں نہیں کیا جاتا۔

تعلق کا بقاء استحکام پر موقوف ہے

تعلق کا بقاء استحکام پر موقوف ہے۔ نفس تعلق بقاء کے لیے کافی نہیں بلکہ اس میں زوال و انقطاع کا خطرہ لگا ہوا ہے تو کیا کوئی اس بات کو گوارا کرسکتا ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ جو اس کا علاقہ ہے وہ منقطع ہو جائے ہرگز نہیں پھر اس کے استحکام کا کیوں خیال نہیں کیا جاتا۔

مولانا فرماتے ہیں:

ایکہ صبرت نیست از فرزند وزن　　صبر چوں داری زرب ذوالمنن

- ایکہ صبرت نیست از دنیائے دوں　　صبرے چوں داری زنعم الماہدون

(اے شخص بیوی بچوں سے تجھ کو صبر نہیں ہے خدا تعالیٰ سے تجھ کو صبر کیونکر آ گیا' حقیر اور ذلیل دنیا سے تجھ کو صبر نہیں ہے تو حق تعالیٰ شانہ سے تو نے کیونکر صبر کر لیا)

اللہ تعالیٰ سے نفس تعلق بھی نعمت ہے

ہائے ہمیں چھوٹی چھوٹی چیزوں سے تو صبر نہیں ہو سکتا مگر نہ معلوم خدا تعالیٰ سے لوگوں کو کیسے صبر آ گیا۔ ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کے ساتھ ضعف تعلق ہم کو گوارا نہیں اور خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق ضعیف ہونے پر ذرا جی نہیں دکھتا۔ پس گو حق تعالیٰ کے ساتھ نفس تعلق بھی ایک نعمت ہے۔ مگر ضعف تعلق پر قناعت کر لینا بھی بڑا ظلم ہے۔ بعض لوگ تو بے تعلقی ہی پر راضی ہیں یہ تو کفار ہیں ان سے اس وقت خطاب نہیں اور بعض لوگ ضعف تعلق پر راضی ہیں یہ ہم آج کل کے مسلمان ہیں۔ حیرت ہے کہ ہم کو خدا تعالیٰ کے ساتھ ضعف تعلق رکھنے پر صبر کیسے آتا ہے اسی کا یہ اثر ہے کہ آج کل ہم کو مستحب کی خبر نہیں اور ان کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔

ضعف تعلق پر قناعت کرنا ظلم ہے

میں اپنی کہتا ہوں کہ بچپن میں بہت سے نوافل کا پابند تھا مگر منیۃ المصلی پڑھتے ہی جب معلوم ہوا کہ یہ تو مستحبات ہیں جن کے نہ کرنے میں کچھ گناہ نہیں اسی وقت سے نوافل کو چھوڑ دیا۔ اس وقت تو متنبہ نہ ہوا کہ میں کیا کر رہا ہوں مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ حالت بری تھی۔ اس کا تو یہی حاصل ہوا کہ ہم حق تعالیٰ کے ساتھ ضابطہ کا تعلق رکھنا چاہتے ہیں کہ ضروریات کو بجا لائیں اور ان کے علاوہ جو باتیں خدا تعالیٰ کو خوش کرنے کی ہیں ان کو نہ بجا لائیں تو کیا ہم دنیا میں اپنے مربیوں کے ساتھ بھی یہ برتاؤ کر سکتے ہیں کہ خدمت واجبہ کے سوا کچھ نہ کریں ہرگز نہیں۔ دیکھئے بعض اوقات کسی طمع کی وجہ سے یا محبت کی وجہ سے ہم اپنے مربیوں کی خدمت غیر واجبہ بھی کچھ کرتے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کا اتنا بھی حق نہیں جتنا مربیوں اور بزرگوں کا حق ہوا کرتا ہے۔ ذرا کچھ تو انصاف سے کام لینا چاہیے پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی اطاعت میں اسی قدر اکتفا کرتے ہیں جو فرض و واجب ہے اور طاعت غیر واجبہ کو کسی درجے میں بھی ضروری نہیں سمجھتے یہ ضرور ہے کہ خدا تعالیٰ کی شان کے لائق ہم سے اس کی طاعت کا حق ادا نہیں ہو سکتا اور ہم جتنا

بھی کچھ کریں وہ اس کوتاہی کا کیونکہ اس سے ہم کو یہ دھوکہ ہوگیا ہے کہ جب حق ادا ہو ہی نہیں سکتا تو پھر کس لیے زیادہ کوشش کریں مگر یہ سخت غلطی ہے۔

اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق عمل کی ضرورت

اس میں شک نہیں کہ ہم اس کی شان کے موافق عمل نہیں کر سکتے مگر اپنے مقتضائے حال کے موافق تو کر سکتے ہیں۔ (دنیا میں رات دن دیکھا جاتا ہے کہ لوگ سلاطین کے سامنے ہدایہ وتحائف لے جاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ بادشاہ کی شان کے موافق ہمارا ہدیہ نہیں ہوسکتا مگر اس کا یہ اثر کبھی نہیں ہوتا کہ ہدیہ دینا ہی موقوف کر دیں بلکہ جتنا اپنے سے بن پڑتا ہے کوشش کر کے عمدہ سے عمدہ ہدیہ پیش ہی کرتے ہیں اسی لیے مثل مشہور ہے کہ ہدیہ تو دوسرے کی شان کے موافق ہو یا کم از کم اپنی ہی شان کے موافق ہو) پس ہم کو اپنی ہمت اور طاقت کے موافق تو عمل کرنا چاہیے اور میں اطمینان دلاتا ہوں کہ حق تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے اتنا ہی عمل کافی ہے جتنا آپ کر سکتے ہیں۔ آپ اپنی طاقت سے زیادہ نہ کیجئے۔ حق تعالیٰ نے بندہ کو اس کا مکلف نہیں کیا کہ وہ حق تعالیٰ کی شان کے موافق عمل کرے بلکہ اسی قدر کا مکلّف کیا ہے کہ وہ اپنی طاقت و ہمت کے موافق عمل کرے تو اب یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ ہم مستحبات کو اس لیے ترک کر دیں کہ حق تعالیٰ کا حق تو ادا ہو ہی نہیں سکتا۔

طلب راحت اور سستی میں فرق

یہ اور بات ہے کہ کسی وقت مستحب کسی مصلحت شرعی کی وجہ سے ترک کر دیا جائے (مثلاً لوگوں کو یہ بتلانے کے لیے یہ فعل واجب نہیں یا سفر میں رفقاء کی رعایت سے نوافل وغیرہ کو چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ انتظار سے پریشان نہ ہوں ۱۲) یا کسی وقت تعب کی وجہ سے اپنی راحت کے لیے ترک کر دیا جائے کہ شرعاً اس وقت ترک مستحبات پر ملامت نہیں۔ چنانچہ راحت حاصل کرنے کے لیے تو حدیث میں وارد ہے:

اِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَیْنَیْکَ حَقًّاo [۱]

"یعنی تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری آنکھوں کا تم پر حق ہے۔"

مگر بلا وجہ ترک کرنا اس سے حدیث میں پناہ آئی ہے کیونکہ وہ سستی اور کاہلی ہے جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْعِجْزِ وَالْکَسْلِ" [۲] (خدایا! عجز اور سستی سے آپ سے پناہ مانگتا ہوں)

---

[۱] (مسند احمد ۲: ۲۶۸) [۲] (الصحیح للبخاری ۴: ۲۸)

خوب سمجھ لیجئے کہ طلب راحت اور چیز ہے اور سستی اور چیز ہے دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔ طلب راحت کا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امر فرمایا ہے اور اس کے لیے بعض صحابہ کو ترک مستحبات و تقلیل نوافل کی ترغیب دی ہے اور سستی سے آپ نے پناہ مانگی ہے (اب سمجھئے کہ طلب راحت اور سستی میں کیا فرق ہے۔ طلب راحت اس وقت ہوا کرتی ہے جب آدمی اپنی طاقت کے موافق کام کر چکا ہو اس کو حکم ہے کہ بس طاقت سے زیادہ نہ کرو جا کر آرام کرو اور سستی یہ ہے کہ اپنی طاقت و ہمت کے موافق بھی کام نہ کرے بلکہ تھوڑا سا کر کے عمل کو چھوڑ دے اس سے پناہ آئی ہے ۱۲)

مستحبات کے ثمرات

غرض خدا تعالیٰ کے ساتھ ہمارا بڑا تعلق ہے اس کے لحاظ سے مستحبات بھی ضروری ہیں۔ یہ میں اس شبہ کا جواب دے رہا ہوں جو میرے اس قول پر ہوا تھا کہ خدا تعالیٰ کے کام کا ہر ہر جزو ضروری ہے چونکہ قرآن میں مستحبات کا بھی ذکر ہے اور ان کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے تو میں نے بتلا دیا کہ تعلیم ان کی بھی ضروری ہے کیونکہ ان کے برکات و ثمرات بیشمار ہیں۔ چنانچہ ایک برکت تو یہ ہے کہ بعض اوقات مستحبات معصیت سے مانع ہو جاتے ہیں (کیونکہ جو شخص تہجد و اشراق کا پابند ہوگا وہ بہ نسبت اس شخص کے معاصی سے زیادہ بچے گا جو محض پانچ وقت کے فرائض ہی ادا کرتا ہے اور اس میں علاوہ خاصیت کے ایک طبعی راز یہ ہے کہ مستحبات کی پابندی سے یہ شخص دیندار تہجد گزار مشہور ہو جاتا ہے تو اس لقب کے ساتھ گناہوں کے ارتکاب سے وہ خود بھی شرمانے لگتا ہے ۱۲) اور بعض اوقات کوئی فعل مستحب حق تعالیٰ کو ایسا پسند آ جاتا ہے کہ وہ ہی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

لفظ اللہ اعراف المعارف ہے

چنانچہ یہ ایک نحوی ہے جو عقیدے کے لحاظ سے معتزلی ہے اور عقائد فاسدہ پر سخت عذاب نار کا استحقاق ہوتا ہے مگر مرنے کے بعد ان کو کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ خدا تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ فرمایا' کہا مجھے بخش دیا' پوچھا کس بات پر بخش دیا' کہا ایک نحو کے مسئلہ پر میری نجات ہوگئی وہ مسئلہ یہ ہے کہ معرفہ کی بحث میں نحاۃ نے اختلاف کیا ہے کہ اعراف المعارف کون ہے۔ کسی نے ضمیر متکلم کو اعراف المعارف کہا کسی نے ضمیر مخاطب کو' میں نے یہ کہا کہ لفظ اللہ اعراف المعارف ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی معرفہ متعین نہیں کیونکہ لفظ اللہ میں بجز ذات حق کی کسی کا احتمال ہی نہیں۔ حق تعالیٰ نے اس بات پر فرمایا کہ تم نے ہمارے نام کی بہت تعظیم کی جاؤ تم کو بخشا گیا۔ دیکھئے اس نحوی کی مغفرت ایسے عمل مستحب پر کی گئی جو اس نے بہ نیت ثواب بھی نہ کیا تھا بلکہ مسئلہ نحو کے طور پر ایک بات کہی تھی مگر اسی پر فضل ہو گیا اور باوجود فساد عقیدہ اور استحقاق نار کی بخش دیا گیا۔

بلی پر ترس کھانے سے نجات

اسی طرح ایک بزرگ جاڑے کی رات میں چلے جا رہے تھے راستے میں ایک بلی کا بچہ دیکھا جو سردی میں ٹھٹھر رہا تھا ان کو رحم آیا اور اسے گود میں اٹھا کر گھر لائے اور لحاف میں چھپالیا' جب انتقال ہوگیا تو پوچھا گیا بتلاؤ ہمارے واسطے کیا لائے۔ انہوں نے بہت سوچ سوچ کر یہ خیال کیا کہ اور اعمال تو میرے کسی قابل ہیں نہیں ان کو کیا پیش کروں لیکن الحمدللہ مجھے ایمان کی دولت حاصل ہے اس میں ریاء وغیرہ بھی کچھ نہیں ہوسکتا' بس ایمان کو پیش کرنا چاہیے۔ اس لیے عرض کیا کہ میں توحید لایا ہوں' وہاں سے اعتراض ہوا "تذکر لیلة اللبن" یعنی وہ دودھ والی رات بھی یاد ہے اس میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ تھا کہ ایک رات ان بزرگ نے دودھ پیا تھا اس کے بعد پیٹ میں درد ہوگیا صبح کو ان کے منہ سے یہ بات نکل گئی کہ رات دودھ پیا تھا اس سے پیٹ میں درد ہوگیا۔ حق تعالیٰ نے اس واقعہ کو یاد دلا کر توحید پر گرفت فرمائی کہ یہی توحید کا دعویٰ ہے کہ ہم کو چھوڑ کر تم نے دودھ کو مؤثر کہا اور درد کے فعل کو اس کی طرف منسوب کیا۔ اب تو بیچارے تھرا اٹھے۔ پھر ارشاد ہوا کہ تم نے اپنے دعوے کی حقیقت کو دیکھ لیا لو اب ہم تم کو ایک ایسے عمل پر بخشتے ہیں جس کی بابت تم کو یہ وہم بھی نہ تھا کہ یہ موجب نجات ہو جائے گا۔ تم نے ایک رات ایک بلی کے بچے کو جو سردی میں مر رہا تھا اپنے لحاف میں سلایا تھا اس نے تمہارے حق میں دعا کی تھی جو ہم نے قبول کر لی۔ جاؤ آج اس بلی کے بچے کی دعا پر تم کو بخشتے ہیں تم نے ہماری ایک مخلوق پر رحم کیا تھا تو ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم پر رحم کریں۔

مستحبات میں عنایات و برکات

تو صاحبو! یہ عنایات و برکات ہوتی ہیں احادیث میں ایسے بہت واقعات آئے ہیں کہ بعض لوگوں کی ایک ادنیٰ فعل مستحبات پر مغفرت ہوگئی۔ چنانچہ ایک فاحشہ عورت کا قصہ حدیث میں آتا ہے کہ اس نے گرمی کی دوپہر میں ایک کتے کو دیکھا جو پیاس کے مارے زمین کی ترمٹی چاٹ رہا تھا۔ اس کو رحم آیا اور پاس ہی ایک کنواں تھا اس سے پانی نکال کر کتے کو پلانا چاہا مگر دیکھا تو کنویں پر ڈول ہے نہ رسی۔ اب وہ سوچنے لگی کہ پانی کیونکر نکالوں۔ مثل مشہور ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ آخر اس نے ایک ترکیب نکالی وہ یہ کہ اپنی اوڑھنی کو تو رسی بنایا اور پیر میں چمڑے کا موزہ تھا اسے ڈول بنایا اس طرح پانی نکال کر کتے کو پلایا' پھر کچھ دنوں کے بعد اس کا انتقال ہوگیا اس فاحشہ کی مغفرت اس عمل پر ہوگئی۔ لیجئے ساری عمر تو سیہ کاری میں گزاری اور ایک ذرا سے عمل مستحب پر مغفرت ہوگئی۔ واقعی سچ ہے:

رحمت حق بہانہ می جوید رحمت حق بہانمی جوید

(اللہ تعالیٰ کی رحمت بہانہ ڈھونڈتی ہے رحمت حق قیمت نہیں مانگتی)

واقعات رحم سننے کے دواثر

اس لیے عمل کو حقیر نہ سمجھو نہ معلوم کون سا کام اس کو پسند آ جائے ۱۲) مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ رحمت پر بھروسہ کر کے عمل ہی چھوڑ دو۔ آج کل اس مذاق کے لوگ بھی ہیں جن پر واقعات رحمت کے سننے سے یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ عمل کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ بات یہ ہے کہ ان حکایات کی مثال بارش جیسی ہے اور یہی کیا جتنی بھی نصوص ہیں سب کی یہی مثال ہے تو بارش فی نفسہ نہایت لطیف اور روح پرور ہے مگر اس کا اثر ہر محل کی قابلیت وعدم قابلیت کے مناسب جدا ہوتا ہے۔ اگر عمدہ زمین ہے تو بارش سے اس میں پھول پھلواری اور عمدہ پھل پیدا ہوں گے اور اگر شور زمین ہے تو اس میں جتنی بارش ہوگی اتنے ہی کانٹے اور جھاڑ جھنکاڑ پیدا ہوں گے۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں:

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

(بارش کہ اس کی لطافت طبع سے اختلاف نہیں بلکہ زمین کی قابلیت میں اختلاف ہے۔ باغ لالہ اُگتا ہے اور بنجر زمین میں جھونڈ جھنکاڑ)

اسی طرح واقعات رحمت کو سن کر دو اثر ہوتے ہیں جو لوگ علیل المزاج ہیں وہ تو سمجھتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ ایک ذرا سے نکتہ پر بخش دیتے ہیں تو عمل صالح کی کیا ضرورت ہے اور جو شریف المزاج ہیں وہ اس کو سن کر پہلے سے زیادہ اطاعت پر گرتے ہیں اور کہتے ہیں:

تصدق اپنے خدا کے جاؤں یہ پیار آتا ہے مجھ کو انشا

ادھر سے ایسے گناہ پیہم ادھر سے وہ دمبدم عنایت

بلکہ میں ایک نئی بات کہتا ہوں کہ بعض اوقات بدوں سزا کے معافی دے دینے پر اہل دل اس قدر شرمندہ ہوتے ہیں کہ کچھ سزا مل جاتی تو اتنے شرمندہ نہ ہوتے' سزا مل جانے پر تو کچھ شرمندگی کم ہو جاتی مگر سنگین جرم کو ویسے ہی معاف کر دینا تو گویا ان کو ذبح کر دینا ہے۔ اب تو مارے ندامت کے وہ زمین میں گڑ جاتے ہیں۔ یہ ایک حالت ہے جس پر گزرتی ہے وہی اس کو سمجھ سکتا ہے اور جس نے اس حالت کو سمجھا ہوگا وہ اس آیت کی تفسیر بے تکلف سمجھ لے گا۔

"فَاَثَابَکُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِکَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰی مَافَاتَکُمْ"

(سو خدا تعالیٰ نے تم کو پاداش میں غم دیا بسبب غم دینے کے تاکہ تم مغموم نہ ہو اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل گئی ہے)

غزوہ احد میں حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اجتہادی غلطی

اس کا قصہ یہ ہے کہ جنگ احد میں بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ایک غلطی ہوگئی تھی وہ یہ کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ شروع ہونے سے پہلے جب لشکر کی صف بندی فرمائی تو پچاس آدمیوں کو پہاڑ کی ایک گھاٹی پر متعین فرمایا اور ان سے ارشاد فرمایا کہ تم یہاں سے بدون میری اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا خواہ ہمارے اوپر کچھ ہی حالت گزر جائے۔ اس گھاٹی کی اس قدر حفاظت کی یہ ضرورت تھی کہ اس راستے سے دشمن کے آ جانے کا اندیشہ تھا اور یہ گھاٹی لشکر اسلام کی پشت پر تھی۔ اگر دشمن کی فوج کا ایک دستہ ادھر سے آ جاتا اور ایک دستہ مقابل ہو کر لڑتا تو مسلمان بیچ میں گھر جاتے اور ظاہر ہے کہ آگے پیچھے دونوں طرف سے لشکر کا گھر جانا سخت خطرناک ہے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صف بندی کرتے ہوئے اس گھاٹی پر ایک جماعت کو تاکید کے ساتھ متعین فرمایا۔ خدا تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قوت انتظام بھی ایسا عطا فرمائی تھی کہ غیر اقوام بھی اس کو تسلیم کرتی ہیں حتیٰ کہ وہ تو اشاعت اسلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت عقلیہ ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں تو وہ ہم سے بھی زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت عقلیہ کے معتقد ہوئے کہ جس چیز کو ہم امداد غیبی کا نتیجہ سمجھتے ہیں وہ اس کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت عقلیہ پر محمول کرتے ہیں اس انتظام کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر اسلام کو حملے کی اجازت دی اور الحمد للہ تھوڑی ہی دیر میں مسلمانوں کو کھلی فتح حاصل ہوئی کہ ابو سفیان بن حرب جو اس وقت لشکر کفار کے سردار تھے مع لشکر کے بھاگ پڑے (اور جھنڈا بھی گر پڑا) حضرت ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ بھی بھاگیں اور بھاگتے ہوئے ان کے خلخال اور پنڈلیاں تک کھل گئیں، غرض کفار کو شکست فاش ہوئی اور مسلمان ان کے تعاقب میں دوڑے۔ ان پچاس آدمیوں میں اختلاف ہوا جو گھاٹی پر متعین تھے۔ بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہوگئی ہے اب ہم کو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس غرض کے لیے ہم کو یہاں متعین فرمایا تھا وہ غرض حاصل ہو چکی ہے اس لیے حکم قرار بھی ختم ہو گیا اب یہاں سے ہٹنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصود کے مخالفت نہ ہوگی اور ہم نے اب تک جنگ میں کچھ نہیں کیا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہیے۔ ہمارے بھائی کفار کا تعاقب کر رہے ہیں ہم کو مال غنیمت جمع کر لینا چاہیے۔ بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرما دیا تھا کہ بدون میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا اس لیے ہم کو بدون آپ کی اجازت کے ہرگز کچھ نہ کرنا چاہیے مگر پہلی رائے والوں

نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے یہ ان سے اجتہادی غلطی ہوئی اور گھاٹی پر صرف دس آدمی اور ایک افسر رہ گئے۔

حضرت خالد بن ولید اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے اور اس جنگ میں وہ لشکر کفار کی طرف تھے یہ ہمیشہ سے بڑے مدبر اور جنگ آزمودہ ہیں۔ انہوں نے اپنے جاسوس چھوڑ رکھے تھے تا کہ اس گھاٹ کی خبر وقتاً فوقتاً ان کو پہنچاتے رہیں۔ چنانچہ عین اس وقت جبکہ حضرت خالد مع تمام لشکر کفر کے بھاگے جا رہے تھے ان کے جاسوس نے اطلاع دی کہ اب وہ مورچہ خالی ہے اور بجز دس گیارہ آدمیوں کے وہاں کوئی نہیں ہے۔ حضرت خالد نے بھاگتے بھاگتے اپنا رخ پلٹا اور پانچ سو جوانوں کو ساتھ لے کر اس گھاٹی پر پہنچ گئے۔ دس گیارہ صحابی جو وہاں باقی رہ گئے تھے ان سے مقابل ہوئے مگر تھوڑی ہی دیر میں سب شہید ہو گئے اور حضرت خالد نے مسلمانوں کے پیچھے سے آ کر ان پر حملہ کر دیا یہ رنگ دیکھ کر کفار کا باقی لشکر بھی لوٹ پڑا اور مسلمان آگے پیچھے دونوں طرف سے نرغے میں آ گئے اور جس خطرے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حفاظت فرمائی تھی بعض صحابہ کی اجتہادی غلطی سے اس خطرے کا سامنا ہو گیا۔ چنانچہ ستر کے قریب مسلمان شہید ہوئے اور شیطان کی اس جھوٹی آواز پر کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قتل ہو گئے بہت سوں کے پیر اُکھڑ گئے اور جنگ کا نقشہ بالکل پلٹ گیا۔ (یہ سب کچھ ہوا مگر بایں ہمہ مسلمانوں کو شکست نہیں ہوئی کیونکہ شکست کے معنی یہ ہیں کہ لشکر مع سردار کے بھاگ جائے اور یہاں ایسا نہیں ہوا کیونکہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع چند جانثاروں کے میدان میں برابر جمے رہے آپ کبھی نہیں بھاگے اور تھوڑی دیر کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو حکم دیا کہ بھاگنے والوں کو پکارے تو فوراً میدان میں سب مسلمان آ موجود ہوئے ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو نمایاں فتح حاصل نہیں ہوئی ۱۲)

حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق تھے

حق تعالیٰ نے اس واقعہ میں مسلمانوں پر مصیبت آنے کا سبب ان صحابہ کی غلطی اجتہادی کو قرار دیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر گھاٹی سے ہٹ گئے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِمَا اَرٰاكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ" (اور تم کہنے پر نہ چلے بعد اس کے کہ تم کو تمہاری دل خواہ بات دکھا دی گئی تھی)

اس کے بعد بطور عتاب کے فرماتے ہیں: "فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَافَاتَكُمْ" (سو خدا تعالیٰ نے تم کو پاداش میں غم دیا بسبب غم دینے کے تا کہ تم مغموم نہ ہو اس چیز پر جو

تمہارے ہاتھ سے نکل گئی ہے) یعنی پھر خدا تعالیٰ نے تم کو بھی غم دیا بدلہ (اس) غم کے (جو تم نے نافرمانی کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا) اس کے بعد اس انتقام کی حکمت ارشاد فرماتے ہیں: "لِكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلٰى مَافَاتَكُمْ" تاکہ تم کو (انتقام لینے کے بعد) اس بات پر زیادہ رنج نہ ہو جو تم سے فوت ہوگئی تھی یہ وہی بات ہے جو میں نے ابھی بیان کی تھی کہ بعض شریف طبیعتوں پر خطا کا انتقام نہ لینے سے ندامت زیادہ غالب ہوتی ہے۔ اور انتقام لے لینے سے ندامت کم ہو جاتی ہے۔ اس بناء پر ارشاد ہے کہ ہم نے تم کو تھوڑی سی مصیبت اس لیے دیدی تاکہ بدون سزا کے معافی دینے سے تم پر ندامت و رنج کا زیادہ غلبہ نہ ہو۔ بعض مفسرین نے اس جگہ "لکیلا تحزنوا" (تاکہ تم مغموم نہ ہو) میں لاء نافیہ کو زائد مانا ہے۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ موقع عتاب کا ہے اور سزا تو رنج دینے ہی کے لیے دی جاتی ہے پھر اس کا کیا مطلب کہ تم کو اس لیے غم دیا تاکہ تم مافات پر رنج نہ کرو ان کے نزدیک لا کو اپنے معنی پر رکھ کر مطلب نہ بن سکا اس لیے انہوں نے لا کو زائد کہہ کر یہ مطلب بیان کیا کہ تم کو غم دیا تاکہ تم کو مافات پر رنج ہو مگر جس نے اس حالت کو سمجھا ہے جو میں نے ابھی بیان کی ہے وہ سمجھے گا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق تھے۔ اگر ان کی خطا بدون کسی انتقام کے معاف کر دی جاتی تو عمر بھر مارے ندامت کے آنکھ نہ اٹھا سکتے اس لیے ان کو تھوڑی سی مصیبت دے دی گئی تاکہ زیادہ رنج غالب نہ ہو۔ پس یہ کہنا غلط ہے کہ سزا ہمیشہ رنج دینے ہی کے لیے ہوا کرتی ہے بلکہ بعض دفعہ رنج کو کم کرنے کے لیے بھی سزا دی جایا کرتی ہے۔ اس حالت پر نظر کر کے تفسیر نہایت صاف ہے اور لا کو زائد کہنے کی کچھ ضرورت نہیں اب بتلایئے جس شخص کی یہ حالت ہو کہ خطا کر کے بدون سزا کے اسے چین ہی نہ پڑے وہ واقعات رحمت سن کر گناہوں پر دلیر ہوگا یا غیرت سے زمین میں گڑ جائے گا۔ یقیناً جو لوگ صحیح المزاج ہیں اور جن کو خدا تعالیٰ سے محبت کا تعلق ہے وہ تو واقعات رحمت سن کر پہلے سے زیادہ اطاعت کریں گے۔ نمک حرام ہے وہ نوکر جس کو خطا بدون سزا کے معاف کر دی جائے تو ناز کرنے لگے اور نافرمانی پر دلیر ہو جائے شریف وہ ہے جو آقا کی اس عنایت کو دیکھ کر عمر بھر کے لیے گڑ جائے اس لیے میں کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو واقعات رحمت سننے سے یہ ضرر ہوتا ہے کہ وہ عمل میں کوتاہی کرنے لگتے ہیں ان میں مرض ہے ان کو اپنی اصلاح کرنی چاہیے اور حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق محبت پیدا کرنا چاہیے پھر ان پر مستحبات کی بدولت عمر بھر کا دلدر دھل جاتا ہے تو یہ کتنی بڑی رحمت ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو مستحبات کی تعلیم فرمائی۔ اب وہ شبہ بالکل جاتا رہا کہ قرآن کا ہر جزو ضروری کہا ہے بلکہ بعض مستحبات بھی ہیں جو غیر ضروری ہیں۔

اکثر سامعین کی ضرورت کے مطابق وعظ

اس تقریر سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ مستحبات بھی تعلیم کے درجے میں تو نہایت ہی ضروری ہیں اور باعتبار ثمرات کے عمل میں بھی ایک گونہ ضروری ہیں اب وہ دعویٰ صحیح رہا کہ خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا ہر جز وضروری ہے اور میرا کہنا بھی صحیح ہو گیا کہ اس آیت میں مثل دوسری آیات کے ایک نہایت ضروری مضمون ہے۔ رہی یہ بات کہ پھر اسی کو کیوں اختیار کیا گیا تو اصل یہ ہے کہ ضروری تو سب ہیں مگر کسی وقت کسی خاص مضمون کو زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس لئے موقع اور وقت کے لحاظ سے کسی خاص مضمون کو ترجیح ہو جاتی ہے۔ کبھی ایک تعلیم کی زیادہ ضرورت ہے، کبھی دوسری تعلیم کی اور اس کے لیے خدا تعالیٰ ہر ضرورت کے موقعہ پر اپنے بندوں کے دل میں القاء کر دیتے ہیں کہ اس وقت اس مضمون کو بیان کرنا چاہیے یہ کام بھی وہ خود ہی کرتے ہیں ورنہ بیان کرنے والے کو کیا معلوم ہو سکتا ہے کہ اس وقت سامعین کو کس مضمون کی زیادہ ضرورت ہے، میں خود اپنی حالت دیکھتا ہوں کہ بعض دفعہ سوچنے سے کوئی مضمون ذہن میں نہیں آتا بلکہ اکثر خود بخود القاء ہو جاتا ہے سفر میں جہاں کہیں بیان ہوتا ہے تو اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی نے ہماری حالت اس سے کہہ دی ہے کیونکہ بیان ان کی حالت کے مناسب ہوتا ہے۔ مگر الحمدللہ میری یہ عادت نہیں ہے کہ مسلمانوں کی حالت کا تجسس کروں نہ مجھ سے فرمائشی مضمون کبھی بیان ہو سکے بلکہ توکل علی اللہ بیان شروع کر دیتا ہوں اور جو باتیں اللہ تعالیٰ دل میں ڈال دیتے ہیں بیان کر دیتا ہوں اور وہ اکثر سامعین کی ضرورت وحالت کے مطابق ہوتی ہے اس سے لوگوں کو شبہ ہو جاتا ہے کہ کسی نے ہماری حالت اس سے کہہ دی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ اس کو کشف سمجھیں مگر مجھے تو عمر بھر بھی کشف نہیں ہوا اور اس میں کشف کی کیا بات ہے بس حق تعالیٰ جس سے کام لینا چاہتے ہیں لے لیتے ہیں۔ اتنی بات تو ہے کہ بحمداللہ بیان کے وقت یہ نیت ضرور ہوتی ہے کہ اے اللہ ایسا مضمون بیان ہو جو ان لوگوں کی ضرورت کا ہو جس سے ان کی اصلاح ہو جائے۔ خدا تعالیٰ کو تو علم غیب ہے وہ سب کی حالت جانتے ہیں وہ اس نیت کے بعد ضرورت وحالت کے مطابق مضمون دل میں ڈال دیتے ہیں کہ آج یہ بیان کرو۔

یہی وجہ ہے کہ بعض ہفتوں میں کوئی بات ذہن میں نہیں آتی تو میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آج یہ آیت بیان کے لیے ذہن میں آئی تو میں سمجھتا ہوں کہ اس مضمون کی دوسرے مضامین سے ضرورت زیادہ ہے اس لیے اس کو اختیار کیا۔

بدحالی کا سہل علاج

بہرحال اس آیت میں ایک ضروری مضمون ہے جس میں حق تعالیٰ نے ہماری بدحالی کا ایک نہایت سہل علاج بیان فرمایا ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ ہم لوگ بدحال ہیں کوئی شخص بھی اس سے بری نہیں۔ ہاں اتنا فرق ہے کہ کسی کی تباہی کم ہے کسی کی زیادہ' باقی بدحالی میں سب مبتلا ہیں۔ الا ماشاء اللہ اور جن کی تباہی کم ہے وہ بہ نسبت ان لوگوں کے زیادہ پریشان ہیں جن کی تباہی زیادہ ہے اس لیے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس مضمون کی ضرورت انہی لوگوں کو ہے جو بہت تباہ حال ہیں اور جو کم تباہ حال ہیں ان کو ضرورت ہی نہیں یا کم ضرورت ہے بلکہ برعکس حالت یہ ہے کہ جن کی تباہی کم ہے ان کو اس کی ضرورت زیادہ ہے کیونکہ وہ بہ نسبت دوسروں کے زیادہ پریشان ہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ہم نے اپنے بعض دوستوں کو دیکھا ہے جن پر قرض بہت زیادہ ہے کہ وہ بہ نسبت ان لوگوں کے زیادہ فکر میں ہیں جن پر قرض تھوڑا سا ہے۔ بس ان کو تو قرض کی عادت ہوگئی ہے اور اس کے بار کا حس ہی نہیں رہا اب وہ قرض لینے میں بڑے دلیر ہوگئے ہیں اور جس کو قرض کی عادت نہیں اور اس کے ذمہ تھوڑا سا قرض ہوگیا ہے جس کے ادا ہونے کی توقع بھی ہے وہ زیادہ پریشان ہے۔ بعض دفعہ اس کو راتوں کی نیند نہیں آتی اور وہ ان لوگوں کی حالت پر تعجب کرتا ہے جو ہزاروں کے مقروض ہو کر بھی رات کو چین سے سوتے ہیں اور اس کا راز یہ ہے کہ مصیبت کی فکر اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک اس کے زوال کی امید ہو اور جب زوال کی امید نہ رہے تو اب فکر نہیں رہتی بلکہ وہ طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے جیسے دائمی مرض طبیعت ثانیہ بن جاتا ہے۔

اسی طرح جو لوگ کم گناہ کرتے ہیں وہ زیادہ مغموم و پریشان ہیں اور جو زیادہ گناہ کرتے ہیں وہ زیادہ پریشان نہیں ہیں کیونکہ وہ تو بے حس ہوجاتے ہیں بلکہ بعض اوقات انسان کثرت گناہ کے سبب مایوس ہوجاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ اب میری مغفرت تو ہی نہیں سکتی پھر لذات میں بھی کیوں کمی کروں پھر وہ دل کھول کر گناہ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ جب مرنے کا وقت آتا ہے تو وہ اس وقت بھی توبہ و استغفار نہیں کرتا اور اگر اس سے توبہ کو کہا جائے تو صاف انکار کردیتا ہے اور کہتا ہے کہ اتنے گناہوں کو ایک توبہ کیا کافی ہوگی۔

چنانچہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک شخص کو مرتے وقت کلمہ پڑھنے کو کہا گیا تو اس نے انکار کردیا اور کہا کہ ایک کلمہ سے کیا ہوگا میرے تو گناہ اس قدر ہیں کہ ان کو ہزار کلمے بھی نہیں دھو سکتے یہ مایوسی تھی اور خدا کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔

کثرت گناہ کا اثر

تو بعض دفعہ کثرت گناہ انسان کو مایوس بنا کر کفر تک پہنچا دیتے ہیں (خدا ہر مسلمان کو اس سے بچائے۔ آمین) کثرت گناہ میں تو یہ اثر ہے ہی مگر آپ حیرت کریں گے کہ بعض دفعہ یہی اثر اطاعت میں بھی ہو جاتا ہے۔ یہ بات کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتی مگر قربان جایئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ نے اس کو سمجھا ہے اور یہاں سے آپ کو معلوم ہوگا کہ واقعی ہم کو کیسے کامل واکمل رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) عطا ہوئے ہیں کہ آپ کی نظر کہاں تک پہنچی ہے اور یہی چیز ہے جو صرف انبیاء علیہم السلام کو عطا ہوئی ہے۔ اسی سے انبیاء علیہم السلام حکماء سے ممتاز ہیں۔ حکماء کے پاس صرف محسوسات کا علم ہے اور وہ محسوسات ہی کے خواص کو جانتے ہیں' انہی کی ترکیب و تحلیل و کیمیاوی طریقہ سے کر سکتے ہیں بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ وہ معانی معقولہ کے خواص کو جانتے ہیں اور جو چیز نظر نہیں آتی بلکہ محض اعتباری و عقلی شے ہے اس کے آثار کو انہوں نے ایسا صحیح سمجھا ہے کہ کیا کوئی کیمیاوی طریقے سے ان کی تحلیل کر کے سمجھے گا اور یہیں سے آپ کو فقہاء کی بھی قدر ہوگی کیونکہ یہ حضرات علوم انبیاء ہی کے حامل ہیں اور معانی معقولہ ہی کی ترکیب و تحلیل و بیان خواص میں مشغول ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باریک بینی

تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باریک بینی دیکھئے کہ اعمال شر پر برا اثر مرتب ہوتا تو کسی کی سمجھ میں آ سکتا تھا مگر آپ کی نظر دور پہنچی کہ بعض دفعہ اعمال خیر پر بھی برا اثر مرتب ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو آپ کی شان تو یہ ہے:

عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمِیْ وَاَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ○

''میرے رب نے مجھ کو تعلیم دی' پس بہت اچھی ہوئی میری تعلیم اور اللہ تعالیٰ نے مجھے ادب دیا پس اچھی ہوئی میری تادیب''

جس کو خدا تعالیٰ نے لکھایا پڑھایا ہو اس کی نظر جتنی دور بھی پہنچے کم ہے۔

طاعات میں اعتدال کی عجیب مثال

بظاہر تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ طاعت جتنی بھی ہو اچھی ہے' طاعت کے لیے کوئی حد نہ ہونا چاہیے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سمجھا کہ طاعت کے لیے بھی ایک حد ہے اور اسی حد

تک وہ محمود ہے اس سے آگے بڑھنا اچھا نہیں ورنہ اثر برا پیدا ہوگا اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے مریض کو دوا کرنا اچھا ہے اور ترک دوا برا ہے لیکن دوا کرنے کی بھی ایک حد ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ دوا اچھی شے ہے تو اس کے لیے کوئی حد ہی نہ ہو بلکہ یہی حال طاعات کا ہے کہ ان کے لیے بھی ایک حد ہے۔ گو وہ فی نفسہ اچھی چیزیں ہیں ان کو انبیاء علیہم السلام ہی نے سمجھا ہے جو اطباء روحانی ہیں۔ انہوں نے بتلا دیا کہ طاعات بھی دوا کی طرح ہے جیسے ہر دوا کے لیے مقدار اکل وشرب متعلق ہوتی ہے طاعات کے لیے بھی درجات معین ہیں۔ چنانچہ خوف الٰہی ایک بڑی طاعت ہے جس کا جابجا نصوص میں حکم ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھی ایک حد بیان فرمائی ہے۔

خوف کا اعتدال

ایک دعا میں آپ فرماتے ہیں: "اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ مِنْ خَشْیَتِکَ مَاتَحُوْلُ بِہٖ بَیْنَنَا وَبَیْنَ مَعَاصِیْکَ" یعنی اے اللہ میں آپ سے آپ کا اتنا خوف مانگتا ہوں جو مجھ میں اور معاصی میں حائل ہو جائے۔ اس میں آپ نے بتلا دیا کہ خوف (طبعی) کا ہر درجہ مطلوب نہیں بلکہ وہ اسی قدر مطلوب ہے کہ خدا کی نافرمانی سے روک دے کیونکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ خوف (طبعی) کا زیادہ بڑھ جانا مضر ہے کیونکہ ایسے شخص کو ہر وقت حق تعالیٰ کے قہر ہی پر نظر ہوگی تو کوئی عمل بد قابل معافی نہ ہوگا اور عظمت پر نظر کر کے اپنا کوئی عمل قابل قبول نظر نہ آئے گا اور اس کو نجات کی توقع نہ رہے گی۔ نتیجہ یہ کہ رحمت حق سے مایوس ہو جائے گا اور مایوسی کفر ہے تو کیا ٹھکانا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی راز دانی کا۔ بھلا کون عاقل اس کی تجویز کر سکتا ہے کہ طاعت بھی سبب کفر ہو سکتی ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سمجھا کہ غلبہ خوف بعض دفعہ سبب یاس ہو جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یاس کفر ہے: "فَاِنَّہٗ لَایَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ" (اللہ تعالیٰ کی رحمت سے سوائے کافروں کو مایوس نہیں ہونا)

اس لیے آپ نے خوف کے سوال میں یہ قید لگادی: "مَاتَحُوْلُ بِہٖ بَیْنَنَا وَبَیْنَ مَعَاصِیْکَ" کہ میں اتنا خوف مانگتا ہوں جو معاصی سے روک دے اور بس یہی وہ علوم ہیں جن کو دیکھ کر حکماء بھی دنگ رہ جاتے تھے اور اسی لیے انہوں نے نبوت کی حقیقت کو اپنی کتابوں میں مانا ہے کہ بعض افراد ایسے ہو سکتے ہیں جن پر بلاواسطہ مبداء فیاض کی طرف سے علوم فائض ہوں اور اسی لیے وہ انبیاء علیہم السلام کی نبوت کا اقرار کرتے تھے۔ چنانچہ کسی حکیم نے اپنے زمانہ کے نبی کی نبوت کا انکار نہیں کیا بلکہ ان کا اصحاب قوت قدسیہ ہونا تسلیم کیا وہ ان کے علوم کو دیکھ کر یہ کہہ اٹھے کہ

اتنا بڑا علم کسی ریاضت یا تعلیم سے حاصل نہیں ہوسکتا تو معلوم ہوتا ہے کہ مبداء فیاض سے ان کو علم عطا ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ حکماء نے ایک غلطی بھی کی وہ یہ کہ نبوت کو تسلیم کر کے یہ کہا کہ یہ امین کے واسطے نبی ہیں۔ (یعنی جاہلوں کے واسطے) ہمارے واسطے نبی نہیں ہیں اور نہ ہی ہم کو ان کے اتباع کی ضرورت ہے۔ "لانا قوم قد هذبنا نفوسنا بالعلم" کیونکہ ہم نے علوم سے اپنے نفوس کو مہذب بنالیا ہے اب ہم کو کسی مصلح کی ضرورت نہیں' قرآن میں بقول بعض مفسرین "فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ" (اپنے علم سے جو ان کو حاصل ہے خوش ہیں) ایسے حکماء کے بارے میں ہے ان کا یہ قول ایسا تھا جیسے بعض یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تسلیم کر کے یہ کہتے تھے کہ آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو ہیں مگر اہل عرب کے واسطے ہیں۔ ہمارے واسطے نہیں ہیں کیونکہ ہم خود صاحب کتاب ہیں اور وہ کتاب ہمارے لیے موجد ہے۔ اس کا جواب علماء نے خوب دیا کہ تمہارے نزدیک وہ نبی تو ہیں اور نبی کے لیے صادق ہونا ضروری ہے اور وہی نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ فرماتے ہیں کہ میں تمام عالم کی طرف مبعوث ہوا ہوں اور سب پر میرا اتباع لازم ہے بدون میرے اتباع کے کسی کی نجات نہیں ہوسکتی تم ان کے اس قول کو کیوں نہیں تسلیم کرتے حالانکہ یہ تسلیم کرتے ہو کہ نبی کی بات جھوٹی نہیں ہوسکتی تو ان کو اس بات میں بھی سچا ماننا پڑے گا۔

یونانی حکماء کی ایک غلطی

اس بات کا سچا ماننا تمہارے اس قول کے کذب کو مستلزم ہے کہ وہ خاص اہل عرب کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں ہمارے واسطے نہیں ہیں۔ پس ان کے پاس کچھ جواب نہ تھا تو جس طرح یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص اہل عرب کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کہا تھا اسی طرح حکماء بھی انبیاء علیہم السلام کی نبوت کو تسلیم کر کے انہیں خاص عوام کے لیے نبی کہتے تھے اپنے واسطے نبی نہ کہتے تھے۔ خیر یہ غلطی تو ان سے ہوئی مگر انبیاء کے علوم عالیہ کی وجہ سے نبوت کا انکار نہیں کیا بلکہ اس کی حقیقت کو تسلیم کر کے اپنی کتابوں میں علم النوامیس کے عنوان سے اس کو ذکر کیا ہے اور آج کل کے حکماء جو حقیقت نبوت ہی کا انکار کرتے ہیں تو حقیقت میں یہ حکماء نہیں ہیں بلکہ یہ لوگ واقع میں صناع ہیں کہ عجیب وغریب صنعتوں کے موجد ہیں' گو صنعت بھی مفید چیز ہے۔ مگر اس سے آدمی حکیم نہیں بن سکتا حکمت علوم معانی سے حاصل ہوتی ہے اور حکماء عصر کے پاس معانی خاک نہیں ہیں بس ان کے پاس جو کچھ ہے مشاہدہ ہے ان سے بہتر حکماء تو وہی تھے یعنی حکماء یونانی کیونکہ وہ لوگ اہل معانی تھے۔ گو معانی میں انہوں نے غلطیاں کی ہیں اور

ایسی غلطیاں کی ہیں کہ علوم نبوت ظاہر ہونے کے بعد مسلمانوں کا ایک بچہ بھی ان کی غلطی پکڑ سکتا ہے مگر پھر بھی ان کے پاس کچھ معانی عقلیہ کا ذخیرہ تھا تو سہی۔ اسی لیے وہ حقیقت نبوت کا انکار نہ کر سکے' حکماء عصر کے پاس تو علوم عقلیہ ہیں ہی نہیں۔ اس لیے وہ انبیاء علیہم السلام کے علوم کی قدر نہیں جان سکتے۔ یہی وجہ ہے ان کے انکار نبوت کی۔

گناہوں کی کثرت مایوسی کا باعث بن جاتی ہے

میں یہ کہہ رہا تھا کہ بعض دفعہ زیادہ گناہوں کی وجہ سے انسان کو مایوسی ہو جاتی ہے تو وہ دل کھول کر گناہ پر دلیر ہو جاتا ہے اب اس کو گناہوں سے زیادہ پریشانی نہیں ہوتی (کیونکہ مثل مشہور ہے "الیاس احدی الراحتین" (کہ ناامیدی سے بھی گونہ راحت ہو جاتی ہے ۱۲ ظ) اور جس نے تھوڑے گناہ کیے ہیں وہ رحمت ومغفرت سے مایوس نہیں ہے بلکہ اس کو امید ہے اور امید کی وجہ سے معانی کی فکر بھی ہے تو وہ زیادہ پریشان ہے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ جو لوگ کم تباہ حال ہیں ان کو اس مضمون کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ وہ زیادہ پریشان ہیں۔

ظاہر میں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ گناہوں کی کثرت سے غم زیادہ ہوتا ہوگا مگر واقع میں اس کے برعکس ہے کہ تھوڑے گناہ والے کو زیادہ غم ہوتا ہے اور ان میں سے جو خاص لوگ ہیں ان کی تو یہ حالت ہے:

بردل سالک ہزاراں غم بود　　گر زباغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں' اگر اس کی باطنی حالت میں ایک تنکا کم ہو جاتا ہے)

یعنی گناہ تو گناہ اگر اس کی قلبی حالت میں ذرا سا بھی تغیر ہو جاتا یا ایک دار بھی کم ہو جاتا ہے تو اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ جاتا ہے اگر اس وقت کوئی شیخ محقق مل گیا تو اس کی تسلی سے سنبھل جاتا ہے ورنہ بعض دفعہ ہلاکت تک کی نوبت آ جاتی ہے چونکہ مولانا محقق ہیں اس لیے دوسری جگہ تسلیم بھی فرماتے ہیں۔

چونکہ قبضے آیدت اے راہرو　　آں صلاح تست آیس دل شو

چونکہ قبض آمد تو در وے بسط بیں　　تازہ باش و چیں می فگن برجبیں

(اے سالک جب بچہ کو قبض کی حالت پیش آئے تو ناامید مت ہو وہ تیری اصلاح کے لیے ہے جب کہ قبض پیش آئے تو اس میں بسط دیکھ کر خوش وخرم ہو پریشانی پر بل نہ ڈال)

تسلی شیخ کے بعد پریشان ہونا برا ہے

اس کا یہ مطلب کوئی صاحب نہ سمجھیں کہ قبض سے تنگ آنا اور پریشان ہونا نازیبا حرکت اور بری حالت ہے' ہرگز نہیں کیونکہ قبض سے پریشانی کا ہونا تو طبعی اور لازمی امر ہے ہاں شیخ کی تسلی

کے بعد عقلاً پریشان رہنا یہ برا ہے اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو تسلی قبض پر نہیں ہوتی یعنی شیخ کی تسلی کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ خود قبض کی ذات سے راضی رہو اور یہ بالذات مطلوب حالت ہے اس پر خوش رہو بلکہ تسلی ان مصالح اور منافع پر ہوتی ہے جو اکثر قبض پر مرتب ہو جاتے ہیں (اسی کی ایسی مثال ہے جیسے بیمار کی تسلی کی جاتی ہے کہ میاں بخار آ گیا تو کیا حرج ہے بدن کا تنقیہ ہو گیا یا گناہوں کا کفارہ ہو گیا۔ تو مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بیماری مطلوب شے ہے اس پر راضی رہو بلکہ بیماری سے جو بدن کا تنقیہ ہو گیا ہے یا اور بعض فوائد حاصل ہو گئے ہیں ان پر تسلی کی جاتی ہے کہ ان منافع کا خیال کر کے پریشانی کو کم کرنا چاہیے ورنہ جس طرح بیماری خود فی ذاتہ تسلی کے قابل نہیں ہے اسی طرح قبض پر اپنی ذات سے تسلی کی شے نہیں ہے ۱۲ ظ)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی ثقل وحی کی کیفیت

ہم اور آپ تو کیا چیز ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب اول وحی نازل ہوئی ہے تو اس کا قصد حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ پہلے دن ثقل وحی سے یا خوف عظمت الٰہی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بخار آ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھبرائے ہوئے دولت خانہ پر تشریف لائے اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے جب کچھ افاقہ ہوا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ بیان فرمایا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو تورات وانجیل کے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے وحی کا قصہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کی اور یہ بھی کہا کہ افسوس آپ ﷺ کی قوم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ سے ایک دن نکالے گی۔ اگر میں زندہ رہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری مدد کروں گا۔ غرض ہر طرح آپ کو معلوم ہو گیا کہ میں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوا ہوں۔

قبض میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال

اس کے بعد تین سال تک وحی منقطع ہو گئی۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر پریشان تھے کہ بعض دفعہ پہاڑ پر چڑھ کر ارادہ کرتے کہ یہاں سے گرا کر اپنے کو ہلاک کر دوں' یہ قبض ہی کی حالت تھی۔ اسی کو مولانا نے فرمایا ہے:

بردل سالک ہزاراں غم بود　　گر زباغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم وارد ہوتے ہیں اگر اپنی قلبی حالت میں ذرہ بھر بھی کمی پاتا ہے)

آپ اشتیاق وحی میں بے چین تھے اور اس بے چینی میں کسی وقت اپنے کو ہلاک کرنے کا

قصد فرماتے تھے کہ فوراً حضرت جبرائیل علیہ السلام ظاہر ہوتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی فرماتے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم "ابدا افضل ما صلی علی احد من خلقه ۱۲ "رحمت بھیجے اللہ تعالیٰ آپ پر ہمیشہ افضل رحمت جو اللہ تعالیٰ اپنی کسی مخلوق پر بھیجتے ہیں)

آپ اس امت کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ خدا تعالیٰ نے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنایا ہے تو جب قبض میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی تو دوسرا کون ہے جو اس پر راضی ہو اور ذرا بھی پریشان نہ ہو ہاں اس پر رضا اس طرح ہو جاتی ہے کہ اس کے مصالح و منافع کے استحضار سے کسی قدر قلب کو شگفتگی ہو جاتی ہے پھر ان مصالح کا علم کبھی تو اجمالی ہوتا ہے جس کو مولانا نے ان اشعار میں بیان فرمایا ہے:

چونکہ قبضے آیدت اے راہرو　　　آں صلاح تست آئیس دل شو

(جب تجھ کو قبض پیش آئے ناامید مت ہو وہ تیری مصلحت کے لیے ہے)

محقق کے ارشاد سے اجمالاً معلوم ہو گیا کہ قبض میں بھی مصالح ہوتی ہیں۔ یہ کوئی بری حالت نہیں جس سے سالک خواہ مخواہ اپنے کو مردود سمجھنے لگے اور فرماتے ہیں:

چونکہ قبض آید تو دروے بسط بیں　　　تازہ باش و چیں میفکن برجبیں

(جب تجھ کو قبض پیش آئے تو اس میں بسط کا مشاہدہ کر کے خوش و خرم ہو اور پیشانی پر بل نہ ڈال)

قبض میں مصلحت

اس میں یہ بتلا دیا کہ قبض کے بعد بہت قوی ہوا ہے۔ یہ کلمہ دراصل ایسا ہے جیسے "**ان مع العسر یسرا**" (یقیناً دشواری کے بعد آسانی) میں کلمہ مع بمعنی بعد تم اس کا خیال کر کے شاداں و فرحاں رہو پریشان نہ ہو۔ یہ تو اجمالی مصالح ہیں اور کبھی بعض مصالح کا تفصیلی علم بھی ہو جاتا ہے تو اس سے پوری تسلی ہو جاتی ہے مثلاً کبھی قبض میں یہ مصلحت ہوتی ہے کہ بعض اوقات سالک پر بسط کی حالت میں کسی وارد کے عطا ہونے سے ایک ناز کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اس وقت اگر حق تعالیٰ دستگیری نہ فرمائیں تو یہ کبر و عجب میں مبتلا ہو کر تباہ و برباد ہو جائے۔ حق تعالیٰ نے اس کی یوں دستگیری فرمائی کہ قبض طاری کر دیا اور ساری کیفیات و واردات کو سلب فرما لیا۔ اب اس کی یہ حالت ہے کہ بجائے ناز و انداز کے یوں دیکھتا ہے کہ میں ساری دنیا سے زیادہ ذلیل ہوں اور اس وقت سچ مچ اس کو اپنے سے زیادہ ذلیل و حقیر کوئی نظر نہیں آتا۔ چنانچہ ایک سالک نے قبض کی حالت میں مجھ سے یہ بیان کیا کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں فرعون و ہامان سے بھی بدتر ہوں۔ یہ بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی اور جب تک انسان ایسا ہی نہ بن جائے اس وقت تک اہل دل کا کلام سمجھ میں آ بھی نہیں سکتا۔

سالک کا حال

حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عارف اس وقت تک عارف نہیں ہوتا جب تک اپنے کو کافر فرنگ سے بدتر نہ سمجھے۔ صاحب سالک پر واقعی ایسی حالت گزرتی ہے کہ وہ سچ مچ تمام مخلوق سے اپنے کو بدتر سمجھتا ہے۔ خیر اگر کسی پر یہ حالت نہ گزری ہو تو وہ اس کلام کو انجام ہی کے اعتبار سے سمجھ لے کہ نہ معلوم میرا انجام کیسا ممکن ہے کہ کافر فرنگ کا انجام مجھ سے اچھا ہو جائے کیونکہ حالت یہ ہے کہ

گہ رشک برد فرشتہ برپا کی ما　　گہ خندہ زند دیوز ناپاکی ما
ایماں چو سلامت بہ گو بریم　　تحقیق شود پاکی و ناپاکی ما

(کبھی فرشتہ ہماری پاکی پر رشک کرتا ہے اور کبھی ہماری ناپاکی پر شیطان بھی ہنستا ہے' ایمان اگر قبر تک سالم لے جائیں تو ہماری پاکی اور ناپاکی کی تحقیق ہو)

تو اپنے دل کو یہی سمجھنا چاہیے کہ انجام معلوم ہونے سے پہلے مجھے کیا حق ہے کہ اپنے کو کسی سے افضل اور اچھا سمجھوں (اور اگر سب سے بدتر ہونا بھی متیقن نہیں مگر محتمل تو ہے اور احتمال کی بناء پر اپنے کو اچھا سمجھنا مضر اور برا سمجھنا مفید ہے۔ بشرطیکہ یاس کا درجہ نہ ہو اس لیے اپنے کو سب سے برا ہی سمجھنا چاہیے ۱۲ ظ)

یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے

ایک شخص نے مجھ سے یہ پوچھا کہ یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے' میں نے کہا جائز ہے۔ اگر یہ اطمینان ہو کہ ہم اس سے اچھی حالت میں مریں گے تو واقعی ہمیں کسی سے اپنے کو اچھا سمجھنے کا کیا حق ہے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ انجام کی کچھ خبر ہی نہیں ہے کہ کیا ہوگا۔ خوب کہا ہے:

غافل مرد کہ مرکب مردان مردرا　　درسنگلاخ بادیہ پیا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش　　ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(غافل مت چل مرکب مردان خدا نے سنگلاخ جنگل میں راستہ قطع کیا ہے اور ناامید مت ہو کہ زندان بادہ نوش اچانک ایک ہی نالہ میں منزل مقصود کو پہنچ گئے)

خاتمہ کا خیال اور خود کو حقیر سمجھنا

تو صوفیاء کے اس کلام کی ایک موٹی سی توجیہ تو یہی ہے کہ خاتمہ کا خیال کر کے اپنے کو حقیر و ذلیل سمجھتا رہے لیکن یہ تو عقل کے سمجھنے کے واسطے توجیہ ہے اور اہل حال تو خاتمہ کے خیال سے قطع

نظر کر کے بھی حالت موجودہ ہی میں اپنے کو سب سے بدتر سمجھتے ہیں' باقی اس کو میں سمجھا نہیں سکتا۔ بس ایک حالت ہے جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔

پر سید یکے کہ عاشقی چیست　　　　گفتم کہ چوما شوی بدانی

(کسی نے کہا کہ عاشقی کس کو کہتے ہیں' میں نے جواب دیا کہ جب تو ہم جیسا ہو جائے گا اس کو جان لے گا)

بس اس وقت تو تقلیداً مان لیا جائے کہ سالکین پر ایسی حالت گزرتی ہے جیسا کہ ہمارے ایک دوست نے کہا تھا کہ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں فرعون و ہامان سے بھی بدتر ہوں تو جب بسط میں غلبہ واردات سے ناز کی سی کیفیت سالک میں پیدا ہونے لگتی ہے اس وقت حق تعالیٰ اس پر قبض طاری کر دیتے ہیں تا کہ وہ اپنی عبدیت کا مشاہدہ کرے اور اپنے کو سب سے ذلیل وحقیر سمجھنے لگے اور دعویٰ اور ناز نہ کرے تو دیکھئے یہ کتنی بڑی رحمت ہے۔ اگر اس وقت قبض وارد نہ کیا جاتا تو بسط میں تو یہ تباہ ہو جاتا کبھی قبض میں یہ مصلحت ہوتی ہے کہ سالک کے لیے انوار حجاب راہ بنے ہوئے تھے ذکر میں جو اس پر تجلیات وانوار کا انکشاف ہوتا تھا یہ انہی کی سیر میں مشغول ہو گیا اور انہی پر اکتفا کرنے لگا حالانکہ مقصود توجہ الی الحق ہے۔

حجاب کی دو قسمیں

حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حجاب دو قسم کے ہیں ایک حجاب ظلمانی' ایک حجاب نورانی' حجاب ظلمانی تو یہی وساوس وخطرات ہیں جو ذکر کے وقت دنیوی امور کے متعلق قلب میں آیا کرتے ہیں۔ ان پر توجہ کرنا تو ظاہر ہے کہ مضر ہے اور حجاب نورانی یہ ہے کہ عالم ملکوت کے انوار تجلیات مکشوف ہوں وہ بھی ایک عالم ہے جو کہ غیر خدا ہے اس لیے اس کی کیفیات پر بھی توجہ نہ کرنا چاہیے۔ حضرت حاجی صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ حجاب نورانی ظلمانی سے اشد ہے کیونکہ اس میں بوجہ نورانی ہیئت کے زیادہ مشغولیت ہوتی ہے۔ دوسرے وہ ایک نئی سی چیز ہے اس کو دیکھ کر سالک سمجھتا ہے کہ میں کامل ہو گیا حالانکہ وہ ہنوز غیر حق کے ساتھ الجھا ہوا ہے کیونکہ وہ انوار وتجلیات بھی اس کے شاغل عن الحق (حق سے پھرنے والے) ہیں اور اس کو ان میں ایک لذت بھی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ کسی وقت محجوب ہو جاتے ہیں تو بڑا رنج ہوتا ہے تو میاں اب تک اپنی لذت ہی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ مقصود تک رسائی کہاں اس وقت حق تعالیٰ قبض طاری کر کے ان انوار وتجلیات کو سلب کر لیتے ہیں تا کہ سالک غیر حق سے ہٹ کر حق

تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور اس میں بندہ کی بڑی مصلحت ہوتی ہے ورنہ مقصود سے رہ جاتا۔ پس اگر کسی وقت تمام انوار کو چھپا دیا جائے تو یہ حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے ایسے وقت گھبرانا نہ چاہیے۔ غرض یہ چند مثالیں ہیں تفصیلی حکمتوں کی ان کے سوا اور بھی مصلحتیں قبض میں ہوتی ہیں جو اکثر سالک کو وقت پر خود ہی معلوم ہو جاتی ہیں تو ان اجمالی یا تفصیلی حکمتوں کے استحضار سے قبض میں تسلی ہو جاتی ہے اور کچھ شگفتگی قلب میں آ جاتی ہے ورنہ درحقیقت قبض تسلی کی چیز نہیں وہ تو موجب غم ہی ہوتا ہے۔ دراصل تسلی تو جب ہی ہوتی ہے جب کسی قسم کا بسط ہو (معلومات دنیا میں بھی تو یہ بات ظاہر ہے کہ مال و متاع کا چوری ہو جانا یا لٹ جانا تو موجب رنج ہی ہے یہ اور بات ہے کہ ثواب آخرت سوچ کر پامال جانے کے بعد جو حفاظت و نگہداشت سے بےفکری ہوگئی۔ اس راحت کو متحضر کر کے دل کو سمجھا لیا جائے مگر نفس مال کا چوری ہو جانا ایسی چیز نہیں کہ انسان خود اس پر طبعاً راضی ہو جائے اس سے تو ایک دفعہ تو صدمہ ہو ہی گا اور اس کا تصور قائم کر لینا بھی موجب الم ہوگا۔ ہاں اس کے تصور کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں دل لگایا جائے تو کچھ تسلی ہو سکتی ہے اسی طرح قبض بھی بظاہر متاع باطن کا لٹ جانا اس سے صدمہ اور پریشانی کا ہونا لازمی و طبعی امر ہے۔ گو اس کے مصالح و منافع کی طرف قلب کو متوجہ کر کے تسلی حاصل ہو جائے۔ مگر خود نفس قبض پر دل راضی نہیں ہوتا نہ اپنی ذات سے تسلی کی شے ہے بلکہ جس طرح دنیا کے معاملات میں اصل تسلی کی چیز یہ ہے کہ روزانہ نئی آمدنی ہوتی رہے اور ہر دن چھنا چھن روپے ہاتھ میں آتے رہیں اسی طرح باطن میں اصل تسلی کی چیز بسط ہی ہے جس میں وقتاً فوقتاً یوماً فیوماً متاع باطن کو ترقی ہوتی رہتی ہے اور جدید و لذیذ واردات ہر دم وارد ہوتے رہیں ۱۲ ظ)

بعض خاص لوگوں کو کم گناہ کرنے پر زیادہ افسوس

میں یہ کہہ رہا تھا کہ کم گناہ کرنے والوں میں جو خاص لوگ ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ گناہ پر تو وہ کیا ہی صبر کر سکتے ہیں ایک ذرا سے قلبی تغیر اور وارد کے فوت ہونے پر ہی ان کو قرار نہیں آتا اسی سے تو وہ بے چین اور ہو جاتے ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ تھوڑے گناہ والا بہ نسبت بہت گناہ والوں کے زیادہ پریشان ہوتا ہے اور جس کے پاس بالکل گناہ نہیں وہ اس سے بھی زیادہ پریشان ہے جس کے پاس تھوڑے سے گناہ ہیں (اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص نے قرض لینا تو کبھی جانا ہی نہ ہو بلکہ اس سے بڑھ کر وہ ہمیشہ سے اس بات کا عادی ہو کہ اپنے پاس سو پچاس روپے ہر وقت جمع رکھتا ہے کبھی خالی ہاتھ نہیں رہتا اور ضرورت والوں کو ضرورت کے وقت دیتا دلاتا رہتا

ہے۔ایسے شخص کا اگر کبھی اتفاق سے ہاتھ خالی ہو جائے تو سمجھ لیجئے اس کو کتنی پریشانی ہوگی تھوڑے سے مقروض کو قلیل قرض سے وہ پریشانی نہ ہوگی جو اس شخص کو محض اپنا ہاتھ خالی ہو جانے سے ہوگی کیونکہ جس نے ہمیشہ دوسروں کو دیا ہو کبھی کسی سے ایک پیسہ کا ادھار نہ لیا ہو اس کو تو اس حالت کے تصور سے بھی لرزہ آئے گا کہ آج میرا ہاتھ خالی ہے اور شاید مجھے دوسروں سے مانگنا پڑے۔اہل اللہ کی یہی حالت ہے کہ گناہ تو کیا وہ تو احتمال گناہ سے کانپتے ہیں واردات کے کم ہو جانے سے ہی گھبرا جاتے ہیں کیونکہ اس سے کسی قدر تنزل اور بعد کا وہم سا ہو جاتا ہے ۱۲)

یہ سلسلہ کلام اس پر شروع ہوا تھا کہ تھوڑا گناہ میں غم زیادہ ہوتا ہے کیونکہ ابھی اس کو گناہ کے نشتر سے تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور جو لوگ واردات کی کمی سے بھی پریشان نہ ہوں گے یہی پریشانی ہے جو سب میں مشترک ہے کسی کو اس کا زیادہ احساس ہے کسی کو کم اور جو کسی کو اپنی اس حالت پر نظر اور تاسف بھی نہ ہو تو اس کی یہ حالت خود قابل تاسف ہے اول تو اپنے گناہوں پر نظر کر کے ہم کو خود رونا چاہیے اور جو کسی کو رونا نہ آئے تو اس رونا نہ آنے پر رونا چاہیے کہ افسوس میں ایسا سنگدل ہوں کہ مجھے اپنی بدحالی پر رونا بھی نہیں آتا اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب اس کو کسی بات پر رونا نہیں آتا تو اسی پر کیوں آئے گا تو سمجھ لیجئے کہ اس رونے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر رونے کی کوشش کرنی چاہیے چاہے رونا آئے یا نہ آئے تو رونے کی صورت بنانی چاہیے اس کی دلیل حدیث ہے:

"فَاِنْ لَّمْ تَبْکُوا فَتَبَاکَوا"[۱] (اگر رونہ سکو تو رونے کی صورت ہی بنالو) اور اکثر قاعدہ تو یہ ہے کہ رونے کی کوشش کرنے سے رونا آ ہی جاتا ہے چنانچہ بہت دفعہ ایسا ہو جاتا ہے اور اگر رونا بھی نہ آئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تباکی ہی کو بکا کا بدل قرار دیدیا ہے اور جب کسی چیز کے لیے کوئی بدل ہوتا ہے تو وہاں مقصود کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو اصل و بدل میں مشترک ہو تو معلوم ہوا کہ رونے سے جو مقصود ہے وہ رونے کی کوشش کرنے سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔چنانچہ طبیب جب کوئی دوا لکھ کر اس کا بدل بتلاتا ہے تو وہاں اس کا مقصود ایک ایسا اثر ہوتا ہے جو دونوں دواؤں میں مشترک ہے۔پس جب تباکی بکائے عین کا بدل ہے تو معلوم ہوا کہ بکائے عین خود مقصود نہیں بلکہ مقصود وہ چیز ہے جو اس میں اور تباکی میں مشترک ہے وہ کیا چیز ہے وہ بکاء قلب ہے جس کو دل کا رونا کہتے ہیں پس تباکی میں گو آنکھ سے رونے کی صورت نہ پائی جائے مگر رونے کی حقیقت موجود ہے یعنی دل کا رونا اور دل کا رونا کیا ہے۔اس کی حقیقت ہے فکر اور رنج و ملال تو جو شخص رونے کی کوشش کرے گا ظاہر ہے کہ وہ اس سے خالی نہ ہوگا اس لیے اس تقریر پر شبہ نہ رہا۔

---

[۱] (امالی الشجراء ۱ : ۱ ۹)

اصل مقصد دل کا رونا ہے

ایک دوست مجھ سے کہنے لگے کہ حج سے آ کر مجھے رونا ہی نہیں آتا گویا وہ اپنی اس حالت پر افسوس کر رہے تھے، میں نے کہا کہ رونا نہ آنے پر رنج کرنا یہ بھی رونا ہی ہے۔ پہلے آپ کی آنکھ روتی تھی اس وقت ایک مصرعہ مصداق تھے۔

اے خوشا چشمیکہ آں گریان اوست

(وہ آنکھیں بہت اچھی ہیں جو اس کی محبت میں رونے والی ہیں)

اور اب دل روتا ہے اس وقت آپ دوسرے مصرعہ کے مصداق ہیں۔

اے خوشا آں دل کہ آن بریان اوست

(وہ دل بہت اچھا ہے جو اس کی محبت میں سوختہ ہے)

اور اصل مقصود دل کا رونا ہے آنکھ کا رونا مقصود نہیں۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک بار وعظ فرمایا تو لوگوں نے کپڑے پھاڑ دیئے۔ آپ نے فرمایا: "لَاتَشَقُّوا جُیُوبَکُمْ بَلْ شَقُّوا قُلُوبَکُمْ" یعنی گریبان چاک نہ کرو بلکہ دلوں کو چاک کرو۔ اس کے یہ معنی نہیں گریبان چاک کرنے والے قابل ملامت ہیں بلکہ آپ کا مطلب یہ ہے کہ اصل مقصود دل کا چاک کرنا ہے اس میں سعی کرنا چاہیے اور یہ حالت جس کی وجہ سے کپڑے چاک کیے جا رہے ہیں مقصود نہیں نہ یہ کچھ کمال ہے۔

معذور حضرات صاحب کمال نہیں ہوتے

پس ایسے لوگ کامل نہیں ان کو اہل کمال تو نہ سمجھے مگر طعن بھی نہ کرے کیونکہ بعضے معذور بھی ہوتے ہیں چنانچہ اسی لیے شیخ سعدی شیرازیؒ جن کا لقب تاج الاولیاء ہے۔ فرماتے ہیں:

مکن عیب درویش حیران و مست　　　کہ غرق ست ازاں می زندہ پاؤ دست

(درویش حیران و مست پر طعن تشنیع مت کرو کہ عشق میں غرق ہے اس وجہ سے ہاتھ پاؤں مارتا ہے)

اس میں تو یہ تعلیم ہے کہ ان پر اعتراض نہ کرو آگے ان کی حالت بتا کر عذر ظاہر کرتے ہیں۔

بہ تسلیم سر در گریباں برند　　　چو طاقت نماند گریباں درند

(تسلیم کے ساتھ سر جھکا لیتے ہیں جب طاقت نہیں رہتی گریبان پھاڑتے ہیں)

پس یہ لوگ معذور تو ہیں مگر صاحب کمال نہیں ہیں۔ ان کپڑے پھاڑنے والوں کی حکومت صرف ظاہر پر ہوتی ہے اس لیے وہ اپنے ظاہر ہی میں جو تصرف چاہتے ہیں کر ڈالتے ہیں باطن پر ان کی حکومت

نہیں ہوتی اور اہل کمال وہ ہیں جن کی حکومت ظاہر و باطن دونوں پر ہوتی ہے کہ وہ کسی قلبی حالت سے از جا رفتہ نہیں ہو جاتے۔ وہ حالت ان پر غالب نہیں ہوتی بلکہ وہ خود حالت پر غالب ہو جاتے ہیں۔

حضرت جنیدؒ ایک صاحب کمال بزرگ

ایک دفعہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ مجلس میں تشریف فرما تھے کسی نے کوئی عجیب شعر پڑھا۔ اس پر ایک صوفی کو سخت وجد ہوا کہ قریب بہ ہلاک ہو گیا اور سارے مجمع پر ایک کیفیت طاری ہو گئی مگر حضرت جنیدؒ ویسے ہی وقار سے بیٹھے رہے جیسے تھے ان کو ذرا تغیر نہ ہوا تو کسی نے سوال کیا کہ اے جنید! کیا تم کو اس شعر سے لطف نہیں آیا جو ذرا بھی وجد نہ ہوا تو آپ نے جواب دیا:

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ○

"یعنی پہاڑوں کو تم (قیامت میں) ایک جگہ پر ٹھہرا ہوا دیکھو گے حالانکہ وہ ایسے تیز چلتے ہوں گے جیسے بادل چلا کرتا ہے۔"

مطلب یہ کہ یہ لوگ ہلکے ظرف تھے۔ ان کی حرکت سب کو نظر آ گئی اور کامل پہاڑ کی طرح ہے کہ اس کی حرکت نظر نہیں آتی۔ ظاہر میں وہ ساکن معلوم ہوتا ہے اور درحقیقت وہ بہت تیز جا رہا تھا اور ذرا سی دیر میں کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔

بعض اکمل الصحابہؓ کا حال

یہی وجہ ہے کہ حضرت صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے زیادہ صاحب کمال اور انوار باطنیہ سے مالا مال کون ہوا ہو گا مگر بجز ایک آدھ قصہ کے مثلاً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر بیہوش ہو گئے تھے۔ باقی صحابہ سے عموماً یہ بات ثابت نہیں ہے کہ کسی نے جوش و ولولہ میں کپڑے پھاڑ دیئے ہوں یا بیہوش ہو گئے ہوں یا ناچنے لگے ہوں اور اگر ایک آدھ سے کبھی اتفاقیہ بیہوش ہو جانا ثابت بھی ہے تو کن سے ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ تھے، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ تھے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نہ تھے۔ حالانکہ یہ حضرات اکمل الصحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں تو ان کے سامنے مؤخر درجہ میں تھے۔ ان میں ایک آدھ قصہ شاذ و نادر ایسا ہو گیا عموماً ان کی بھی یہ حالت نہ تھی۔ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں جو سب سے زیادہ کامل ہیں وہ سب سے زیادہ مضبوط اور مستقل مزاج ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حادثہ وصال مسلمانوں کے لیے کچھ کم جانکاہ نہ تھا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس پر جس قدر بھی روتے تھوڑا تھا اور نہ معلوم ہمارے سامنے یہ حادثہ ہوتا تو ہم لوگ کیا سے کیا کر ڈالتے مگر حضرات صحابہ نے بجز آنسو بہا لینے اور تنہا بیٹھ کر رو لینے کے کچھ نہیں

کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بظاہر صحابہ میں سب سے زیادہ مضبوط اور دلیر و مستقل مزاج نظر آتے تھے مگر اس وقت ان کی بھی یہی حالت تھی کہ حواس باختہ ہوگئے اور تلوار ہاتھ میں لے کر پکارتے تھے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا' اس کی گردن اڑا دوں گا' آپ زندہ ہیں اور ابھی منافقین کی خبر لیں گے۔

وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خطبہ صدیق اکبرؓ

یہ خبر سن کر حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوڑے ہوئے عوالی سے تشریف لائے اور سیدھے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں جا پہنچے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو ہی چکا تھا۔ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چادر چہرہ مبارک سے ہٹائی اور بے اختیار پیشانی انور کا بوسہ لیا۔ اس وقت حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب سے زیادہ مضبوط نکلے' ان کی زبان سے وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا یقین ہوجانے کے بعد کوئی بات نہیں نکلی سوا اس کے کہ ایک دو دفعہ اتنا کہا:

وَاخَلِيْلَاهُ وَاحَبِيْبَاهُ لَقَدْ طِبْتَ حَيًّا وَمَيِّتًا وَلَاَنْتَ اَكْرَمُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ اَنْ يُذِيْقَكَ الْمَوْتَ مَرَّتَيْنِ۝

(رواہ کما قال) (ہائے خلیل ہائے محبوب آپ زندگی میں خوشبودار تھے' موت میں بھی خوشبو دار ہیں اور آپ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اکرم اس بات سے کہ دو مرتبہ موت کا ذائقہ چکھیں) اس کے بعد غایت ضبط کے ساتھ حجرہ سے باہر آئے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم تمام کے تمام حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے منہ کو تک رہے تھے کہ دیکھئے ان کے منہ سے کیا نکلتا ہے اور یہ کیا خبر سناتے ہیں۔ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اول تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: "عَلٰى رِسْلِكَ يَارَجُلُ" اے شخص! بس ٹھہر جا مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور برابر اپنی اس بات کو پکارتے رہے۔ اس کے بعد حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سیدھے ممبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر تشریف لے گئے اور خطبہ ماثورہ کے بعد فرمایا:

اَيُّهَا النَّاسُ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ۝ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْخَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ فَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ط وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَرَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ۝

یعنی اے لوگو! جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معبود سمجھتا ہو تو وہ سن لے کہ آپ کا تو وصال ہو گیا اور جو خدا تعالیٰ کو معبود سمجھتا ہوا اس کی عبادت کرتا ہو تو وہ سن لے کہ خدا حی لا یموت ہے وہ کبھی نہ مرے گا۔ اس کے بعد یہ آیت پڑھی: ''وَمَا مُحَمَّدٌ اِلاَّ رَسُوْلٌ'' جس کا ترجمہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک رسول ہی تو ہیں ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم مر جائیں یا قتل ہو جائیں تو تم دین حق سے الٹے پاؤں ہٹ جاؤ اور جو اس طرح ہٹے گا وہ خدا تعالیٰ کو کچھ بھی نقصان نہ دے گا (اپنا نقصان کرے گا) اور حق تعالیٰ (ایسے وقت میں) شکر و حمد کرنے والوں کو جزا دیں گے اور یہ آیت بھی پڑھی ''اِنَّکَ مَیِّتٌ'' جس کا ترجمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرماتے ہیں کہ آپ بھی ایک دن مرنے والے ہیں اور یہ کفار بھی پھر تم سب قیامت کے دن اپنا جھگڑا خدا کے پاس لے جاؤ گے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو یہ مضمون اور یہ آیتیں سنیں تو سمجھ گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو چکا۔ اب ان سے کھڑا بھی نہ ہوا گیا' مارے غم کے تلوار ٹیک کے بیٹھ گئے اور رونے لگے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں کہ یہ آیت ہمارے ذہن سے اس وقت بالکل غائب ہو گئی تھی جس وقت حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر ان کو پڑھا ہے۔ تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ابھی اتر رہی ہیں۔ یہ سب کچھ ہوا مگر تھوڑی ہی دیر میں سب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سنبھل گئے اور دین کے کاموں میں مشغول ہو گئے مگر جیسے حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ افضل الصحابہ تھے ویسے ہی اس وقت سب سے زیادہ صاحب ضبط و استقلال بھی نکلے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کا ایک عجیب واقعہ استقلال

ایک واقعہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے استقلال کا اس سے بھی زیادہ عجیب ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کچھ قبائل عرب مرتد ہو گئے تھے جن میں تو مسیلمہ کذاب وغیرہ مدعیان نبوت کے ساتھ ہو گئے اور بعض لوگ کسی کے ساتھ تو نہیں ہوئے بلکہ ظاہر میں اپنے کو مسلمان کہتے رہے توحید و رسالت کے مقر رہے کہ کعبہ کو قبلہ مانتے رہے' نماز کی فرضیت کے قائل رہے مگر زکوٰۃ فرضیت سے منکر ہو گئے اور یہ کہا کہ فرضیت زکوٰۃ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے مخصوص تھی اب فرض نہیں اور علت یہ بتلائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمانوں پر فقر زیادہ تھا اس لیے اس وقت زکوٰۃ کی ضرورت تھی۔ اب وہ حالت نہیں رہی اس لیے فرضیت بھی باقی

نہیں رہی۔ جیسے آج کل بھی بہت سے لوگ اس قسم کی تاویلیں کیا کرتے ہیں۔ پہلی جماعت کے بارے میں سب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی بالاتفاق یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ جہاد کیا جائے۔

مگر دوسری جماعت کے حق میں سب کی رائے نرم تھی حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بھی یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ نرمی کی جائے اور جو کھلے کافر ہیں صرف ان سے لڑائی کی جائے ان لوگوں پر جہاد نہ کیا جائے۔ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے اس دوسری جماعت کے متعلق بھی وہی تھی جو اور مرتدین کے متعلق تھی وہ ان لوگوں کو کافر کہتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس کے ساتھ قتال کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے تھے کہ یہ لوگ تو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتے ہیں ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں ان پر کیونکر جہاد ہو سکتا ہے اور ان کو کفار کی طرح کیسے قتل کیا جا سکتا ہے۔ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ سب کچھ سہی مگر یہ لوگ نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں (کہ نماز کو تو فرض مانتے ہیں اور زکوٰۃ کو فرض نہیں مانتے حالانکہ شریعت نے دونوں کو فرض کیا ہے تو یہ لوگ فرض قطعی کے منکر ہیں اور) ان لوگوں نے دین کو بدل دیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ'' (جو شخص آپ کے دین کو بدل دے پس اس کو قتل کر دو) اس لیے میں ان کے ساتھ قتال کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پھر کہا کہ آپ کلمہ گو آدمیوں سے کیسے قتال کریں گے۔ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

اَجَبَّارٌ فِی الْجَاهِلِيَّةِ خُوَارٌ فِی الْاِسْلَامِ وَاللّٰهِ لَوْ مَنَعُوْنِیْ وَفِی رِوَايَةٍ عِنَاقًا عِقَالًا كَانُوْا يُؤَدُّوْنَهٗ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاُقَاتِلَنَّهُمْ عَلَيْهِ ۝

اے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ! یہ کیا کہ تم جاہلیت میں تو زبردست تھے اور اسلام میں اتنے بودے ہو گئے بخدا اگر یہ لوگ ایک رسی کو یا ایک بکری کے بچے کو بھی روکیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے تو میں اس پر بھی ان سے قتال کروں گا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی ''اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا'' (یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس وقت میں بھی تھا تو خدا تعالیٰ میرے ساتھ بھی ہیں اگر میں تنہا بھی جہاد کو نکل کھڑا ہوں گا تو خدا میرے ساتھ ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ میں تمام دنیا پر غالب آؤں گا کیا انتہا

ہے اس وقت قلب کی۔ چنانچہ پھر سب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے پر متفق ہو گئے اور بعد میں اقرار کیا کہ اس وقت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہم لوگوں کو سنبھالا ورنہ ہم گمراہی میں پڑ چکے تھے کہ ان لوگوں کو مسلمان سمجھے تھے ۱۲ ظ)[1]

اس واقعہ سے حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے استقلال وقوت قلب کا بخوبی یہ پتہ چلتا ہے کہ تمام صحابہ کے اختلاف کرنے پر بھی وہ تنہا اس جماعت کے مقابلہ پر آمادہ رہے۔ غرض صحابہ میں جو سب سے افضل تھے وہ سب سے زیادہ مستقل اور قوی القلب تھے اور یہ بات تمام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں تھی کہ وہ غلبہ حالات وکیفیات سے کبھی مغلوب نہ ہوتے تھے اسی لیے نہ وہ کبھی وجد میں رقص کرتے تھے نہ کپڑے پھاڑتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کپڑے پھاڑنے والے گو معذور ہوں گے مگر صاحب کمال نہیں' کامل کو ضبط کیفیت پر پوری قدرت ہوتی ہے۔ ہمارے مشائخ میں سے حضرت شیخ عبدالحق ردولوی قدس اللہ سرہ کا ارشاد ہے:

منصور بچہ بود کہ ازیک قطرہ بفریاد آمد

ایں جامرد انند کہ دریا ہا فرد برند و آروغ نزنند

یعنی منصور طریق سلوک میں بچے تھے کہ ایک قطرہ پی کر فریاد کرنے لگے اور جوش میں آکر انا الحق کہہ بیٹھے اور یہاں مرد ہیں کہ دریا کے دریا پی جائیں اور ڈکار تک نہ لیں ان حضرات کا دریا وجد یا رقص یا شطح کی صورت سے نہیں بہتا البتہ ان کا دریا دوسری راہ سے نکلتا ہے یعنی افادات ونفع رسانی کی راہ سے کہ وہ اپنے جوش وخروش کو طالبین کی توجہ میں صرف کرتے ہیں جس سے ہزارہا مخلوق درجہ ولایت پر پہنچ جاتی ہے یا اگر کبھی بہت ہی غلبہ ہوا تو ان کا دریا آنسوؤں کی راہ سے بھی

---

[1] کتب احادیث وتاریخ سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ مانعین زکوٰۃ کے مرتد ہونے پر حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اجماع کر لیا تھا باوجود یہ کہ اپنے کو مسلمان کہتے اور نماز پڑھتے تھے اور جماعت اسلام کو چھوڑ کر کفار کے ساتھ نہ ملے تھے تو یہاں سے ایک مدعی مقتدا یہ سے اہل حدیث کی غلطی واضح ہو گئی جو اس زمانہ میں جماعت قادیانی کے متعلق اسی نے کی ہے تو وہ کہتا ہے کہ شریعت میں مرتد وہ ہے جو جماعت اسلام کو چھوڑ کر کفار میں جا ملے اور جو ایسا نہ کرے بلکہ اپنے کو مسلمان کہے وہ مرتد نہیں اس لیے قادیانی جماعت مرتد نہیں کیونکہ وہ اپنے کو حلقہ بگوش اسلام کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ جماعت بہت سی ضروریات اسلام کا صریح انکار کرتی ہے اس لیے اس کی وہی شان ہے جو مرتدین مانعین زکوٰۃ کی تھی بلکہ اس سے بڑھ کر وہ قادیانی کو نبی کہتے ہیں تو اب اس کی وہ شان ہے جو مسیلمہ کذاب کے متبعین کی تھی۔ کیونکہ مسیلمہ کذاب اور اس کے متبعین بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے منکر نہ تھے اور بعض لوگ قادیانی کو نبی نہ کہیں مگر ولی اور مجدد کہتے ہیں حالانکہ وہ صریح کافر ہے۔ بیشمار کفریات اس کے اقوال میں موجود ہیں اور کافر کو ولی یا مجدد کہنا بھی کفر ہے اس لیے جماعت قادیانی کے سب فرقے مرتد ہیں ۱۲ ظ)

کسی وقت بہہ نکلتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازاں ۔۔۔ یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم

(اے اللہ چشمہ محبت کیسا چشمہ ہے کہ اس کا میں نے ایک قطرہ پیا اور آنسوؤں کا دریا ہوگیا)

یہ حضرات بڑے عالی ظرف ہوتے ہیں بہت ضبط کرتے ہیں ہاں کبھی ضبط پورا نہ ہوسکا تو آنکھوں سے آنسو بہا لیتے ہیں اور یہ نقص نہیں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ نماز میں بعض دفعہ آپ روتے تھے تو سینے سے ایسی آواز نکلتی تھی جیسے ہنڈیا پکتی ہو۔ الغرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ جو لوگ چلاتے چیختے اور کپڑے پھاڑتے ہیں وہ اہل کمال نہیں ہیں۔ اسی لیے عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

"لاتَشُقُّوا جُيُوبَكُمْ بَلْ تَشُقُّوا قُلُوبَكُمْ" (اپنے دامنوں کو نہ پھاڑو اپنے دلوں کو چیرو)

ہاں صاحب حال ہیں اسی واسطے شیخ سعدی ان پر ملامت وطعن سے منع فرماتے ہیں:

مکن عیب درویش حیران و مست ۔۔۔ کہ غرق است ازاں مے زند پاؤ دست

(درویش حیران ومست یعنی صاحب کمال پر طعن مت کرو اس لیے کہ وہ محبت میں غرق ہے اس وجہ سے ہاتھ پیر مارتا ہے)

کیونکہ صاحب حال معذور ہوتا ہے مگر آج کل لوگ اسی کو کمال سمجھتے ہیں کہ بات بات پر جدآئے رقت طاری ہو کپڑے پھاڑنے لگیں تو خوب سمجھ لو کہ یہ کمالات نہیں ہاں حالات ہیں اور حالات بھی ایسے جو مطلوب ہیں نہ مذموم کیونکہ حالات مطلوبہ تو وہی ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کے مشابہ ہوں۔ جتنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشابہت ہوگی اتنا ہی زیادہ کمال ہوگا' باقی کیفیات نہ ضروری ہیں نہ کمال ہیں (گومضر بھی نہیں بلکہ ان کا وجود علامت ہے تاثیر ذکر کی ۱۲) اسی لیے میں نے کہا تھا کہ اصل مقصود دل کا رونا ہے' آنکھ کا رونا اصل مقصود نہیں کیونکہ حدیث میں آ چکا ہے: "فَاِنْ لَّمْ تَبْكُوا فَتَبَاكُوْ"[1] (اگر رونا نہ آتا ہو تو رونے کی کوشش کرو) اگر بکا ہی مقصود ہوتا تو رونے کی کوشش کرنا اس کا قائم مقام نہ ہوتا بہرحال ہم لوگوں کی حالت قابل اصلاح ضرور ہے اور جو لوگ گناہوں میں کم مبتلا ہیں ان کو بھی اس حالت پر تاسف ہونا چاہیے اور جس کو تاسف نہ ہو اس کو اس تاسف نہ ہونے پر تاسف ہونا چاہیے۔ خاص کر جب یاددہانی کی جائے کیونکہ بعض دفعہ خود اپنی کسی حالت پر تاسف نہیں ہوتا مگر دوسرے کی تنبیہ سے خیال پیدا ہو جاتا ہے مگر خیر غنیمت ہے کہ جن لوگوں کو اپنی بدحالی پر تاسف بھی نہیں ہے وہ بھی اپنی بدحالی کے

---

[1] (امالی الشجراء ا:۱۹۱)

مقر تو ضرور ہیں کیونکہ گنہگار ہونے کا ہر شخص کو اقرار ہے تو مرض کا احساس تو سب کو ہے مگر کوتاہی یہ ہے کہ علاج کی فکر نہیں اور ظاہر ہے کہ مرض کا علاج نہ کرنا سخت خطرناک ہے تو علاج ڈھونڈنا ضروری ہوا۔ سو اس آیت میں جس کی میں نے تلاوت کی ہے اس مرض عام کا علاج موجود ہے۔ اسی لیے اس کو بیان کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو بھلجانا مسلمانوں کی محبت سے بعید ہے

میں اول ترجمہ کرتا ہوں اس کے بعد مقصود کی توضیح کروں گا حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم ان لوگوں کی مثل نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں۔ سبحان اللہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کا کیسا لحاظ فرماتے ہیں کہ یوں نہیں فرمایا: "وَلَاتَكُوْنُوْا مِنَ الَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ" (جس کا ترجمہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں) کیونکہ آیت کے مخاطب مسلمان ہیں (اور خدا کے بھولنے والے کافر ہیں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس طرح خطاب کرنا گوارا نہیں فرمایا کہ تم خدا کے بھولنے والے نہ بن جانا بلکہ یہ فرمایا کہ دیکھو بھولنے والوں کے مشابہ نہ ہو جانا اس میں جس قدر عنایت اور لطف ہے ظاہر ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کو بھول جانا تو تمہاری محبت سے بعید ہے۔ ہاں بھولنے والوں کی طرح ہو سکتے ہو تو ہم تم سے کہتے ہیں کہ تم ایسے بھی نہ ہونا اس لیے "لَاتَكُوْنُوْا كَا الَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ" (تم ان لوگوں کے مشابہ نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں) فرمایا۔

دوسرے یہ بھی اس میں نکتہ ہو سکتا ہے کہ خدا کا بالکل بھولنے والا کافر ہے اور آیت کے مخاطب مسلمان ہیں اور مسلمان کافر نہیں ہو سکتا اس لیے مسلمانوں کو "لَاتَكُوْنُوْا مِنَ الَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ" (ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں) کے ساتھ خطاب ہو بھی نہیں سکتا بلکہ ان کو تو "لَاتَكُوْنُوْا مِنَ الَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ" (تم ان لوگوں کی مثل نہ ہو جانا جو اللہ کو بھول گئے ہیں) ہی سے خطاب ہو سکتا ہے۔

مسلمان کبھی کافر نہیں ہو سکتا

اس پر مجھے حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بات یاد آئی۔ مولانا فرماتے تھے کہ جو مسلمان ہو گیا وہ کافر کبھی نہیں ہو سکتا ہے اور یہ جو بعضے مسلمان آریہ وغیرہ ہو جاتے ہیں وہ حقیقت میں مسلمان ہی نہ تھے ان کو ایمان نصیب ہی نہیں ہوا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایک شخص ظاہر میں اپنے کو مسلمان کہتا ہو اور اس کے دل میں ایمان نہ ہو کیونکہ زبانی دعوے سے دل میں ایمان کا ہونا لازم نہیں تو ممکن ہے کہ ایک مدعی اسلام عند اللہ مسلمان نہ ہو بلکہ میں ترقی

کر کے کہتا ہوں کہ جو لوگ مرتد ہوتے ہیں وہ عندالناس بھی مسلمان نہیں تھے اور ہم لوگوں کا ان کو مسلمان سمجھنا محض حسن ظن پر مبنی تھا کہ نیک گمان کی وجہ سے ہم نے ان کی حالت میں غور نہیں کیا اور اگر دعویٰ اسلام کی حالت ہی میں ان کے اقوال و افعال کو غور سے دیکھا جاتا تو ہم کو بھی معلوم ہو جاتا کہ ان کو ایمان نصیب نہیں ہوا۔

ایک عجیب عبرت انگیز حکایت

چنانچہ میں آپ کو ایک عجیب عبرت انگیز حکایت سناتا ہوں جو میں نے مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی تھی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ شیخ دہان (تاجر روغن) نے جو مکہ مکرمہ کے ایک بڑے عالم تھے، فرمایا کہ مکہ مکرمہ میں ایک عالم کا انتقال ہوا اور ان کو دفن کر دیا گیا، کچھ عرصہ کے بعد کسی دوسرے شخص کا انتقال ہوا تو اس کے وارثوں نے ان عالم صاحب کی قبر میں ان کو دفن کرنا چاہا مکہ مکرمہ میں یہ دستور ہے کہ ایک قبر میں کئی کئی مردوں کو دفن کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان عالم صاحب کی قبر کھودی گئی تو دیکھا کہ ان کی لاش کی بجائے ایک نہایت حسین لڑکی کی لاش رکھی ہوئی ہے اور صورت دیکھنے سے وہ لڑکی یورپین معلوم ہوتی تھی۔ سب کو حیرت ہوئی کہ یہ کیا معاملہ ہے، اتفاق سے اس مجمع میں یورپ سے آنے والا ایک شخص بھی موجود تھا اس نے جو لڑکی کی صورت دیکھی تو کہا میں اس کو پہچانتا ہوں یہ لڑکی فرانس کی رہنے والی اور ایک عیسائی کی بیٹی ہے یہ مجھ سے اردو پڑھتی تھی اور در پردہ مسلمان ہوگئی تھی، میں نے اس کو دینیات کے چند رسالے بھی پڑھائے تھے۔ اتفاق سے بیمار ہو کر انتقال کر گئی اور میں دل برداشتہ ہو کر نوکری چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ لوگوں نے کہا کہ اس کے یہاں منتقل ہونے کی وجہ تو معلوم ہوگئی کہ مسلمان اور نیک تھی لیکن اب یہ بات دریافت طلب ہے کہ ان عالم صاحب کی لاش کہاں گئی، بعض لوگوں نے کہا کہ شاید عالم کی لاش اس لڑکی کی قبر میں منتقل کر دی گئی اس پر لوگوں نے اس سیاح سے کہا کہ تم حج سے واپس ہو کر یورپ جاؤ تو اس لڑکی کی قبر کھود کر ذرا دیکھنا کہ اس میں مسلمان عالم کی لاش ہے یا نہیں اور کوئی صورت شناس بھی ساتھ کر دیا۔ چنانچہ وہ شخص یورپ واپس گیا اور لڑکی کے والدین سے اس کا یہ حال بیان کیا اس پر ان کو بڑی حیرت ہوئی کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ لڑکی کو دفن تو کیا جائے فرانس میں اور تم اس کی لاش مکہ مکرمہ میں دیکھ لو۔ اخیر رائے یہ قرار پائی کہ اس لڑکی کی قبر کو کھودو۔ چنانچہ اس کے والدین اور چند لوگ اس حیرت انگیز معاملہ کی تفتیش کے لیے قبرستان چلے اور لڑکی کی قبر کھودی گئی تو واقعی اس کے تابوت میں اس کی لاش نہ تھی بلکہ اس کے بجائے وہ مسلمان عالم قطع صورت وہاں دھرے ہوئے تھے جن کو مکہ مکرمہ میں دفن کیا گیا تھا۔ شیخ دہان نے فرمایا کہ اس سیاح نے کسی ذریعہ سے ہم کو اطلاع دی کہ اس عالم کی لاش یہاں فرانس میں موجود ہے۔ اب مکہ

مکرمہ والوں کو فکر ہوئی کہ لڑکی کا مکہ پہنچ جانا تو اس کے مقبول ہونے کی علامت ہے اور اس کے مقبول ہونے کی وجہ بھی معلوم ہوگئی مگر اس عالم کا مکہ مکرمہ سے کفرستان میں پہنچ جانا کس بنا پر ہوا اس کے مردود ہونے کی کیا وجہ ہے۔ سب نے کہا کہ انسان کی اصلی حالت گھر والوں کو معلوم ہوا کرتی ہے۔ اس کی بی بی سے پوچھنا چاہیے چنانچہ لوگ اس کے گھر گئے اور دریافت کیا کہ تیرے شوہر میں اسلام کے خلاف کوئی بات تھی اس نے کہا کچھ بھی نہیں وہ تو بڑا نمازی اور قرآن کا پڑھنے والا تہجد گزار تھا۔ لوگوں نے کہا سوچ کر بتلاؤ کیونکہ اس کی لاش دفن کے بعد مکہ مکرمہ سے کفرستان میں پہنچ گئی ہے کوئی بات اسلام کے خلاف اس میں ضرور تھی اس پر بی بی نے کہا ہاں میں اس کی ایک بات پر ہمیشہ کھٹکتی تھی وہ یہ کہ جب وہ مجھ سے مشغول ہوتا اور فراغت کے بعد غسل کا ارادہ کرتا تو یوں کہا کرتا تھا کہ نصاریٰ کے مذہب میں یہ بات بڑی اچھی ہے کہ ان کے یہاں غسل جنابت فرض نہیں' لوگوں نے کہا بس یہی بات ہے جس کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے اس کی لاش کو مکہ مکرمہ سے اسی قوم کی جگہ پھینک دیا جن کے طریقہ کو وہ پسند کرتا تھا۔ حضرات آپ نے دیکھا کہ یہ شخص ظاہر میں عالم متقی اور پورا مسلمان تھا مگر تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں ایک بات کفر کی موجود تھی کہ وہ کفار کے ایک طریقے کو اسلامی حکم پر ترجیح دیتا تھا اور استحسان کفر کفر ہے۔ اس لیے وہ شخص پہلے ہی سے مسلمان نہ تھا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ لاش منتقل ہو جایا کرے۔ مگر خدا تعالیٰ کہیں ایسا بھی کر کے دکھلا دیتے ہیں تا کہ لوگوں کو عبرت ہو کہ بدحالی کا نتیجہ یہ ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ جو کافر ہوتا ہے اس میں اول ہی سے کوئی بات کفر کی ہوتی ہے جو تفتیش اور غور کے بعد ہم کو بھی معلوم ہو سکتی ہے مگر ہم غور نہیں کرتے اس لیے کہہ دیتے ہیں کہ مسلمان آریہ ہو گیا حالانکہ وہ پہلے ہی سے آریہ تھا اس میں اسلام تھا ہی نہیں مگر ہم کو اس کی بدحالی کا علم نہ تھا ورنہ جو مسلمان ہوگا وہ کبھی کافر نہیں ہو سکتا اسی لیے شیطان کے بارے میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ کہ وہ پہلے ہی کافروں میں سے تھا سجدہ آدم علیہ السلام سے انکار کرنے کے وقت ہی کافر نہیں ہوا جس کا راز اہل تحقیق نے اس طرح فرمایا ہے کہ

در لوح بدنوشتہ کہ ملعوں شود یکے — بردم گماں بہرکس و برخود گماں بنود
آدم زخاک بود و من از نور پاک او — گفتم منم یگانہ وا وخود یگانہ بود

یعنی لوح محفوظ میں پہلے ہی سے لکھا ہوا تھا کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ایک شخص کافر ہوگا (یعنی اس وقت اس کا کفر ظاہر ہوگا ۱۲) اور شیطان لوح محفوظ کو پڑھ کر اس واقعہ سے باخبر تھا کہ ایک شخص کافر ہونے والا ہے۔ مگر اس کو کبھی اپنے متعلق یہ احتمال نہ ہوا کہ شاید وہ میں ہی ہوں وہ اپنی طاعت وعبادت کی وجہ سے بےفکر تھا کہ بھلا اتنا بڑا عابد کبھی کافر ہو سکتا ہے ہرگز نہیں یہ کوئی اور شخص ہوگا۔

اس تکبر اور بے فکری ہی نے اس کو تباہ کیا (ورنہ ملائکہ کی یہ حالت تھی کہ اس خبر کو دیکھ کر سب کے سب تھراتے تھے کہ دیکھئے کس کی کم بختی آنے والی ہے اس تواضع اور خشیت ہی سے وہ مقبول و مکرم رہے ۱۲)

عجب و پندار کیلئے مردودیت لازم ہے

حاصل راز کا یہ ہوا کہ اس کا عجب و پندار اساس تھی کفر کی اور وہ اس میں پہلے ہی سے تھا جس کے لیے مردودیت لازم ہے۔ غرض شیطان پہلے ہی سے مقبول نہ تھا اس لیے مردود ہو گیا ورنہ جو مقبول ہو جاتا ہے وہ کبھی مردود نہیں ہوتا جیسے بالغ کبھی نابالغ نہیں ہوتا مگر یہ بھی خبر ہے کہ بالغ کون ہے۔ ہر زبان سے دعویٰ اسلام کرنے والا بالغ نہیں بلکہ بالغ وہ ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں:

خلق اطفالند جز مست خدا　　　نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

(بجز مست (عشق) الٰہی کے تمام مخلوق (گویا) اطفال ہیں۔ پس بالغ وہی ہے جو ہوائے نفسانی سے چھوٹ گیا)

یعنی جس نے اسلام کے بعد حکم الٰہی کے سامنے اپنی ہوا و ہوس کو فنا کر دیا ہو وہ بالغ ہے باقی سب نابالغ ہیں۔ بس جو شخص اسلام سے مرتد ہو کر اپنا نابالغ ہونا ظاہر کرتا ہے وہ ابھی تک بالغ ہوا نہیں بلکہ اس وقت تک نابالغ تھا۔

ایمان کی حالت

حدیث میں بھی تو ہے کہ ہرقل نے حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کے اسلام لانے سے پہلے دریافت کیا تھا کہ کیا اس دین کو اختیار کر کے کوئی شخص کراہت کے ساتھ اس کو چھوڑتا بھی ہے۔ حضرت ابوسفیان نے کہا نہیں ہرقل نے اس پر کہا "وَكَذٰلِكَ الْاِيْمَانُ اِذَا خَالَطَ بَشَاشَةِ الْقُلُوْبَ" یعنی ایمان کی یہی حالت ہوتی ہے کہ جب وہ قلوب میں پیوستہ ہو جاتا ہے پھر نہیں نکلتا کیونکہ ایمان ایک عشق ہے اور عشق اگر سچا ہو تو کبھی دل سے نہیں نکلتا حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی نہیں نکلتا جیسے کہ اگر کسی کو غیر اللہ سے محبت ہو جائے تو وہ بھی مر کر نہیں جاتی۔ اسی کو کہا ہے:

رفتم اندر تہ خاک　　　انس بتانم باقی ست

(میں تہ خاک ہو گیا اپنے معشوقوں کی محبت باقی ہے)

اسی لیے اہل اللہ اپنے دل میں کسی جائز محبت کو بھی جمنے نہیں دیتے کیونکہ مرنے کے وقت اس محبوب کا خیال آئے گا اور ان کا اصل مدعا یہ ہے کہ جب دنیا سے جائیں تو اس وقت کسی کی محبت بجز خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں نہ ہو۔ اہل اللہ نے تو جنت کی بھی رغبت نہیں کی۔

بعض صاحب حال کا حال

حضرت عمر بن الفارض رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جب انتقال ہونے لگا تو آٹھوں جنتیں ان کے سامنے کر دی گئیں۔ انہوں نے منہ پھیر لیا اور یہ شعر پڑھا:

ان کان منزلتی فی الحب عندکم ماقدرایت فقد ضیعت ایامی

(اگر آپ کے نزدیک میری محبت کی یہی قدر ہے جو میں دیکھ رہا ہوں تو میں نے اپنے دن ہی ضائع کیے ساری عمر یوں ہی برباد ہو گئی)

فحجبت الجنان و تجلی له الرب تعالیٰ وطار روحه فرحا به

پس اسی وقت جنتیں چھپا دی گئیں اور حق تعالیٰ کی خاص تجلی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی جان نکل گئی اور بالکل وہ حالت ہوگئی:

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو رب تو کیست گویم آنکس کہ ربود ایں دل دیوانہ ما

(اگر منکر نکیر آ کر مجھ سے سوال کریں کہو تمہارا رب کون ہے تو میں جواب دوں گا وہی ہے جو ہمارے دل دیوانہ کو لے گیا)

اور جان نکلنے کے قرب تھی:

گر بیاید ملک الاموت کہ جانم ببرد تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن نہ دہم

(اگر ملک الموت میری جان لینے کو آ جائے تو جب تک رخ انور نہ دیکھ لوں جان نکلنے نہ دوں گا)

واقعی عمر بن الفارض رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو یہ کر کے دکھلا دیا کہ بدون تجلی الٰہی کے جان ہی نہ دی جب ان حضرات کو جنت پر بھی توجہ نہیں ہوتی تو دوسروں کی طرف تو کیا التفات ہوگا مگر یہ تو صاحب حال تھے ان کو جنت سے منہ پھیرنے کا حق تھا۔

اہل نیاز کو ناز زیبا نہیں

ہم کو بدون اس حال کے ایسا دعویٰ نہ چاہیے ہم کو تو اگر وہاں دنیا کی روٹی بھی مل جائے تو غنیمت ہے بعض لوگ اکثر ڈینگیں مارا کرتے ہیں کہ ہم کو جنت کی کیا پرواہے ہم کو حوروں کی کیا پروا ہے یہ نہایت سخت بات ہے ہر شخص کا منہ اس بات کے قابل نہیں۔

ناز را روئے بباید ہمچو ورد چوں نداری گرد بدخوئی مگرد
زشت باشد روئے نازیبا و ناز عیب باشد چشم نابینا و باز

(ناز کے لیے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے بدخوئی کے پاس مت جاؤ بدصورت کو ناز کرنا برا ہے' آنکھ اندھی ہو اور کھلی ہو عیب میں شمار ہوتی ہے)

اور

پیش یوسف نازش و خوبی مکن جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

(یوسف علیہ السلام کے سامنے ناز اور اپنی مت بیان کرد سوائے نیاز اور آہ یعقوبی مت بیان کرو)

چوں تو یوسف نیستی یعقوب باش ہمچو او باگر یہ آشوب باش

(جب تم یوسف علیہ السلام نہیں ہوئے یعقوب علیہ السلام جیسے بنو ان کی طرح سے گریہ وزاری کرو)

غرض ہم لوگ اہل نیاز ہیں ہم کو ناز نہ چاہیے بلکہ احتیاج ظاہر کرنا چاہیے جو لوگ جنت سے لاپروائی کی ڈینگیں مارتے ہیں ان کو چار دن روٹی نہ ملے تو حقیقت کھل جائے اسی وقت لوگوں سے قرض ادھار یا خیرات مانگنے لگیں تو جس کی چار روٹیوں سے بھی استغناء نہ ہو اس کو جنت سے لاپروائی کا دعویٰ کب زیبا ہے۔ خیر وہ تو صاحب حال تھے مگر ہے یہی بات کہ محبت مرتے دم تک بلکہ مرنے کے بعد بھی دل سے نہیں نکلتی اس لیے اہل اللہ جائز محبت سے بھی بچتے ہیں ہم اگر ایسا نہ کر سکیں تو کم از کم حرام محبت سے تو بچنا چاہیے۔ اس واقعہ سے یہ بات تو معلوم ہوگئی کہ حق تعالیٰ کے چاہنے والوں کی یہ حالت ہوا کرتی ہے کہ وہ مرتے وقت بجز جمال محبوب کے اور کسی خیال میں نہیں ہوتے واقعی جینا اور مرنا ان ہی کا کام ہے اور اگر ہم بھی ان کے ساتھ وابستہ ہو جائیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ دولت ہم کو بھی حاصل ہو جائے گی اور ہم بھی مرتے وقت ایسے ہی ہوں گے لیکن اگر یہ بات نہ ہو تو ایسا ہونا چاہیے کہ اس وقت کوئی ناجائز محبت دل میں نہ ہو اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ زندگی میں محبت حرام سے بچو! اگر زندگی میں اس میں مبتلا ہو گیا تو مرتے وقت بھی وہ ساتھ رہے گی۔ غرض عشق خواہ حلال ہو یا حرام دل سے کبھی نہیں نکل سکتا اسی لیے ہرقل نے کہا تھا کہ ایمان دل میں رچ جانے کے بعد نہیں نکلا کرتا کیونکہ ایمان نام ہے عشق خداوندی کا۔ چنانچہ نص "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" (اور مومن اللہ کی محبت میں سخت تر ہیں) اس کی کافی دلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ کو بھول جانا کافر کا کام ہے

پس حاصل یہ ہے آیت میں تشبیہ کے اختیار کرنے کے دوسرے نکتہ کا یعنی چونکہ مخاطب مسلمان ہیں اس لیے وہ خطاب "وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ" (تم ان لوگوں سے نہ ہونا جو خدا کو بھول گئے ہیں) کے محل نہیں ہو سکتے یعنی وہ کبھی خدا کو دل سے بالکل بھلا نہیں سکتے۔ اس

واسطے حق تعالیٰ نے "وَلَا تَكُونُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ" (تم ان لوگوں سے نہ ہونا جو خدا کو بھول گئے ہیں) فرمایا اور اس میں بہ نسبت نکتہ اولیٰ کے زیادہ مبالغہ ہوا (کیونکہ اس نکتہ اولیٰ کا حاصل یہ تھا کہ مسلمان کا خدا کو بھول جانا بعید سہی لیکن بھول سکتا ہے مگر حق تعالیٰ نے پھر بھی عنایت وشفقت کی بناء پر یہ نہیں فرمایا کہ تم ہم کو بھولنا بلکہ یہ فرمایا کہ بھولنے والوں کی طرح نہ ہونا اور دوسرے نکتہ کا حاصل یہ ہوا کہ مسلمان کا خدا کو بھول جانا ممکن ہی نہیں کیونکہ بالکل بھول جانا کافر کا کام ہے اور مسلمان کافر نہیں ہوسکتا ۱۲) آگے ارشاد ہے: "فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ" کہ جب وہ خدا کو بھول گئے تو خدا تعالیٰ نے ان کے نفسوں کو بھی ان کو بھلا دیا یہاں ایک نکتہ ہے گو ظاہر کرنے کو جی نہیں چاہتا مگر خیر دل میں آئی ہوئی بات کو کیوں روکوں شاید کسی کو نفع ہو جائے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا ہے: "وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ" کہ ہم انسان کی جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں تو جو شخص جان سے زیادہ قریب کو بھول جائے تو ممکن نہیں کہ وہ اپنے کو یاد رکھے۔ حقیقت میں خدا کو بھولنے والا اپنے آپ کو بھی بھولا ہوا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے جو اپنے آپ کو بھی بھول گیا اس کو تو مقام فنا حاصل ہوا تو جواب یہ ہے کہ لعنت ہے ایسی فنا پر فنا کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی یاد میں اتنا مستغرق ہو کہ اپنے کو بھول جائے۔[1] نہ یہ کہ خدا کو بھلا کر اپنے آپ کو بھولے اور اگر کوئی یہ کہے کہ خدا کو بھول کر ہم اپنے کو کہاں بھولتے ہیں اپنی یاد تو پھر بھی رہتی ہے تو پہلے یہ سمجھو کہ یاد کے معنی کیا ہیں۔ یاد مطلوب وہ ہے جو نافع ہو اور جو محبت کے ساتھ ہو چنانچہ یہ محاورہ بھی تو ہے کہ دوستوں سے کہا کرتے ہیں کہ بھائی ہم کو یاد رکھنا اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ محبت کے ساتھ یاد رکھنا یہ کسی کا مطلب نہیں ہوتا کہ بس جس طرح سے بھی ہو یاد رکھنا خواہ روزانہ دو چار لیپڑ ہی لگا دیا کرنا اور اگر وہ آ کر دو چار لیپڑ لگا دیا کرے اور یہ کہے کہ تم نے یاد کرنے کو کہا تھا میں یاد ہی تو کرتا ہوں تو اس کو ہرگز یاد نہیں کہا جا سکتا۔ غرض محاورہ میں بھی محبت ہی کی یاد کو یاد کہتے ہیں۔ دشمن اور ضرر رسانی کی یاد کو یاد نہیں کہا کرتے۔ اب سمجھئے کہ جس وقت کسی نے اپنے خدا کو بھلا دیا تو اس نے اپنے تمام مصالح کو فوت کر دیا۔

اب اس کو یہ یاد نہیں رہا کہ میرے نفس کی فلاح کا طریقہ کیا ہے تو حقیقت وہ اپنے کو بھول گیا اور اب اس کو اپنی یاد ایسی ہوگی جیسے کوئی کسی کے روزانہ دو چار جوتے مار کر یہ کہے کہ میں تجھ کو

---

[1] (اور در حقیقت خدا کی یاد میں اپنے کو بھولنے والا واقع میں بھولنے والا نہیں ہے بلکہ اپنے کو یاد رکھنے والا ہے گو درجہ التفات میں بھولا ہوا ہے۔ چنانچہ یاد کے معنی معلوم کر کے ابھی یہ حقیقت واضح ہو جائے گی ۱۲ ظ)

یاد کرتا ہوں۔غرض جو شخص خدا تعالیٰ کو بھولے گا وہ اپنے کو بھی ضرور بھول جائے گا۔اسی طرح جو خدا کو یاد رکھے گا وہ اپنے کو بھی یاد رکھے گا مگر مستقلاً نہیں بلکہ اس طرح کہ میں خدا کی چیز ہوں خدا تعالیٰ کے ساتھ مجھے تعلق ہے اور جو کچھ میرے پاس ہے سب خدا کی امانت ہے وہ کسی چیز کو بلاواسطہ خدا تعالیٰ کے یاد نہ کرے گا بلکہ جیسے عاشق کو محبوب کی سب چیزیں یاد رہتی ہیں اور ان کی یاد حقیقت میں محبوب ہی کی یاد ہوتی ہے۔

خودکشی کے حرام ہونے کا راز

اسی طرح وہ اپنے کو بھی اور اپنی متعلقات کو بھی اسی حیثیت سے یاد کرتا ہے کہ یہ سب محبوب ہی کی چیزیں ہیں۔یہ ایسی بات ہے جیسے بیل پالنا تھا اور بیل کی حفاظت ایک تو مالک کرتا ہے وہ تو اپنی چیز سمجھ کر ان کی حفاظت کرتا ہے اور ایک نوکر حفاظت کرتا ہے وہ اپنی چیز سمجھ کر نہیں کرتا بلکہ دوسرے کی چیز سمجھ کر ان کی حفاظت کرتا ہے۔اہل اللہ اپنی ذات یا اپنے ہاتھ پاؤں اور تمام متعلقات کی حفاظت نوکر کی طرح کرتے ہیں مالک کی طرح نہیں کرتے ہم تو کہتے ہیں اپنا پیٹ بھرنے کے لیے اور وہ سرکاری مشین کی حفاظت کے لیے کھاتے ہیں اور یہاں سے ''لَاتَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ'' (اپنی جانوں کو ہلاک مت کرو) کا راز بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ حق تعالیٰ نے قتل نفس سے اس لیے منع فرمایا ہے کہ یہ آپ کی جان انہی کی ملک ہے تمہاری ملک نہیں ہم سب خدا ہی کی چیزیں ہیں اس لیے انہوں نے اپنی چیزیں بدون اجازت کے تصرف کرنے سے منع فرما دیا۔اسی مرتبہ میں حکم ہے:

اِنَّ لِجَسْدِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَیْنِکَ عَلَیْکَ حَقًّا[1]

''بلاشک جسم کا تجھ پر حق اور تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا تجھ پر حق ہے۔''

پس کسی کو یہ حق نہیں کہ کوئی دوا بار دکھا کر نامرد ہو جائے یا آنکھوں میں گرم سلائی لگا کر اندھا ہو جائے۔عارفین پر چونکہ یہ راز منکشف ہو گیا ہے اس لیے وہ اپنی جان کو سرکاری چیز سمجھ کر اس کی خوب حفاظت کرتے ہیں اور اسی نیت سے بعض دفعہ عمدہ غذا اور عمدہ لباس بھی استعمال کرتے ہیں لوگ اس کو تن پروری سمجھتے ہیں مگر نہیں وہ اس سے بہت دور ہیں لیکن

در نیابد حال پختہ ہیچ خام　　　　بس سخن کوتاہ باید والسلام

(ناقص کامل کی حالت کو نہیں سمجھ سکتا پس کلام کو کوتاہ کرنا چاہیے)

---

[1] (مسند احمد ٦: ٢٦٨)

لذائذ کے استعمال میں عارفین کی نیت

ایک دفعہ ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ نے فرمایا کہ میاں اشرف علی پانی جب پیو خوب ٹھنڈا پینا کہ ہر بن منہ سے الحمدللہ نکلے گا اور گرم پانی پینے میں زبان سے تو الحمدللہ کہو گے مگر دل شریک نہ ہوگا۔ (آپ نے دیکھا کہ لذائذ کے استعمال میں عارفین کی کیا نیت ہوتی ہے۔ عام لوگ تو ٹھنڈا پانی اس غرض سے پیتے ہیں کہ مزا آئے گا پیاس کو تسکین ہوگی اور عارف اس لیے پیتا ہے کہ ہر بن منہ سے حق تعالیٰ کی حمد نکلے گی بعد میں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا ۱۲) (دیکھو تو راستہ کا فرق کہاں سے کہاں تک ہے) اور اسی راز کے منکشف ہونے پر ایک بزرگ فرماتے ہیں:

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است   افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را   تو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

(میں اپنی آنکھوں پر ناز کرتا ہوں کہ تیرے جمال کو دیکھا ہے اور اپنے پاؤں پر فدا ہوں کہ تیری گلی تک پہنچے ہیں ہردم اپنے ہاتھوں پر ہزاروں بوسہ دیتا ہوں کہ تیرے دامن کو پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے)

اپنی آنکھوں پر ناز کرتے ہیں کیونکہ اس نے سرکاری کام کیا ہے اس نے محبوب کے جمال کو دیکھا ہے (اور اسی سے محبوب کے کلام کو دیکھ کر تلاوت کی توفیق ہوئی ہے' اپنے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دیتے ہیں مگر اسی سرکاری تعلق کی وجہ سے کہ ان سے نماز پڑھی۔ خدا کے رستہ میں چلنا نصیب ہوا اور بہت سے کام رضائے محبوب کے واسطے سے لیے گئے۔ اس لیے فرماتے ہیں کہ میں اپنے ان اعضاء پر جان دیتا ہوں اور ان کی قدر کرتا ہوں۔

محبوب کی طرف بری باتوں کی نسبت کرنا بے ادبی ہے

مولانا فخرالحسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں مکہ معظمہ میں ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا' لوگ ان کے منہ پر ان کی تعریف کررہے تھے اور وہ خوش ہو رہے تھے۔ میں نے اپنے دل میں کہا یہ کیسے بزرگ ہیں جو اپنی تعریف سے مزلے لے رہے ہیں ان کو اس خطرہ کی اطلاع ہوگئی فوراً جواب دیا کہ میری تعریف تھوڑی ہی ہے۔ میرے محبوب کی تعریف ہے کیونکہ ہمارا کمال سب ادھر سے ہی ہے' مصنوع کی تعریف حقیقت میں صانع کی تعریف ہے کہ اس نے کس خوبی سے اس چیز کو بنایا ہے اس لیے میں محبوب کی تعریف پر خوش ہو رہا ہوں وہ کہنے لگے کہ مجھے پھر خطرہ ہوا کہ جب یہی بات ہے تو میرا یہ خطرہ بھی محبوب ہی کی طرف سے تھا اس پر اتنی

ناگواری کیوں ہوئی ان کو اس پر بھی اطلاع ہوگئی' فرمایا محبوب کی طرف بری باتوں کی نسبت کرنا بے ادبی ہے اب تو میں بہت گھبرایا کہ یہاں تو دل کو سنبھال کر بیٹھنا چاہیے یہ تو ہر خطرے پر مطلع ہوجاتے ہیں۔ واقعی اہل اللہ کے پاس بیٹھ کر برے خیالات سے دل کی حفاظت کرنا چاہیے کیونکہ ان کو گاہے خطرات پر بھی اطلاع ہوجاتی ہے جس سے ان کو ایذا ہوتی ہے۔

پیش اہل دل نگہدارید دل   تانبا شید از گمان بدخجل

(اہل دل کے روبرو دل کی نگہداشت کروتا کہ بدگمانی سے شرمندہ نہ ہو)

اس پر یہ شبہ ہوگا کہ بعضے خطرات تو بے اختیار آتے ہیں ان سے کیونکر حفاظت کی جائے۔

اہل اللہ کی خدمت میں بیٹھنے کا ادب

بس اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اہل اللہ کے پاس بیٹھنا ہی نہ چاہیے تو سمجھ لیجئے کہ جن کو خطرات کی اطلاع ہوتی ہے ان کو اللہ تعالیٰ یہ بھی معلوم کرادیتا ہے کہ یہ اختیار ہے اور یہ غیر اختیار ہے اور وہ ایسے نہیں ہوتے کہ غیر اختیاری امور پر مواخذہ کریں اور نہ غیر اختیاری خطرات سے ان کو ایذا ہوتی ہے پس نگہدارید دل کے معنی ہیں کہ اختیار خطرات سے ان کے پاس بیٹھ کر دل کی حفاظت کروغرض واقع میں ہم اپنے نہیں ہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے ہیں تو خدا کو یاد کرے گا وہ اپنے کو اس طرح یاد کرے گا کہ اس کی نظر اول خدا پر پڑے گی پھر اپنے پر (اور یہ التفات الی الغیر نہیں ہے) اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک حسین شخص کے گھر میں آئینہ رکھا ہو جس میں اس کی صورت نظر آرہی ہو اور ایک عاشق بھی وہاں بیٹھا ہوا ہے جو محبوب کی طرف رعب جمال کی وجہ سے نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا اس لیے وہ آئینے میں اس کی صورت دیکھ رہا ہے اور ایک دوسرا شخص ہے جو عاشق نہیں وہ بھی اس آئینہ کو دیکھ رہا ہے مگر اس نیت سے کہ دیکھوں یہ آئینہ جلی ہے یا چینی ہے تو یہ دونوں شخص آئینے کے دیکھنے سے شریک ہیں مگر دونوں کے دیکھنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں   درمیان شان برزخ لایبغیان

(بحر تلخ اور بحر شیرین برابر دونوں جاری ہیں مگر ان کے درمیان ایسا پردہ حائل ہے جس کی وجہ باہم مختلط اور متشبہ نہیں ہونے پاتے)

ظاہر میں دونوں یکساں معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت میں الگ الگ ہیں' عاشق کی نظر اول محبوب کی تصویر پر پڑے گی۔ تو تبعاً آئینہ پر بھی نظر ہے اور غیر عاشق کی نظر اول آئینہ پر پڑے گی گو تبعاً حسین کی تصویر پر بھی نظر پڑ جائے گی مگر اس کا مقصود حسین کی تصویر دیکھنا نہیں ہے بلکہ صرف

آئینہ کی خوبی دیکھنا مدنظر ہے۔ اسی طرح عارف بھی مخلوقات کو دیکھتا ہے اور ہم بھی دیکھتے ہیں مگر بڑا فرق ہے۔ اس کی نظر اول خدا تعالیٰ پر پڑتی ہے پھر تبعاً مخلوق بھی اس کے سامنے ہے اور ہماری نظر اول مخلوق پر پڑتی ہے۔ گو تبعاً حق تعالیٰ کی قدرت وصنعت کا بھی خیال آ جائے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رتبہ

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رتبہ تو یہاں تک ہے کہ ان سے پوچھا گیا:

هَلْ عَرِفْتَ رَبَّکَ بِمُحَمَّدٍ اَمْ عَرِفْتَ مُحَمَّدًا بِرَبِّکَ ؁

کہ آپ نے حق تعالیٰ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے پہچانا یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کے واسطے سے پہچانا تو فرمایا: "عَرِفْتُ مُحَمَّدًا بِرَبِّیْ" کہ میں نے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کے واسطے پہچانا۔ اگر آج کوئی شخص یہ بات کہہ دے تو بس کفر ہو گیا' بجائے قدر کرنے کے غریب پر چار طرف سے کفر کے فتوے لگیں گے کیونکہ حقیقت شناس دنیا سے اُٹھ گئے۔ چنانچہ ایک شخص نے میرے ایک دوست سے کہا کہ تم جو توحید کے مضامین زیادہ بیان کرتے ہو (کہ حق تعالیٰ کے افعال میں نہ کسی ولی کو دخل ہے نہ نبی کو وہاں کوئی دخیل کار نہیں ہے وغیرہ وغیرہ) اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے تعظیمی ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ توبہ توبہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم سے تھوڑا ہی روکتے ہیں بلکہ خدا کی توہین سے روکتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا نہ بڑھاؤ کہ حق تعالیٰ کو گھٹا دو غور کر کے دیکھا جائے تو جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صفات الوہیت ثابت کرتے ہیں حقیقت میں وہ آپ کی بے تعظیمی کرتے ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ صفات الوہیت درجہ کمال میں تو آپ کے لیے ثابت کر نہیں سکتے لامحالہ درجہ نقصان میں ثابت کریں گے تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناقص قرار دیا (نعوذ باللہ) اور ہم آپ کے لیے صفات الٰہی کو ثابت نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کی نفی کر کے صرف صفات بشریہ اور کمالات نبوت کو آپ کے لیے ثابت کرتے ہیں اور ان میں سے ہر صفت کو درجہ کمال میں ثابت کرتے ہیں تو ہم آپ کو بشر کامل و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کامل کہتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہو گے تو ناقص خدا کہو گے اور ہم انسان کہتے ہیں مگر کامل انسان تو بتلاؤ بے تعظیمی کس نے کی' بے ادب وہ ہے جو آپ کو ناقص کہے یا وہ جو کامل کہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا سے گھٹانا بھی بے ادبی ہے تو پھر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کیا کہئے گا جو یوں کہتے ہیں کہ میں نے اول خدا کو جانا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے

سے خدا کونہیں پہچانا۔ غرض یہ ثابت ہو گیا کہ عارف کی نظر اول خدا پر پڑتی ہے۔ پھر اپنے پر تو معلوم ہوا کہ خدا قریب ہے اور نفس دور ہے (اگر خدا تعالیٰ نفس سے قریب تر نہ ہوتے تو کسی کی نظر بھی اول ان پر نہ پڑ سکتی ۱۲) تو لازم آ گیا کہ جو خدا کو بھول گیا وہ اپنے نفس کو بھی بھول گیا۔ اسی کا بیان ہے "فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ" (پس وہ نفسوں کو بھول گیا)

ہماری بدحالی کا سبب

آگے فرماتے ہیں: "اُولٰئِکَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ" یہ ہے جز و مقصود جس سے مجھ کو بدحالی مذکور سابقاً کا علاج مستنبط کرنا ہے۔ ترجمہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہیں حکم سے نکل جانے والے اس میں اولئک اسم اشارہ ہے جس کے لیے فاسقون کا حکم ثابت کیا گیا ہے اور بلاغت کا قاعدہ ہے کہ اسم اشارہ میں مشار الیہ کا مع صفات مذکورہ کے اعادہ ہوتا ہے اور حکم کی بناء الٰہی صفات پر ہوتی ہے جو پہلے مذکور تھیں۔ "اُولٰئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ o" (یہی لوگ ہیں ہدایت پر جو ان کو اللہ کی جانب سے ملی اور یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے) کی تفسیر میں مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے کہ اسم اشارہ سے اس جگہ یہ بات بتلائی گئی ہے کہ ہدایت و فلاح کا حکم صفات مذکورہ ایمان بالغیب و اقامة الصلوٰة کتب منزله و انفاق مال وغیرہ پر مبنی ہے اور ان صفات کو حکم فلاح میں دخل ہے ۱۲) اس قاعدے کی بناء پر یہاں بھی اولئک میں صفت نسیان کا اعادہ ہوگا جو پہلے "اَلَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ" (جو لوگ اللہ کو بھول گئے ہیں) میں مذکور ہو چکی ہے اور حکم فسق کی بناء اسی صفت پر ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ آیت میں نسیان خدا پر فسق کو مرتب کیا گیا ہے تو یہ سبب ہوا فسق کا یعنی حکم سے نکل جانے اور حکم سے نکل جانا یہی حقیقت ہے معصیت کی جس میں ہم مبتلا ہیں تو الحمدللہ آیت سے صاف طور پر سبب مرض کی تشخیص ہو گئی اور معلوم ہو گیا کہ ہماری بدحالی کا سبب یہ ہے کہ ہم خدا کو بھول گئے ہیں۔

ذکر اللہ مرض نسیان کا علاج

اور طبعی قاعدہ ہے العلاج بالضد (علاج ضد کے ساتھ ہونا چاہیے اور نسیان کی ضد ذکر ہے تو معصیت کا علاج ذکر اللہ ہوا یا یوں کہیے کے ہر مرض کا علاج رفع سبب سے ہوتا ہے خواہ ضد کے ذریعے سے رفع کیا جائے یا مثل کے ذریعے سے مگر ازالہ مرض کے لیے رفع سبب سب کے نزدیک ضروری ہے ۱۲) اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مرض عصیاں کا سبب نسیان ہے تو اس کا علاج یہ ہوا کہ نسیان کو اٹھا دو اور رفع نسیان مستلزم ہے وجود ذکر کو (کیونکہ ارتفاع نقیضین محال ہے تو حاصل

پھر وہی ہوا کہ معصیت کا علاج خدا کو یاد رکھنا ہے۔ میں بیان کو مختصر کرتا ہوں اور ایک بہت بڑے مضمون کو تھوڑے لفظوں میں بیان کرتا ہوں۔ گو جی نہ بھرے مگر ان شاء اللہ تعالیٰ بقدر کفایت تسلی ہو جائے گی۔ ایک دوست کا خط آیا تھا کہ تمہارے جوابات سے جی نہیں بھرتا کیونکہ میں لمبے لمبے مضامین کا جواب دو چار سطروں میں دے دیتا ہوں تو میں نے لکھا کہ گو جی نہیں بھرتا مگر تسلی تو ہو جاتی ہے اور چند جملوں میں آپ کی سب باتوں کا کافی جواب تو ہو جاتا ہے۔ اس کا انہوں نے اقرار کیا میں نے کہا بس یہی کافی ہے جی بھرنے کی ضرورت نہیں (جس کو جی بھرنا ہو وہ پاس آ کر رہے اگر میں خطوط میں مخاطب کے جی بھرنے کی کوشش کروں تو بس دن بھر میں دو چار خطوں کا جواب ہوا کرے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ روزانہ کی ڈاک اسی دن پوری ہو جائے آج کا کام کل پر نہ رہے کیونکہ اگلے دن پھر دوسری ڈاک آ جاتی ہے اور یہ صورت تو مختصر ہی جوابات میں ہو سکتی ہے لیکن الحمدللہ میرے جوابات باوجود اختصار کے کافی ہوتے ہیں کسی جزو سوال کا جواب رہ نہیں جاتا ۱۲) اسی طرح اس وقت گو مضمون بڑا ہے اور مختصر بیان سے شاید جی نہ بھرے لیکن ان شاء اللہ تسلی ہو جائے گی۔ یہ تو معلوم ہو چکا کہ گناہ سے بچنے کا طریقہ خدا کو یاد کرنا ہے۔

اللہ کی یاد کے متعدد طرق

اب یہ بات رہی کہ یاد کیسے کرے تو سنئے یاد کے طریقے مختلف ہیں۔ ایک یاد ہوتی ہے محبت سے اور ایک ہوتی ہے خوف سے اور ایک ہوتی ہے حیا سے اور ان میں بھی پھر چند قسمیں ہیں کہ محبت ذات سے ہے یا ثواب سے اور خوف ذات کا ہے یا عقاب کا (اور حیا ذات سے ہے یا محسن کے احسان ۱۲) اس میں لوگوں کے طبائع اور مذاق مختلف ہیں بعضے تو وہ ہیں جن پر محبت ذات غالب ہے اور صرف ذات حق کا عشق ان کے لیے ذکر پر باعث ہے وہ نہ جنت کے لیے ذکر کرتے ہیں نہ دوزخ سے بچنے کے لیے بلکہ محض رضائے محبوب کے لیے ذکر کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں:

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن — کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(تم بندگی مثل فقیروں کے مزدوری کی شرط سے مت کرو آقا خود بندہ پروری کی روش سے واقف ہے)

یہ تو خواص عارفین کی حالت ہے اور بعضے وہ ہیں جن کو ذکر کا ولولہ اسی سے اٹھتا ہے کہ ہم کو اس عمل سے جنت ملے گی ان کے ذکر کا منشا ثواب ہے سو اس کا بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ گو بعض عارفین نے ان پر اعتراض کیا ہے کہ یہ لوگ خواہش پرست ہیں مزدوروں کی طرح کام کرتے ہیں کہ عمل سے پہلے اجرت ٹھہرا لیتے ہیں۔ گویا خدا سے کہتے ہیں کہ ہم اس شرط پر ذکر کرتے ہیں کہ اس صلہ میں ہم کو جنت دی

جائے مگر یہ معترض محقق نہیں ہے۔ میاں مقصود تو ذکر ہے وہ ہونا چاہیے کسی طرح ہو اگر اس شخص کو طلب ثواب کی نیت سے روکا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ذکر ہی سے رہ جائے گا اور اگر یہ اسی نیت سے ذکر کرتا رہا تو ان شاء اللہ تعالیٰ ایک دن وہ بھی ہوگا کہ اس کو ذات حق سے عشق ہو جائے گا۔ پھر اس کو بھی رضائے محبوب کے سوا کچھ مطلوب نہ رہے گا۔ پس یہ حالت بھی اچھی ہے بری نہیں۔ دیکھو گلستان کے پڑھنے والے دو طرح کے لڑکے ہیں ایک تو وہ ہے جس کو خود گلستان میں لطف آتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو محض باپ کے اس کہنے سے پڑھتا ہے کہ گلستان پڑھتے رہو گے تو ہم تم کو روزانہ ایک آنہ دیا کریں گے۔ ہر چند کہ اس کی حالت پہلے سے کم درجہ کی ہے مگر کیا کوئی عاقل اس سے یہ کہہ سکتا ہے کہ میاں اگر گلستان پڑھو تو خود ذاتی شوق سے پڑھو ورنہ ایک آنہ کے لالچ سے پڑھنا فضول ہے اس میں کیا فائدہ۔ ہر گز نہیں کیونکہ اس کا نتیجہ بجز محرومی علم کے کچھ نہیں بلکہ ہر شخص یہ کہے گا کہ جس طرح بھی ہو پڑھنا چاہیے۔ اسی طرح ایک دن تم کو خود مزا آنے لگے گا پھر اس وقت یہ حالت ہو جائے گی کہ اگر باپ کچھ بھی نہ دے بلکہ یہ کہے کہ گلستان پڑھنا چھوڑ دے تو تم ہر گز اس کی بات نہ مانو گے پھر یہ قاعدہ ذکر میں کیوں نہیں جاری کیا جاتا اور جو لوگ ثواب کے لیے عمل کرتے ہیں ان پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ کے ارشاد فرمودہ سب طریقے بڑھیا ہیں

جب خدا تعالیٰ نے خود جنت کی رغبت دلائی (اور اس میں رغبت کرنے کا امر بھی کیا ہے) چنانچہ ارشاد ہے: ''وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ'' (اس میں چاہیے کہ رغبت کرنے والے رغبت کریں) تو اس کی رغبت سے ذکر کرنے میں کیا حرج ہے اور جو معترض گھٹیا حالت بتلاتا ہے وہ گویا خدا تعالیٰ پر اعتراض کرتا ہے کہ انہوں نے گھٹیا حالت کی رغبت دلائی ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے حق تعالیٰ نے جتنے طریقے بتلائے ہیں سب بڑھیا ہیں ان میں گھٹیا کوئی نہیں۔ (یہ اور بات ہے کہ ایک رفیع ہو دوسرا ارفع پس ہر چند کہ محض رضائے محبوب کے لیے ذکر کرنا مقام ارفع ہے مگر طلب جنت کے لیے ذکر کرنا بھی رفیع حالت ہے گھٹیا اور ادنیٰ حالت نہیں خوب سمجھ لو ۱۲) یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْجَنَّةَ وَمَا قَرَّبَ اِلَیْھَا مِنْ قَوْلٍ اَوْ عَمَلٍ''[1] (اے اللہ! میں آپ سے جنت مانگتا ہوں اور پھر وہ چیز مانگتا ہوں جو جنت سے نزدیک کرنے والی ہو قول و عمل) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی رغبت سے عمل کرنا سب سے ارفع حالت ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی حالت تھی تو سمجھ لیجئے کہ ارفع

---

[1] (مسند احمد ۱: ۱۴۷)

تو وہی حالت ہے کہ محض رضائے محبوب کے لیے عمل کیا جائے۔ رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا سواس کے متعلق وہ بات یاد کر لیجئے جو میں نے پہلے بیان کی ہے کہ عاشق کو محبوب کی چیزوں سے بھی محبت ہوا کرتی ہے۔ پس آپ کا جنت مانگنا ویسا نہیں ہے جیسا ہمارا مانگنا تو ہم جنت اس لیے مانگتے ہیں کہ وہاں ہم کو آرام ملے گا' حوریں ملیں گی' خوب مزے اڑیں گے۔ غرض ہم کو حظ نفس مطلوب ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا اس بناء پر تھا کہ وہ خدا کی چیز ہے اور خدا تعالیٰ نے اس کے مانگنے کا امر فرمایا ہے۔ جب محبوب خود یہ چاہے کہ مجھ سے میری چیزیں بھی مانگو تو اس وقت مانگنا ہی موجب رضا ہے اس وقت استغناء مناسب نہیں۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں　　خاک برفرق قناعت بعد ازیں

اگر سلطان دین مجھ سے طمع کی فرمائش کرے تو اس کے بعد قناعت کے سر پر خاک ڈال دوں گا)

اس لیے آپ نے جنت مانگی اور اس سے استغناء برتا۔ عارف کامل خدا تعالیٰ کی ادنیٰ نعمت سے بھی استغناء ظاہر نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ جنت سے جو کہ اجل النعم ہے ہاں کوئی ابن الفارض جیسا صاحب حال ہو تو وہ بلا سے استغناء ظاہر کر دے اور ایسے لوگ غلبہ حال سے معذور ہوں گے ورنہ معرفت کا مقتضاء یہی ہے کہ جیسے محبوب سے رضائے محبوب طلب کی جاتی ہے۔ اسی طرح اور جس چیز کا مانگنا اسے پسند ہو وہ بھی مانگے اور یہ بھی درحقیقت طلب رضا ہی ہے کسی دوسری چیز کی طلب نہیں۔ دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنت کا سوال اس بناء پر بھی کرتے تھے کہ وہ محل دیدار ہے تو درحقیقت یہ جنت کا سوال نہ تھا بلکہ دیدار محبوب کا سوال تھا۔ اسی کو کہتے ہیں:

عاشقاں جنت برائے دوست می دارند دوست

(عاشقین جنت کو محبوب کیوجہ سے دوست رکھتے ہیں)

طلب جنت کی متعدد نیتیں

اور ایک بات اس سے بھی باریک ہے وہ یہ کہ بعض دفعہ جنت کی طلب اس نیت سے بھی نہیں ہوتی کہ وہاں محبوب کا دیدار ہوگا بلکہ محض اس خیال سے تمنا کی جاتی ہے کہ ہماری یہ شان تو کہاں جو دیدار کی تمنا کریں تو اگر جائے دیدار ہی کو دیکھ لیں تو بڑی قسمت ہے ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ لوگ بڑے حوصلے کے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں ہم تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ گنبد خضراء ہی ہمیں نظر آ جائے۔

مرا از زلف تو موئے بسند است　　　ہوس را رہ مدہ بوائے بسند است

(اگر محبوب نہ ملے تو اس کا ایک بال ہی کافی ہے اور اگر بال بھی نہ ملے تو خوشبو ہی بہت ہے)

تو بعض دفعہ غلبہ تواضع طلب جنت کا منشا ہوتا ہے کہ عاشق اپنے کو وصال محبوب کے قابل نہیں سمجھتا اس لیے تمنا کرتا ہے کہ میں اس کو دیکھنے کے تو لائق نہیں۔ کاش اس کے شہر میں جا رہوں اور بھی اپنی احتیاج و افتقار ظاہر کرنے کے لیے جنت کی تمنا کی جاتی ہے کہ اے اللہ میں آپ کی رضا کا محتاج تو کیوں نہ ہوں گا میں تو جنت تک کا بھی محتاج ہوں اس لیے بطور اظہار احتیاج کے دعا کی جاتی ہے کہ اے اللہ جنت دے دے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حال پیش نظر ہوتا تو آپ کھانا کھا کر فرمایا کرتے تھے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ غَیْرَ مُوَدَّعٍ وَلَا مَكْفُوْرٍ وَلَا مُسْتَغْنًى عَنْهُ رَبَّنَا ۝[1]

"یعنی اے اللہ! اس وقت پیٹ بھر گیا اس لیے کھانے کو ہٹا دیا ہے ہم اس کو ہمیشہ کے لیے وداع نہیں کرتے نہ اسکی ناقدری کرتے ہیں اور نہ اے اللہ ہمیں اس سے استغنا ہے۔"

حقیقت میں آپ کی اداؤں کی یہ حالت ہے کہ

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

(سر سے پیر تک جس جگہ نظر کرتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوبیت کی ہے یعنی اس کے حسن سے ہر پہلو سے محبوبیت برستی ہے)

آپ کی جس ادا کو بھی دیکھو اس میں غضب کی دل ربائی ہے۔ پھر کمال یہ کہ اس میں نہ تصنع نہ تکلف بلکہ ایک بے ساختہ حال ہے:

دلفریبان نباتی ہمہ زیور بستند　　　دلبر ماست کہ با حسن خدا داد آمد

(نباتی دلفریب زیور متعارف سے مزین ہیں ہمارے محبوب میں حسن خداداد ہے)

مخالفین نے بھی ان باتوں کو دیکھ کر آپ کی سچائی کی شہادت دی اور ان کو ماننا پڑا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں جس قدر کمالات تھے وہ اصلی تھے تصنع اور بناوٹ کا وہاں نام نہ تھا۔ غرض ایک منی طلب جنت کا یہ بھی ہوتا ہے یعنی اظہار احتیاج پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا اور ہمارا مانگنا برابر نہیں (اور آپ کے سوال جنت کا یہ مطلب نہیں کہ عمل جنت کے واسطے کرنا چاہیے بلکہ اس کا جو

---

[1] (سنن الترمذی: ۳۴۵۶)

منشاء آپ کی شان کے مناسب تھا وہ اپنے علم کے موافق کر دیا گیا ۱۲) لیکن اگر کوئی شخص جنت ملنے ہی کی نیت سے عمل کرے تو وہ بھی راہ صواب پر ہے' غلط راستے پر نہیں خدا تعالیٰ سے محبت ہونی چاہیے خواہ بلا واسطہ راست ہو یا جنت کے واسطے سے سب ٹھیک ہے:

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف　　　گر بکشد زہے شرف ور بکشم زہے طرب

(نصیبہ اگر مدد کرے تو محبوب کا دامن پکڑ لوں' اگر وہ کھینچے بہت شرف ہے اور اگر میں کھینچوں بڑی خوشی)

یعنی مقصود قرب ہے بس قرب ہونا چاہیے خواہ میں انہیں کھینچ لوں یا وہ مجھے کھینچ لیں۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ مقصود تو کام چلنا ہے کہ بندہ کو خدا کی اطاعت و ذکر کی توفیق ہو جائے۔ اب وہ براہ راست خدا کی محبت سے ہوا تو کیا اور جنت کی رغبت سے ہوا تو کیا دونوں راستے ٹھیک ہیں اور دونوں بڑھیا ہیں۔ گو ایک رفیع ہے اور ایک ارفع ۱۲) یہ تو محبت کی قسمیں تھیں عظمت و جلالت شان کے اور کسی کو عذاب کا خوف ہے یہ دونوں راستے بھی ٹھیک ہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے اپنے عذاب و عقاب سے بندوں کو ڈرایا ہے اور اس کی شدت جا بجا اسی لیے بیان فرمائی ہے کہ بعض طبائع پر جلالت و عظمت حق کا انکشاف نہیں ہوتا ان کے لیے خوف عذاب ہی گناہوں سے زاجر ہوتا ہے۔ پس جو لوگ خوف عذاب سے عمل کرتے ہیں ان پر بھی اعتراض نہ چاہیے ان کی حالت بھی گھٹیا نہیں (بلکہ رفیع حالت ہے گو اس سے ارفع کی یہ حالت ہے کہ عظمت و جلالت شان خالق منکشف ہو کر گناہوں سے زاجر ہو ۱۲)

یاد کی اقسام

یاد کی دو قسمیں تو یہ ہوئیں ایک یاد محبت' ایک یاد خوف۔ ایک تیسری قسم اور ہے یاد حیاء بعض وہ طبائع ہیں جو ذکر اللہ اور اعمال صالحہ محض حیا کی وجہ سے کرتے ہیں ان کو اپنے خالق محبوب کی یاد سے غافل ہوتے ہوئے شرم و حیا آتی ہے خوف یا محبت ان کے لیے ذکر و طاعت کا قوی باعث نہیں ہوتا بلکہ وہ محض حیا کی وجہ سے سب کچھ کرتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حضرات خوف و محبت سے خالی ہوتے ہیں یہ نہیں بلکہ ان کا غلبہ نہیں ہوتا' غلبہ حیا کو ہوتا ہے باقی خوف و محبت و حیا کسی سے بھی کوئی مسلمان خالی نہیں ہو سکتا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہر مسلمان میں ان کا موجود ہے۔ ہاں غلبہ کسی پر خوف کا ہے کسی پر محبت کا کسی پر حیا کا اور جس صفت کا جس میں غلبہ ہے وہی اس کے لیے اعمال کی طرف داعی ہوتی ہے کسی میں حیا غالب ہے تو یہی حیاء اس کے لیے ذکر اللہ کا باعث ہوتی ہے' یہ راستہ بھی ٹھیک ہے (خدا تعالیٰ نے جس کے لیے جو راستہ مناسب سمجھا مقرر کر دیا)

سرکاری تقسیم

بندگی کے معنی یہ ہیں کہ اس پر راضی رہے اور اس کے خلاف کی تمنا نہ کرے امور غیر اختیاریہ موہوبہ غیر مکتسبہ میں خلاف کی تمنا مذموم ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "وَلَا تَتَمَنَّوْا مَافَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ" ۱۲ (مت تمنا کرو اس چیز کی جس سے اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے) پس اے سالکین! جب تم کو معلوم ہوگیا کہ ذکر کی اتنی صورتیں ہیں اور یہ سب وصلی الی المقصود کے لیے کافی ہیں تو ذکر و شغل کر کے اس کے متمنی نہ ہوا کرو کہ کاش ہم کو خوف حاصل ہو جاتا اور جب عرصہ تک ذکر کر کے وہ حاصل نہ ہوا تو افسوس کرنے لگے کہ ہائے ہم پر خوف غالب کیوں نہیں ہوتا۔ صاحب تم کو کیا خبر ہے کہ تمہارے خوف کا راستہ مناسب ہے یا محبت وحیا کا۔ یہ تو سرکاری تقسیم ہے جس کے مناسب جو راستہ معلوم ہوا اسی کے اسباب اس میں پیدا کر دیئے وہ کسی کو ہنسا کر پہنچاتے ہیں کسی کو رُلا کر اور کسی کو نہ ہنساتے ہیں نہ رُلاتے ہیں اس کو حیرت و پریشانی میں رکھ کر پہنچاتے ہیں۔ خوب کہا ہے:

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان است ۔۔۔ بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں است

(گل سے کیا کہہ دیا ہے کہ خنداں ہو رہا ہے اور بلبل سے کیا فرما دیا ہے کہ نالاں ہے)

مولانا فرماتے ہیں:

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست ۔۔۔ ور بجہل آئیم ماز ندان اوست

گر بخواب آئیم مستان ویم ۔۔۔ ور بہ بیداری بدستان ویم

(یعنی اگر علم تک ہماری رسائی ہو جائے تو یہ بھی ان کا ایوان ہے کہ درجہ علم ان کے تصرف سے عطا ہوا اور اگر جہل میں مبتلا رہیں تو یہ ان کا زندان ہے یعنی حق تعالیٰ کا تصرف ہے کہ مجلس جہل سے نہیں نکلے۔ اگر سو رہیں تو ان ہی کے بیہوش کیے ہوئے ہیں اور اگر جاگ اٹھیں تو بھی ان ہی کی گفتگو ہیں)

اور حیرت کا بیان فرماتے ہیں:

در تردد ہر کہ او آشفتہ است ۔۔۔ حق بگوش او معما گفتہ است

(یعنی جو شخص تردد میں پریشان ہو رہا ہے گویا حق تعالیٰ نے اس کے کان میں کوئی معمہ کہہ دیا ہے)

کہ چنیں بنماید و گہ ضد ایں ۔۔۔ جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

(غرض کسی کو کچھ دیا کسی کو کچھ دیا جس کو محبوب کے ہاتھ سے جو بھی مل گیا اس کو سب سے اچھا سمجھنا چاہیے اور اس پر راضی رہ کر یہ شان ہونی چاہیے)

من چو کلکم درمیان اصبعین　　　نیستم در صفت طاعت بین بین

(میں قلم کی طرح دوانگلیوں میں ہوں' صفت طاعت میں بین بین نہیں ہوں)

یعنی جس طرح قلم کاتب کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھنا چاہتا ہے وہی لکھا جاتا ہے' اگر عربی لکھنا چاہے تو قلم سے عربی ہی لکھی جاتی ہے اگر اردو لکھنی چاہے تو اردو ہی لکھی جاتی ہے۔ اسی طرح تم بھی خدا تعالیٰ کے تقسیم کے سامنے مطیع و منقاد ہو جاؤ۔ چنانچہ جنہوں نے اس کو سمجھ لیا ہے وہ ہر حال میں راضی رہتے ہیں۔ اگر ان پر محبت کا غلبہ ہے تو غلبہ خوف کے طالب نہیں ہوتے۔ اگر خوف کا غلبہ ہے تو غلبہ محبت کے طالب نہیں ہوتے وہ تو ہر حال میں یہ کہتے ہیں:

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش　　　کہ انچہ ساقی ماریخت عین الطاف است

(تجھ کو صاف اور گدلے سے مطلب نہیں خاموش رہ کر جو کچھ ہمارے ساقی نے پیالہ میں ڈال دیا ہے عین اس کی مہربانی ہے)

کیفیات ومقامات کی تمنا خلاف عبدیت ہے

یہ بات ذاکرین کے کام کی ہے کیونکہ ان کو بڑی حرصیں ہوتی ہیں ان میں حالات و کیفیات و مقامات کی تمنا کا مرض بہت ہے۔ یاد رکھو یہ خلاف عبدیت ہے بعض ذاکرین ذکر کر کے یہ شکایت کرتے ہیں کہ مزہ نہیں آتا ہائے یہ ساری عمر نفس کے مزے ہی میں پڑے رہیں گے' محبوب کی طرف کب متوجہ ہوں گے۔ حضرت منصور نے ایک سالک سے پوچھا کہ آج کل کس کام میں ہو' انہوں نے کہا کہ مقام توکل طے کر رہا ہوں' منصور نے کہا افسوس تم ساری عمر پیٹ ہی کے دھندے میں رہو گے' محبوب کے ساتھ کب مشغول ہو گے کیونکہ واقعی توکل تو اکثر کھانے پینے اور پہننے ہی کے فکر سے چھوٹ جانے کے لیے کیا جاتا ہے تو یہ بھی پیٹ ہی کا دھندا ہوا ۱۲) یاد رکھو عاشق کا مذہب یہ ہونا چاہیے۔

عشق آن شعلہ است کو چوں برفروخت　　　ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

تیغ لادر قتل غیر حق براند　　　درنگر آخر کہ بعد لاچہ ماند

ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت　　　مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

(عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے تو سوائے محبوب کے سب کو فنا کر دیتا ہے لا الہ الا اللہ کی تیغ غیر اللہ کو ہلاک کرنے میں چلاؤ لا الہ الا اللہ کے بعد دیکھو کیا رہ گیا یعنی الا اللہ باقی رہ گیا باقی تمام فنا ہو گئی' اے عشق شرکت سوز تجھ پہ آفریں کہ سوائے محبوب حقیقی کے تو نے سب کو فنا کر دیا)

جب لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا تو اللہ تعالیٰ کے سوا اب سب منفی ہو گئے۔ پس اب نہ کسی خاص کیفیت کے طالب بنو نہ کسی خاص مقام کے بلکہ خدا کے طالب بنو اور اگر کچھ بھی نہ ملے تب بھی راضی رہو۔

گر مرادت را مذاق شکر است   بے مرادی نے مراد لبراست

یعنی ہم نے مانا کہ تمہاری مراد بہت عمدہ ہے مگر یہ تو سوچو کہ اگر دلبر کی مراد یہ ہے کہ تم نامراد رہو تو کیا اس کی مراد تمہاری مراد سے افضل نہ ہوگی۔ یقیناً ہوگی اس جگہ نامرادی کا مطلب اور کچھ نہ ملنے کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری مخترعات اور متخیلات نہ ملیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ بالکل کچھ نہ ملے کچھ تو ضرور ملتا ہے اگر تمہارے مخترعات نہ ملیں گے تو وہ خود تم کو ملیں گے اور جب وہ مل گئے پھر تو سب کچھ مل گیا:

آنکس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند   فرزند و عیال و خانماں راچہ کند

(جس شخص کو آپ کی معرفت حاصل ہوگئی اس کو جان فرزند اسباب کی پروانہیں)

گناہوں سے بچنے کی آسان تدبیر

پس بندے کا کام یہ ہے کہ خدا کی یاد میں لگے اور ذکر و فکر ہی کو مقصود سمجھے اور کسی کیفیت پر نظر نہ رکھے کیونکہ میں نے بتلا دیا کہ ذکر کی مختلف صورتیں ہیں اور ذکر ان سب کو عام ہے۔ اب میں گناہوں سے بچنے کی ایک بہت آسان تدبیر بتلاتا ہوں جس پر ہر شخص کو عمل کرنا آسان ہو وہ یہ کہ گناہ تو خیر ہم سے بہت ہوتے ہی ہیں اور سب کا دفعتہً چھوٹ جانا ہر شخص سے آسان بھی نہیں مگر تم یہ کیا کرو کہ ایک وقت تنہائی کا مقرر کرلو اور اس میں خدا کی یاد کیا کرو مگر یاد ایسی ہو کہ زبان و دل دونوں اس میں شریک ہوں ورنہ وہ حالت ہوگی:

سبحہ برکف توبہ برلب دل پراز ذوق گناہ   معصیت راخندہ می آید براستغفار ما

(تسبیح ہاتھ میں اور لب پر توبہ اور دل گناہوں سے بھرا ہوا ہمارے استغفار پر گناہ کو ہنسی آتی ہے)

اور ایسی زبان یاد جلدی مؤثر نہیں ہوتی یاد خدا جلدی رنگ لاتی ہے جو دل و زبان دونوں سے ہو تو صاحب میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ دن بھر کوئی گناہ نہ کرو میں کہتا ہوں کہ اگر تم سے گناہ چھوٹ ہی نہیں سکتے تو خدا کے لیے اتنا کرو کہ ایک وقت گھنٹہ آدھ گھنٹہ یاد خدا کے واسطے مقرر کرلو لیکن جب اللہ کا نام لینے بیٹھو تو قصداً دل میں کچھ نہ لاؤ اور جو خود آجائے اسے آنے دو وہ تم کو کچھ مضر نہیں، دیکھو اگر ایک سرکاری آدمی پہرا پر کھڑا کیا گیا ہو کہ دربار میں کسی باغی کو نہ آنے دے تو اگر وہ سنتری خود ہی باغی کو اندر لے لے تو مجرم ہوگا۔ لیکن اگر وہ خود اندر نہ لے بلکہ باغی اس کو مجبور کر کے اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر زبردستی اندر چلا آئے تو سنتری مجرم نہ ہوگا۔ اسی طرح

نماز یا ذکر میں خود وساوس کا لانا یا ادھر مشغول ہو جانا برا ہے اور اگر خود نہ لاؤ اور نہ ادھر متوجہ ہو تو کچھ ضرر نہیں پس تم اپنے مایہ و متاع کو خود ذہن میں نہ لاؤ بلکہ اپنی طرف سے تو اس کی کوشش کرو:

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے　　　　بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے

(ایک ساعت ایک لحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا دن بھر کی دار و گیر شاہی سے بہتر ہے)

صاحبو! ایک گھنٹہ تو ایسا نکال لو جس میں اس طرح خدا کو یاد کرو۔ آگے ایک تجربے کی بات ہے کہ اس وقت جتنا مفرد اور بسیط ذکر ہوگا اتنا ہی یکسوئی زیادہ ہوگی اور وہی زیادہ مفید ہوگا۔ پس اس ایک گھنٹہ میں دل لگا کر لا الہ الا اللّٰہ کا ذکر کرو یا اللہ اللہ اور اس وقت اپنی طرف سے خدا کی طرف متوجہ رہنے کی پوری کوشش کرو بس تم اس طرح روزانہ ایک گھنٹہ پورا کر دیا کرو اس کے بعد چاہے جس طرح حال میں بھی تمہاری گزرے میں دکھلا دوں گا کہ چند روز کے بعد عین گناہ کے وقت شرم آئے گی اور گناہ کرتے ہوئے اندر سے کوئی چیز تم کو روکے گی اگر اس وقت تم نے اس شرم وحیا سے کام لیا اور فائدہ اٹھایا تو مدعا حاصل ہوا اور اگر نفس و شیطان سے مغلوب ہو کر گناہ کر بھی لیا تو فوراً دل کے نور میں کمی معلوم ہوگی جس سے گھبرا کر معاً توبہ کی طرف جھکو گے اور اگلے دن اس حرکت کے بعد خدا کا نام لیتے ہوئے نہایت شرم آئے گی اور سخت صدمہ ہوگا اور کیا کہوں کیا کیا پیش آئے گا آپ ورد کو پورا کرنا چاہیں گے اور گناہ کا خیال آپ کی زبان پکڑ لے گا۔ بس وہ حال ہوگا:

احب مناجاة الحبيب يا وجه　　　　ولكن لسان المذنبين كليل

(محبوب کی پسندیدہ تر مناجات کے بہت سے طریقے ہیں لیکن گناہ گاروں کی زبان بیان کرنے سے قاصر ہے)

پابندی ذکر کی برکات

حضرات میں آپ کو عجیب بات بتلا رہا ہوں بخدا ذکر کی پابندی کے ساتھ اول تو آپ سے گناہ ہی نہیں صادر ہو سکتے اور اگر ہوئے بھی تو اس حالت سے ہوں گے کہ بعد میں دل پر آرے چلیں گے جس سے ان شاء اللہ تعالیٰ یہ اثر ہوگا کہ ایک ایک کر کے سب گناہ چھوٹ جائیں گے اور جس وقت کوئی لغزش ہوگی فوراً دل پر نشتر سا لگے گا اور توبہ کی توفیق ہوگی' بدون توبہ کے چین ہی نہ آئے گا۔ جائیے میں نے تو اتنا سہل نسخہ بتلایا جس سے زیادہ آسان کوئی نسخہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کسی سے یہ تدبیر نہ ہو سکے تو "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن" (ہم سب اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) بس اس کے لیے یہ کہا جائے گا:

اس کے الطاف تو ہیں علم شہیدی سب پر　　　تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

خلاصہ وعظ

خلاصہ وعظ کا یہ ہوا کہ اس آیت میں "اُولٰئِکَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ نَسُوا اللّٰهَ" پر مرتب کیا گیا ہے جس سے اس نسیان کا سبب فسق و معصیت ہونا ظاہر ہوا اور مرض کا سبب سبب کے ازالہ سے ہوتا ہے تو معصیت کا علاج ازالہ نسیان ہوا اور ازالہ نسیان ذکر سے ہوتا ہے اس لیے گناہوں سے بچنے کے واسطے ذکر اللہ لازم ہوا جس کی سہل تدبیر میں نے بتلا دی۔ الحمدللہ اس آیت سے یہ عجیب مسئلہ نہایت آسانی سے مستنبط ہو گیا۔

اب میں ختم کرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ اس کو مقبول فرما دیں اور آپ کو اس کا نفع عنایت فرمائیں۔ آمین

وَصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقه سیدنا و مولانا محمدٍ وَعلیٰ آله واصحابه اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین. فقط

التثبیت بمراقبۃ الممبیت

یہ وعظ ۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۰ ہجری بمقام تھانہ بھون بر مکان منشی محمد مظہر علی صاحب برادر خورد حضرت حکیم الامت قدس سرہ جو کہ حضرت والا نے بیٹھ کر ۲ گھنٹہ ۴۵ منٹ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً...... تھی۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّاٰتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡقَوۡلِ الثَّابِتِ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَفِی الۡاٰخِرَۃِ وَیُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیۡنَ وَیَفۡعَلُ اللّٰہُ مَایَشَآءُ○

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس پکی بات سے دنیا اور آخرت میں مضبوط رکھتا ہے اور ظالموں کو بھلا دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔"

ہر وقت کا مراقبہ

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ایک خاص فضیلت بیان فرمائی ہے ایک خاص عمل کی اس وقت مجھے اس عمل کی فضیلت کا بیان کرنا بھی مقصود ہے لیکن اصل مقصود ایک دوسرا امر بیان کرنا ہے جو شوق کلام سے مقصود حق بھی معلوم ہوتا ہے یعنی مجھے ایک مراقبہ کا بیان کرنا زیادہ مقصود ہے اور چونکہ اس مراقبہ کا کوئی وقت مقرر نہیں بلکہ ہر وقت کرنے کا ہے اس لیے وہ نفس پر گراں بھی ہوتا ہے کیونکہ نفس وقتی عمل کو تو آسان سمجھتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے کسی کام میں مقید ہو جائے اور ہر وقت کی قید کو نہایت دشوار سمجھتا ہے اگرچہ وہ مراقبہ فی نفسہ دشوار نہیں صرف ایک بات کا دھیان رکھنا ہے اور کسی بات کا دھیان رکھنا کچھ مشکل کام نہیں کیونکہ کچھ سامان کرنا تھوڑا ہی پڑتا ہے مگر ہر وقت دھیان رکھنا بھی نفس کو گراں ہے۔ حق تعالیٰ جزائے خیر دے حکماء اُمت وفقہاء ملت کو کہ انہوں نے اس دشواری کو سہل کر دیا کہ اس کے لیے بھی انہوں نے ایک وقت مقرر کر دیا اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب وہ مراقبہ کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں تو حکماء اُمت نے اس کو کس طرح مقید کر دیا کیونکہ یہ تو عموم کی تخصیص ہے جواب یہ ہے کہ حکماء نے عموم کی تحصیل ہی کے لیے یہ تخصیص کی ہے

یعنی مقصود تو ان کا بھی یہی ہے مراقبہ ہر وقت ہو مگر چونکہ ابتداء میں ہر وقت اس کا استحضار گراں ہوتا ہے اس لیے انہوں نے اس کی عادت ہو جانے سے ذہن میں یہ مراقبہ راسخ ہو جاتا ہے پھر رسوخ کے بعد خود بخود ہر وقت دھیان رہنے لگتا ہے۔ غرض یہ تخصیص ابطال عموم کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کی تحصیل وکمال کے لیے ہے خوب سمجھ لو بہر حال حکماء اُمت نے اس دشواری کو آسان کر دیا ہے۔ یہ بات اخیر میں بیان کرنے کی تھی مگر میں نے گھبراہٹ دفع کرنے کے لیے اس کو پہلے ہی بیان کر دیا تا کہ سامعین مطمئن ہو کر سنیں کہ ان کو کوئی دشوار بات نہ بتلائی جائے گی۔ اب اس کی تعیین سننا چاہیے کہ یہاں کونسا مراقبہ مقصود ہے اور گو حق تعالیٰ نے صراحۃً تو کسی خاص عمل کے امر کا ذکر نہیں فرمایا مگر اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے کیونکہ یہاں صراحۃً تو کسی خاص عمل کے امر کا ذکر نہیں بلکہ محض ایک خبر مذکور ہے کہ حق تعالیٰ ثابت رکھتے ہیں ایمان والوں کو پکی بات کے ساتھ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور ظالموں کو بچلا دیتے ہیں۔

اخبار قرآنیہ کا مقصود

مگر اس پر علماء ومفسرین کا اجماع ہے کہ اخبار قرآنیہ سے محض خبر ہی مقصود نہیں ہوتی بلکہ مقصود تو انشاء ہوتا ہے اور اخبار قرآنیہ ہی کیا تخصیص ہے میرے نزدیک تو خبر من حیث ہو خبر کسی عاقل کے کلام میں بھی مقصود نہیں ہوتی بلکہ عقلاء کو ہر جملہ خبریہ سے کوئی انشاء ہی مقصود ہوتا ہے اور جس جملہ خبریہ سے کوئی انشاء مقصود نہ ہو وہ لغو ہوتا ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو یہاں خبر سے محض مقصود نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ چونکہ ایسا ہونے والا ہے لہٰذا اس واقعہ سے ڈرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں میں یعنی ایمان والوں میں داخل ہونا چاہیے ظالمین میں سے نہ ہونا چاہیے۔ پس یہاں بھی تصریح تو اس کی ہے کہ حق تعالیٰ کے خاص بندوں کی یہ فضیلت ہے کہ دنیا و آخرت میں حق تعالیٰ ان کو ثابت رکھتا ہے اور کافروں کی یہ مذمت ہے کہ ان کو بچلا دیتا ہے لیکن اس سے ایک مراقبہ کی طرف اشارہ بھی ہو گیا کہ اس وقت سے ڈرنا چاہیے جس میں کافر بچلیں گے اس لیے ایمان وعمل کا اہتمام کیا جائے۔

آیت مبارکہ میں حکیمانہ وحاکمانہ جواب

بظاہر اس آیت پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ ہی ثابت رکھتے ہیں اور وہی بچلا دیتے ہیں تو الزام کس پر؟ اس کا جواب ظالمین کے لفظ سے ہو گیا کہ انہوں نے ظلم کیا تھا اس لیے اس کی نحواست سے بچل گئے یہ تو حکیمانہ جواب تھا اگر اس پر بھی کوئی شبہ کرے تو آگے حاکمانہ جواب بھی

دے دیا: "یَفْعَلُ اللّٰہُ مَایَشَآءُ" کہ کسی کے ادا کا کچھ اجارہ نہیں جاؤ اللہ تعالیٰ جو چاہیں کرتے ہیں حکیمانہ جواب سے بعض دفعہ شک وشبہ قطع نہیں ہوتا اس لیے حاکمانہ جواب بھی بیان فرمادیا۔ اب سب کی زبانیں بند ہوگئیں۔ یہ تو ترجمہ آیات کا تھا مگر اس سے، وہ واقعہ معلوم نہیں ہوا جس کی نسبت تثبیت واضلال کی خبر دی گئی ہے اس کے لیے تفسیر کی ضرورت ہے اور قرآن کی تفسیر کہیں تو قرآن ہی سے ہوتی ہے اور کہیں حدیث سے اس آیت کی تفسیر حدیث سے معلوم ہوئی ہے۔ حدیث کیا ہے: ارشاد ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جن کی شان یہ ہے:

گفتہ او گفتہ اللہ بود　　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ اگرچہ یہ اللہ تعالیٰ کے بندے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زبان سے نکلا ہے)

اس لیے حدیث بھی بمنزلہ قرآن ہی کے ہے۔

قرآن وحدیث سے عذاب قبر کا ثبوت

سوحدیث میں آچکا ہے کہ یہ آیت عذاب قبر کے متعلق ہے پس ثابت ہوگیا کہ یہاں عذاب قبر سے ڈرنے کا اور اس کے استحضار کا امر ہے مگر اس پر ایک طالب علمانہ اشکال ہوتا ہے میں اس کا بھی جواب دیئے دیتا ہوں وہ یہ کہ یہ سورت مکی ہے اور احادیث صحاح سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عذاب قبر کا علم مدینہ میں ہوا ہے پھر یہ آیات عذاب قبر کے متعلق کیونکر ہوسکتی ہے اگر اس میں عذاب قبر کا ذکر کرنا ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ ہی میں اس کا علم ہوجاتا اس کا ایک جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ اس سورت کی خاص اس آیت کو مدنی مانا جائے مگر میں نے اس کو کہیں منقول نہیں دیکھا اس لیے میرے نزدیک دوسرا سہل جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو "تثبیت و اضلال فی الاخرۃ" کی تفسیر کا ایک جزو تو مکہ میں منکشف ہوگیا تھا یعنی قیامت میں حساب وکتاب کے وقت مسلمانوں کا ثابت قدم رہنا اور کفار کا بچلنا اور ایک جزو یعنی "تثبیت و اضلال فی القبر" مدینہ میں منکشف ہوا کیونکہ آیت میں لفظ فی الاخرۃ وارد ہے اور آخرت دو ہیں ایک حقیقی یعنی قیامت اور ایک اضافی یعنی قبر پس مکہ میں آپ کو "تثبیت و اضلال فی الاخرۃ" کا پہلا جزو منکشف ہوگیا جو قیامت کے متعلق تھا اور دوسرا جزو مدینہ میں منکشف ہوا یعنی عذاب ونعیم قبر پس اب آیت قیامت اور قبر دونوں کے متعلق تھی مگر مکہ میں آپ کو اس کا علم نہ تھا' مدینہ پہنچ کر آپ کو معلوم ہوا کہ اس آیت میں عذاب قبر کا بھی ذکر ہے اور لفظ آخرت اس کو بھی عام ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قبر میں دو فرشتے آتے ہیں اور وہ سوال

کرتے ہیں پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ بہرحال حدیث سے اس کا عذاب قبر کے متعلق ہونا صراحتہً معلوم ہورہا ہے اور اس پر جو اشکالات تھے وہ بھی سب رفع ہوگئے اور یہ میں اوپر بتلا چکا ہوں کہ اس خبر سے مقصود یہ ہے کہ اس واقعہ کو یاد رکھو اور اس وقت کے لیے تیاری کرو۔ اس سے مقصود بیان کی تعیین بھی ہوگئی اور اس وقت میں نے اس مضمون کو اس لیے اختیار کیا ہے۔

غفلت کا علاج تذکرہ آخرت ہے

ہمارے اندر بڑا مرض یہ ہے کہ ہم اعمال میں سستی کرتے ہیں جس کا سبب غفلت عن الاخرۃ ہے اور اس کا علاج تذکرہ آخرت ہے اسی کو میں مراقبہ کہتا ہوں چاہے مراقبہ کی صورت متعارفہ سے نہ ہو ویسے ہی چلتے پھرتے دھیان رکھا جائے۔ مقصود یہ ہے کہ جو غفلت اعمال کی خرابی کا سبب ہورہی ہے وہ دفع ہونا ضروری ہے مگر باوجود ضروری ہونے کے اس میں بہت ہی کوتاہی ہورہی ہے اور اس کوتاہی کا ایک باریک سبب ہے اور یہ بات آج ہی میرے ذہن میں آئی ہے اور اسی کے بیان کے لیے میں نے یہ آیت اختیار کی ہے وہ یہ کہ جب لوگوں سے آخرت کی یاد کو کہا جاتا ہے تو ان کا ذہن فوراً اس طرف جاتا ہے کہ آخرت تو بہت دور ہے اس سے پہلے بہت سے واقعات پیش آنے والے ہیں۔ امام مہدی کا ظہور ہوگا' حضرت عیسٰی علیہ السلام کا نزول ہوگا' دجال نکلے گا' پھر آفتاب مغرب سے نکلے گا' اس کے بھی ایک مدت بعد نفخ صور ہوگا۔ اس وقت یہ عالم فنا ہوگا پھر قرن کے قرن اسی حالت فنا میں گزر جائیں گے پھر دوسرا نفخ صور ہوگا تب کہیں قیامت آئے گی۔ اس بعد کی وجہ سے انسان آخرت کو اپنے ذہن میں نہیں آنے دیتا کہ یہ تو ابھی بہت دور ہے اور اگر کسی کے ذہن میں یہ خیال آتا بھی ہے تو اس بعد کی وجہ سے اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوتا کیونکہ خطرہ بعیدہ سے عادۃً تاثر کم ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی لیے عقلاء کا مقولہ مشہور ہے:

بترس از بلائے کہ شب درمیان ست

(مصیبت سے ڈر کہ رات درمیان میں ہے)

اگرچہ فی الواقع یہ بات علی الاطلاق غلط ہے کیونکہ طبیعت کو مشوش کرنے کے لیے طبعاً بس رات کے بعد کی مصیبت بھی کافی ہے۔

لاپروائی غفلت کا سبب ہے

مگر شعراء و عقلاء کی طبیعت پر عموماً ایسی بلا جس کے آنے میں زیادہ توقف ہو بہت گراں نہیں ہوتی اسی وجہ سے آخرت سے غفلت ہے اور غفلت کی وجہ سے لاپروائی ہے۔ چنانچہ اسی لاپروائی کی وجہ سے بعض لوگ جب ان کو کسی گناہ پر ٹوکا جاتا ہے بے دھڑک کہہ دیتے ہیں کہ جاؤ بس تم ہی جنت میں

چلے جانا ہم دوزخ ہی میں چلے جائیں گے۔ یہ بات ان لوگوں نے اپنی طبیعت کے موافق کہی کیونکہ دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ بعض جرائم کے لیے تقادم عہد کو مسقط مانا گیا ہے اور شریعت میں بھی فی الجملہ اس کی رعایت ہے مگر یاد رکھو یہ حکم دنیا ہی میں ہے آخرت میں یہ قاعدہ نہیں کہ تقادم عہد سے جرم ساقط یا خفیف ہو جائے۔ یہ لوگوں کی غلطی ہے کہ آخرت کو دنیا پر قیاس کرتے ہیں پھر بعد آخرت کی وجہ سے اپنے جرائم کو خفیف سمجھنے لگتے ہیں۔ بعض بیہودہ لوگوں کا یہ قول سنا گیا کہ آخرت میں تو ہزاروں لاکھوں سے بھی زیادہ مخلوق ہوگی ممکن ہے کہ اس ہجوم میں ہم بچ جائیں جیسا کہ دنیا میں ہوتا ہے کہ جرم میں ہزاروں شریک ہوں اس میں بعض لوگ گرفتاری سے بچ جاتے ہیں مگر یہ بھی وہی غلط قیاس ہے۔ چنانچہ تھانہ بھون میں ایک صاحب نے کسی کے کیکر کاٹ لیے تھے ایک آدمی نے ان سے کہا کہ میاں قیامت میں جب اترے پترے کھلیں گے اس وقت اس فعل کا انجام معلوم ہوگا تو اس نے کس قدر بیہودہ جواب دیا میں وہاں کہاں ملوں گا' بے شمار مخلوق ہوگی کہیں چھپ رہوں گا۔ یہ کلمہ بہت ہی سخت ہے گو اس پر کفر کا فتویٰ ہو یا نہ ہو غرض غفلت عن الاخرت سے یہ سب نتائج پیدا ہو رہے ہیں جس کے دفع کرنے کے لیے آخرت کی یاد بہت مفید ہے مگر اس کا بعد کوتاہی کا سبب ہو رہا تھا۔

آخرت کی دو قسمیں

اس لیے آج یہ بات ذہن میں آئی کہ آخرت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قریب ایک بعید تو اگر آخرت بعید کا خوف نہیں تو آخرت قریبہ کا خوف ہونا چاہیے اور وہ موت ہے اور موت کچھ بعید نہیں کیونکہ سفر اور ریل اور گاڑی اور کھانا پینا اور بیمار ہونا اور چلنا پھرنا یہ سب موت ہی کے اسباب ہیں اور ان کو کوئی بعید نہیں سمجھتا اس لیے آخرت بعیدہ کے مراقبہ سے غالباً موت کا مراقبہ زیادہ نافع ہوگا اس لیے میں نے اس آیت کو اختیار کیا ہے کیونکہ اس میں لفظ فی الاخرت کی تفسیر قبر سے وارد ہوتی ہے جس نے مراقبہ آخرت کو قریب کر دیا کہ آخرت صرف قیامت ہی کا نام نہیں بلکہ آخرت قبر ہی سے شروع ہو جاتی ہے اور قبر میں جانا کچھ دور نہیں تو اس کو ہی یاد کر لیا کرو۔ قرآن شریف میں ایسے اشارات بکثرت ہیں جن میں خاص مراقبات کی تعلیم کی گئی ہے اور ساتھ کے ساتھ ان کو نہایت قریب بھی کر دیا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر حق تعالیٰ نے توحید کی تعلیم فرمائی ہے تو اس کے لیے ایک مراقبہ بتلایا ہے کہ مخلوقات الٰہیہ میں غور کیا کرو پھر ساتھ ہی اس مراقبہ کو قریب بھی کر دیا۔ فرماتے ہیں:

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ٥

کیا یہ لوگ اونٹ کونہیں دیکھتے کہ کس حکمت کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے' اونٹ تو اہل عرب کے سامنے ہروقت ہی رہتا ہے تو سب سے پہلے ایسی چیز کا مراقبہ بتلایا گیا جس کے استحضار میں کچھ بھی بعد نہیں۔ پھر آسمان کا مراقبہ بتلایا جو اونٹ پر سوار ہونے والے کے سامنے ہی ہوتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے آسمان کو مدور پیدا کیا ہے اس لیے اس کے کنارے ذرا نگاہ اٹھانے سے فوراً نظر آجاتے ہیں پھر اونٹ پر سوار ہوکر عرب کے میدان میں چلو تو ذرا دائیں دیکھنے سے پہاڑ ہی پہاڑ نظر آئیں گے تو آسمان کے بعد پہاڑ کا مراقبہ بتلایا کہ اس کی حکمتوں میں غور کرو۔ اس کے بعد زمین کا مراقبہ بتلایا جو سوار کے نیچے ہوتی ہے جس پر منزل میں پہنچ کر آرام کرتے ہیں۔

قبر بھی آخرت میں داخل ہے

غرض اس ترتیب میں غور کرنے سے میرا مدعیٰ ثابت ہوگیا کہ خدا تعالیٰ مراقبات کو قریب کرنے کا بہت اہتمام فرماتے ہیں۔ اسی طرح آخرت کا مراقبہ ذرا بعید تھا حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دیا کہ قبر بھی آخرت میں داخل ہے اس سے موت اور مابعد الموت کا مراقبہ بہت قریب ہوگیا کیونکہ قبر کیا چیز ہے یہی زمین تو ہے جس پر آپ روزانہ چلتے پھرتے ہیں جس میں موت کے بہت سے اسباب ہیں۔ بعض دفعہ ٹھوکر لگ جانے سے موت آجاتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہوا ہے اور یہ بھی نہ سوچو تو یہی سوچ لو کہ ہم اسی میں ایک دن دفن ہوں گے۔ اس مراقبہ کو کرکے دیکھئے انشاء اللہ غفلت دور ہوجائے گی اور اعمال صالحہ کا اہتمام دل میں پیدا ہوگا۔ اول تو اس کا دھیان ہر وقت ہی کرنا چاہیے اور اگر ایسا نہ ہو تو کثرت تو ہونی چاہیے۔

مراقبہ موت

چنانچہ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاص مقدار میں اس کا دھیان کر لینا بھی کافی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جو شخص بیس دفعہ روزانہ موت کو یاد کرلیا کرے اس کو شہادت کا ثواب ملے گا۔ پس ہر وقت نہ ہوسکے تو اس مراقبہ کی کثرت ہی ہو اور اگر موت کے بعد کا حساب و کتاب بھی یاد کرلیا کرو تو اور بھی اچھا ہے پھر اپنا سونا بھی آپ کو گراں ہوگا۔ یہ مطلب نہیں کہ تم سونا چھوڑ دو گے بلکہ نیند کا آنا ناگوار ہوگا اور سونے کو جی نہ چاہے گا ہاں اگر حال غالب ہوگیا تو پھر یہ بھی ہوجائے گا کہ نیند ہی نہ آسکے گی۔ اس وقت تم سونے والوں سے یوں کہو گے:

چوں چنیں کارے ست اندر رہ ترا　　　لب چوں می آید اے ابلہ ترا

(جب تجھے اس راہ میں مشکل نظر آتی ہے تو اے بیوقوف تیرے لب پر کیا آتا ہے)

بعض اولیاء اللہ کو ایسا پیش آیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم مالک الحال تھے

روض الریاحین میں ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ رات کو بالکل نہ سو سکتے تھے اور یہ فرماتے تھے۔ آیت نہیں سونے دیتی۔ "یَایُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَهْلِیْکُمْ نَارًا o" (اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ) ان کی یہ حالت تھی کہ ذرا اغنودگی آتی اور پھر گھبرا کر اُٹھ جاتے۔ یہ غلبہ تھا اور اگر حال نہ ہوا یا حال ہوا مگر یہ شخص مغلوب نہ ہوا بلکہ غالب علی الحال رہا تو نیند آئے گی۔ یہاں سے یہ شبہ رفع ہو گیا کہ انبیاء کو تو نیند آتی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام رات کبھی نہیں جاگے، کچھ حصہ ضرور سوتے تھے جواب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مالک الحال تھے مملوک الحال نہ تھے مگر اس سے آپ خوش نہ ہوں کہ ہماری حالت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہے، ہم بھی تمام رات نہیں جاگتے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح ہم کو بھی نیند آتی ہے کیونکہ

کار پاکان را قیاس از خود مگیر   گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(نیک لوگوں کے کام کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو اگرچہ شیر (درندہ) اور شیر (دودھ) ایک ہی طرح لکھا جاتا ہے)

کفار نے بھی یہی کہا تھا کہ ہم میں اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں کیا فرق ہے ہم بھی کھاتے ہیں یہ بھی کھاتے ہیں یہ بھی سوتے ہیں ہم بھی سوتے ہیں مگر فرق یہ تھا کہ ایک بار ابوجہل بھی بت خانہ میں گیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لے گئے تھے ابوجہل تو بتوں کے سامنے سجدہ میں گر پڑا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خود وہ بہت ہی سجدہ میں گر پڑے۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "تَنَامُ عَیْنِیْ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ"[۱] کہ نیند میں میری آنکھیں ہی سوتی ہیں قلب نہیں سوتا۔

لیلۃ التعریس میں نماز فجر قضا ہونے کا سبب

اسی لیے سونے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وضو نہ ٹوٹتا تھا اس پر شاید لیلۃ التعریس کے قصہ سے کسی کو شبہ ہو گا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل نہیں سوتا تھا تو پھر اس واقعہ میں آپ کی نماز فجر کیوں قضا ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ روشنی صبح کا دیکھنا آنکھ کا فعل ہے قلب کا فعل نہیں، مبصرات کا ادراک قلب کو بواسطہ بصر ہی کے ہو سکتا ہے اور اس وقت آپ کی آنکھیں سو رہی تھیں اس لیے صبح

---

[۱] (الصحیح للبخاری ۴: ۲۳۲)

کا ادراک نہ ہوسکا اس پر پھر یہ اشکال ہوتا ہے کہ وقت کا اندازہ کرنا تو قلب کا فعل ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وقت کا اندازہ کیوں نہ کرلیا یہ اشکال اور اس کا جواب میں نے کہیں منقول نہیں دیکھا یہ ابھی میرے قلب پر وارد ہوا ہے اور جواب بھی حق تعالیٰ نے ساتھ ساتھ قلب میں ڈال دیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قلب سے وقت کا اندازہ اس وقت ہوسکتا ہے جبکہ قلب کسی فکر اہم میں مشغول نہ ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب اس وقت مشاہدہ جمال الٰہی میں مشغول تھا اور کامل یکسوئی کے ساتھ ادھر متوجہ تھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آنکھیں بند کیے ہوئے تھے اور آنکھیں بند کر کے قلب کو پوری یکسوئی ہوتی ہے۔ جیسا کہ مشاہدہ ہے اس لیے وقت کا اندازہ بھی نہ ہوسکا۔ دوسرا جواب بہت ہی سہل یہ ہے کہ نوم عین سے مراد نعاس ہے اور نعاس میں بھی اندازہ پر قدرت نہیں ہوتی۔

(قلت والجواب الاصلی ماورد فی الحدیث انه کان من الله لیشرع لهم ای احکام القضاء فلم یکن صلی الله علیه وسلم نسی بل قدنسی وما نام بل قد نوم ۱۲ جامع)

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند کو اپنی نیند پر قیاس نہ کرو آپ تو نیند میں بھی حق تعالیٰ سے غافل نہ ہوتے تھے اور تم جاگتے ہوئے بھی غافل ہو۔

بہ بین تفاوت رہ ازکجاست تا بکجا

(اس راہ کا فرق تو دیکھو کہ کہاں سے کہاں تک ہے)

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر ہر وقت موت کا دھیان نہ ہوسکے تو کثرت تو یہ ہونا چاہیے جس کی ایک مقدار حدیث میں بھی وارد ہے کہ بیس دفعہ موت کو یاد کرلیا کرے مگر یاد کے یہ معنی نہیں کہ موت موت کا وظیفہ پڑھ لیا کرو بلکہ یہ سوچ لو کہ اپنے دوست کو کس طرح یاد کرتے ہیں اس طرح کوئی یاد نہیں کرتا کہ اس کے نام کا وظیفہ پڑھ لے زید زید زید بلکہ دوست کا یاد کرنا یہ ہے کہ اس کی صورت و سیرت کا تصور کرے اس کی باتوں کو یاد کرے۔ اسی طرح موت کی یاد یہ ہے کہ اس وقت جو باتیں پیش آئیں گی ان کو ذہن میں حاضر کرے جس کی تفصیل احادیث سے معلوم ہوگی۔

منکر نکیر موت کے ایک مقررہ وقت کے بعد آتے ہیں

مثلاً حدیث میں ہے کہ دفن کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر مردہ کا اچار ڈال لو اور دفن نہ کرو تو یہ فرشتے نہ آئیں گے بعضے اسی خیال میں ہیں چنانچہ ایک جاہل دیندار نے مکہ میں یہ وصیت کرنے کا ارادہ کیا کہ میری لاش کو دفن نہ کیا جائے بلکہ ایک پہاڑ پر رکھ

دیا جائے تا کہ سوال قبر نہ ہو میں نے کہا سبحان اللہ کیا آپ قبر اس گڑھے کو سمجھتے ہیں کہ اس میں اگر دفن نہ کیا جائے گا تو قبر کے معاملات ہی بند ہو جائیں گے بلکہ قبر تو عالم برزخ کا نام ہے جس میں انسان اس عالم سے منتقل ہو کر پہنچتا ہے چاہے دفن ہو یا نہ ہو غرض فرشتے تو اس وقت کی ایک معین مقدار کے بعد آ جاتے ہیں۔ گو اس وقت غسل ہی ہو رہا ہو یا نماز ہی ہو رہی ہو وہ اپنا کام شروع کر دیتے ہیں اور تمام سوالات و جوابات روح سے ہوتے ہیں اور اس وقت روح کو اس جسم عنصری سے ایسا تعلق ہوتا ہے جیسا لباس اتارنے کے بعد ہم کو اپنے لباس سے تعلق ہوتا ہے کہ اگر کوئی ہماری رضائی چھین کر آگ میں جلا دے تو گو ہم متالم و محترق نہیں ہوتے مگر ہم کو ناگوار ہوتا ہے باقی روح کو زیادہ تعلق مرنے کے بعد جسم مثالی سے ہوتا ہے جو اس جسم عنصری کے علاوہ دوسرا جسم ہے جس کے ماننے سے بہت سے اشکالات رفع ہوتے ہیں ضغطہ قبر وغیرہ سب باتیں اسی جسم مثالی سے ہوتی ہیں۔ غرض مردہ میں موت کے بعد بھی برزخی حیات ہوتی ہے۔

سماع موتی

چنانچہ حدیث میں ہے کہ میت کو قرع نعال کی آواز آتی ہے اور جو کوئی عزیز و قریب اس کی قبر پر آتا ہے اسے پہچانتا بھی ہے گو معتزلہ نے اس کا انکار کیا ہے مگر احادیث میں اس کا ثبوت موجود ہے بعض لوگوں نے عدم سماع موتی کا مسئلہ امام صاحب کی طرف منسوب کیا ہے مگر امام صاحب کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں۔ امام صاحب سے صراحۃً یہ امر منقول نہیں اور جس مسئلہ سے لوگوں نے اس کو مستنبط کیا ہے کہ اس مسئلہ میں امام صاحب کا جواب عدم سماع موتی کو مستلزم ہے وہ یمین کا مسئلہ ہے جس کا مبنی عرف پر ہے اس لیے امام صاحب کا کلام اس بارے میں صریح نہیں ہاں یہ ممکن ہے کہ فقہاء متاخرین نے جب یہ دیکھا کہ عوام کے عقائد سماع موتی کے مسئلہ سے خراب ہوتے ہیں اس لیے انتظام عوام کی غرض سے اس کا انکار کر دیا ہو تو ممکن ہے کہ ان فقہاء کو بھی صحت سماع موتی کا علم ہو مگر عوام کی اصلاح کیلئے مصلحۃً انکار کیا ہو (فیکون مما یعلم ولا یفتی به وله نظائر فی الفقه ۱۲) واقعی اس مسئلہ کی وجہ سے عوام کے عقائد یہاں تک بگڑ گئے ہیں کہ اب لوگ مردوں سے حاجات مانگتے ہیں کوئی ان سے اولاد مانگتا ہے بھلا ان کے پاس اولاد کہاں کیا وہ پلا پلایا بچہ تمہاری گود میں دے دیں گے۔ جیسا بچپن میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ بچے دائی کے گھر میں جمع رہتے ہوں گے وہ لا کر عورتوں کو دے دیتی ہے اگر یہ کہا جائے کہ مردوں سے اولاد مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے لیے دعا کر دیں گے تو پہلے اس کا ثبوت دو کہ وہ اس وقت خاص تمہارے مطلوب کے لیے دعا کرنے

کے ماذون بھی ہیں۔ غرض موت کو تفصیل کے ساتھ یاد کرنا چاہیے اور حدیث میں آتا ہے کہ اے عمر اس وقت کیا حال ہوگا جبکہ قبر میں دو فرشتے گرجتے اور برستے آئیں گے مگر مومن اس سے گھبرائے نہیں کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق سوال کر کے اطمینان کرلیا ہے وہ یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ہماری عقل بھی درست ہوگی یا نہیں۔ آپ نے فرمایا: "سک نعم کھیئتکم الیوم"، یعنی تم جیسے اس وقت ہو ایسے ہی اس وقت عاقل ہوگے اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر کچھ خطرہ نہیں انشاء اللہ سمجھ کر صحیح جواب دے دیں گے۔ شرح الصدور۔ دوسرے مومن کے ساتھ عنایت حق ہوگی۔ چنانچہ اسی آیت میں ارشاد ہے:

یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ۝

(پارہ ۱۳ رکوع ۱۶)

"اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس پکی بات سے دنیا اور آخرت میں ثابت قدم رکھتا ہے۔"

شفیق ممتحن

جب حق تعالیٰ ہی کو تمہیں پاس کرنا منظور ہے پھر گھبرانا کاہے کا کیونکہ جب ممتحن کو پاس کرنا منظور ہوتا ہے تو وہ مضمون کی تقریر خود کر کے طالب علم سے پوچھتا ہے کہ تمہارا یہی مطلب ہے وہ کہہ دیتا ہے جی ہاں بس پاس ہوگیا۔ مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی نے گڑبڑ کی اور مولانا خود مطلب بیان کر کے فرماتے ہیں کہ تمہارا یہی تو مطلب ہے جس کو پوری طرح ادا نہیں کر سکے وہ کہتا جی ہاں اور مولانا اس کو پاس کر دیتے۔ اسی طرح مولانا ذوالفقار علی صاحب بھی بہت سہل امتحان لیا کرتے تھے اور یہ فرمایا کرتے تھے کہ ممتحن کو اپنے درجے اور طالب علم کے درجہ کے تفاوت میں غور کر کے سوال کرنا چاہیے اور اسی درجہ کے جواب کا منتظر رہنا چاہیے۔ بعض ممتحن طلبہ سے ایسے سوالات کرتے ہیں جو مدرسین سے کرنے چاہئیں یہ بہت ظلم ہے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت فرمایا تھا کہ مولانا کی طبیعت میری مرضی کے موافق ہے وہ یہی بات تھی کہ مولانا ہر شخص سے اس کی فہم کے موافق معاملہ کرتے تھے اور طبیعت میں رحمت و آفت کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ حاجی صاحب کے اس ارشاد کی اطلاع جب مولانا کو پہنچی تو بہت مسرور ہوئے۔ بہر حال جب دنیا میں شفیق ممتحن کے امتحان سے پریشانی نہیں ہوتی تو حق تعالیٰ کے امتحان سے کیوں پریشان ہوتے ہو مطمئن رہو کیونکہ حق تعالیٰ سب سے زیادہ رحیم و

کریم ہیں وہ تم کو پاس ہی کر دیں گے۔ دوسری بات تسلی کی ایک اور ہے جوظنی ہے وہ یہ جب فرشتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ سوال کریں گے کہ من ھذا الرجل یہ حضرت کون ہیں تو بعض اہل محبت کا قول ہے کہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک سے مومن کی قبر تک حجابات اٹھائے جائیں گے اور ہذا سے جو کہ اشارہ حسیہ کے لیے ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ محسوسہ کی طرف اشارہ ہوگا۔ حدیث کے اس محمل کے متعلق حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نکتہ بھی فرمایا کہ حق تو یہ تھا کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مرتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے جنازہ کی نماز پڑھتے مگر یہ تو بعض حکمتوں کی وجہ سے حق تعالیٰ کو منظور نہ ہوا تو اب کیا عجب ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں آپ کی زیارت ہوگی پھر یہ شعر پڑھا:

کششے کہ عشق دارد نگذاردت بدنیساں — بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

(عشق میں جو کشش ہے تجھے یونہی نہ چھوڑے گی اگر تو جنازہ پر نہ آیا تو مزار پر تو ضرور آئے گا)

گو یہ بات قطعی نہیں مگر ظن کے متعلق بھی حدیث قدسی میں آیا ہے: ''اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ''[1] کہ میں اپنے بندہ کے گمان کے ساتھ ہوں پھر کیوں نہ گمان رکھا جائے۔ صاحب بعض دفعہ ہفتے ہفتے ہی گھر بس جاتا ہے پس تم امید رکھو کہ انشاء اللہ قبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوگی، خدا تعالیٰ اس گمان کو پورا کر دیں گے۔

حکایت قاضی یحییٰ بن اکثم

قاضی یحییٰ بن اکثم شیخ بخاری کا جب انتقال ہوا تو حق تعالیٰ نے ان سے پوچھا ''شیخ السوء ما عملت لنا'' اے بڑے بڈھے تو نے ہمارے واسطے کیا عمل کیا ہے، قاضی یحییٰ خاموش ہو گئے حق تعالیٰ نے فرمایا بولتے کیوں نہیں ہو عرض کیا یا اللہ میں ایک سوچ میں ہوں، پوچھا کیا سوچ ہے، عرض کیا میں نے یہاں کا حال تو اور طرح کا سنا تھا اور ارشاد ہوا کہ کیا سنا تھا عرض کیا:

حدثنا فلان عن فلان عن فلان قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان اللّٰہ یستحیی من ذی الشیبۃ المسلم[2]

سند کے ساتھ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ بوڑھے مسلمان کا لحاظ فرماتے ہیں اور میں اس وقت معاملہ اس کے خلاف دیکھ رہا ہوں اور اب مجھے یہ سوچ ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا راویوں نے غلطی کی۔ حکم ہوا کہ جاؤ تمہارے سب راوی سچے اور میرا حبیب

[1] (مسند احمد ۲: ۳۱۵) [2] (کنز العمال: ۴۲۶۴۴)

بھی سچا۔ آج ہم تم کو محض بڑھاپے ہی کی وجہ سے بخشتے ہیں۔ (یہ واقعہ کسی بزرگ کو قاضی یحییٰ اکثم کے انتقال کے بعد مکشوف ہوا ہوگا یا کسی نے ان کو خواب میں دیکھا ہو اور انہوں نے بیان کیا ہو ۱۲) تو حق تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن کے ساتھ یہ نفع ہوا کہ قاضی یحییٰ کو اپنے بڑھاپے کی وجہ سے مغفرت کی امید تھی حق تعالیٰ نے ان کا یہ گمان پورا کردیا۔ اسی طرح اگر ہم یہ امید رکھیں کہ قبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوگی تو یہ گمان بھی انشاء اللہ پورا ہوگا اور یہ ایسی خوشی کی بات ہے کہ اس کا خیال کرکے تو مسلمانوں کو قبر میں جانے کا شوق پیدا ہوگیا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر مسلمان کو سب سے زیادہ محبت ہے لیکن یہ یاد رکھو کہ ایک تو توقع ہے اور ایک دھوکہ ہے اگر اسباب جمع کرکے امید ہو وہ تو توقع ہے اور بدون اسباب کے امید ہو تو دھوکہ ہے جیسے نکاح کے بعد اولاد کی تمنا کرنا تو توقع ہے اور بدون نکاح کے اس کی تمنا کرنا محض دھوکہ ہے۔ علامہ ابن قیم نے لکھا ہے کہ "اَنَا عِنْدَظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ"[1] (میں اپنے بندہ کے گمان کے ساتھ ہوں) میں دراصل اسباب کی تعلیم ہے کیونکہ عادت اسباب ہی سے ظن پیدا ہوتا ہے بدون اسباب کے امید نہیں ہوتی ہاں کسی زن کو ہوجائے تو اور بات ہے بہرحال مومن کو احوال واحوال آخرت سے خوف تو رکھنا چاہیے اور اعمال میں کوشش کرنا چاہیے مگر پریشان نہ ہونا چاہیے اس کے لیے تسلی کی بہت چیزیں۔ چنانچہ قبر کے متعلق تو اوپر گزر چکا تھا، پر قیامت میں جب قبروں سے نکلیں گے تو اس وقت فرشتے اگر طرح طرح کی بشارتیں سنائیں گے:

لَایَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ هٰذَا یَوْمُکُمُ الَّذِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ٥

یعنی مسلمانوں کو قیامت کی بڑی گھبراہٹ پریشان نہ کرے گی اور فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور کہیں گے کہ یہی تمہارا وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا (کہ اس دن تم کو اس طرح کی نعمتیں حاصل ہوں گی ۱۲)

ایک جگہ ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ٥ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ وَلَکُمْ فِیْهَا مَاتَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ٥ (پارہ ۲۴، رکوع ۱۸)

[1] (مسند احمد ۲: ۳۱۵)

یعنی جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر جمے رہے (یعنی اسلام ہی پر مرے ۱۲)
ان پر فرشتے نازل ہوں گے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول ملائکہ موت کے وقت بھی ہوتا ہے اور
قیامت میں بھی ہوگا پھر وہ فرشتے یوں کہیں گے کہ تم نہ (آئندہ ضرر کا) اندیشہ کرو نہ کسی حاصل شدہ نفع
کے فوت ہونے کا) رنج کرو اور اس جنت کی خوشخبری حاصل کرو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا ہم
تمہارے رفیق تھے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی (رفیق رہیں گے) اور تمہارے لیے آخرت میں وہ
چیز بھی ہے جس کی تم کو خواہش ہے اور وہ بھی ہے جس کی تم درخواست کرو اور یہ بطور مہمانی ہے پروردگار
بخشنے والے مہربان کی طرف سے۔ غرض مرتے وقت بھی اور قیامت میں بھی فرشتے اس وقت بشارتیں
سنا سنا کر مومن کو مطمئن کریں گے اور میدان حشر میں مسلمانوں کے لیے عرش کا سایہ ہوگا اور گو قیامت کا
دن پچاس ہزار سال کا ہوگا لیکن حدیث میں آتا ہے کہ مومن کو ایسا معلوم ہوگا جیسے نماز شروع کرنے سے
سلام پھیرنے تک وقت معلوم ہوا کرتا ہے اسی کو ایک عارف فرماتے ہیں:

عاشقاں را با قیامت روز محشر کار نیست　　　عاشقاں را جز تماشائے جمال یار نیست

(عاشقوں کو محشر کے دن قیامت میں کام نہیں ہے، عاشقوں کے لیے سوائے محبوب کے
جمال کے تماشے کے اور کچھ مطلوب نہیں)

عشاق کے لیے تو میدان حشر ایک تماشا گاہ ہوگا ان کو کچھ پریشانی نہ ہوگی یہ واقعات قبر کے بعد
ہوں گے۔ غرض مسلمان تو قبر میں ٹھیک ٹھیک جواب دے دے گا جس پر فرشتے کہیں گے کہ تم سے ہم
کو یہی امید تھی کہ تم صحیح جواب دو گے اس کے بعد ایک کھڑکی جنت کی طرف کھول دی جائے گی اور
مومن سے کہا جائے گا "نم کنومة العروس" کہ تم عروس کی طرح سو رہو جس کو بجز محبوب کے اور کوئی نہیں
جگایا کرتا اور اگر مردہ مومن نہیں ہے تو وہ قبر میں فرشتوں کو گرجتا برستا دیکھ کر گھبرا کر اٹھتا ہے اور اگر مومن
فاسق ہو تو اس کی بابت علماء نے کہا ہے کہ احادیث میں کچھ تصریح نہیں اب یا تو مقاسہ کیا جائے کہ
جس طرح اس کی حالت بین بین ہے کہ اعتقاد میں مومن کے مشابہ ہے اور عمل میں کفار کے مشابہ
ہے اسی طرح اس کے ساتھ معاملہ بھی قبر میں بین بین ہوگا اور یا ظن رحمت سے اس کو مومن کا فر قرار
دے کر پہلی صورت میں داخل کہا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ امید ہی کیوں نہ رکھی جائے۔
پھر جب فرشتے کافر سے سوال کریں گے تو وہ کہے گا ہاں ہاں **ھاء ھاء لا ادری** افسوس
میں کچھ نہیں جانتا اس پر فرشتے اس کو گرزوں سے ماریں گے اور کہیں گے **(لا دریت و لا تلیت)**
کہ نہ تو نے خود سمجھا نہ کسی کے اتباع سے ایمان اختیار کیا۔

ایمان تقلیدی بھی معتبر ہے

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کی دو قسمیں ہیں۔ایک تحقیقی اور تقلیدی۔اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان تقلیدی بھی معتبر ہے جیسے بعض عوام کو ایمان کی حقیقت پوری طرح معلوم نہیں ہوتی صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے دین پر ہیں یہ ایمان تقلیدی ہے یہ بھی معتبر ہے۔مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے سنا' فرماتے تھے کہ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا دھوبی جب مرا اور اس سے قبر میں سوال ہوا کہ "من ربک وما دینک" (تمہارا رب کون ہے؟ اور تمہارا دین کیا ہے؟) تو اس نے جواب دیا کہ [1]حضور میں تو بڑے پیر کا دھوبی ہوں (مطلب یہ تھا کہ جو مذہب ان کا ہے وہی میرا ہے) اس پر فرشتوں نے اس ہنس کر چھوڑ دیا کہ یہ تو بڑے شخص کا آدمی ہے اور اس پر کچھ اشکال نہ کیا جائے کیونکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے مقتدی کہا کرتا ہے کہ جو نیت امام کی ہے[2] وہی میری اور اس سے نماز صحیح ہو جاتی ہے۔اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یمن سے آتے ہوئے حج کا احرام اس طرح باندھا تھا:

اَهْلَلْتُ بِمَا اَهَلَّ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

"میں نے حج کا احرام باندھا جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھا تھا۔"

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نیت کو معتبر سمجھا اسی طرح ایمان میں بھی تقلید صحیح ہے۔ غرض انسان یا تو محقق ہو تب کامیابی ہے یا کسی محقق کا مقلد ہو اگر محقق ہوا تو وہ ایسا جواب دے گا کہ فرشتے بھی دنگ رہ جائیں گے۔

حضرت رابعہ بصریہ کا منکر نکیر کو عجیب جواب

حضرت رابعہ بصریہ کا واقعہ ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا اور قبر میں فرشتوں نے سوال کیا کہ "من ربک وما دینک" (تمہارا رب کون ہے؟ اور تمہارا دین کیا ہے؟) تو انہوں نے فرمایا

---

[1] (اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دین و ایمان کو جانتا نہ تھا بلکہ اس جاننے ہوئے کی یہ ایک سادہ تعبیر تھی جیسا کسی صحیفہ میں سب عقائد لکھے ہوں اور کوئی شخص اس کو سمجھ کر کہے کہ میرے یہ عقائد ہیں وہ کافی ہے۔۱۲)

[2] (مطلب اس جملہ کا یہ ہے کہ میں امام کی نماز میں اقتداء کرتا ہوں تو یہ نیت صحیح ہے اور جس کو غیر صحیح لکھا ہے وہ یہ ہے کہ میں امام کی اقتداء کرتا ہوں اور یوں نہیں کہا کہ اس کی نماز میں اقتداء کرتا ہوں وجہ یہ کہ پہلی صورت میں نماز کی تعیین نہ ہوئی کہ فرض ہے یا نفل اور اقتداء میں دونوں احتمال ہیں کیونکہ متنفل کی اقتداء بھی مفترض کے پیچھے جائز ہے اور دوسری صورت میں تعیین ہوگئی کیونکہ امام کی نماز فرض ہے اور اس نے بھی کہا ہے کہ اس کی نماز میں اقتداء کرتا ہوں تو ایسا ہوگیا جیسے یوں کہے کہ فرض نماز میں اقتداء کرتا ہوں کذا فی الدر المختار و رد المحتار ۱۲ منہ)

کہ تمہارے سوال کا جواب تو میں بعد میں دوں گی پہلے تم میرے سوال کا جواب دو کہ تم کہاں سے آرہے ہو' کہا آسمان سے' پوچھا آسمان وزمین میں کتنا فاصلہ ہے' کہا پانچ سو برس کی مسافت ہے' فرمایا تم خدا کو نہیں بھولے کیونکہ بہت دور سے آرہے ہو' فرشتوں نے کہا ہم تو خدا تعالیٰ کو نہیں بھولے' فرمایا جب تم اتنی دور سے چل کر بھی نہیں بھولے تو کیا تمہارا یہ گمان ہے کہ رابعہ زمین سے چار گز نیچے آ کر خدا تعالیٰ کو بھول گئی ہوگی حالانکہ زمین پر ایک ساعت بھی اس سے غافل نہیں رہی یہ سن کر فرشتے متعجب رہ گئے۔

یہ مقام ناز ہے' جس کے آگے فرشتے بھی نہیں چل سکتے۔ اسی کو عارف فرماتے ہیں:

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں — کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

(گدائے میکدہ ہوں لیکن مستی کی حالت میں دیکھو کہ فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں)

اور حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو رب تو کیست — گویم آنکس کہ ربود ایں دل دیوانہ ما

(اگر منکر نکیر پوچھیں گے کہ تمہارا رب کون ہے تو میں کہوں گا کہ وہی ہے جو ہمارے اس دیوانے دل کو لے گیا)

یہ بھی حضرت رابعہ ہی کے قول کے مثل ہے۔ غرض کافر چونکہ ایمان تحقیقی وتقلیدی دونوں سے محروم ہے اس لیے فرشتے اس کو قبر میں عذاب دیں گے اور دوزخ کی کھڑکی کھول دیں گے اور وہ سمجھے گا کہ قیامت میں اس میں داخل ہونا ہوگا اور مومن کے لیے جنت کی طرف کھڑکی کھولی جائے گی اور وہ یہ سمجھے گا کہ قیامت کے دن اس میں داخل ہونا ہوگا اس لیے مسلمان جنت کو دیکھ کر قیام ساعت کی تمنا کرے گا اور کافر دوزخ کو دیکھ کر یہ کہے گا کہ قیامت کبھی نہ آئے اس کے عذاب سے تو قبر ہی کا عذاب اہون ہے۔ واللہ اعلم

اب یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ یہ آیت عذاب قبر کے متعلق تو ہے لیکن اس میں تثبیت کا وعدہ دنیا اور آخرت دونوں کے بارے میں ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۝

(پارہ ۱۳ رکوع ۱۶)

''اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس پکی بات سے دنیا اور آخرت میں ثابت قدم رکھتا ہے۔''

اب سوال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس پوری آیت کو تلاوت فرما کر عذاب قبر کے

متعلق فرمایا ہے تو آپ نے معاملہ قبر کو حیات دنیا میں داخل فرمایا یا آخرت میں' سو احتمال دونوں طرف سے ہے قبر کو حیات دنیا میں بھی داخل کیا جا سکتا ہے اور آخرت میں بھی۔ دوسرا احتمال تو محتاج تاویل نہیں کیونکہ موت سے حیات دنیا منقطع ہو جاتی ہے اس لیے مابعد الموت حیات دنیا میں داخل نہیں بلکہ وہ آخرت میں داخل ہونا چاہیے البتہ پہلا احتمال محتاج نہیں تاویل ہے اس پر کہہ سکتے ہیں کہ گو موت سے حیات دنیا منقطع ہو جاتی ہے مگر حیات اخرویہ بھی شروع نہیں ہوتی کیونکہ حیات اخرویہ وہ ہے جبکہ یہی جسد عنصری دوبارہ زندہ ہوگا اور یہ قیامت میں ہوگا' قبر میں جسد عنصری زندہ نہیں ہوتا۔ گو روح کو اس سے تعلق رہتا ہے پس گو موت کے بعد انسان کو نہ حیات اخرویہ حاصل ہوتی ہے نہ حیات دنیویہ بلکہ حیات برزخیہ ہوتی ہے مگر حیات برزخیہ کو حیات دنیا سے بہ نسبت آخرت کے قرب زیادہ ہے اس لیے حکماً وہ حیات دنیا میں داخل ہو سکتی ہے لیکن یاد آیا در منثور میں ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فی الاخرۃ کی تفسیر عذاب قبر سے فرمائی ہے اب کسی تاویل کی ضرورت نہیں رہی نہ دوسرا احتمال رہا۔ البتہ ایک اور اشکال وارد ہوگا۔

جنت مثالیہ اور مثالی جہنم

وہ یہ کہ ایک حدیث میں آتا ہے:

رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ اَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ○[1]

کہ قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے حالانکہ دخول جنت یا دخول نار قیامت کے بعد ہوگا' عالم برزخ میں دخول جنت و نار نہ ہوگا۔ اس کا ایک جواب تو علماء نے دیا ہے وہ یہ کہ برزخ میں جو مسلمانوں کو راحت اور کفار کو عذاب ہوگا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نعیم جنت اور عذاب جہنم سے تشبیہ دی ہے اور مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو برزخ میں ایسی راحت ہوگی کہ گویا وہ جنت کے باغ میں ہیں اور کفار کو ایسی تکلیف ہوگی کہ گویا جہنم کے گڑھے میں ہیں اور صوفیاء نے یہ کہا ہے کہ جنت و جہنم دو ہیں ایک حقیقی اور ایک مثالی اگر اس قول کو مان لیا جائے تو پھر اس حدیث میں تاویل نہ کرنا پڑے گی۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ قبر میں مومن کے لیے جس جنت کی طرف کھڑکی کھولی جائے گی وہ جنت مثالیہ ہے اسی طرح کافر کے لیے جس جہنم کی طرف کھڑکی کھلے گی وہ بھی مثالی جہنم ہے پھر قیامت کے بعد حقیقی جنت و جہنم میں دخول ہوگا اور یہ اشکال نہ کیا جائے کہ مومن اور کافر کے لیے جنت و جہنم

---

[1] (الصحیح للبخاری ۲: ۷۷)

میں داخل ہونے کے بعد تو پھر خروج نہ ہوگا پھر مسلمان اور کافر اس جنت مثالیہ وجہنم مثالیہ سے قیامت کے دن کیونکر نکلیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عدم خروج وغیرہ یہ احکام جنت وجہنم حقیقیہ کے ہیں مثالیہ کے یہ احکام نہیں اس سے خروج ہوسکتا ہے بلکہ صوفیاء نے تو یہ کہا ہے کہ دنیا میں بھی کفار کو جہنم اور مومنین کو جنت محیط ہے کیونکہ اعمال سیۂ جہنم ہیں اور اعمال صالحہ جنت ہیں اور حقیقی جنت ودوزخ کا ثواب وعذاب انہی اعمال کی صورت جوہریہ ہے۔ بس دنیا میں بھی ہر شخص یا جنت میں ہے یا دوزخ میں مگر حال کے بعد تو یہ احاطہ معلوم ہوسکتا ہے بدون حال کے اس احاطہ کا ادراک دشوار ہے بس اب میں ختم کرنا چاہتا ہوں۔

غفلت کا علاج

خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ ہم کو معاصی سے بچنے کا اہتمام کرنا ضروری ہے جن کا سبب غفلت عن الاخرت ہے اور غفلت کا علاج تذکر ہے اور تذکر آخرت کا سہل طریقہ موت کو یاد کرنا ہے۔ پس ہم کو غفلت دور کرنے کے لیے موت کو یاد کرنا چاہیے اور یاد کرنے کا طریقہ بھی میں نے بتلا دیا کہ صرف موت موت کا ورد کرنا کافی نہیں بلکہ اس کی صورت یہ ہے کہ حدیث میں جو باتیں موت کے متعلق وارد ہیں کہ دفن کے بعد فرشتے قبر میں آئیں گے اور اس طرح سوال وجواب ہوگا اس کا تصور کیا جائے۔ اگرچہ یہ مراقبہ ہر وقت کرنے کا ہے مگر حکمائے اُمت نے اس کے لیے بھی ایک وقت مقرر کر دیا ہے تا کہ تعیین وقت سے کام میں سہولت ہو جائے' اچھا وقت اس کے لیے سونے کا وقت ہے کیونکہ "النوم اخو الموت"[1] سونا ہی موت کے مشابہ ہے تو سوتے وقت ہم کو یاد کرنا چاہیے کہ ایک دن وہ بھی آنے والا ہے جبکہ ہم بہت لمبی نیند سوئیں گے جس کے بعد قیامت سے پہلے اٹھنا ہی نہ ہوگا۔ روزانہ سوتے ہوئے اس کو یاد کرنا چاہیے تا کہ ہم کو قول ثابت کی برکتیں حاصل ہوں۔ رہا یہ کہ قول ثابت سے مراد کیا ہے اور اس کی برکتیں کیا ہیں اس کو قرآن ہی سے معلوم کرو۔ چنانچہ اس آیت سے پہلے جو آیت ہے اس میں توحید کا ذکر ہے اس میں حق تعالیٰ نے کلمہ توحید وکلمہ کفر کی مثال بیان فرمائی ہے۔ صاحب تفسیر (یعنی امام فخر رازی) کا قول ہے کہ تمام قرآن تین مضمونوں کی شرح ہے توحید ورسالت ومعاد یہ قول مجھے بہت ہی پسند آیا۔ اس کا لحاظ کر لینے سے تمام قرآن مرتبط معلوم ہوتا ہے یہ ایسا ہے جیسا کہ حضرت حاجی صاحب نے مثنوی کا خلاصہ نکالا تھا کہ تمام مثنوی میں دو مضمون اصل مقصود ہیں ایک توحید حالی دوسرے حقوق شیخ واقعی عجیب خلاصہ ہے جس کے بعد تمام

---

[1] (مشکوۃ المصابیح: ۵۶۵۴)

مثنوی مرتبط معلوم ہوتی ہے۔ غرض اوپر کی آیات میں توحید کا ذکر فرماتے ہیں:

''کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی شان بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ کی کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جا رہی ہوں۔''

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلاً کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَاءِ○

''کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ (یعنی کلمہ توحید) کی کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہے اور اس کی شاخیں اونچائی کی طرف جا رہی ہوں۔''

اس میں کلمہ طیبہ کی مثال بیان فرمائی ہے جس سے مراد لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

تابع اور متبوع: حدیث میں اس کی تصریح ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے تابع ہے وہ بھی مراد ہے کیونکہ متبوع کے ساتھ تابع کا ہونا لازم ہے مگر چونکہ اہل ایمان اس اُمت سے پہلے بھی گزرے ہیں اور جو فضائل ایمان کے ہیں وہ ان کے لیے بھی ثابت ہے اور لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا قرین ہر امت میں بدلتا رہا ہے۔ کوئی لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ساتھ نوح نبی اللہ کوئی ابراہیم خلیل اللہ کہتا تھا کوئی موسیٰ کلیم اللہ کوئی عیسیٰ روح اللہ اور ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں تو یہ جملہ متبدل ہے اور لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ غیر متبدل ہے جس میں تمام اہل ایمان مشترک ہیں اس لیے اکثر احادیث میں لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پر اکتفا کیا گیا ہے باقی مطلب وہی ہے کہ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مع اپنے قرین کے جو ہر امت مسلمہ کے لیے الگ الگ ہے اور صوفیاء کا ادب دیکھئے کہ وہ جب اپنے مریدوں کو ذکر لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی تعلیم کرتے ہیں تو یوں کہتے ہیں کہ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ذکر تو اتنی مقدار میں کیا کرو دو سو یا پانچ سو دفعہ اور کبھی کبھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہہ لیا کرو یہ نہیں بتلاتے کہ ہر دفعہ پورا کلمہ کہا کرو اس طرح انہوں نے تابع و متبوع دونوں کا حق ادا کر دیا تو فرماتے ہیں کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ کی کہ وہ مشابہ ہے شجرہ طیبہ (پاکیزہ درخت کے) شجرہ طیبہ سے مراد شجرہ نخلہ ہے اس کو مثال کے لیے یا تو اس واسطے خاص کیا کہ اہل عرب کے نزدیک وہ اطیب الاشجار ہے مگر میرے نزدیک حقیقت میں وہ عرب و عجم سب میں اطیب شجرہ ہے۔ ایک تو اس کی پیدائش سہل ہے بعض دفعہ تو خود ہی اُگ آتا ہے۔ چنانچہ سینکڑوں درخت کھجور کے خودرو موجود ہیں پھر اس کی خدمت کی جائے تو اس کا پھل نہایت عمدہ اور لذیذ ہے پھر اس کی کوئی چیز ضائع نہیں ہر ایک میں منافع بینہ موجود ہیں لکڑی، کڑیوں میں کام آتی ہے پتوں سے پنکھے اور بوریے بنتے ہیں، جیسے گنے کا رس نکالا جاتا

ہے ۱۲ جامع) اور بینہ کی قید اس لیے لگائی کہ منافع خفیہ تو ان چیزوں میں بھی ہیں جن کو ہم بیکار سمجھتے ہیں جیسا کہ گلزار ابراہیم میں ایک حکیم کا قصہ لکھا ہے کہ اس کو ایک دن پاخانہ میں بیٹھے بیٹھے خیال ہوا کہ یہ پاخانہ کا کیڑا کس کام آتا ہے۔ اس میں ظاہر ہے کوئی منفعت نہیں معلوم ہوتی اس خیال کا آنا تھا کہ چند روز میں اس کی آنکھیں اندھی ہو گئیں، بڑا گھبرایا بہت علاج کیے مگر کچھ نفع نہ ہوا اتفاق سے ایک دفعہ کوئی دوسرا حکیم اس کی بستی میں آیا جو آنکھوں کا علاج کرتا تھا اس اندھے حکیم نے بھی اس سے رجوع کیا اس نے کوئی دوا اس کی آنکھ میں لگادی جس سے بہت جلد آنکھیں کھل گئیں اور اچھی طرح نظر آنے لگا اس نے حکیم سے پوچھا کہ اس دوا کے کیا اجزاء ہیں، دوسرے حکیم نے کہا کہ اس کا جزاعظم گوکا کیڑا ہے اس وقت اس کا متنبہ ہوا کہ یہ غیب سے مجھ کو سزا دی گئی تھی کیونکہ میں نے اس کو بیکار خیال تھا۔ حق تعالیٰ نے اس طرح مجھ کو اس کا نفع بتلایا پس منافع خفیہ سے تو کوئی چیز بھی خالی نہیں گو ہم کو علم نہ ہو مگر کھجور کے تو ہر جزو میں منافع بینہ ہیں، جن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اس لیے وہ عرب و عجم سب کے نزدیک اطیب شجر ہے۔ آگے فرماتے ہیں: "اَصْلُهَا ثَابِتٌ" کہ اس کی جڑ تو جمی ہوئی ہے یعنی زمین میں "وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ" اور اس کی شاخیں آسمان میں ہیں۔ نخلہ میں اس صفت کا ہونا تو ظاہر ہے اور کلمہ طیبہ کے لیے یہ صفت اس طرح ثابت ہے کہ اس کی بھی ایک جڑ ہے جو مومن کے قلب میں جمی ہوئی ہے۔ پس قلب مومن منزلہ ارض کے ہے اور اعتقاد توحید جو اس میں راسخ ہے وہ کلمہ طیبہ کی جڑ ہے اور قلب مومن کو ارض سے تشبیہ قرآن میں دوسری جگہ مصرح ہے سورہ حدید میں ہے۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ○ اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ○

ترجمہ: "کیا مسلمانوں کے لیے اس کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد اور اس دین حق پر (عمل) کے لیے جھک جائیں جو اللہ کی طرف سے ان پر نازل ہوا ہے اور ان لوگوں کی طرح نہ بنیں جن کو ان سے پہلے کتاب دی گئی تھی پھر ان کے دل سخت ہو گئے اور زیادہ تر ان میں سے فاسق ہیں۔ جان لو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو مردہ ہوئے پیچھے زندہ کر دیتا ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عباس نے اس کی تفسیر میں صراحتہ فرمایا ہے کہ ارض سے قلب مراد ہے اوپر جو اہل کتاب کی قساوت کا ذکر تھا جس سے ان کے مایوس اور ناامید ہو جانے کا احتمال تھا اس آیت سے مایوسی کو قطع کیا گیا ہے کہ گو تمہارے دل سخت تو ہو گئے مگر ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

ہر عمل کے لیے قبول شرط ہے

اللہ تعالیٰ مردہ دلوں کو بھی زندہ کر دیتے ہیں اور "فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ" یہ ہے کہ وہ عالم ملکوت کی طرف بلند ہوتا ہے جس کی تفصیل دوسری آیت میں ہے: "اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ" اچھا کلام اسی تک پہنچتا ہے (یعنی حق تعالیٰ ہی اس کو قبول فرماتے ہیں اور اچھا کام اس کو بلند کرتا اور پہنچتا ہے صعود سے مراد تو قبول ہے اور رفع سے مراد ذریعہ قبول بنتا ہے۔ اب اگر عمل صالح سے مراد ایمان ہے تب تو قبول سے مراد نفس قبول ہے کیونکہ ایمان ہر عمل کے قبول کے لیے شرط ہے اور اگر دیگر اعمال صالحہ مراد ہیں تو وہ نفس قبول کے لیے شرط نہیں مگر کمال قبول کے لیے شرط ہیں۔ آگے فرماتے ہیں: "وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ" چونکہ مثال عجیب تھی اس لیے اس کی حکمت بتلاتے ہیں کہ حق تعالیٰ لوگوں کے واسطے مثالیں اس لیے بیان فرماتے ہیں تا کہ وہ خوب سمجھ لیں کیونکہ مثال سے توضیح مقصود خوب ہو جاتی ہے آگے کلمہ کفر کی مثال ہے: "وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ نِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَالَهَا مِنْ قَرَارٍ" اور گندہ کلمہ کی (یعنی کلمہ کفر و شرک کی) ایسی مثال ہے جیسے خبیث درخت ہو۔ (حدیث میں اس کی تفسیر آئی ہے کہ وہ حنظل کا درخت ہے) جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے اس کو کچھ ثبات ہی نہ ہو۔ (چنانچہ حنظل کے درخت کی جڑ درخت تک نہیں ہوتی نیز حنظل اور اس کا پھل بو اور مزہ میں بھی تلخ ہوتا ہے اسی طرح کلمہ کفر سے دل کو بے چینی ہوتی ہے راحت نہیں ملتی اور اس کی جڑ گو کافر کے دل میں ہے مگر حق کے سامنے باطل ایسا مضمحل و مغلوب ہے کہ گویا اس کے جڑ ہی نہیں اور جب اس کے جڑ ہی نہیں تو پھل وغیرہ کیا ہوتے اس لیے نہ یہاں شاخوں کا ذکر فرمایا نہ پھل کا اور یہ عجیب نکتہ ہے اس مقام میں کہ چونکہ کفر کا کچھ تو وجود ہے اس لیے اس کا کچھ ذکر فرما دیا اور چونکہ اس کا معتد بہ وجود نہیں اس لیے بقیہ آثار کو ذکر نہیں فرمایا کیونکہ ذکر اس شے کا ہوتا ہے جو کچھ تو ہو اور یہ فی الجملہ وجود بھی دنیا میں ہے اور آخرت میں تو کفر معدوم ہی ہو جائے گا کیونکہ وہاں سب کو ایمان حاصل ہو جائے گا۔ گو کفار کا وہ ایمان معتبر نہیں کیونکہ بالاضطرار ہوگا اختیار سے نہ ہوگا آگے اس آیت میں جس کی میں نے تلاوت کی ہے کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کے اثر کا ذکر ہے۔ اوپر تو دونوں کی مثال تھی یہاں دونوں کے اثر کا بیان ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس پکی بات کی برکت سے (مراد کلمہ طیبہ ہے جس کی جڑ مضبوط ہے) دنیا اور آخرت دونوں جگہوں میں مضبوط رکھتا ہے دنیا میں تو اس طرح کہ مومن کلمہ کی برکت سے شیاطین الانس والجن کے اغوا سے محفوظ رہتا ہے اور مرتے دم تک ایمان پر قائم رہتا ہے اور آخرت میں اس طرح کہ قبر میں نکیرین کے سوال کا صحیح صحیح جواب دے دے گا۔ آگے کلمہ کفر کے اثر کا بیان ہے "وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ" یعنی اس کلمہ خبیثہ کی

نحوست سے کافروں کو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت دونوں جگہوں میں بچلا دیتے ہیں۔ دنیا میں تو ان کا بچلنا ظاہر ہے اور آخرت میں بچلنا یہ ہے کہ قبر میں ان سے نکیرین کے سوال کا جواب نہ بن پڑے گا بلکہ حیرت زدہ ہو کر کہیں گے۔ افسوس ہم کچھ نہیں جانتے۔ غرض قول ثابت سے مراد کلمہ طیبہ ہے جس کا ذکر اوپر کی آیت میں تھا۔ اسی کی بدولت آخرت میں نجات ہوگی جس کی ایک جڑ ہے اور کچھ شاخیں ہیں جڑ تو عقیدہ توحید ہے اور شاخیں اعمال صالحہ ہیں ان سب کا مجموعہ قول ثابت ہے۔ پس عقیدہ توحید کو پختہ کرو جس کا طریقہ کثرت ذکر ہے اور اعمال کو صالحہ کرو جس کا طریقہ یہ ہے کہ علم دین حاصل کرو مسائل کی کتابیں دیکھو وعظ کی کتابیں مطالعہ کرو اور ان کے موافق عمل شروع کرو جس کے لیے ہمت کی ضرورت ہے کہ دین پر عمل کرنے میں اگر کوئی ملامت کرے تو کسی کی پروانہ کرو پھر انشاء اللہ آپ کو وہ دولت ملے گی کہ تمہارے اقوال و اعمال و احوال میں نورانیت ہوگی اور کثرت ذکر کا طریقہ یہ ہے کہ اگر کسی کی تربیت و تعلیم حاصل ہے تب تو اس سے پوچھ کر کوئی ذکر شروع کرو اور اگر کسی کی تربیت نہیں ہے تو چلتے پھرتے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا ورد کرتے رہو کام کے وقت زبان سے کسی قدر جہر کرتے رہو تا کہ یاد رہے اور خالی وقت میں تسبیح ہاتھ میں رکھو یہ مذکرہ ہے اس سے ذکر یاد رہتا ہے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ بعد کمال کے بعد تسبیح ہاتھ میں رکھتے تھے کسی نے کہا حضرت اب تو آپ کو اس کی ضرورت نہیں رہی فرمایا جس رفیق کی بدولت یہ بات حاصل ہوئی ہے کیا اب اس کو چھوڑ دوں یہ تو بڑی بے مروتی ہے۔ غرض تسبیح سے غفلت نہیں ہوتی ذکر کا دھیان رہتا ہے اس کو ہاتھ میں رکھو اور کسی کی طعن کی پروانہ کرو لوگوں میں مرض ہے کہ جہاں کسی نے تسبیح ہاتھ میں لی اور اس پر طعن شروع کیا مگر جب تم کو تسبیح سے دولت ملتی ہو تو مخلوق کو بکنے دو کیا کسی کے طعن سے ڈر کر اپنا نقصان کر لو گے یہ تو قول ثابت کے حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔

دنیا کی محبت کم کرنے کا طریقہ

اس کے نباہ کا طریقہ وہ ہے جس کے لیے میں نے اس بیان کو اختیار کیا تھا یعنی موت کا مراقبہ اور قبر میں جانے کا تصور کرنا اس سے دنیا کی محبت دل سے کم ہوگی آخرت کا اہتمام پیدا ہوگا اور اعمال میں کوتاہی کا سبب حب دنیا و عدم اہتمام آخرت ہی تھا جب یہ دونوں مرتفع ہو جائیں گے پھر عمل میں انشاء اللہ کوتاہی نہ ہوگی۔ لیجئے میں نے مکمل نسخہ اور کامل مطلب بیان کر دیا ہے اب عمل کرنا نہ کرنا آپ کے ہاتھ ہے۔ دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو توفیق عمل اور فہم سلیم عطا فرمائیں۔ آمین

وصلی اللّٰہ علیٰ سیّدنا و مولانا محمّد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین، واخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین۔

زکوۃ النفس

یہ وعظ ۱۵ رجب ۱۳۴۱ ہجری بروز یکشنبہ ہوا۔ بمقام خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون جو کہ حضرت والا نے بیٹھ کر ایک گھنٹہ ۴۵ منٹ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۳۰ تیس عدد تھی۔ شاہ لطف رسول صاحب نے مسودہ اجمالی ضبط کیا اور مولانا ظفر احمد صاحب نے تفصیل کی۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا○ (سورۃ الشمس، آیت نمبر۹)

ترجمہ: ''جس نے اپنے نفس کو رذائل سے پاک کیا وہ کامیاب ہوگیا۔''

فلاح کا مدار تزکیہ ہے

یہ ایک مختصر سی آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے تزکیہ کو مدار فلاح ٹھہرایا ہے۔ جس سے تزکیہ کی ضرورت ظاہر ہے کیونکہ فلاح کی ضرورت سب کو ہے اور اس کا مدار تزکیہ کو ٹھہرایا گیا ہے لیکن اس وقت مجھے ضرورت تزکیہ کے بیان کی نہیں کیونکہ مخاطبین بفضلہ تعالیٰ سب ایسے ہیں جن کو اس کی ضرورت میں تردد نہیں بلکہ سب تزکیہ کو ضروری ہی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ تزکیہ کا ضروری سمجھنا ہی اس بیان کی درخواست کا سبب ہے کیونکہ احباب نے محض طلب اصلاح کے لیے اس وقت بیان کی درخواست کی ہے کہ ہماری اصلاح کے لیے کوئی ضروری بات بیان کردی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصلاح کی ضرورت ان کو معلوم ہے اور یہی تزکیہ کا حاصل ہے اس لیے ضرورت تزکیہ پر میں زیادہ اہتمام کے ساتھ گفتگو نہ کروں گا۔ اس وقت مجھے صرف بعض غلطیوں کا رفع کرنا مقصود ہے جو اکثر سالکین کو تزکیہ کے متعلق ہوجاتی ہے اگرچہ وہ غلطیاں ان کو معلوم ہیں۔ مگر استحضار نہیں ہے بلکہ یوں کہیے کہ استحضار بھی ہے لیکن جیسا استحضار ہونا چاہیے وہ نہیں ہے اور جب غلطیوں کا پورا استحضار نہیں ہے تو ان میں سے کسی کے اختیار کرلینے کا احتمال ہے اس لیے ان پر متنبہ کردینا ضروری ہے تنبیہ سے ان کا پورا استحضار ہوجائے گا پھر غلطی کی کوئی صورت اختیار کرنے کا احتمال نہ رہے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ مخاطبین میں سے بعض کو یہ غلطیاں معلوم ہی نہ ہوں تو ان کو اس تنبیہ سے علم بھی ہوجائے گا اور استحضار بھی۔ اب سنئے کہ وہ غلطیاں دو ہیں جو تزکیہ کے متعلق پیش آیا کرتی ہیں۔

تزکیہ کی حقیقت

مگر غلطیوں کے بیان سے پہلے میں تزکیہ کی حقیقت بیان کردوں کیونکہ بعض دفعہ حقیقت کے معلوم نہ ہونے سے بھی غلطی میں وقوع ہوجاتا ہے سوتزکیہ کے معنی ہیں اپنے نفس کو رذائل سے پاک کرنا کیونکہ جس طرح باطن کے لیے بھی ایک حالت صحت کی ہے اور ایک مرض کی اور نفس کو امراض باطنیہ سے پاک کرنا یہی تزکیہ ہے جس کا شریعت میں نہایت تاکید سے امر ہے اور اسے مدارفلاح ٹھہرایا گیا ہے۔ یہاں ایک خفیف سا شبہ ہے درمیان میں اس کو بھی رفع کر دینا چاہتا ہوں ممکن ہے کہ جن لوگوں نے درسیات باقاعدہ نہ پڑھی ہوں ان کو یہ شبہ ہوجائے اور ممکن ہے کہ وہ اس تقریر کے بعد بھی اپنے شبہ کو حل نہ کرسکیں کیونکہ قرآن سمجھنے کے لیے علوم عربیہ کی ضرورت ہے اور جو شخص عربیہ سے ناواقف ہے وہ قرآن کو نہیں سمجھ سکتا لیکن مجملاً اس تقریر سے ان کو اپنے شبہ کا غلط ہونا تو معلوم ہوجائے گا اور اتنا بھی کافی ہے۔ وہ شبہ یہ ہے کہ یہاں پر تو اللہ تعالیٰ نے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا٥ (جس نے اپنے نفس کو رذائل سے پاک کیا وہ کامیاب ہوگیا) فرمایا ہے جس سے تزکیہ کا مدار اور مامور بہ ہونا ثابت ہوا ہے۔

لَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ پر شبہ کا جواب

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے: لَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى[1] (تم اپنے نفسوں پر تزکیہ نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون متقی ہے) جس کا ترجمہ ناواقف یوں کرے گا کہ اپنے نفسوں کا تزکیہ نہ کرو کیونکہ لاتزکوا نہی کا صیغہ ہے مشتق تزکیہ سے تو اب اس کو اشکال واقع ہوگا کہ ایک جگہ تو تزکیہ کا امر ہے اور ایک جگہ اس سے نہی ہے اس کے کیا معنی؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اگر اسی آیت میں لَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ (تم اپنے نفسوں کا تزکیہ نہ بیان کرو) کو اس کے مابعد سے ملا کر غور کیا جائے تو شبہ حل ہوجائے گا۔ قرآن میں اکثر شبہات ماسبق اور مابعد کو نہ ملانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر شبہ وارد ہونے کے وقت آیت کے ماسبق اور مابعد میں غور کرلیا کریں تو خود قرآن ہی سے شبہ رفع ہوجایا کرے اور اسی جگہ شبہ کا جواب موجود ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ہر شبہ کا جواب بھی ساتھ ساتھ ذکر فرما دیا ہے جیسا کہ تکوینیات میں بھی حق تعالیٰ کی یہی عادت ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے خواص ادویہ کی تحقیق کی ہے وہ کہتے ہیں کہ جن نباتات میں کسی قسم کا ضرر ہے جس مقام پر وہ پیدا ہوتی ہیں اسی مقام پر ایک دوسری نباتات بھی حق تعالیٰ پیدا

[1] (کنز العمال: ۳۵۹۹۳)

کر دیتے ہیں جس میں اس ضرر کی اصلاح ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے سنا ہے کہ ایک گھاس زہریلی ہوتی ہے جس کو کہتے ہیں اس میں بچھو کی سی خاصیت ہے اس کے چھونے سے بچھو کا سا اثر ہوتا ہے تو جس مقام پر وہ پیدا ہوتی ہے اسی مقام پر اس کے پاس ہی اللہ تعالیٰ نے دوسری گھاس اس کی اصلاح کرنے والی پیدا کر دی ہے کہ اس کے ملنے سے وہ اثر زائل ہو جاتا ہے خیر تکوینیات میں تو ہم کو زیادہ تحقیق نہیں اور اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں کہ سب چیزوں کی خاصیات دریافت کی جائیں اور ہر قسم کی دوائیں جمع کی جائیں کیونکہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ عدم تحقیق کی وجہ سے کسی مضر کو استعمال کرلے گا اور اس کی مضرت کا انتہائی درجہ یہ ہے کہ ہلاک ہو جائے گا تو ہلاک ہونا تو ایک دن ضروری ہے۔ بدون کسی مضر چیز کے استعمال کیے بھی موت ایک دن آنی ہے۔

دینی ضرر ایک خسارہ عظیم ہے

مگر شرعیات میں یہ ضروری ہے کہ جو امور مضر ہیں ان کو جانے کیونکہ ان کے نہ جاننے سے دینی ضرر ہوتا ہے جو کہ خسارہ عظیم ہے۔ اس کا ضرر موت سے بھی ختم نہ ہوگا بلکہ مرنے کے بعد بھی باقی رہے گا اور یہ سخت ضرر ہے جس کا تحمل نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: "کَانُوْا یَسْئَلُوْنَہٗ عَنِ الْخَیْرِ وَکُنْتُ اَسْئَلُہٗ عَنِ الشَّرِّ مَخَافَۃَ اَنْ یُّدْرِکَنِیْ"[1] یعنی اور صحابہ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کی تحقیق کیا کرتے تھے اور میں شر کی تحقیق زیادہ کیا کرتا تھا اس خوف سے کہ کہیں شر میں مبتلا نہ ہو جاؤں اس لیے جو چیز دین کو مضر ہو اس کی تحقیق کر لینا لازم ہے۔ من جملہ اس کے وہ شبہات بھی ہیں جو قرآن وحدیث میں لوگوں کو پیش آیا کرتے ہیں ان کا رفع کرنا ضروری ہے اور اس میں حق تعالیٰ نے یہ اعانت فرمائی ہے کہ جس جگہ قرآن میں شبہ ہوتا ہے وہیں جواب بھی مذکور ہوتا ہے۔ لہٰذا شبہ کے وقت سیاق وسباق میں ضرور غور کر لینا چاہیے۔ چنانچہ لَاتُزَکُّوْا اَنْفُسَکُمْ (تم اپنے نفسوں کا تزکیہ کرو) پر جو "قَدْاَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا" (جس نے اپنے نفسوں کو رذائل سے پاک کیا وہ کامیاب ہوگیا) سے تعارض کا شبہ ہوا تھا اس کا جواب اسی جملہ کے ساتھ ساتھ دوسرے جملہ میں مذکور ہے۔ یعنی "ھُوَاَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی" (وہ خوب جانتے ہیں کہ کون متقی ہے) میں کیونکہ اس میں نہی مذکور کی علت کا ذکر ہے اور ترجمہ یہ ہے کہ تم اپنے نفسوں کا تزکیہ نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون متقی ہے۔ اس میں حق تعالیٰ نے دو باتیں بیان فرمائی ہیں ایک اپنا زیادہ علیم ہونا دوسرے من اتقیٰ کے ساتھ علم کا متعلق ہونا۔

---

[1] (کنز العمال: ۳۵۹۹۳)

تقویٰ باطنی عمل ہے

نصوص شرعیہ میں غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہے کہ تقویٰ باطنی عمل ہے چنانچہ حدیث میں صراحۃً مذکور ہے: "اَلاَ اِنَّ التَّقْوٰی ھٰھُنَا وَاَشَارَ اِلٰی صَدْرِہٖ" [1] یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ سنو تقویٰ یہاں ہے۔

تقویٰ صلاحیت قلب کا نام ہے

نیز تقوے کے معنی لغۃً ڈرنے اور پرہیز کرنے کے ہیں۔ یعنی معاصی سے بچنا اور ڈرنا تو ظاہر ہے کہ باطن کے متعلق ہے اور معاصی سے بچنے کی ڈر خود اصلاح باطنی ہے۔ چنانچہ ایک دوسری حدیث میں اس کی پوری تصریح ہے۔

اِنَّ فِی جَسَدِ اِبْنِ اٰدَمَ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلاَ وَھِیَ الْقَلْبُ o [2]

کہ انسان کے بدن میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو جاتا ہے تو تمام بدن درست ہو جاتا ہے۔ سن لو وہ دل ہے اس سب سے تقویٰ کی حقیقت واضح ہو گئی کہ تقویٰ صلاحیت قلب کا نام ہے پس اب تقویٰ اور تزکی دونوں مراد ہوئے تو آیت کا حاصل یہ ہوا "ھو اعلم بمن تزکی" (وہ خوب جانتے ہیں کہ کس نے تزکیہ نفس کیا ہے) ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

تقویٰ فعل اختیاری ہے

اب یہ سمجھو کہ اس میں تزکی کو عبد کی طرف منسوب کیا گیا ہے جس سے اس کا داخل اختیار ہونا مفہوم ہوتا ہے تو وہ مقدور ہوا پھر یہ کہ اعلام فرمایا' اقدر نہیں فرمایا (اس سے بھی) اشارۃً معلوم ہوا کہ بندہ کی قدرت کی نفی مقصود نہیں ہے پس اس سے بھی تقویٰ و تزکی کا مقدور عبد ہونا مفہوم ہوا اور نہ اعلم نہ فرماتے بلکہ "قدر علی جعلکم متقین" (وہ تمہیں متقی بنانے پر قادر ہیں) یا اس کے مناسب اور کچھ فرماتے۔ جب تقویٰ اور تزکی ایک ٹھہرے اور مقدور عبد ٹھہرے اب غور کرنا چاہیے کہ "ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی لَاتُزَکُّوْا اَنْفُسَکُم" (اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ متقی کون ہے اپنے آپ کو مقدس نہ سمجھو) کی علت بن سکتی ہے یا نہیں۔ لَاتُزَکُّوْا کے معنی یہ لیے جائیں کہ نفس کا تزکیہ نہ کیا کرو یعنی نفس کو رذائل سے پاک کرنے کی کوشش نہ کرو تو "ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی"...... (وہ خوب جانتے

---

[1] (الصحیح لمسلم کتاب البر واصلہ: ۳۲) [2] (الصحیح للبخاری ۱: ۲۰)

ہیں کہ متقی کون ہے) اس کی علت نہی ہوسکتی کیونکہ ترجمہ یہ ہوگا کہ اپنے نفسوں کو رذائل سے پاک نہ کرو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کس نے تزکی اور تقویٰ کیا ہے اور یہ ایک بے جوڑ سی بات ہے یہ تو ایسا ہوا جیسے یوں کہا جائے کہ نماز پڑھو کیونکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کس نے نماز پڑھی ہے۔ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کا بندہ کے کسی فعل کو جاننا اس کے ترک کی علت نہیں ہوسکتی ورنہ پھر سب افعال کو ترک کر دینا چاہیے کیونکہ حق تعالیٰ تو بندہ کے سبھی افعال کو جانتے ہیں بلکہ اس کے مناسب یہ علت ہوسکتی تھی کہ ''هو اقدر على جعلكم متقين او نحوه'' (وہ اللہ زیادہ قادر ہیں تمہارے متقی بنانے پر) یعنی یوں فرماتے ہیں کہ تم نفس کو رذائل سے پاک نہ کرو کیونکہ تم کو متقی بنانے پر حق تعالیٰ زیادہ قادر ہیں تم پورے قادر نہیں ہو پھر کیوں کوشش کرتے ہو۔

اپنے نفس کو پاک کہنے کی ممانعت

جب یوں نہیں فرمایا بلکہ ''اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی'' (وہ زیادہ واقف ہیں کہ کون متقی ہے) فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ یہاں تزکیہ کے وہ معنی نہیں بلکہ کچھ اور معنی ہیں جس کے ترک کی علت ھوا علم بن سکے سو وہ معنی یہ ہیں کہ اپنے نفسوں کو پاک نہ کہو یعنی پاکی کا دعویٰ نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ ہی کو خوب معلوم ہے کہ کون متقی ہے (اور کون پاک ہوا ہے) یہ بات تم کو معلوم نہیں اس لیے دعویٰ بلا تحقیق مت کرو۔ اب کلام میں پورا جوڑ ہے اور علت و معلول میں کامل ارتباط ہے اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ تزکیہ باب تفعیل کا مصدر ہے اور تفعیل کی خاصیتیں مختلف ہیں جس طرح اس کی ایک خاصیت تعدیہ ہے۔ اسی طرح ایک خاصیت نسبت بھی ہے پس قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ٥ (جس نے اپنے نفس کو رذائل سے پاک کیا وہ کامیاب ہوا) میں تزکیہ کا استعمال خاصیت تعدیہ کے ساتھ ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جس نے نفس کو رذائل سے پاک کیا وہ کامیاب ہوگیا۔ اس میں نفس کو رذائل سے پاک کرنے کا امر ہے۔ لَاتُزَكُّوْا اَنْفُسَكُم[1] (اپنے آپ کو مقدس نہ سمجھو) میں تزکیہ کا استعمال خاصیت نسبت کے ساتھ ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے نفسوں کو پاک کہنے کی ممانعت ہے۔ اب ان دونوں میں کچھ بھی تعارض نہیں کیونکہ جس چیز کا ایک جگہ امر ہے دوسری جگہ اس کی ممانعت نہیں بلکہ ایک نئی چیز کی ممانعت ہے۔ حکم تو نفس کے پاک کرنے کا ہے اور ممانعت پاک کہنے سے ہے کہیے اب کیا اشکال رہا۔

---

[1] (کنز العمال: ۳۵۹۹۳)

فہم قرآن کیلئے عربیت سے واقفیت ضروری ہے

مگر اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جو عربیت سے واقف ہے اسی لیے فہم قرآن کے لیے عربی جاننے کی سخت ضرورت ہے۔ بدون زبان عربی کا کافی علم حاصل کیے قرآن کا صحیح ترجمہ سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اردو میں جب عربی زبان کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو چونکہ اردو اور عربی زبانیں مختلف ہیں دونوں کے محاورات الگ ہیں اس لیے اگر کسی کو عربی علم کافی نہیں اس کے ترجمہ میں بعض جگہ ابہام رہ جائے گا جس سے شبہات پیدا ہوں گے اور بعض جگہ ترجمہ غلط ہو جائے گا۔

لفظ ضال کے دو معنی

سورۃ الضحیٰ میں ضالاً کا ترجمہ بعض نے گمراہ کر دیا جو باوجود فی نفسہ صحیح ہونے کے ایک عارض کے سبب غلط ہو گیا اور وہ عارض یہ ہے کہ ضال لفظ عربی ہے جس کا عربی میں مختلف استعمال ہوتا ہے یعنی اس میں بھی جس کو وضوح دلیل نہ ہوا ہو اور اس میں بھی جو بعد وضوح دلیل کے مخالفت کرے اور گمراہ ہمارے محاورہ میں صرف اس کو کہتے ہیں جو وضوح دلائل کے بعد حق کا اتباع نہ کرے اور لغت عربیہ کے اعتبار سے لفظ ضال دو معنی کو جیسا کہ مذکور ہوا عام ہے۔ ایک معانی ضال کے وہ ہیں جو ہمارے محاورہ میں گمراہ کے ہیں اور دوسرے معنی بے خبر کے ہیں اور بے خبر اس کو کہتے ہیں جس پر دلائل ظاہر ہی نہیں ہوئے اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وضوح حق کے بعد اس کا اتباع نہ کرنا محال ہے۔ لہٰذا اس جگہ گمراہ سے ترجمہ کرنا غلط ہے بلکہ بے خبری سے ترجمہ کرنا مناسب ہے اور گو بے علمی بھی بے خبری کا مترادف ہے مگر اس سے بھی ترجمہ کرنا مناسب نہیں کیونکہ ہمارے محاورہ میں بے علم جاہل کو کہتے ہیں جو علوم صحیحہ سے بالکل عاری ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے لوگ علوم نبوت سے بے خبر ہوں۔ مگر علوم عقلیہ میں کامل تھے۔ (چنانچہ آپ نبوت سے پہلے بھی تمام عقلاء میں ممتاز اور صائب الرائے صحیح العقل کامل الفہم مشہور تھے اور یہ محض دعویٰ ہی نہیں بلکہ واقعات تاریخیہ اس پر شاہد ہیں کہ نبوت سے پہلے اہم واقعات اور امور متنازعہ میں لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بکثرت رجوع کرتے تھے ۱۲) پس بے علمی سے بھی ترجمہ مناسب نہیں بلکہ بے خبری ہی سے ترجمہ کرنا مناسب ہے اور کسی بات سے بے خبری کچھ عیب نہیں کیونکہ علم ذاتی اور علم محیط سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں ہر شخص علم میں تعلیم الٰہی کا محتاج ہے (بالخصوص علوم سمعیہ نقلیہ میں جن کے ادراک کے لیے عقل محض ناکافی ہے ۱۲) اور ہر شخص کو جو علم حاصل ہوتا ہے معلوم کرنے سے پہلے وہ غیر معلوم ہی ہوتا ہے۔ پس علم بعد عدم علم کوئی عیب نہیں۔

بے خبری کوئی عیب نہیں

چنانچہ حق تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان میں بھی فرماتے ہیں:

وَ کَذٰلِکَ نُرِیْٓ اِبْرَاهِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِیَکُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَo

''ہم نے ایسے ہی طور پر ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کی مخلوقات دکھلائیں تا کہ وہ عارف ہو جائیں اور تا کہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔''

اس آیت سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملکوت سموٰت وارض کا پہلے علم نہ تھا اللہ تعالیٰ کی تعلیم واردات سے ان کو یہ علم حاصل ہوا۔ پس بے خبری کچھ عیب نہیں تو مناسب ترجمہ ضالاً کا اس جگہ ناواقف ہے پس اس لفظ کا صحیح ترجمہ موجود تھا مگر مترجمین کی نظر اس پر نہیں پہنچی اور وہ ضالاً کا ترجمہ گمراہ کر گئے۔ حاصل یہ کہ الفاظ عربیہ کا ترجمہ ہر جگہ کافی نہیں ہوتا اور مقصود کے سمجھنے میں غلطی واقع ہو جاتی ہے اس لیے ترجمہ کے لیے خود عربی کا بھی پوری طرح جاننا اور اس زبان کے محاورات سے بھی جس میں ترجمہ کیا جارہا ہے پورا واقف ہونا ضروری ہے۔

مترجم کو محاورات زبان پر عبور کامل کی ضرورت

چنانچہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰهَاo (جس نے اپنے نفس کو رذائل سے پاک کیا وہ کامیاب ہو) اور لَاتُزَکُّوْٓا اَنْفُسَکُمْ[1] (اپنے آپ کو مقدس نہ سمجھو) میں دونوں جگہ زکیٰ اور لاتزکوا باب تفعیل ہی سے ہے تو جو شخص عربی نہ جانتا ہوگا وہ دونوں جگہ ایک ہی معنی سمجھے گا اور شبہات میں پڑے گا اور جو شخص عربی جانتا ہوگا وہ سمجھے گا کہ باب تفعیل کی خاصیتیں مختلف ہیں جس طرح تعدیہ ایک خاصیت ہے نسبت بھی اسی بات کی ایک خاصیت ہے پس ایک جگہ ترجمہ یہ ہوگا کہ اپنے کو پاک نہ کہو اور ایک جگہ ترجمہ یہ ہوگا کہ جس نے نفس کو پاک کیا اور پاک نہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے کو تزکیہ کی طرف منسوب نہ کرو یعنی یہ دعویٰ نہ کرو کہ ہم پاک ہو گئے یعنی گفتن کے دو معنی ہیں ایک تو مطلق کہنا کہ بقصد قبول حق کے ہو۔ دوسرا کمال کا دعویٰ کرنا پس لَاتُزَکُّوْٓا میں میں تزکیہ بمعنی پاک گفتن سے مراد دعویٰ پاکی کردن ہے۔ مطلق اقرار قبول حق مراد نہیں کہ وہ تو مامور بہ ہے۔ اسی کے مماثل صوفیاءِ کرام کا یہ قول ہے:

---

[1] (کنز العمال: ۳۵۹۹۳)

مغرور سخن مشو کہ توحید خدائے　　　واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

(توحید کا دعویٰ نہ کرو اس لیے توحید خدا کو واحد کہنا نہیں بلکہ واحد یقین کرنا ہے)

اس گفتن کا بھی یہی مطلب ہے کہ دعویٰ توحید مت کرو یہ مطلب نہیں کہ توحید کے قائل نہ ہو کیونکہ تکلم بکلمہ الشہادۃ تو فرض ہے اس سے کیونکر روک سکتے ہیں بلکہ مقصود دعویٰ سے روکنا ہے۔

انا مومن انشاء اللہ کہنے میں اختلاف

یہ ایسا ہے جیسا کہ امام اشعری رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ انا مومن حقا (میں یقیناً مومن ہوں) نہ کہنا چاہیے بلکہ انا مومن حقا انشاء اللّٰہ (میں انشاء اللہ مومن ہوں) کہنا چاہیے اور انہوں نے بھی حقیقت میں دعوے ہی سے منع کیا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ علماء میں اختلاف ہوا ہے کہ انا مومن حقا انشاء اللّٰہ کہنا چاہیے یا انا مومن حقا تو اشعری انا مومن حقا (میں انشاء اللہ مومن ہوں) کہنا چاہیے اور امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انا مومن حقا (میں واقعی مومن ہوں) کہنا چاہیے۔ انا مومن حقا انشاء اللّٰہ (میں انشاء اللہ مومن ہوں) نہ کہنا چاہیے۔ مشہور قول میں تو اس اختلاف کا منشاء یہ ہے کہ جن لوگوں نے انا مومن حقا سے منع فرمایا ہے اور انا مومن انشاء اللہ کہنے کی تعلیم دی ہے۔ انہوں نے حال پر نظر کی ہے اور چونکہ حال معلوم نہیں کہ ہم حال میں مومن ہیں یا نہیں اس لیے انشاء اللہ بڑھانے کی تاکید کی ہے اور جن لوگوں نے کہا ہے کہ انا مومن حقا کہنا چاہیے ان کی نظر حال پر ہے اور فی الحال اپنے ایمان میں تردد و شک کرنا کفر ہے اس لیے وہ انشاء اللہ بڑھانے سے منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انا مومن حقا کہنا چاہیے اور یہ نزاع محض لفظی ہوگا کیونکہ حال کے اعتبار سے انشاء اللہ بڑھانے کو کوئی منع نہیں کر سکتا اور حال کے اعتبار سے انا مومن حقا سے کوئی روک نہیں سکتا مگر میرے ذوق میں یہ ہے کہ جیسے انا مومن حقا حال کے اعتبار سے ہے اسی طرح انا مومن انشاء اللہ بھی حال ہی کے اعتبار سے ہے مال کے اعتبار سے نہیں۔ امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حال کے اعتبار سے حقاً کہنا چاہیے اور امام اشعری فرماتے ہیں کہ نہیں بلکہ حال کے اعتبار سے بھی انا مومن انشاء حقا انشاء اللہ ہی کہنا چاہیے اور مطلب اشعری کا یہ ہے کہ انا مومن حقا دعویٰ کے طور سے نہ کہنا چاہیے بلکہ دعوے سے بچنے کے لیے انشاء اللہ کہنا چاہیے اور یہ انشاء اللہ محض برکت کے لیے ہوگا' تعلیق و تردد کے لیے نہیں ہوگا جس سے مقصود تفویض و توکل ہے کیونکہ انشاء اللہ جیسے تعلیق فی المستقبل کے لیے آتا ہے کبھی حال کے لیے بھی مستعمل ہوتا ہے جس سے تعلیق مقصود نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس آیت "وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَیْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ" آپ کسی کام کی نسبت یوں

نہ کہا کیجئے کہ میں اس کوکل کروں گا مگر خدا کے چاہنے کوملا دیا کیجئے) میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو برکت ہی کے لیے انشاء اللہ کہنے کی تعلیم کی گئی ہے۔ یہ انشاء اللہ تعلیق کے لیے نہیں ہے کیونکہ آگے ارشاد ہے: "وَاذْكُرْ رَّبَّكَ إِذَا نَسِيْتَ" (اپنے رب کا ذکر کرو جبکہ بھول جاؤ) کہ اگر کبھی انشاء اللہ کہنا بھول جاؤ تو جب یاد آئے اسی وقت انشاء اللہ کہہ لیا کرو۔ یعنی ایک بات کہہ کر گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد انشاء اللہ کا خیال آئے تو اس وقت بھی امر ہے کہ انشاء اللہ کہہ لو تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ لفظ تعلیق کے لیے نہیں ہوسکتا کیونکہ تعلیق کے لیے کلام سابق سے موصول ہونا عقلاً ضروری ہے اور اگر انشاء اللہ کلام سے مفصول ہو تو تعلیق کو مفید نہیں ہوسکتا۔

(قلت وبقيد العقل خرج جوابا عما قيل ان هذا انما يصلح الزاما على الحنيفته القائلين بعدم جواز الفصل بان المعلق والتعليق والقائل ان يقول ان لفظته الا ان يشاء الله فيه التعليق والاستثناء كما هو الا صل فيها ثم قوله واذكر ربك اذا نسيت يجيز الفصل بين المعلق والتعليق والمستثنىٰ منه والا ستثناء كما هو مذهب ان عباس رضى الله تعالىٰ عنه ۱۲ جامع)

پس یہاں بھی یعنی انا مومن انشاء اللہ میں لفظ انشاء اللہ محض تفویض کیلئے ہے نہ کہ تعلیق وتردد کے لیے اور مطلب اشعری رحمتہ اللہ کا یہ ہے کہ انا مومن حقا میں ایک قسم کا دعویٰ ہے۔

اپنے کو دعویٰ کے طور پر مؤحد نہ کہو

اس لیے دعویٰ سے بچنا چاہیے اور تفویض کے لیے انشاء اللہ کہنا چاہیے یہی مطلب صوفیاء کا ہوگا اس قول سے

مغرور سخن مشوکہ توحید خدا — واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

(توحید خدا کا دعویٰ مت کرو کہ توحید خدا کو واحد جاننا ہے نہ واحد کہنا)

یہاں بھی واحد گفتن کے معنی دعویٰ کردن ہیں تو صوفیاء کی مراد یہ ہے کہ اپنے کو دعویٰ کے طور پر موحد نہ کہو اور جنہوں نے حقا کہنے کو فرمایا ہے مراد وہ کہنا ہے جو بطور اقرار بالایمان کے ہو اور یہی مطلب لاتزکوا کا ہے کہ دعویٰ کے طور پر اپنے کو پاک نہ کہو جس پر قرینہ ھواعلم ہے یعنی خدا ہی کو خبر ہے کہ کون پاک ہے پس دعویٰ پاکی کا نہ کرو یہ قرینہ اس پر دال ہے کہ یہاں تزکیہ کے معنی پاک کہنے کے ہیں نہ پاک کرنے کے جیسا مفصلاً اوپر مذکور ہو چکا ہے۔

تزکیہ سے متعلق سالکین کی غلطیاں

اب میں اصل مضمون کو بیان کرتا ہوں کہ تزکیہ کے متعلق سالکین کو کچھ غلطیاں واقع ہوتی ہیں وہ دو غلطیاں ہیں ایک یہ کہ وہ سمجھتے ہیں کہ تزکیہ کی غایت تزکی ہے۔ پس جب تزکی پر تزکی ان کے زعم میں مرتب نہیں ہوتی تو شکستہ خاطر ہو کر عمل کو چھوڑ دیتے ہیں اور یہ ان کی غلطی ہے کیونکہ تزکی باب تفعیل کا مصدر ہے جو تفعیل کا مطلوع ہے جسے قطع فنقطع (میں اس کو قطع کیا پس وہ قطع ہو گیا) تو اس کا ترتب تزکیہ پر ضروری اور لازمی ہے جیسے تقطع پر تقطع کا ترتب لازم ہے۔ پس یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص تزکیہ میں مشغول ہو اور تزکی حاصل نہ ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جیسا تزکیہ ہوتا ہے ویسی ہی تزکی حاصل ہوتی ہے اگر ناقص تزکیہ ہے تو تزکی بھی ناقص ہے اور کامل تزکیہ ہے تو تزکی بھی کامل ہوگی اور ظاہر ہے کہ تزکیہ کامل ایک دو دن میں نہیں ہو سکتا تو پھر تزکی کامل ایک دو دن میں کیونکر ہو جائے مگر لوگوں کو اول ہی دن سے شوق کامل تزکی کا ہوتا ہے کیونکہ ہر شخص کمال کا طالب ہے اور وہ جلدی حاصل ہوتا نہیں تو شکستہ خاطر ہو کر عمل کو چھوڑ دیتے ہیں۔

تحصیل کمال کی ترغیب

اس کو محققین منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم اس کی فکر ہی نہ کرو کہ تزکی کا ترتب ہوا یا نہیں تمہارا کام تزکیہ ہے اس میں مشغول رہو تم سے تزکیہ ہی میں مشغول ہونا مطلوب ہے۔ تزکی مطلوب نہیں تم اس کی فکر نہ کرو اور گو بظاہر یہ تحصیل کمال سے روکنا معلوم ہوتا ہے لیکن واقع میں یہ روکنا نہیں بلکہ تحصیل کمال کی ترغیب ہے کیونکہ اول ہی سے تزکی کی فکر میں پڑنا اور کچھ دنوں کے بعد تزکی کو اپنے زعم میں حاصل شدہ نہ دیکھنا طالب کے لیے پریشانی کا سبب ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ تزکیہ ہی کو چھوڑ دیتا ہے جو ذریعہ تھا حصول کمال کا اور جب اس سے یہ کہہ دیا جائے گا کہ تزکی کی فکر نہ کرو تم سے یہ مطلوب ہی نہیں بلکہ تزکیہ مطلوب ہے تو وہ بے فکر اور یکسو ہو کر کام میں لگا رہے گا اور واقع میں تزکیہ کے لیے تزکی لازم ہے وہ تو خود بخود حاصل ہوتی رہے گی اس کے لیے فکر و قصد کی ضرورت نہیں جس دن یہ کامل ہوگا اس دن تزکی خود ہی کامل ہو جائے گی اور راز اس میں یہ ہے کہ کمال تزکیہ کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ انسان یکسو ہو کر ہمہ تن اس میں متوجہ ہو اور یہ یکسوئی اس پر موقوف ہے کہ حصول تزکی کی فکر میں نہ پڑے۔

تکمیل صلوٰۃ کی ترغیب

اس لیے محققین کا تزکی کی فکر سے منع کرنا تحصیل کمال سے روکنا نہیں بلکہ تحصیل کمال پر اعانت ہے جیسے کسی کو نماز میں وسوسے آتے ہوں اور وہ بند کرنے کی کوشش کرے مگر بند نہ ہوں اس وقت

بھی محققین یہ کہتے ہیں کہ وساوس کی کچھ پروانہ کرو' آنے دوتم وساوس کے ساتھ ہی نماز میں مشغول رہو۔ یہاں یہی شبہ ہوتا ہے کہ کیسے شیخ ہیں جو وساوس کے بند کرنے سے روکتے ہیں گویا نماز کی تکمیل سے منع کرتے ہیں لیکن محقق سمجھتا ہے کہ وساوس دفعتہً بند نہیں ہو سکتے۔ پس اول ہی سے اس کی فکر کرنا کہ نماز میں کوئی وساوس نہ آئے' طالب کو پریشان کردے گا۔ وساوس کے بند ہونے کی صورت یہی ہے کہ انسان ہمت کر کے نماز ہی میں توجہ رکھے چونکہ نفس کی دو طرف توجہ نہیں ہوتی اس لیے جب مدت تک توجہ سے نماز کا پابند رہے گا وسوسے خود ہی کم ہو جائیں گے اور ایک وقت وہ آئے گا کہ بالکل بند ہو جائیں گے۔ پس شیخ کا وساوس کی طرف التفات کرنے سے منع کرنا دراصل وساوس کی اجازت نہیں بلکہ تکمیل صلوٰۃ کی ترغیب ہے کیونکہ ان کی طرف التفات نہ کرنے سے وہ یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہے گا اور اس طرح سے وساوس بند ہو جائیں گے۔

وساوس کے دو درجے

اور اس کی حقیقت یوں سمجھئے کہ وسوسہ کے دو درجے ہیں ایک اختیاری ایک غیر اختیاری اور کمال صلوٰۃ کے منافی وسوسہ اختیاری ہے اور غیر اختیاری وسوسہ منافی کمال صلوٰۃ نہیں ہے بلکہ اس حالت میں اپنے کام میں لگا رہنا بوجہ شاق ہونے کے زیادہ ثواب کا موجب ہے جیسے حدیث میں آیا ہے: "وَالَّذِیْ یَقْرَاُ الْقُرْآنَ وَھُوَ یَتَعْتَعُ فِیْهِ لَهٗ اَجْرَانِ"[1] (اور جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور اس میں اٹکتا ہے اس کے دو اجر ہیں) غرض وسوسہ غیر اختیاری سے نماز ناقص نہیں ہوتی بلکہ یہ واقع میں کمال ہے مگر بصورت نقصان مگر اس میں بعض اوقات یہ غلطی ضرور ہوتی ہے کہ ایک وسوسہ ابتداءً تو بلا قصد و اختیار آیا پھر یہ شخص باختیار خود ادھر متوجہ ہوا اور اسی میں مشغول ہو گیا۔ اس وقت دھوکہ ہو جاتا ہے کہ سالک اس وسوسہ کو غیر اختیاری سمجھتا ہے حالانکہ یہ توجہ غیر اختیاری نہیں ہے بلکہ اختیاری ہے۔ حاصل یہ کہ شیخ وساوس غیر اختیاریہ کی طرف التفات اور توجہ کرنے سے اسی لیے منع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم اس کے دفع میں بھی کوشش نہ کرو جس سے ظاہر بینوں کو شبہ ہوتا ہے کہ وساوس کی اجازت دیتے ہیں اور نماز ناقص کی تعلیم دیتے ہیں حالانکہ غیر اختیاری وساوس کے ساتھ نماز حقیقت میں کامل ہے گو ظاہر میں ناقص ہو۔ پس ظاہر میں شیخ کا یہ حکم ناقص نماز کا حکم ہے مگر وہ حقیقت بین ہے اور دور بین یہی سمجھتا ہے کہ وسوسہ دفعتہً تو قطع ہوگا نہیں اور جب قطع نہ ہوگا تو یہ اس کو ناقص نماز سمجھے گا اور یہ سمجھ کر چھوڑ بیٹھے اس لیے بھی وہ ایسی نماز کو کامل بتاتا اور اسی کی ترغیب دیتا ہے اور وساوس کی طرف التفات سے منع کر دیتا ہے۔

---

[1] (مسند احمد ۶: ۱۹۲ بلفظ آخر)

کثرت عبادت کا طریق

اس دور بینی کے سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرت عبادت سے ممانعت فرمائی ہے۔ ظاہر میں اس پر شبہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ عبادت کرنے سے روک دیا حالانکہ اچھی چیز جتنی بھی زیادہ ہو اتنی ہی اچھی ہے مگر حقیقت میں یہ کثرت عبادت سے ممانعت نہیں بلکہ تقلیل عبادت سے ممانعت ہے کیونکہ کثرت سے نفس کو کچھ دنوں کے بعد ملال اور تعب محسوس ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ گھبرا کر تھوڑی عبادت بھی نہ کر سکے گا اور بالکل معطل ہو جائے گا اس لیے آپ فرماتے ہیں کہ عبادت اس قدر کرنا چاہیے جو ہمیشہ ہو سکے، گو قلیل ہی ہو کیونکہ وہ اس وقت گو قلیل ہے لیکن دوام اور نباہ سے کثیر ہو جائے گی اور عبادت کثیرہ گو اس وقت زیادہ معلوم ہوتی ہے مگر تعطل کے بعد عبادت قلیلہ دائمہ کے سامنے وہ قلیل ہو جائے گی۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ سبق ایسے حال میں چھوڑو کہ کچھ شوق باقی رہ گیا ہو بالکل سیر ہو کر نہ چھوڑو۔ اگر دس بار کا شوق ہو تو زیادہ بار ذکر کر دو تا کہ ایک بار کا شوق باقی رہے اور اس کی ایک مثال فرمایا کرتے تھے کہ بچے جو چکئی سے کھیلتے ہیں تو اس پر کچھ تھوڑا اڈورا لپٹا ہوا چھوڑ دیتے ہیں وہ پھر لوٹ آتی ہے اگر سارا اڈورا کھول دیا جائے تو پھر عود نہیں کرتی۔ تکلف اعادہ کی حاجت ہوتی ہے مگر یہ مشورہ اس شخص کے لیے ہے جس میں شوق غالب ہو باقی جو بدشوق ہو اس کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ بتکلف عبادت میں مشغول ہو تا کہ کچھ شوق پیدا ہو۔ بہرحال مقصود یہ ہے کہ گو ثمرہ تزکیہ ترقی ہے مگر اس کا کامل درجہ دفعتہً حاصل نہیں ہوا کرتا اس لیے شیوخ کہتے ہیں کہ تم ترقی کی فکر ہی میں نہ پڑو بس تزکیہ میں مشغول رہو ترقی خود بخود ہوتی رہے گی۔ رہا یہ شبہ کہ ہم کو تو باوجود سعی کے اب تک کچھ بھی نور حاصل نہیں ہوا۔ تو یہ کیسے تسلیم کیا جائے کہ تزکیہ کے ساتھ ترقی ضرور ہوتی ہے۔

عجلت کی عجیب حکایت

اس کا جواب یہ ہے کہ نور تو حاصل ہوا ہے لیکن ابھی اتنا قلیل ہے کہ تم کو محسوس نہیں ہوتا جیسے بچہ دن بدن بڑھتا ہے مگر ہر روز اس کا بڑھنا محسوس نہیں ہو سکتا بلکہ کچھ عرصہ کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ پہلے اس کا اتنا قد تھا اور آج اتنا ہو گیا۔ اب اگر کوئی شخص بچہ کو روزانہ دھاگے سے ناپا کرے اور طبیب سے جا کر شکایت کرے کہ جناب نہیں معلوم کیا بات ہے کہ میرا بچہ بڑھتا ہی نہیں تو بتلائیے وہ کیا جواب دے گا۔ یقیناً یہی کہے گا کہ بھائی اس کا بڑھنا کچھ عرصہ کے بعد دفعتہً محسوس ہوگا تم جلدی نہ

کرو۔ دیکھے جاؤ یہی جواب اس شبہ کا محقق دیتا ہے۔ دوسرے یہ بات بھی ہے کہ نور تو پیدا ہوتا ہے مگر بعض دفعہ غم کی ظلمت اس کو چھپالیتی ہے تم کو چونکہ ابھی سے درجہ کمال کی ہوس ہے اور وہ حاصل نہیں ہوا۔ اس لیے غم ہوتا ہے جس کی ظلمت سے قلیل نور مخفی ہو جاتا ہے اور یہ ظلمت طبعی ہے جو نور طاعت کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔ اس سے نور طاعت زائل نہیں ہوتا بلکہ چھپ جاتا ہے۔ البتہ ظلمت معصیت نور طاعت کو زائل کر دیتی ہے وہ اس کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی اس لیے تم جلدی نہ کرو اور بے فکری سے تزکیہ میں مشغول رہو انشاء اللہ ایک دن تم کو بھی نور محسوس ہو جائے گا۔

اس جلدی پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک عالم پست آواز تھے۔ ایک بزرگ ان کے حلقہ وعظ میں بیٹھے تھے مگر ان تک آواز نہ پہنچتی تھی اس لیے اور آگے بڑھ کر بیٹھے پھر بھی آواز نہ آئی تو بالکل قریب جا کر بیٹھے اب آواز آئی تو مضامین بہت اچھے تھے یہ سن کر بہت محظوظ ہوئے۔ جب وعظ ختم ہو گیا تو ان بزرگ نے گھر جا کر دعا کی کہ مولوی صاحب کی آواز بلند ہو جائے' دعا کرنے کے بعد ایک آدمی کو ان کے پاس بھیجا کہ جا کر دریافت کرو آواز بلند ہوئی یا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں' تو بعضے بزرگ بہت بھولے ہوتے ہیں' یہ بھولا پن دنیوی کاموں میں تو مضر نہیں مگر ضروریات دینیہ میں مضر ہوتا ہے۔ (چنانچہ ان بزرگ کی جلدی سے عام لوگوں کو یہ شبہ ہوا ہوگا کہ اجابت دعا کے معنی یہ ہیں کہ دعا کرتے ہی فوراً اثر ظاہر ہو جائے حالانکہ اجابت دعا کے لیے یہ لازم نہیں۔ بعض دفعہ انبیاء علیہم السلام کی دعا کا اثر بہت دیر میں ظاہر ہوا۔ باوجود یہ کہ وحی سے اس کا اطمینان کر دیا گیا تھا کہ دعا قبول ہو گئی ۱۲ ظ) اسی طرح بعض لوگ بھولے پن سے یہ سمجھتے ہیں کہ جب کسی عمل کا ثمرہ روز کے روز حاصل نہ ہوا تو فائدہ ہی کیا اور یہ سمجھ کر عمل کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

تعجیل سدراہ ہے

میں اس غلطی کو رفع کرتا ہوں اور خیر خواہی سے کہتا ہوں کہ جلدی مناسب نہیں اس طریق میں تعجیل سدراہ ہے بس کام کیے جاؤ انشاء اللہ ایک دن ثمرہ تم کو خود بھی نظر آ جائے گا۔ دیکھو حق تعالیٰ نے بھی عدم تعجیل کی تعلیم کے لیے آسمان و زمین کو جلدی نہیں بنایا۔ باوجود یہ کہ ان کی شان ہے: "اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنَا اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنَ" (ہم جس چیز کو چاہتے ہیں بس اس سے ہمارا اتنا ہی کہنا ہوتا ہے کہ تو ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے) اگر چاہتے تو لمحہ میں سب کچھ پیدا فرما دیتے مگر ایسا نہیں کیا بلکہ ارشاد ہے: "خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَى الْعَرْشِ" (اس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پھر عرش پر قائم ہوا)

کہ چھ دن میں آسمان اور زمین کو بنایا۔ یہاں ایک علمی فائدہ استطراداً عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ یہودیوں نے اس تدریج سے یہ سمجھا کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کے بنانے میں تھک گئے اور عرش پر لیٹ گئے اس لیے ایک آیت میں یہ بھی فرمادیا: "وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ" کہ ہم کو کچھ بھی تھکن نہیں ہوتی اس میں یہود کی گستاخی کا جواب ہے اور یہود نے یہ کلمہ چونکہ گستاخی اور بے ادبی کے طور سے کہا تھا مذمت کی گئی۔

حکایت شبان موسیٰ علیہ السلام

موسیٰ علیہ السلام کے چرواہے نے محبت سے یہی کلمہ کہا تھا اس کی شکایت تو کیا بلکہ موسیٰ علیہ السلام نے جب اس کو ایسی باتوں سے روک دیا تو ان پر عتاب ہوا۔

وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا — بندہ مارا چرا کہ دی جدا
تو برائے وصل کردن آمدی — نے برائے فصل کردن آمدی
موسیا آداب دانا دیگر اند — سوختہ جاں در داناں دیگر اند

(موسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی آئی ہمارے بندہ کو ہم سے کیوں جدا کردیا تم وصل کے لیے آئے ہو نہ جدائی کے لیے اے موسیٰ علیہ السلام! جاننے والوں کے لیے آداب اور ہیں)

غرض یہود بڑے گستاخ اور نالائق تھے وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ زمین وآسمان کو چھ دن میں بنا کر تھک گئے (نعوذ باللہ) اور تھک کر عرش پر لیٹ گئے اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہود کی اس قسم کی گستاخیاں سن کر رنج ہوتا تھا اس لیے حق تعالیٰ نے "وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ" (اور ہم کو تھکن نہیں ہوئی) کے بعد یہ بھی ازالہ حزن کے لیے فرمایا: "فَاصْبِرْ عَلٰى مَايَقُوْلُوْنَ" (آپ ان کی باتوں پر صبر کریں) کہ ان کمبختوں کی باتوں پر صبر کیجئے۔

صبر کا طریق

پھر چونکہ حق تعالیٰ کی شان میں گستاخی سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسا عاشق صبر نہیں کرسکتا اس لیے آگے صبر کے طریقے بتلاتے ہیں: "وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ" کہ آپ اپنے رب کی تسبیح و تحمید میں مشغول رہیے یعنی ان کی طرف سے توجہ کو ہٹا کر ذکر الٰہی میں لگ جایئے ادھر توجہ ہی نہ کیجئے جو سن کر ایذا پہنچے بلکہ اپنی توجہ کو محبوب کی طرف مشغول کردیجئے۔ الغرض حق تعالیٰ نے زمین و آسمان کو باوجود ایک لحہ میں پیدا کرسکتے چھ دن میں پیدا کیا۔ ہمارے مفسرین نے لکھا ہے کہ اس میں حکمت ہے کہ مخلوق کو تعلیم کرنا مقصود ہے: "لیعلم المخلوق التبثت فی الامور" تا کہ

مخلوق کو جملہ امور میں اطمینان وتحمل کا سبق حاصل ہو کہ اگر کسی مقصود کے حصول میں دیر ہو جائے تو گھبرانا نہیں، دیکھو ہم نے اتنے بڑے قادر ہونے کے "خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" (آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں) میں اتنی دیر لگائی حالانکہ ہم کو جلدی پیدا کرنا بھی آسان تھا پھر باوجود آسان ہونے کے ہم نے اتنی دیر لگائی اور تم تو قادر بھی نہیں۔

طالب کی شان

اور حصول مقصد بھی تم کو مشکل ہے پھر تم جلدی کیوں کرتے ہو۔ بس طالب کی شان تو یہ ہونا چاہیے:

دست از طلب ندارم تا کام من برآید　　　یا تن رسد بجاناں یا جان زتن برآید

(طلب سے باز نہ رہوں گا جب تک میرا مقصد پورا نہ ہو جائے یا تو تن محبوب حقیقی کے پاس پہنچ جائے یا جان تن سے نکل جائے)

اگر کسی حالت طلب میں مر جائے گا تو انشاء اللہ مرنے کے بعد تکمیل کر دی جائے گی۔ چنانچہ قرآن کی نسبت حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن شریف یاد کرتا ہو اور پورا یاد ہونے سے پہلے مر جائے تو اللہ تعالیٰ قبر میں اس کے پاس ایک فرشتہ کو بھیجتے ہیں وہ اسے پورا قرآن شریف یاد کرا دیتا ہے۔ اس واسطے آدمی کو چاہیے کہ طلب میں مشغول رہے اور کام کیے جائے اور حصول مقصود میں تعجیل نہ کرے۔ ہاں پہلے یہ تحقیق کر لے کہ میں رستہ پر بھی چل رہا ہوں یا نہیں۔ جب یہ معلوم ہو جائے کہ راستہ پر چل رہا ہوں تو بس پھر اطمینان کے ساتھ چلتا رہے کبھی نہ کبھی مقصود تک پہنچ ہی جائے گا اور راستہ ہی غلط ہے تو جتنا چلے گا! اتنا ہی دور ہوتا جائے گا اس لیے اس کی تحقیق ضروری ہے اور راستہ پر پڑ جانے کے بعد پھر یہ کوشش نہ کرے کہ وصول جلدی ہی ہو جائے اگر دنیا میں بھی وصول نہ ہوا تو انشاء اللہ مرنے کے بعد تکمیل ہو جائے گی۔

ایک قسم کا دوام

ہاں یہ شرط ہے کہ برابر طلب میں لگا رہے، دوام طلب کو ہاتھ نہ دے اور اگر کبھی کبھی معمول ناغہ ہو جاتا ہو تو اس سے بھی نہ گھبرائے بلکہ ناغہ کے بعد پھر کام میں لگ جائے یہ بھی ایک قسم کا دوام ہے کہ کبھی ہوا اور کبھی نہ ہوا کبھی کبھی ناغہ ہو جانے کو دوام کے خلاف نہ سمجھو اور اس سے گھبرا کر طلب سے ہمت نہ ہارو۔ دیکھو جو شخص دس مرتبہ روزانہ وظیفہ پڑھتا ہے تو اس وقت سے دوسرے وقت تک کتنے گھنٹے ذکر سے خالی گزر جاتے ہیں یہ بھی تو ناغہ ہے مگر پھر بھی اس کو دوام کہا جاتا ہے تو اسی طرح ایک صورت دوام کی یہ بھی ہے کہ درمیان میں بجائے گھنٹوں کے ایام کا ناغہ ہو جائے مولانا فرماتے ہیں:

دوست دارد دوست ایں آشفتگی　　کوشش بیہودہ بہ از خفتگی

(محبوب حقیقی اس آشفتگی یعنی طلب کو پسند فرماتے ہیں۔ سعی اگرچہ بے ثمر ہوگا مگر تعطل سے بہتر ہے)

غرض بالکل نہ ہونے سے ناغہ کے ساتھ کام میں لگا رہنا بھی مفید ہے۔ پس جس طرح ہو سکے طلب کو نہ چھوڑو انشاء اللہ کسی وقت کامیاب ہو جاؤ گے۔

اندریں رہ می تراش و می خراش　　تادم آخر دمے فارغ مباش

تادم آخر دمے آخر بود　　کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(اس طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ ادھیڑ بن میں لگے رہو اور آخر وقت تک ایک لحظہ بھی فارغ مت رہو اس وقت تک کوئی گھڑی آخر ایسی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائے گی)

وصول جب ہوتا ہے دفعۃً ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ایک بار خدا کا نام دل سے اس طرح نکلتا ہے جو سالک کو واصل کر دیتا ہے اس لیے جتنا ہو سکے اس کو بیکار نہ سمجھو چاہے قاعدہ سے ہو یا بے قاعدہ ناغہ سے ہو یا بلا ناغہ کرتے رہو اسی طرح ایک دن عنایت ہو جائے گی۔ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں:

بس ہے اپنا ایک نالہ بھی اگر پہنچے وہاں
گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

دیکھو جب کوئی شخص کھانا کھاتا ہے تو پہلے ہی لقمہ سے پیٹ نہیں بھرتا بلکہ آخر میں ایک لقمہ ایسا ہوتا ہے جس کے پہنچتے ہی پیٹ بھر جاتا ہے۔ اسی طرح بندہ جب ذکر و شغل میں مشغول ہوتا ہے تو پہلے ہی دن واصل نہیں ہوتا بلکہ آخر میں ایک دفعہ اللہ کا نام اس طرح لیتا ہے کہ اس پر جذبہ غیبی وارد ہو جاتا ہے جو سالک کو دفعۃً واصل کر دیتا ہے مگر وہ ہوتا ہے ان اعمال ہی کے بعد (جیسے پیٹ تو آخری لقمہ سے بھرتا ہے مگر جب ہی کہ اس سے پہلے اور بھی لقمہ پہنچ چکے ہوں)

تزکیہ میں مشغول رہنے کی ضرورت

اسی طرح "قَدْاَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا" (جس نے اپنے نفس کو رذائل سے پاک کیا کامیاب ہو گیا) میں حق تعالیٰ نے تزکیہ پر فلاح کو مرتب فرمایا ہے پس تزکیہ میں مشغول رہنا چاہیے تزکیہ ہو یا نہ ہو تم اس کی فکر میں نہ پڑو تزکیہ کرتے کرتے ایک دن ایسا ہوگا کہ دفعۃً تزکی حاصل ہو جائے گی۔ بس سالک کو اتنا ضرور ہے کہ اپنے اعمال کو دیکھتا رہے کہ ان میں خلاف شریعت تو کوئی بات نہیں

جب اعمال درست ہوں تو بے فکری کے ساتھ کام میں لگا رہے یہ انشاء اللہ کامیاب ہوگا چاہے احوال وکیفیات ہوں یا نہ ہوں انوار وتجلیات وارد ہوں یا نہ ہوں۔ اسی کو عارف شیرازی فرماتے ہیں:

در راہ عشق وسوسہ اہرمن بس ست　　　بشدار گوش رابہ پیام سروش دار

(طریق عشق میں شیطان کے وساوس بہت ہیں ہوشیار رہو اور وحی کی طرف کان لگائے رہو)

یہاں پیام سروش سے وحی مراد ہے کہ احکام وحی کے ساتھ اپنے اعمال کا موازنہ کرتے رہو۔ اگر اعمال میں تو خلاف شرع کوئی بات نہیں مطمئن ہو تم صراط مستقیم پر چل رہے ہو کسی دن ضرور مقصود پر پہنچو گے۔ واللہ اس راہ میں وہی راہبر ہے۔ سالک کو چاہیے کہ شریعت کو اپنا امام بنالے شریعت کے خلاف کوئی کام نہ ہو تو پھر کوئی خطرہ نہیں جو حالت بھی پیش آئے وہ مضر نہ ہوگی۔ یہاں تک ایک غلطی کی اصلاح تھی۔

سالکین کی دوسری غلطی

دوسری غلطی یہ ہے کہ بعض لوگ یہ سن کر چاہے ثمرہ حاصل ہو یا نہ ہو کام میں لگا رہنا چاہیے۔ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ بس کام کرو چاہے تکمیل ہو یا نہ ہو اور یہ سمجھ کر ادنیٰ درجہ کا عمل کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً نماز وذکر میں از خود وساوس لانے لگے حالانکہ ناقص عمل حصول مقصود کے لیے کافی نہیں تکمیل جب ہوتی ہے اعلیٰ درجہ کے عمل سے ہوتی ہے جو عمل غفلت کے ساتھ کیا جائے اس سے باطنی نفع نہیں ہوتا۔ (پس خوب سمجھ لو کہ جب تک کامل عمل پر قدرت نہ ہو اس وقت سے تو ناقص عمل ہی کو غنیمت سمجھ کر کرتے رہو اور تکمیل کی کوشش میں لگے رہو ہمت نہ ہارو اور جب ناقص عمل پر کچھ دنوں دوام کر کے عمل کامل پر قدرت حاصل ہو جائے اس وقت عمل ناقص کو کافی نہ سمجھو بلکہ عمل کامل کا اہتمام اب بھی کرو ناقص میں لگے رہے تو تکمیل نہ ہو سکے گی۔

ناقص عمل کو ہمیشہ کافی سمجھنا غلطی ہے

اس کی ایسی مثال ہے کہ بچہ جب تک روٹی کھانے کے قابل نہ ہو اس وقت تو اس کو دودھ پر اکتفا کرنا جائز ہے اور نشو ونما کو مانع نہیں لیکن جب وہ دو برس کا ہو کر روٹی ہضم کرنے کے قابل ہو جائے اب اس کو دودھ پر اکتفا جائز نہیں بلکہ اب اسے روٹی کھانا چاہیے اور دودھ کو بالکل چھوڑ دینا چاہیے۔ اگر وہ اب بھی دودھ پر اکتفا کرے گا تو نشو ونما میں قصور رہے گا اور وہ مرد کامل نہ ہو سکے گا۔ پس پہلی غلطی کا تو حاصل یہ تھا کہ بعض سالکین اول ہی سے کمال کی ہوس کرنے لگتے ہیں جیسے کوئی بچہ شروع ہی سے اگر دودھ کے بجائے روٹی کے ہوس کرنے لگے تو ان سے کہا جاتا ہے کہ

ابھی کمال کی ہوس نہ کرو بس کام میں لگے رہو چاہے ناقص ہی ہو ہمت نہ ہارو۔ اور دوسری غلطی کا حاصل یہ ہے بعض لوگ ناقص عمل ہی کو ہمیشہ کے لیے کافی سمجھنے لگے۔ جیسے بچہ ہمیشہ کو دودھ ہی پر اکتفا کرنا چاہے تو ان سے کہا جاتا ہے کہ ہمیشہ کے لیے کافی نہیں۔ جب عمل کامل پر قدرت ہو جائے تو اب عمل کامل کا اہتمام کرو ناقص کو پس پشت چھوڑ و۔

خطرہ کا ابقاء فعل اختیاری ہے

بعض لوگ وساوس کو خود تو نہیں لاتے مگر اس مقام پر شیطان ایک اور دھوکہ دیتا ہے وہ یہ کہ خطرہ اولاً تو بے اختیار ہی آیا مگر پھر یہ شخص اپنے اختیار سے اس میں مشغول ہو گیا اور یہ سمجھتا رہا کہ یہ تو بے اختیاری خطرہ تھا حالانکہ اس کا حدوث صرف غیر اختیاری تھا باقی اس میں مشغول اور اس کا بقاء تو غیر اختیاری نہ تھا بلکہ یہ فعل اختیاری ہے پس ورود تو مضر نہ ہوگا۔ مگر اس میں مشغول ہونا مضر ہوگا۔ چنانچہ احادیث میں نامحرم پر پہلی نظر (جو فجاۃ اچانک پڑ جائے ۱۲) معاف ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے "وعلیک الاخرۃ" (مضر تمہارے لیے دوسری نظر ہے) کیونکہ دفعۃً نظر پڑ جانا تو بے اختیاری بات ہے کہ پہلے سے خبر ہی نہ تھی کہ سامنے سے کون آ رہا ہے۔ اچانک سامنا ہو گیا لیکن نظر پڑنے کے بعد نگاہ کو نہ ہٹانا اور برابر گھورتا رہنا اور نظر جمانا یہ تو اختیاری ہے یہاں بھی بعض لوگوں کو وہی دھوکہ ہوا ہے جو وسوسہ میں بعضوں کو ہوتا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ دوسری نظر یہ ہے کہ ایک بار نظر ہٹا کر پھر دوبارہ نظر کی جائے اور اگر نظر نہ ہٹاوے بلکہ برابر دیکھتا رہے تو گناہ نہیں کیونکہ یہ سب تو اول ہی نظر میں داخل ہے۔ اس کا حل آیت "لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا" (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) نے کر دیا ہے اس میں فیصلہ کہ غیر اختیاری بات پر مواخذہ نہیں اور اختیاری پر مواخذہ اب خود دیکھ لو کہ نظر جمانا اختیاری ہے یا غیر اختیار ہے۔ یقیناً اس میں اختیار کو دخل ہے تو اس پر ضرور مواخذہ ہوگا۔

ایک محرف درویش کی حکایت

ایک محرف درویش نے "لک الاولیٰ" (تمہاری پہلی نظر معاف ہے) میں اوپر کا بدن دیکھنا مراد لیا ہے اور "علیک الاخرۃ" (دوسری نظر تمہارے لیے مضر ہے) میں نیچے کا بدن دیکھنا وہ کہتے تھے کہ اوپر کا بدن جنت ہے اور نیچے کا بدن دوزخ اور جنت تعلق رضوان سے ہے اور دوزخ کا مالک سے اور رضوان عورت کی رضا ہے اور مالک شوہر ہے۔ پس اوپر کا بدن دیکھنا تو عورت کی رضا سے جائز ہے اور نیچے کا بدن مالک کا حق ہے یعنی شوہر کا' استغفر اللہ کیا واہیات بات ہے۔ میں کہتا

ہوں کہ اگر مالک اجازت دے دے تو شاید یہ اسفل دیکھنا بھی جائز کرلیں گے تو جو شخص ایسے ایسے خیالات پکا کر وسعت نکالے گا تو ضرور اس کے اعمال ناقص رہیں گے اور ناقص اعمال پر ثمرہ مرتب نہیں ہوتا تو یہ عمر بھر ناکام رہے گا۔ باقی فضل کی اور بات ہے ورنہ قاعدہ یہی ہے۔

وصول کے لیے مجاہدہ کی ضرورت

چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا'' (جو لوگ ہمارے راستہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے دکھادیں گے) اس سے معلوم ہوا کہ وصول کے لیے مجاہدہ کی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ ناقص عمل میں مجاہدہ نہیں ہوتا بلکہ مزہ آیا کرتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص حساب کر رہا تھا اور ایک دوسرا آدمی اسے باتوں میں لگالے جس سے حساب میں خلل پڑنے لگا تو اس شخص نے کھڑے ہوکر نماز کی نیت باندھ لی اور حساب سوچنے لگا تو اس میں خاک مجاہدہ ہوگا بلکہ اس میں تو مزہ آئے گا۔ چنانچہ اسی مزہ کی وجہ سے نماز میں حساب خوب یاد آتا ہے نماز میں دنیا کی باتیں یاد آجانے پر ایک قصہ یاد آگیا۔

شیطانی نسیان

ایک شخص نے امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا کہ میں نے گھر میں ایک جگہ روپیہ دفن کیا تھا اب وہ جگہ بھول گیا' کسی طرح یاد نہیں آتی کوئی ترکیب بتلایئے جس سے جگہ یاد آجائے۔ اول تو امام صاحب نے عذر کیا کہ بھائی اس کی ترکیب میں کیا بتلاؤں کوئی شرعی مسئلہ پوچھو تو میں بتلاسکتا ہوں مگر جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ جاکر نماز پڑھو اور یہ عزم کرلو کہ جب تک وہ جگہ یاد نہ آئے گی برابر نماز پڑھتا رہوں گا۔ چنانچہ اس نے دو ہی رکعتیں پڑھی تھیں کہ جگہ یاد آگئی۔ اس کا راز پوچھنے پر امام صاحب نے فرمایا کہ اس کو شیطان نے پریشان کرنے کے لیے بھلا رکھا تھا اس لیے میں نے یہ تدبیر بتلائی کہ میں جانتا ہوں کہ شیطان کو یہ کب گوارا ہوگا کہ ساری رات نماز پڑھے اس لیے اس نے جلدی ہی یاد دلا دیا۔ مگر یہ ترکیب ہر جگہ کام نہیں دے سکتی یہ ترکیب وہاں کام دیتی ہے جہاں نسیان شیطان کے سبب ہو طبعی نہ ہو یہ امام صاحب کا کمال ادراک تھا کہ اس شخص کی حالت سے سمجھ گئے کہ اس کو طبعی نسیان نہیں ہے بلکہ شیطانی نسیان ہے۔ شیطان نے پریشان کر رکھا ہے اس کا یہ علاج بتلا دیا کہ نماز پڑھتے رہو یاد آجائے گا کیونکہ شیطان جب یہ دیکھے گا کہ بدون میرے یاد کرائے یہ شخص نماز سے باز نہ آئے گا تو جلدی یاد دلا دے گا۔ غرض نماز میں شیطان ایسی باتیں خوب سوجھاتا ہے اسی لیے حساب بھی نماز میں خوب یاد آتا ہے جس طرح نیند بھی خوب آتی ہے۔

دراصل نیند یکسوئی میں آتی ہے

ایک شخص نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ حضرت کیا بات ہے کہ نماز میں تو نیند آتی ہے اور ناچ رنگ میں نہیں آتی۔ فرمایا میاں پھولوں کی سیج پر تو نیند آیا ہی کرتی ہے' کانٹوں پر کیسے نیند آتی ہے۔ یہ جواب ان بزرگ نے اپنی حالت کے موافق دیا ورنہ ہر شخص کے اعتبار سے یہ صحیح نہیں کیونکہ بعضوں کو پاخانہ میں بھی نیند آتی ہے اور باتیں بھی خوب یاد آتی ہیں بلکہ دراصل وجہ یہ ہے کہ نیند یکسوئی میں آیا کرتی ہے نماز کی چونکہ مشق ہے اس لیے قرأت وغیرہ پر توجہ کی ضرورت نہیں ہوتی وہ تو سب بلا قصد ادا ہوتی رہتی ہے تو ذہن کو یکسوئی ملتی ہے اور ناچ رنگ میں ذہن کو یکسوئی نہیں ہوتی اس طرح توجہ رکھتا ہے جس میں قوت فکر یہ کو حرکت رہتی ہے اس لیے نیند نہیں آتی (اور اگر کوئی شخص نماز بھی مشق پر نہ پڑھے بلکہ ہر ہر لفظ کو توجہ سے ادا کرے تو اس کو نماز میں بھی حرکت فکر یہ کی وجہ سے نیند نہ آئے گی ۱۲) اب اگر کوئی واعظ یہ نکتہ بیان کرنا چاہے کہ تمہاری کیسی نماز ہے کہ پاخانہ میں بھی تم کو نیند آتی ہے اور نماز میں بھی تم نے دونوں کو برابر کر دیا تو نکتہ کے طور پر بیان کر سکتا ہے مگر تحقیقاً یہ ٹھیک نہیں کیونکہ سبب اس تساوی کا امر عارض ہے یعنی قوت فکر یہ کے استعمال نہ کرنے میں اشتراک بہر حال ناقص عمل سے ترقی نہیں ہوتی کیونکہ اس میں مجاہدہ نہیں ہوتا بلکہ نفس کو مزہ آتا ہے اور مجاہدہ میں مزہ کہاں یہاں شاید کوئی یہ شبہ کرے کہ مزہ تو دلیل نقصان عمل کی نہیں اور کمال عمل کے منافی نہیں۔

نماز میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سہو کا سبب

کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نماز میں مزہ آتا تھا چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے: ''وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِىْ فِى الصَّلٰوةِ''[۱] (یعنی نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈ ہے) جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ آپ کو یہ بھی خبر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں کس بات سے مزہ آتا تھا۔ آپ کو توجہ الی الحق سے مزہ آتا تھا اور تم کو توجہ الی الغیر سے مزہ آتا ہے توجہ الی الحق سے مزہ نہیں آتا بلکہ اس میں مجاہدہ کرنا پڑتا ہے اس لیے تمہاری نماز میں وہ بات مجاہدہ سے پیدا ہوگی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا مجاہدہ حاصل تھی اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو نماز میں سہو ہوا ہے اس کا سبب بھی غلبہ توجہ الی الحق تھا اس سے گا ہے توجہ الی الصلوٰۃ میں کمی ہو جاتی تھی اور تم کو سہو ہوتا ہے۔ دنیوی امور کی طرف توجہ کرکے توجہ الی الصلوٰۃ میں کمی ہونے سے غرض نہ ہمارا مزہ

---

[۱] (کنز العمال: ۱۸۹۱۲)

اور آپ کا مزہ برابر اور نہ ہمارا سہو اور آپ کا سہو برابر بس آپ کے مزہ پر اپنے مزہ کو قیاس کر کے وسوسہ والی نماز کو ناقص نہ سمجھنا نری حماقت ہے۔

تزکی ماموربہ نہیں

بہرحال تزکیہ میں سالکین کو دو طرح کی غلطی واقع ہوتی ہے ایک یہ کہ تزکی کو مطلوب سمجھتا ہے اور جلدی مرتب عمل کامل نہ ہونے کی وجہ سے مغموم ہو کر عمل ہی سے معطل ہو جاتا ہے اور دوسری یہ کہ تزکی کو مطلب نہیں سمجھتا۔ اس لیے عمل ناقص پر جس پر تزکی مرتب نہیں ہوتی اکتفا کرتا ہے۔ سو یہ دونوں جماعتیں غلطی پر ہیں۔ حق تعالیٰ نے پہلی جماعت کی غلطی کو ''قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰهَا'' (جس نے اپنے نفس کو تزکیہ کر لیا کامیاب ہو گیا) میں رفع فرمایا ہے کہ تم خود تزکیہ کو مقصود سمجھو تزکی کا انتظار نہ کرو ضرور کامیاب ہو جاؤ گے اور دوسری جماعت کی غلطی ایک دوسری آیت میں رفع فرمادی ''قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی'' (جس کا نفس پاک ہو گیا وہ کامیاب ہو گیا) اس میں فلاح کو حصول تزکی پر موقوف فرمایا ہے۔ بتلا دیا کہ گو ماموربہ تزکیہ ہے تزکی ماموربہ نہیں مگر تزکیہ وہی ماموربہا ہے جس پر تزکی مرتب ہو جائے اور وہ ایسا تزکیہ ہے جس میں تکمیل اعمال کا اہتمام ہو اختیار اسباب تکمیل سے غفلت اور تکاسل نہ ہو۔ حاصل یہ ہوا کہ ناقص عمل کو کافی مت سمجھو بلکہ تکمیل اعمال میں کوشش کرتے رہو اور ان کو اس حد تک پہنچاؤ جس پر تزکی مرتب ہو جائے گی۔ اگرچہ تزکیہ کے وقت ثمرہ تزکی پر نظر نہ کرو بلکہ نظر عمل ہی پر رکھو لیکن عمل وہی اختیار کرو جو مؤثر ہو حصول تزکی میں۔

طالب جاہل اور قانع جاہل

پس ایک آیت میں طالب جاہل کی اصلاح ہے اور دوسری آیت میں قانع جاہل کی۔ طالب جاہل وہ ہے جو ثمرہ مرتب نہ ہونے سے عمل کو چھوڑ دے اور قانع جاہل وہ ہے جو ناقص عمل پر قناعت کرے۔ اب یہاں پر ایک شبہ اور ہے وہ یہ کہ جب تزکی تدریجاً حاصل ہوتی ہے اور وہاں فلاح اس کو ہو گی جو تزکی حاصل کر چکا ہو۔ تو ممکن ہے کوئی شخص تزکیہ میں مشغول ہو اور تدریجاً اسے تزکی حاصل ہو رہی ہو جو درجہ کمال کو ابھی نہیں پہنچتی تھی کہ یہ پہلے ہی مر گیا تو کیا اس کو فلاح نہ ہو گی جواب اس کا سایہ ہے کہ ''قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی'' میں میں جو حصول تزکی پر فلاح کو موقوف کیا گیا ہے یہ اس شخص کے لیے ہے جس کو اتنا وقت ملا تھا کہ اگر وہ برابر تزکیہ میں مشغول رہتا تو تزکی حاصل ہو جاتی۔ یہ شخص اگر اپنی سستی کی وجہ سے قبل حصول تزکی مر گیا تو ناکام مرے گا اور جس کو اتنا

وقت ہی نہ ملا جس میں تزکی حاصل کر لیتا وہ اگر قبل حصول مقصود مر جائے تو ناکام نہیں اس لیے "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا" (جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا وہ پاک ہو گیا) کے موافق یہ تزکیہ ہی تزکی کے حکم میں ہے مگر بشرط عدم انقطاع نامرادی کو مولانا بحکم بامرادی فرماتے ہیں:

گر مرادت را مذاق شکر است — بے مرادی نے مراد دلبراست

(اگرچہ تمہاری مراد شکر کی طرح پسندیدہ کیا بے مرادی محبوب کی مراد نہیں ہے)

صلح حدیبیہ فتح مبین ہے

مولانا نے "اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِيْنًا" (ہم آپ کو عنقریب فتح مبین عطا فرمائیں گے) کی تفسیر بھی اسی قاعدہ سے کی ہے۔ یہ تو تمام مفسرین کے نزدیک مسلم ہے کہ اس آیت کا نزول صلح حدیبیہ کے بارے میں ہوا ہے مگر اس میں اختلاف ہوا ہے کہ یہاں صلح حدیبیہ کو فتح مبین کہا گیا ہے یا فتح مکہ مراد ہے۔ بعض نے تو یہ کہا ہے فتح مبین سے فتح مکہ مراد ہے اور "انا فتحنا" صیغہ ماضی بمعنی مضارع ہے یعنی "انا سنفتح فتحالک مبینا" (ہم آپ کو عنقریب فتح مبین عطا فرمائیں گے) مضارع کو بصورت ماضی تیقن و تحقق ظاہر کرنے کے لیے لایا گیا اور بعض نے یہ کہا کہ فتح مبین سے خود صلح حدیبیہ ہی مراد ہے اس کو مجازاً فتح مبین کہہ دیا گیا کیونکہ صلح حدیبیہ فتح مکہ کا سبب بن گئی تھی اور وہ حقیقت میں فتح مبین ہے۔ مولانا سب سے الگ یہ فرماتے ہیں کہ صلح حدیبیہ اگر فتح مکہ کا سبب ہے) نہ ہوتی جب بھی اسی کو حقیقتاً فتح مبین کہا گیا ہے کیونکہ جو ناکامی بقصد کامیابی ہو وہ کامیابی ہی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صلح حدیبیہ سے مقصود فتح مکہ ہی تھا۔ حق تعالیٰ نے فرما دیا کہ آپ کو نیت فتح کی وجہ سے اسی وقت فتح مبین کا ثواب مل گیا۔ لہٰذا آپ آج ہی سے فاتح ہیں خواہ فتح کا وقوع ہو یا نہ ہو (سبحان اللہ یہ تفسیر سب سے اعلیٰ ہے کیونکہ اس میں کسی تکلف کی حاجت نہیں، نہ کلام حقیقت سے بدلتا ہے۱۲) اسی طرح یہاں سمجھو کہ جب انسان تزکیہ بقصد تزکی کرتا ہے اور اس کو اتنا وقت نہیں ملا کہ تزکی حاصل ہو تو اس کے لیے تزکیہ ہی بحکم تزکی ہے۔ غرض مقصود عمل ہے حتیٰ کہ یصل خواہ وصول دنیا میں ہو یا آخرت میں۔

ملائکہ بھی اجتہاد کرتے ہیں

اب مقولہ صوفیاء کا مطلب حل ہو گیا کہ کامیابی کا قصد نہ کرو یعنی جب عمل بقصد کامیابی ہو تو حصول کامیابی کی فکر میں نہ پڑو تم محروم نہ رہو گے ضرور کامیاب ہو گے۔ اگر دنیا میں بھی کامیابی نہ

ہوئی تو آخرت میں ہوجائے گی۔ جیسے حدیث میں ایک قصہ آیا ہے کہ ایک شخص نے ننانوے خون کیے تھے پھراس کوتوبہ کا خیال ہوا تو ایک عالم کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اتنے خون کیے ہیں اب میری توبہ قبول ہوسکتی ہے یا نہیں۔ عالم نے کہا نہیں تیری توبہ قبول نہیں ہوسکتی اس کو غصہ آ گیا اور اس عالم کو ختم کر کے پورے سو کر دیئے پھر دوسرے عالم کے پاس گیا (شاید ان کو پہلے عالم کا قصہ معلوم ہو چکا ہوگا ۱۲) ان سے پوچھا کہ میری توبہ قبول ہوسکتی ہے یا نہیں انہوں نے کہا کہ حق تعالیٰ کی رحمت کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا ہوا ہے اگر تو توبہ سچے دل سے کرے گا تو ضرور قبول ہوگی لیکن تیری توبہ کی شرط یہ ہے کہ اپنی بستی کو چھوڑ کر فلاں بستی میں جا کر سکونت اختیار کر (کہ وہاں صلحاء رہتے ہیں صحبت نیک سے تیری کامل اصلاح ہوجائے گی ۱۲) غرض انہوں نے ہجرت عن الوطن کو قبول توبہ کی شرط بتلایا۔ اس شخص کے دل میں طلب پیدا ہوگئی تھی اس لیے وطن سے بہ نیت ہجرت چلا، راستہ ہی میں تھا کہ اس کی موت آ گئی، اس نے اتنا کیا کہ مرتے مرتے بھی اس بستی کی طرف گھسٹتا رہا جہاں ہجرت کر کے جارہا تھا۔ چنانچہ نزع کے وقت بھی اس نے اپنے سینہ کو اس زمین کی طرف بڑھا دیا کہ جس قدر سعی ممکن ہے وہ تو کرلوں بس یہ عمل مقبول ہوگیا۔ چنانچہ اس کے انتقال کے وقت ملائکہ رحمت و ملائکہ عذاب دونوں آئے اور ان میں باہم اختلاف واقع ہوا۔ ملائکہ رحمت کہتے تھے کہ یہ جنتی ہے کیونکہ یہ بقصد توبہ ہجرت کر کے اپنے وطن سے چل پڑا تھا اب پہنچنا نہ پہنچا تقدیری بات ہے اس نے تو اپنی سی کوشش تکمیل توبہ میں کرلی ہے۔ ملائکہ عذاب نے کہا کہ نہیں یہ دوزخی ہے کیونکہ ساری عمر گناہوں کا مرتکب رہا ہے اور اخیر میں توبہ بھی کی ہے تو وہ بھی ناقص ہے ابھی اس کی توبہ صحیح نہیں ہوئی تکمیل توبہ کے لیے زمین صلحاء میں پہنچ جانا شرط تھا اور یہ ابھی پہنچا نہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ملائکہ بھی استنباط و اجتہاد کرتے ہیں۔ پہلے میں یہ سمجھتا تھا کہ ملائکہ اجتہاد نہیں کرتے بلکہ ہر امر میں ان کے پاس نص آتی ہے جیسا کہ "یَفْعَلُوْنَ مَایُؤْمَرُوْنَ" (وہ وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم کیا جاتا ہے) سے بظاہر معلوم ہوتا ہے مگر اس حدیث سے ثابت ہوا کہ وہ بھی اجتہاد کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس بھی بعض دفعہ نص کلیت کے ساتھ آتی ہے اور جزئیات میں استنباط کرتے ہیں جس میں بعض اوقات اختلاف کی بھی نوبت آتی ہے اگر استنباط نہ کرتے تو ان میں باہم اختلاف نہ ہوا کرتا۔ اب حق تعالیٰ نے اس معاملہ کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک اور فرشتہ بھیجا۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کی لاش سے دونوں طرف کی زمین کی پیمائش کرلو اگر اس کا وطن نزدیک ہو تو یہ دوزخی ہے اگر جائے ہجرت نزدیک ہو تو جنتی ہے۔ چنانچہ زمین ناپی گئی اور واقع میں

وطن ہی کی زمین نزدیک تھی مگر حق تعالیٰ کا وطن کی زمین کو حکم ہوا کہ دور ہو جاؤ اور ہجرت کی زمین کو حکم ہوا کہ نزدیک ہو جا۔ چنانچہ جائے ہجرت بالشت بھر نزدیک نکلی (اور یہ وہی مقدار تھی جو نزع کے وقت اس نے کچھ حرکت کی تھی۱۲) آخر کار وہ جنتی قرار پایا اور ملائکہ رحمت کے سپرد ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو عمل بقصد کامیابی کیا جائے اس میں اگر دنیا میں ناکامی بھی رہے تو آخرت میں یہ ناکامی کامیابی ہی کی برابر شمار ہوتی ہے۔

قلت والیه الاشارة قوله تعالیٰ ومن یخرج من بیته مهاجرا الی الله ورسوله ثم یدرکه الموت فقد وقع اجره علی الله

''جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کرے پھر اس کو راستہ میں موت آ جائے تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہو گیا۔''

وقال صلّی الله علیه وسلّم نیت المؤمن ابلغ من عمله ۱۲)[1]

''مومن کی نیت اس کے عمل سے ابلغ ہے''

وصال وہجرت کا مفہوم

اسی وجہ سے صوفیاء نے کہا ہے کہ تم عمل کامیابی کے لیے کرو اور ایسے عمل کا اہتمام کرو جو کامیابی کی طرف مفضی ہو جانے کے قابل ہو مگر عمل شروع کر کے حصول ثمرہ کی فکر میں نہ پڑو اگر پھر بھی کامیابی نہ ہو تو تم کامیاب ہی شمار ہو گے۔ اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں:

ارید وصاله و یرید هجری فاترک ما ارید لما یرید

(میں اس کے وصال کا خواہش مند ہوں اور وہ فراق چاہتا ہے تو میں اس کی خواہش کی خاطر اپنی خواہش کو ترک کر دیتا ہوں)

اور فرماتے ہیں:

میل من سوئے وصال و میل اوسوئے فراق ترک کام خود گرفتم تابر آید کام دوست

(میرا میلان وصل کی طرف ہے اور اس کا میلان فراق کی طرف ہے اپنے مقصد کو میں نے ترک کر دیا تا کہ محبوب کا مقصد پورا ہو جائے)

وصال وہجر کے دو معنے ہیں ایک رضا و عدم رضا دوسرے قبض و بسط۔ یہاں پر وصال سے رضا اور ہجر سے عدم رضا مراد نہیں بلکہ بسط و قبض مراد ہے کیونکہ اگر رضا و عدم رضا مراد ہو تو ارید

---

[1] (اتحاف السادة المتقین ۱۰: ۱۵)

وصالہ کے ساتھ ہر یدہجری جمع ہی نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ طالب رضا کے ساتھ حق کی طرف سے بھی رضا ہی متوجہ ہوتی ہے نہ کہ عدم (کمادل علیه النصوص الواضحة الصریحة ۱۲) (نصوص واضح صریحہ اس پر ملامت کرتے ہیں) اور قبض و بسط کو وصال و ہجر سے اس لیے تعبیر کردیتے ہیں کہ بسط صورت وصال ہے اور قبض صورت ہجراور صورت اس لیے کہا کہ حقیقی وصال تو رضا ہی ہے اور اسی طرح حقیقی فراق عدم رضا ہے مگر سلوک میں سالک کو ایک حالت ایسی پیش آتی ہے جس کو وصال سمجھتا ہے اور اس میں ظاہری آثار بھی وصال کے ہوتے ہیں مثلاً انوار و تجلیات کی کثرت دل میں انشراح وانبساط وغیرہ اس کو بسط کہتے ہیں۔

قبض کی حقیقت

اور بعضی حالت ایسی پیش آتی ہے جس کو سالک فراق و ہجر سمجھتا ہے اور اس میں آثار بھی ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے محبوب سے جدا ہونے والے پر حالات طاری ہوا کرتے ہیں مثلاً انوار و تجلیات سے قلب کا خالی ہونا دل میں بے چینی اور ظلمت کا محسوس ہونا وغیرہ اس کو قبض کہتے ہیں۔

قرب صوری و معنوی

مگر یہ حقیقت میں وصال و فراق نہیں ہے بلکہ محض ان کی صورت ہی ہوسکتا ہے کہ ایک شخص حال قبض میں حقیقی وصال یعنی رضا سے مشرف ہو اور ایک شخص حالت بسط میں بعد حقیقی یعنی عدم رضا میں مبتلا ہو کیونکہ قرب صوری بعد معنوی حقیقی کے ساتھ اور بعد صوری قرب حقیقی معنی کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے۔ مثلاً ایک محبوب اپنے دشمن کو جو اس سے بھاگنا چاہتا تھا زبردستی اپنے دربار میں پکڑ بلائے اور وہ زنجیروں میں کسا ہوا اس کے سامنے حاضر کیا جائے اس وقت یہ شخص صورۃ قرب کے ساتھ موصوف ہے کیونکہ حسین کا چہرہ اس کے سامنے مگر حقیقت میں بعد فراق سے متصف ہے کیونکہ دربار میں مجرم ہوکر آیا ہے اور ایک عاشق کو محبوب نے حکم دیا کہ ہمارے واسطے بازار سے فلاں چیز خرید لاؤ یہ اس وقت صورۃ محبوب سے دور ہے اور ظاہراً فراق و بعد میں مبتلا ہے مگر حقیقتاً یہ اس دوری میں بھی قرب و وصال سے کامیاب ہے کیونکہ محبوب کی رضا سے مشرف ہے (اسی کو سعدی نے فرمایا کہ وہ دوران باخبر نزدیک و نزدیکان بے خبر دور ۱۲) (دوران باخبر نزدیک اور نزدیکان بے خبر دور ہیں) پس سالک کو بسط سے مطمئن اور قبض سے پریشان نہ ہونا چاہیے۔ اصل پریشانی کی چیز معاصی ہیں جو بعد حقیقی کے اسباب ہیں ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اگر اعمال درست ہوں تو پھر خواہ ہزار قبض ہو اور جو اعمال میں نقص ہے تو پھر خواہ لاکھ بسط ہو سب ناقابل اعتبار ہے۔

تخلیہ اور تحلیہ

اب میں ایک ایک چھوٹی سی بات بیان کر کے مضمون کو ختم کرتا ہوں وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى" (جس نے تزکی حاصل کرلی کامیاب ہوگیا) کے بعد فرمایا ہے: "وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى" (اپنے رب کا نام ذکر کیا پس نماز پڑھی) اس میں تزکی کو ذکر وصلوٰۃ پر مقدم کیا گیا ہے اس سے تصوف کا ایک مسئلہ مستنبط ہوتا ہے وہ یہ کہ سلوک میں دو عمل ہوتے ہیں ایک تخلیہ اور ایک تحلیہ اور تخلیہ کو تجلیہ وتصفیہ بھی کہتے ہیں۔ تخلیہ کے معنی ہیں رذائل کو زائل کرنا اور تحلیہ کے معنی ہیں فضائل کو حاصل کرنا تو لفظ تزکی میں اس طرف اشارہ ہے کہ رذائل کو زائل کرنا اور "وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى" (اس نے اپنے رب کے نام کا ذکر کیا پس نماز پڑھی) میں اس طرف اشارہ ہے کہ فضائل کو حاصل کرو اور ہر چند کہ تحصیل فضائل بھی تزکی میں داخل ہوسکتا ہے کیونکہ تزکی کے معنی ترک رذائل ہیں اور فضائل کا ترک بھی اس میں آ گیا اور ترک الترک ایجاد ہے اس لیے تحصیل فضائل بھی تزکی میں داخل ہوگیا اور تحقیق اس کی یہ ہے کہ ترک کے دو درجے ہیں ایک ترک وجودی دوسرے ترک عدمی۔ ترک وجودی یہ ہے کہ کسی امر کو خواہ مامور بہ ہو یا منہی عنہ احتمال وجود کے وقت ترک کیا جائے مثلاً ایک عورت سامنے سے گزری اور اس نے نظر کو اس طرف سے ہٹا لیا اور بالکل نظر نہ کی تو یہاں ترک نظر ترک منہی عنہ کی مثال ہے۔ یا نماز کا وقت آیا اور اس نے نماز ترک کردی یہ ترک صلوٰۃ ترک مامور بہ کی مثال ہے اور ترک عدمی یہ ہے کہ اسباب وجود کے نہ ہوں اور کسی کام کو ترک کیا جائے۔ جیسے ایک وقت بہت سے افعال منہی عنہا سے آدمی بچا رہتا ہے اور احتراز کا قصد بھی نہیں ہوتا۔ پس پہلا ترک تو کبھی طاعت ہے اور کبھی معصیت اور دوسرا ترک نہ معصیت ہے نہ طاعت اس لیے تزکی سے ترک عدمی تو مراد ہوسکتا نہیں کیونکہ محل مدح میں فرمانا دلیل ہے اس کی اطاعت ہونے کی اور ترک عدمی طاعت بھی نہیں۔ پس یقیناً ترک وجودی ہی مراد ہے یعنی احتمال وجود کے وقت رذائل کا ترک کرنا اور معصیت بھی رذائل کا فرد ہے پس تزکی میں تمام معاصی کا ترک داخل ہوگیا اور معاصی میں طاعت کا ترک بھی داخل ہے تو اس طرح سے "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى" (بامراد ہوا وہ شخص جو پاک ہوگیا) ہی میں ترک معاصی و امتثال طاعات سب داخل ہوجاتا ہے مگر چونکہ یہ اشتمال ظاہر نہ تھا اس لیے اللہ تعالیٰ جل شانہ نے تحصیل طاعات کو "وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى" (اور اپنے رب کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا) میں ذکر فرما دیا۔ پس اب تزکی میں ترک منہیات ہی داخل رہا اور ان دونوں کے مجموعہ کو مدار فلاح ٹھہرایا گیا تو ثابت ہوا کہ فلاح کا مدار تخلیہ وتحلیہ دونوں کے مجموعہ پر ہے اور یہی صوفیاء کا قول ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ بدون ان دونوں کے سلوک کامل نہیں ہوسکتا۔

تخلیہ مقدم ہے یا تحلیہ

البتہ شیوخ کا اس میں اختلاف ہے کہ تحلیہ کو مقدم کیا جائے اور تخلیہ کو مؤخر یا تحلیہ کو مقدم کیا جائے اور تخلیہ کو مؤخر اور مفید دو طریق ہیں خواہ تخلیہ کو مقدم کیا جائے یا تحلیہ کو کیونکہ ان دونوں میں جانبین سے استلزام ہے جیسے ایک بوتل میں پانی بھرا ہو اور ہم پانی نکال کر اس میں ہوا بھرنا چاہیں تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ پہلے پانی کو نکال دو ہوا خود بخود بھر جائے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی آلہ کے ذریعے سے پہلے ہوا بھرنا شروع کر و پانی خود ہی نکل جائے گی۔ اسی طرح فضائل کے حاصل کرنے سے رذائل خود بخود زائل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کسی نے سخاوت کی صفت حاصل کر لی تو بخل جاتا رہے گا اور رذائل کے زائل کرنے سے فضائل خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بخل زائل ہو گیا تو سخاوت حاصل ہو جائے گی۔ غرض دونوں طریق مفید ہیں مگر چشتیہ نے تخلیہ کو مقدم کیا ہے (اور یہ آیت بظاہر مؤید ہے ۱۲) اور نقشبندیہ نے تحلیہ کو مقدم کیا ہے اور آیت "وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا" (اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے قطع کر کے اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ) کا ظاہر ان کو مؤید ہے۔

ہر شخص کی استعداد جدا ہوتی ہے

مگر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہر شخص کی استعداد جدا ہوتی ہے کسی کے لیے تقدیم تخلیہ مفید ہے اور کسی کے لیے تقدیم تحلیہ مفید ہے اس سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ سب کے لیے نہ چشتیت مفید ہے نہ نقشبندیت۔ بلکہ کسی میں چشتیت کا غلبہ نافع ہے اور کسی میں نقشبندیت کا غلبہ مفید ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب کے لیے خاندان چشتیہ یا نقشبندیہ میں داخل ہونا مفید نہیں اور کوئی یہاں داخل ہو کوئی وہاں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ جو شخص چشتی ہو اسے سب مریدوں کو طریق چشتیت ہی سے تربیت نہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح جو شیخ نقشبندی ہو اسے سب کو نقشبندیت کے ساتھ تربیت نہ کرنا چاہیے بلکہ سب مشائخ کو لازم ہے کہ طالب کی استعداد دیکھ کر جو طریق اس کے لیے مفید ہو وہ تجویز کریں۔ بس چشتی بھی دونوں طریقوں سے کام لیں اور نقشبندی بھی۔ اس طرح ہر ایک کے مریدوں میں کوئی چشتی ہونا چاہیے کوئی نقشبندی اس سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ چشتی بننے کے لیے یہ ضرور نہیں کہ جب سلسلہ چشتیہ میں داخل ہو جب ہی چشتی ہو اور نقشبندی بننے کے لیے بھی یہ ضرور نہیں کہ سلسلہ نقشبندیہ میں داخل ہو جب ہی نقشبندی ہو بلکہ چشتیت نام ہے تخلیہ کے زیادہ اہتمام اور نقشبندیت نام ہے تحلیہ کے زیادہ اہتمام کا۔ پس جو تخلیہ کا زیادہ اہتمام کرے وہ چشتی ہے گو کسی خاندان میں داخل ہوا۔ جو تحلیہ میں داخل ہوا اور جو تحلیہ کا زیادہ اہتمام کرے وہ

نقشبندی ہے۔ گو سلسلہ چشتی ہی میں داخل ہوا ایک سلسلہ میں ہو کر دوسرے سلسلہ کے طریق پر چلنا کچھ ممنوع نہیں بلکہ دوسرے سے مناسبت ہو تو شیخ کو ضروری ہے کہ اسی طریق پر چلائے۔

خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت بہاء الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ دونوں ایک ہیں۔ مقصود دونوں کا ایک صرف طریق تربیت میں فرق ہے جو شخص ان کو باہم جدا سمجھے گا اور کسی ایک کی تنقیص کرے گا وہ دونوں دروازوں سے محروم رہے گا۔ ان کو دو سمجھنا ایسا ہے جیسے بھینگا آدمی ایک چیز کو دو دیکھتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

شاہ راحوال کرد در راہ خدا   آں دود مساز خدائی را جدا

(دو بزرگوں میں سے جو شخص ایک کی تنقیص کرے گا وہ دونوں سے محروم رہے گا)

اس پر مولانا نے ایک بھینگے کی حکایت لکھی ہے کہ ایک دن استاد نے اس سے کہا کہ فلاں طاق میں ایک بوتل رکھی ہے اس کو اٹھا لا وہ جو پہنچا تو اس کو دو نظر آئیں کہا صاحب وہاں تو دو بوتلیں ہیں کونسی لاؤں۔ اس نے کہا ارے احمق دو نہیں ہیں ایک ہی ہے اس نے اصرار کیا کہ واہ وہاں تو دو صاف نظر آرہی ہیں۔ استاد نے کہا اچھا ایک کو توڑ دے اور دوسری لے آ۔ اب جو اس نے ایک کو توڑا تو دونوں غائب' اسی طرح ان دو بزرگوں میں سے جو شخص کسی ایک کی تنقیص کرے گا وہ دونوں سے محروم رہے گا۔ بعض لوگوں کو یہ مرض ہوتا ہے کہ ایک خاندان میں داخل ہو کر اس کی رسوم کے ایسے پابند ہوتے ہیں کہ دوسرے خاندان کے طریق کا اختیار کرنا حرام سمجھ لیتے ہیں یہ بڑی نادانی ہے۔

شیخ کامل کی تجویز پر بلا چوں و چرا عمل کی ضرورت

ایک شخص حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا اور شکایت کی کہ حضرت مجھے قبض رہتا ہے کسی طرح بسط نہیں ہوتا' آپ نے ارشاد فرمایا کہ ذکر جہر سے کیا کرو۔ تو وہ کیا کہتا ہے کہ حضرت میں تو نقشبندی ہوں جہر کیسے کروں آپ نے فرمایا کہ اچھا اگر نقشبندی ہو تو جاؤ' پھر اس نے ذکر بالجہر شروع کیا' بس جہر کرتے ہی بسط ہو گیا۔ اب بتلایئے اس شخص کی طبیعت کو ذکر جہر سے مناسبت تھی مگر اس کے شیخ نے ذکر خفی ہی تجویز کیا جس سے نفع نہ ہوا۔ حضرت حاجی صاحب نے پہچان لیا کہ اس کو جہر سے مناسبت ہے وہی تجویز فرمایا۔ مگر وہ حضرت نقشبندی ہونے کا عذر کرنے لگے یہ نہایت واہیات ہے۔ شیخ کامل جو کچھ تجویز کرے طالب کو اس پر بلا تردد و شک عمل کرنا چاہیے کیونکہ وہ صاحب بصیرت ہوتا ہے طالب کی استعداد کو پہچانتا ہے اور پہچان کر نسخہ تجویز کرتا ہے تو خوب سمجھ لو کہ ذکر جہر نقشبندیت کے منافی نہیں اور نہ ذکر خفی چشتیت کے منافی ہے۔ مقصود دونوں کا ایک ہے اور دونوں کو طالب کی استعداد کے

موافق جو طریقہ مفید معلوم ہو وہی بتلانا چاہیے دونوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ چشتیہ کے مذاق پر تخلیہ کا اہتمام غالب ہے اور نقشبندیہ کے مذاق پر تحلیہ کا اہتمام غالب ہے۔

سلسلہ چشتیہ اور نقشبندی کی حقیقت

چنانچہ ایک صاحب نے حضرت حاجی صاحب سے مشورہ لیا کہ میں سلسلہ چشتیہ میں مرید ہوں یا نقشبندیہ میں حضرت نے فرمایا کہ اگر ایک جنگل ہو جس میں جھاڑیاں اور خاردار درخت کھڑے ہوں ایک شخص اس میں زراعت کرنا چاہتا ہے تو وہ کیا کرے آیا پہلے جنگل کو جھاڑ وغیرہ سے صاف پاک کر کے پھر تخم پاشی کرے یا پہلے تخم پاشی کر دے اور بعد کو صاف کرتا رہے۔ ان صاحب نے کہا پہلے تخم پاشی کرنا چاہیے کیونکہ پہلے صفائی میں لگا تو ممکن ہے اسی میں موت آ جائے اور تخم پاشی کی نوبت بھی نہ آئے اور پہلے بیج ڈال کر صفائی میں لگے گا تو کچھ تو غلہ پیدا ہو ہی جائے گا۔ حضرت نے فرمایا کہ نقشبندیہ کے یہاں جا کر مرید ہو جاؤ تمہاری طبیعت کو ان کے مذاق سے زیادہ مناسبت ہے۔ دیکھئے حضرت نے دونوں طریقوں کی حقیقت بتلادی کہ مقصود دونوں کا ایک ہے صرف تخلیہ اور تحلیہ کی تقدیم و اہتمام کا فرق ہے اور جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ طالب کو نقشبندیہ کے مذاق سے زیادہ مناسبت ہے تو خود ہی فرمادیا کہ تم نقشبندی سلسلہ میں بیعت ہو جاؤ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت حصول مقصود کے لیے دونوں کو کافی سمجھتے تھے۔ (اور اگر یہ صاحب حضرت سے مشورہ نہ کرتے بلکہ بیعت کی درخواست کرتے اور حضرت بیعت بھی کر لیتے تب بھی ان کو تربیت نقشبندی ہی طریقے سے کرتے۔ پس مشائخ کو بھی طرز اختیار کرنا چاہیے اور جو محقق ہو گا وہ ایسا ہی کرے گا ۱۲) بحمد اللہ اس وقت تزکیہ کے متعلق کافی مضمون بیان ہو گیا اور اس میں جو غلطیاں واقع ہوتی ہیں ان کا ازالہ بھی ہو گیا اور شکوک و شبہات بھی رفع ہو گئے۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہماری اصلاح فرمائے اور فہم سلیم و عمل مستقیم عطا فرمائے۔ آمین

(وصلّى الله تعالىٰ علىٰ سيّدنا و مولانا محمّدٍ وعلىٰ آله واصحابه وبارک وسلّم. ثم بحمدالله الذی بعزة جلاله تتم الصالحات)

ختم شد

قارئین سے التجا ہے دعا فرمائیں کہ ناشر کی کوشش دینیہ اللہ تعالیٰ قبول فرمالیں اور مقبولان حق کے ساتھ محشور فرمادیں اور تمام زندگی بعافیت پوری فرمادیں۔ آمین بحرمۃ حضور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

......تمت بالخیر......